عروج انسانیت

محمد حافظ

مندرجات

الکلام

بارِ اوّل

قیمت : چار روپے

ناشر

ایم ثناء اللہ خاں - ۲۶ ریلوے روڈ لاہور

طابع

انشاء پریس - اردو بازار - لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلطان الواعظین جناب مولانا ابوالنور محمد بشیر صاحب مدیر ماہ طیبہ کوٹلی لوہاراں

کے

بارہ ۱۲ وعظوں کا بے نظیر مجموعہ

المسمّٰی بہ

واعظ (حصہ اوّل)

جس میں

انکار حدیث۔ رفض و خروج۔ وہابیت و مرزائیت۔ الحاد و ارتداد۔ اور مادر پدر آزادی وغیرہ۔ آجکل کے جملہ فتنوں کے رد و ابطال میں بارہ ۱۲ مفصل و مدلل وعظ درج ہیں۔

جو عوام و خواص سبھی کیلئے مفید ہیں اور جس میں علاوہ قرآن و احادیث اور ارشادات سلف کے مثنوی کی حکایات اور نتیجہ خیز لطائف بھی درج ہیں۔

باہتمام

صاحبزادہ عطاء المصطفیٰ و صاحبزادہ ضیاء المصطفیٰ

در اشرف پریس اردو بازار لاہور طبع شد

ناشر

کتب خانہ ماہ طیبہ کوٹلی لوہاراں ضلع سیالکوٹ

قیمت آٹھ روپے

پیش لفظ

جعفری کی کتاب معراج انسانیت کے اس حصہ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں جس میں غیر مذاہب پر مصنف نے تنقید کی ہے۔ مگر میرے نزدیک مصنف کی یہ ایک پیدائشی کمزوری ہے۔ اور احساس کمتری کا مظاہرہ کہ وہ اپنی برتری کے لئے یورپ کے اماموں کی سند لاتے ہیں۔ اور اپنی پسپائی کا خیال لوگوں کے دلوں سے ہٹانے کے لئے اپنے تنزل کے مقابلہ میں دوسروں کے تنزل اور ان کی پسپائی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اور درمیان میں اپنا دکھڑا بھی روتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تینوں متضاد میلانات ایک انسان کی رائے کا کوئی وزن نہیں چھوڑتے۔

ہم جب اپنی صداقت کے لئے سات سمندر پار والوں کی شہادت کے محتاج ہوئے تو ان کی کوئی بڑی سے بڑی شہادت بھی ہمارے اس نقصان کی تلافی کبھی نہیں کرے گی کہ ہمارا وجود انکے ثبوت پر موقوف ہوتا۔ وہ اگر ہماری شہادت اور تصدیق کے بغیر سب کچھ ہیں تو ہم ان کی شہادت کی بھیک مانگنے میں بہت بڑے بیوقوف ہوں گے۔ اور خود اپنے عمل سے ثابت کریں گے۔ کہ اور نہیں تو کم از کم ان سے ہم اپنے آپ کو فروتر پاتے ہیں۔ اور یہ چیز احساس کمتری کی بدترین قسم ہے۔

دوسری چیز کے متعلق بھی اگر آپ غور کریں تو وہ کچھ قیمتی مشغلہ نہیں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ دوسروں کی تنقیص کا جو پہلو آپ ظاہر کریں وہ خود اپنے اندر بھی تسلیم کریں یہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ میرا ہمسایہ مجھ سے بڑھ کر چور ہے یعنی چور ہونے سے تو مجھے بھی انکار نہیں۔ ایک پرانے اور لاغر مریض کے مقابلہ میں اگر ہم اپنے آپ کو تندرست اور صحت مند ثابت کریں تو کوئی بیوقوف ہی ہوگا جو ہمیں ایک کشتی باز اور اکھاڑہ میں اترنے والا پہلوان مان لے۔ ایک طرف آپ اپنے مسلم علماء و محدثین کو یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کی سازش اور فتنہ بازی کا شکار بتلاتے ہیں۔ جنہوں نے تمام تر انہیں کے خیالات ہاتھوں ہاتھ لے کر حدیث و تاریخ کی کتابوں میں بھر دیئے۔ اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ عیسائیوں کو یہودیوں کی [illegible] یا

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ (پ۱۴ ع۲۲)

"اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر، اور اچھی نصیحت سے اور اُن سے اس طریقہ پر بحث کرو۔ جو سب سے بہتر ہو"

یٰاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (پ۱۱ ع۱۱)

"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی۔ اور دلوں کی صحت، اور ہدایت و رحمت ایمان والوں کے لئے۔

هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًی وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ (پ۴ ع۵)

"یہ لوگوں کو بتانا اور راہ دکھانا۔ اور پرہیزگاروں کو نصیحت (وعظ) ہے"

یہ اور یہ خرابیاں ہیں حالانکہ ان کی آسمانی کتابیں جب محفوظ نہیں تو ان کی تاریخ سے کیا گلہ اور شکوہ ہو سکتا ہے۔ ادھر اپنیں اور بے گانوں اور مخالفین تک کو معلوم ہے کہ یہ حال ہمارا اور ہماری تاریخ کا نہیں۔ اس کے مستند ہونے کا یہ حال ہے۔ کہ اس کے جمع کرنے والوں نے اس کے ایک ایک نقطہ کے لیے مہینوں کے سفر طے کئے ہیں اگر انہوں نے اپنے شہر میں ایک حدیث سُنی اور جس سے سنی اسے بتلانے والا خواہ ایک مہینہ بھر کے سفر سے ملتا بھی ممکن ہوا تو خود اسے مل کر اس سے وہ حدیث سنے بغیر نہ رہے۔ اور اگر انہیں ایک واقعہ دس آدمیوں نے بتلایا جن میں سے ان کے خیال کے مطابق سچا ایک ہی تھا تو ان سب کا بیان جمع کر کے اس کے ساتھ اپنی رائے بھی انہوں نے دے دی جس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے تاریخی دفینہ کی مٹی کو بھی اس احتیاط کی بنا پر محفوظ کر لیا کہ اس مٹی میں بھی اس دفینہ کا کوئی جزو موجود ہو۔ اس طرح یہ ممکن نہ تھا کہ تاریخ اسلام کا کوئی جزو ان کے ریکارڈ سے باہر رہے۔

پھر اس تاریخ کی وسعت وہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا اور اس کے اول و آخر کا کوئی ایک چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی نہیں چھوڑا گیا۔ بلکہ یہاں تک بتایا گیا ہے کہ مختلف حالات میں آپ کیا کھاتے پیتے تھے۔ سوتے میں کیسے سانس لیتے تھے۔ اور جاگنے پر پہلا آپ کا کونسا کام ہوتا تھا سفر میں اگر رات کے پہلے حصہ میں پڑاؤ کرتے تو آپ کے سونے کی کیا کیفیت ہوتی اور اگر رات کے آخر وقت آرام فرماتے تو اترنے کے بعد آپ کس طرح سوتے۔ پاخانہ پھرنے کے لیئے آپ کتنا آبادی سے دور جاتے اور بیٹھتے وقت زمین کے کتنا قریب جا کر ستر کھولتے۔ اور پھر صفائی کے لئے کن چیزوں کو استعمال میں نہ فرماتے۔ بیت الخلاء جاتے تو کونسا پاؤں پہلے اندر یا باہر رکھتے۔ اگر کہیں آپ کو غصہ آتا تو اس کا زبان سے اور چہرے کی رنگت سے کیسے اظہار فرماتے۔ اور اگر کبھی بہت ہی زیادہ ہنستے تو آپ کے کتنے دانت دکھائی دیتے۔ اور عام حالات میں ہنستے ہوئے آپ کے کتنے دانت دکھائی دیتے اور جب آپ پانی پیتے تو پیالہ کو کس مقام پر منہ لگاتے۔ جبکہ کنارہ شکستہ ہوتا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ط

پہلی نظر

مدت سے میری خواہش تھی۔ کہ وعظ کی ایک ایسی جامع کتاب لکھوں جو عوام و خواص سب کے لئے یکساں مفید ہو۔ اور جس سے مبتدی طلبار بھی فائدہ اٹھائیں۔ اور مشتاق مقررین حضرات کے لئے بھی وہ سرمایۂ وعظ و تبلیغ ہو۔ چنانچہ یہ مجموعہ میری اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔ میں نے اسے بڑی محنت کے ساتھ اور بغیر کسی بخل کے لکھا ہے۔ اور دورِ حاضر کے اہم مسائل کو سامنے رکھ کر سادہ اور عام فہم طرز میں بہت کچھ لکھا ہے۔ انکارِ حدیث۔ وہابیت۔ رفض و الحاد اور مادر پدر آزادی وغیرہ کے جس قدر بھی آجکل کے فتنے نظر آرہے ہیں۔ ان سب کے ردّ و ابطال میں آپ اس مجموعہ میں مدلّل وعظ پائیں گے۔ میں نے بہت سی کتابوں کا مطالعہ کر کے ان مواعظ کو مرتب کیا ہے۔ اور جو بات بھی لکھی ہے۔ اصل کتاب میں دیکھ کر لکھی ہے۔ چنانچہ ہر آیت، حدیث اور ارشاداتِ سلف اور مخالفین کی عبارات کا مکمل حوالہ لکھ دیا ہے۔ خدا کے فضل سے کوئی حوالہ غلط نہیں ہے۔ آپ ان حقائق کو ہر مجمع میں بلا خوف و خطر، اور دھڑلے سے بیان کریں۔

اس مجموعہ میں جہاں قرآن و حدیث، اور ارشاداتِ سلف کی ضیار پاشیاں ہیں۔ وہاں حکایات و اشعار اور نتیجہ خیز لطائف کی دلچسپیاں بھی ہیں حق یہ ہے۔ کہ تائیدِ حق اور تردیدِ باطل میں یہ ایک کامیاب تالیف ہے اور اس کا اندازِ بیان ایک انوکھا۔ دلچسپ۔ اور مؤثر انداز ہے۔ مدلّل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سادہ و عام فہم بھی ہے۔ جس سے ہر شخص مستفید ہو

ہمارے تاریخ نگار ایسے واقعات کو مستند مانتے اور منواتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ واقعات بیعت بھی ایسے ہی صحیح ہیں جیسے دوسرے اہم واقعات ہو سکتے ہیں۔

رہا اس تاریخ سے تعلق رکھنے والوں کا معاملہ۔ تو اگر جامعین حدیث کو کسی نے قلم دوات بنا کر دے دی یا کسی نے سایہ بنا کر دیا تو اس کے حالات زندگی کو بھی قلم بند کر ڈالا گیا۔ ایسی حالت میں اگر ہم دوسروں کی تاریخ پر حملہ کا آغاز کریں اور پھر ان کے جوابی اعتراض کو سن کر کہیں کہ ہماری کتب حدیث کے اندر زانی اور چور کی سزا کے واقعات غلط طور پر درج ہیں اور اس پر بہت ہی افسوس و ندامت کا اظہار کریں تو ہو سکتا ہے ہمارے اظہار ندامت کے پیش نظر محدثین کو جھوٹا کہنا ہمارے اپنے لوگ برداشت کر لیں اور ہمیں ان کی بدگوئی پر مخلص فرض کر لیں، اور معذور سمجھیں مگر یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کوئی دوسرا آدمی ہماری اس معذرت خواہانہ تنقید پر کان دھر غور فرمائیے جس ریکارڈ میں درج ہونے والے استنجا اور مسواک کو مستند منوانے پر زور صرف کیا جاتا ہو وہاں اگر کوئی کہے کہ ایسے ریکارڈ میں زانی کو پتھروں کے ساتھ مار دینے کا فسانہ غلط طور پر درج ہے۔ تو کون عقل کا اندھا اس کی بات مان لے گا۔ اور کہے گا کہ ہاں یہ ٹھیک جہاں استنجا میں استعمال ہونے والے ڈھیلوں کی تعداد کو محفوظ رکھنے پر توجہ دی جاتی ہو وہاں ایسے مسائل میں بے احتیاطی ہو جاتی اور ہو سکتا ہے کہ کسی جگہ لوگ روڑے جمع کر رہے ہوں اور روایت کرنے والوں نے دور سے ہی ایسے موقعہ پر معلوم کیا ہو کہ یہ کسی شادی شدہ زانی کو سزا دی جا رہی ہے اور ایسے پتھروں سے مارا جا رہا ہے کیونکہ ریوں کے استنجا کی کیفیت کو تو وہ قریب سے دیکھ کر معلوم کر سکتے تھے مگر ایسے سنگساری کے معاملہ میں انہیں تک کوئی قریب پھٹکنے دیتا تھا اس لئے ہو نہ ہو اندراج واقعی غلط ہوا ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ جس تاریخ اور سنہ میں یہ اندراج حدیث کی کتابوں میں ہوا ہے۔ اس وقت زمانہ نزول کے حالات سے واقفیت رکھنے والا کوئی بھی اس کی تردید کے لئے موجود نہ ہو اور لوگوں نے اس کو صحیح مان لیا ہو۔ کوئی بہت ہی ردی انسان ہو جو ایسے مفروضہ کو مان لے۔

سکے گا۔ اور جہاں اسے علماء و طلباء پسند فرمائیں گے، وہاں عامۃ المسلمین، بھی اسے حرز جاں بنائیں گے۔ اور جہاں دین سے مس رکھنے والے اسے چاہیں گے۔ وہاں دین سے بے نیاز افراد بھی اسے سراہیں گے۔ اور سبھی اس سے مستفید ہوں گے۔

الغرض یہ کتاب اہل سنت کے لئے ایک گرانقدر تحفہ ثابت ہوگی۔ انشاء اللہ۔ مجھے امید ہے۔ کہ علماء عظام۔ طلباء کرام۔ عوام وخواص بلکہ اپنوں اور بیگانوں کی بھی نظر میں یہ مجموعہ قبولیت پائے گا۔ اس لئے کہ ؎

عشق میرا سا نہ ہاتھ آنی دلِ بُلبُل میں نہیں!
میرے پھولوں میں جو بُو ہے وہ کسی گُل میں نہیں

ابوالنور محمد بشیر

عملِ کتابت

حکیم محمد یوسف خوشنویس ۱/۱۹ سیالکوٹ امین پورہ (دوڑس روڈ)

اسی طرح یہ بات کہ دوسروں کو ملامت کرتے وقت ہم اپنی تاریخی غلطیوں پر خون کے آنسو بہاتے بہائیں جیسا کہ پرویز صاحب نے کیا ہے۔ تو ہمارے گندے تاریخی ریکارڈ کی ان خون کے آنسوؤں سے کسی طرح بھی صفائی نہیں ہو سکتی۔ ان وجوہ کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ پرویز صاحب کی طرف سے غیر اسلامی تاریخ کی تنقید بھی دراصل اسلامی تاریخ اور حدیث پر غلاظت ڈالنے کا ایک بہانہ اور ذریعہ ہے۔

آپ کے متضاد نظریات کو مختصر لفظوں میں دور یا تسلسل کا نام دیا جا سکتا ہے۔ دور کی مثال یہ ہے کہ جب رسول کو مشورہ کے ساتھ امور انجام دینے کا حکم دیا گیا اور آپ نے مشورہ سے کوئی ایسا کام کیا جو منشا خداوندی کے موافق نہ تھا۔ تو اس پر خدا کی طرف سے آپ کو تنبیہ ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر آپ مشورہ کے حکم پر عمل کرتے تو بھی تنبیہ ہوتی اور جب عمل کیا تو بھی تادیب ہوئی۔ پھر اگر آپ مشورہ کے خلاف چلتے تو بھی تادیب ہوتی۔ اور جب اس کے مطابق چلے تو بھی تادیب ہوئی۔ گویا چاروں طرف سے تادیب کا چکر چل رہا تھا جس سے نکل جانا آپ کے بس میں نہ تھا۔

تسلسل کی مثال یہ ہے کہ قرآن میں جو حکم آپ کو دیا گیا اس کی عملی جزئیات کو جب آپ نے اپنے یا دوسروں کے دماغ سے بنانا شروع کیا تو اس میں جو غلطی واقع ہوتی اس کی خدا نے اپنے ایک دوسرے حکم کے ذریعہ اصلاح فرمائی۔ پھر جب آنحضور نے اس دوسرے حکم کو بھی ٹھیک انجام نہ دیا تو اس کی اصلاح ایک اور حکم کے ذریعہ ہوئی۔ یہاں تک کہ آپ کی دنیا سے رخصتی ہوتی۔ اس سے لازم آتا ہے جو حکم آخری روز میں نازل ہوا تھا۔ اس کی اصلاح کے لئے بھی کوئی اور حکم بعد کو ملنا چاہیئے تھا۔ حالانکہ واقعۃً ایسا نہیں۔ اور احکام کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اب اگر آج بھی کسی مرکز ملت اور حکمران کی تعمیل حکم کو قابلِ اصلاح نہ مانا جائے تو اس کا مطلب ہو گا کہ وہ رسول سے زیادہ معصوم ہے۔ اور اسی کو رسول ہونا چاہیئے تھا۔ لہٰذا کسی نہ کسی طرح اس تعمیل اور اصلاح کے سلسلہ کو

ؔ۱ مزاج شناس رسول ص۱۸۹۔

فہرست مضامین

پہلا وعظ ۔ توحید

دوسرا وعظ ۔ رسالت

ہونا ہی تھا تو پھر سرے سے رسول کی غلط تعمیل کا اصول ہی باطل ہو کر رہتا ہے۔ اور ماننا پڑتا ہے کہ رسول بھی فقط احکام کا پابند تھا۔ اور ہم بھی صحیح احکام کی تعمیل کے پابند ہیں یہ ہے پرویز صاحب کے ان دو بنیادی اصولوں کے صحیح ہونے کا حال۔ اس سے آپ کی دوسری اختراعات کو سمجھایا جا سکتا ہے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اس کتاب میں معراج انسانیت کے علاوہ مصنّف کی دوسری جن کتابوں کا کہیں کہیں حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ قرآنی فیصلے۔
۲۔ مقام حدیث (اول۔ دوم)
۳۔ اسباب زوال امّت۔
۴۔ سلیم کے نام خطوط۔
۵۔ نظامِ ربوبیّت۔
۶۔ جُوئے نور۔
۷۔ ابلیس و آدم
۸۔ فردوس گمگشتہ
۹۔ مزاج شناس رسُول۔

تیسرا وعظ ـ فضائل رسول
صلی اللہ علیہ وسلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

معراج انسانیت پر کچھ لکھنے والے انسان کو پہلے قدم پر جو خیال آنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ یہ کتاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں ایک ایسے شخص کی طرف سے لکھی گئی ہے جو مسلمان ہوتے ہوئے اسوۂ رسول کا سب سے بڑا مخالف ہے۔ اور اس مخالفت پر اسکی کافی کتابیں شاہد ہیں۔ ادھر آنحضور سے اسکی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ آپ کی شان میں اتنی بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالتا ہے۔ اور اس کی کتابوں کو اس کے معتقد قرآن اور حدیث سے بھی خالی سمجھتے ہیں۔ ایسے موقعہ پر انسان اپنے آپ کو خطرات کے سمندر میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر اس کتاب پر کچھ نہ لکھا جائے تو اس کے عقیدتمندوں کو اور ان کا شکار ہونے والوں کو سوائے اس کے سمجھانے کا اور کوئی راستہ نہیں کہ اس فکری اور ذہنی بنیاد کو غلط ثابت کیا جائے جو ان کی عقیدت کا باعث ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے کہ اس میں اور اس طرح کی دوسری کتابوں میں وہ کچھ لکھا ہے جو ایک ایسا انسان کبھی نہیں لکھتا جو قرآن اور صاحبِ قرآن کو ایک اچھی کتاب اور اچھا انسان مانتا ہو۔ کیونکہ قرآن میں جہاں اطاعتِ خدا اور رسول کی یہ کچھ تاکید ہے وہیں سے پرویز صاحب یہ ثابت کرنے پر اپنا زور صرف کرتے ہیں کہ اس میں اطاعتِ رسول کا حکم تو کیا ہوگا اس کی ممانعت ہے۔ اور رسولؐ کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کی بات دین کے اندر کوئی سند اور حجت نہیں۔ اسکی باتوں میں کوئی سبق نہ تھا۔ وہ کسی طرح بھی قابلِ حفاظت نہ تھیں۔ اور نہ انہیں محفوظ رکھا گیا۔ یہ چند گونہ پریشانیاں ہیں جو ہر اس آدمی کی راہ کا روڑا بنتی ہیں جو پرویز صاحب کی کتاب پر کچھ لکھنا چاہتا ہے۔

وہ سوچتا ہے کہ اگر ایسے شخص کو ہتکِ رسول کا ملزم ٹھیرایا گیا تو خود اس کی بجائے دوسرے لوگ اسکی صفائی میں کتاب "معراجِ انسانیت" کو پیش کر دیں گے۔ اور سننے والے فیصلہ دینگے کہ جس آدمی کی اتنی بڑی بڑی کتابیں رسولؐ کی تعریف میں موجود ہوں وہ بھلا رسولؐ کی ہتک کیسے کر سکتا ہے۔ اور ہو نہ ہو یہ بالکل ملایانہ الزام ہے۔

جب حقیقت یہ ہے تو پھر اسکے سوا چارہ نہیں کہ پرویز صاحب کی کتابوں کا علمی انداز سے جواب لکھا جائے۔

وہ آپ کے بے ڈھنگے استدلال کی غلطی کو دلائل کے ساتھ واضح کیا جائے اور خود آپ کے خلاف کچھ کہنے سے پرہیز کیا جائے۔ یہی طریقہ ہے جسے میں نے اس کتاب میں اختیار کیا ہے۔ میں نے اس کے لکھتے وقت آپ کی اکثر کتابوں کو مدِ نظر رکھا ہے اور انہیں ناظرین کی نظر میں بھی لانے کی کوشش کی ہے۔ بعض جگہ زیرِ بحث کتاب کی عبارۃ کو آپ کی پہلی یا پچھلی عبارۃ سے رد کیا ہے۔ اور کہیں یہ کیا کہ اوپر میں دی گئی عبارۃ کا حاشیہ میں کسی اور کتاب کی عبارۃ سے تضاد واضح کیا۔ حوالہ میں صرف دوسری کتاب کا نام اور صفحہ لکھا مگر معراج الانسانیت کے نمبر صفحہ کے حوالہ پر ہی اکتفا کیا۔ کئی ایک مقامات پر اپنی ہی عبارۃ میں پرویز صاحب کے خیال کو اور آپ کی طرف سے وارد ہونے والے اعتراض کو ثبت کر دیا جس میں حوالہ کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔

قرآن میں ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کا پیرو ظاہر کرتے تھے۔ اللہ نے جگہ جگہ ان کے اس مجرد دعویٰ کو جھٹلایا۔ اور سب سے نمایاں رد یہ تھا۔ فرمایا کہ اگر تمہیں ابراہیم سے کچھ بھی لگاؤ ہوتا تو تم شرک کبھی نہ کرتے۔ کیونکہ اگر ابراہیم کے اندر تمہارے اور سب کرتوت فرض کر لئے جائیں تو یہ تو خود تمہیں بھی اعتراف ہے کہ وہ مشرک نہ تھا۔ اور تم مشرک ہو۔

اس طرح کے متضاد دعووں کی غرض و غایت ہر زمانہ میں جھوٹ رہی ہے۔ جب انسان اپنی زندگی کی عمارت جھوٹ اور باطل کی بنیادوں پر اٹھاتا ہے۔ تو اس کی نظر میں ایسے دعووں کا تضاد کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس علت کو پا لینے کے بعد اس بات میں قطعاً کوئی حیرت نہیں رہتی کہ آج کی دنیا میں قول و عمل کا یہ تضاد کیوں پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ حق یہ ہے کہ باطل جہاں بھی ہوگا تضاد اس کے ساتھ ہوگا۔ خواہ پہلی صدی ہو یا بیسویں۔ یہ اسی تضاد کا کرشمہ ہے کہ مرزا صاحب کو نبی ماننے والے ایک ہی سانس میں ان کی نبوت کے ساتھ ختمِ نبوت کا بھی اقرار کر لیتے ہیں بلکہ مسلمانوں سے بڑھ کر خاتم انبیاء کے آداب میں شاندار عنوانات قائم کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کی ذات مجموعہ اضداد کا مقام نمایاں ہے۔ آپ کی بغل میں ایک طرف قرآن ہے تو دوسری طرف انکارِ سنت۔ ایک طرف اقبال ہے اور دوسری طرف اسلم جیراج پوری۔ آپ اسی قرآن سے اطاعتِ رسول کا انکار نکالتے ہیں۔ جس کا کوئی مقام بھی اس

کے حلم سے خالی نہیں۔ اور اسی اقبال کو منکر حدیث ٹھیراتے ہیں جن کا یہ شعر ہے

کامل بسطام در تقلید فرد　　اجتناب از خوردن خربوزہ کرد

اقبال مرحوم اس شعر کی تشریح میں خود لکھتے ہیں۔ کہ ابا یزید بسطامی نے محض اس بنا پر خربوزہ کھانے سے پرہیز فرمایا کہ انہیں یہ علم نہ تھا کہ اگر آنحضور نے یہ پھل کھایا تو کیسے کاٹ کر کھایا۔ غور کیجئے جو اقبال آنحضور کے خربوزہ کاٹنے کو بھی دین سمجھتا ہو۔ اور جس کے ہاں روایت پرستی کا یہ رواج ہو کہ وہ اس طرح کے عمل کو بھی حدیث کی سند کے بغیر نہ چھوڑے اس اقبال کو پرویز صاحب اپنے راستہ کا مسافر اور اپنے قافلہ کا فرد بتاتے ہوئے خدا سے نہیں ڈرتے۔ اس کے ثبوت میں آپ کی کتاب "اقبال اور قرآن" کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کتابوں میں قرآن کے ساتھ ساتھ اقبال کو بھی بس بے دردی کے ساتھ گھسیٹا گیا ہے۔ اس کا اندازہ ہر پڑھنے والے کو ہو سکتا ہے۔ آپ اپنے استدلال میں قرآن اور اقبال سے اسطرح کام لیتے ہیں جیسے آگ بجھانے میں پیٹرول سے کام لیا جائے۔ ان دونوں کی مظلومی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان سے کام لینے والا ان کے استعمال سے بھی واقف نہ ہو۔

چنانچہ اس کتاب میں اقبال تو نیز فہمی قرآن کو جس طرح سے رسوا کیا گیا ہے اس کا حال میں نے بیان کرنے میں کہیں کمی نہیں کی۔ غور کیجئے کہ اگر اقبال کے اندر دو سارے برائیاں مان لی جائیں تو کیا یہ بھی کہیں ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان کا بھی حدیث رسول کے خلاف اس طرح جہاد رہا۔ جیسے پرویز صاحب نے جاری کر رکھا ہے۔ خدا ایسے نام لیواؤں سے ہر انسان کو بچائے۔ جو مرنے کو نانا بتلائے بغیر نہ چھوڑیں۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر　　تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

(اقبال)

پانچواں وعظ ۔ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَر

جذبہ صادقہ

"اس ظلم عظیم کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس نے غیر مسلم مصنفین کی مرتب کردہ کتب سیرۃ کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتابیں اس قسم کی خرافات و مزخرفات سے بھری ہوتی ہیں جن کے تصور سے ہماری آنکھوں میں خون آتا ہے لیکن ان کی بنیاد ان روایات پر ہوتی ہے جو ہمارے ہاں کی صحیح ترین کتب احادیث میں درج ہیں۔" ص ۳۵ دیکھیے یہ جذبہ کتنا قابل رشک ہے کہ غیر مسلموں کے اعتراض سے ایک مسلمان کا دل تڑپ اٹھے اور وہ اسلام کو ان کے اعتراض سے بچانے کی تدبیر میں لگ جائے لیکن اگر کسی جذبہ کو اس پر مرتب ہونے والے عمل اور نتیجے سے اچھا یا برا کہا جاتا ہے تو یہ جذبہ بہت ہی خطرناک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہمیشہ ایک بگاڑ کی جب اصلاح کی جاتی ہے تو لازم ہوتا ہے کہ خواہ اصلاح ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں بگاڑ پہلے سے زیادہ کسی طرح بھی ہونے نہ پائے۔ اگر آپ ایک بیمار کا علاج کرنے لگیں تو ضروری ہے کہ خواہ وہ تندرست نہ بھی ہو مگر اس کی مرض پہلے سے زیادہ نہ بڑھے۔ اس قاعدہ کے بالکل الٹ پرویز صاحب غیر مسلم لوگوں کے اعتراضات سے جو تنگ آگئے جن کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کا اجتماعی نظام اعمال و عقائد ان سے کچھ بھی متاثر نہ تھا تو آپ نے حدیث کے ریکارڈ پر دھاوا بول دیا جو ان کے ہاں تاریخی اور دینی ماخذ کو پامال کر دینے کے برابر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کے اعتراضات بدستور موجود ہیں، اور پہلے سے زیادہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ ان کے ختم ہونے کی کوئی توقع نہیں اور ادھر مسلمانوں میں انتشار پھیل رہا ہے جس کا پہلے کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ بگاڑ کی اصلاح کا یہ ڈھنگ جیسا کچھ بھی مفید ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں۔

پھر یہ کیسی عجیب صورت ہے کہ ایک طرف قرآن کو آپ اسی بنا پر قرآن مانتے ہیں کہ وہ اللہ کا کلام ہے، اور اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ منکرین نے اس کے خلاف کیا کچھ کہا اور اب کیا کہہ رہے ہیں، اور مسلمانوں کے ہاں اس کا کیا مصرف ہے۔ اور دوسری طرف حدیث کے خلاف غیر مسلموں کے اعتراضات کو

چھٹا وعظ۔ نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم

آپ اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ کلامِ رسول ہونے کی حیثیت سے اس کی آپ کے ہاں سرے سے کوئی قدر و
قیمت نہیں رہ جاتی۔ ادھر واقعہ یہ ہے کہ حدیث کے ذخیرہ میں حدیث کے خلاف کچھ بھی موجود نہیں
مگر قرآن کے خلاف مخالفین کے اعتراضات کی تو داخلی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ پھر کیا یہ حدیث کے خلاف
بے جا تعصب نہیں۔ کہ باہر کی مخالف افواہوں کی وجہ سے اس کی مرمت شروع کر دی جائے۔ اور
اس کے داخلی اہتمام کو بالکل خاطر میں نہ لایا جائے۔

قرآن میں ایسے لوگوں کو بیوقوف کہا گیا ہے۔ جن کے نزدیک ایک قبلہ کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار
کرنا قابلِ اعتراض ہو سکتا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے کسی کام پر اعتراض کرنا بیوقوفوں کا کام
ہے جب واقعہ یہ ہے تو کیا آپ بیوقوفوں کی باتوں کو وقعت دیں گے اور ان لوگوں کے کسی کام کو بھی آپ
قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے۔ جو اسلام کے محافظ ہو گزرے ہیں۔ یہ غیر مسلم معترضین کچھ آج
ہی کی پیداوار تو نہیں۔ کیا محدثین کے زمانہ میں ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ یا انہیں اعتراض کرنا آتا نہ تھا۔
یا محدثین نے کتبِ حدیث کو مرتب کر کے انہیں گھر میں ڈال رکھا تھا۔ اور کوئی انہیں دیکھ نہیں پاتا تھا۔
اگر ایسا نہیں ہوا تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے معترض پہلے زمانہ کے غیر مسلموں سے بھی زیادہ
بیوقوف ہیں۔ اگر وہ پہلے بھی اعتراض کرتے تھے۔ اور ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسلمان حدیث پر عمل کرتے
آئے۔ تو آج جو شخص غیر مسلموں کے اعتراض کی بدولت حدیث پر حملہ کرتا ہے۔ اسے ان سب سے زیادہ اور بڑا
بیوقوف کہنا چاہیئے۔ کیونکہ جو آدمی اپنی بجائے دوسروں کی عقل سے کسی چیز کی جانچ پرکھ کا کام لے اور
انہیں کے کہنے پر اس چیز کے فائدہ کو فائدہ اور نقصان کو نقصان سمجھے وہ سب سے بڑھ کر بیوقوف نہیں تو اور کیا
ہو سکتا ہے۔

حدیث میں حیا کو ایمان کا ایک اہم جزو ٹھہرایا گیا ہے اور قرآن میں خدائے تعالے نے دین میں غلو
کرنے سے منع فرمایا ہے۔ دین میں غلو یہ ہے کہ جس نبی سے محبت و عقیدت ہو اسے خدا اور خدا کا بیٹا کہہ دیا
جائے۔ اور جس سے دل نہ لگے اس کو ولد الزنا کہنے سے بھی نہ شرمایا جائے۔ نوافل سے بڑھ کر مستحب
اور حرام سے بڑھ کر مکروہ کو اہمیت دی جانے لگے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی غلو ہے۔ کہ جس کتاب کے متعلق

ساتواں وعظ معراج شریف

آٹھواں وعظ۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ

کسی نے بتایا ہو کہ اس میں کچھ غلط باتیں ہیں اسے مجموعہ خرافات کہہ دیا جائے۔ یہ اگر جائز ہے تو پھر عدالتوں کو اختیار ہے کہ ہر ملزم کے خلاف الزام کی تحقیق کئے بغیر قتل کا فیصلہ دے دیں بلکہ کوئی عدالت سرے سے ہو ہی نہیں اور ہر شخص اپنے خیال کے مطابق خود ہی جج ہو۔ اور جس کی چاہے گردن اڑا دے۔

پھر مخالفین کے اعتراض کا اثر دیکھئے کہ وہ کس طریقہ پر ظاہر ہو رہا ہے۔ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک آدمی کے گھر میں چور گھس آئیں اور سب کچھ لے کر چلتے بنیں اور جب گھر کا مالک ان سے پوچھے کہ یہ آپ لوگ کیا لیکر جا رہے ہیں تو وہ بتائیں کہ جناب آپ کے گھر کے سب صندوق اور تمام پیٹیاں گندگی سے پڑی تھیں۔ آپ کا گھر کباڑ خانہ بنا پڑا ہے یہ سن کر وہ بھلا آدمی آکر اپنے گھر کے لوگوں کو سخت سست کہنا شروع کر دے اور چوروں کو دعا کرے۔ پھر وہ گھر والوں سے کہے کہ دیکھو! تم نے گھر کو کوڑا اور گندگی سے بھر رکھا ہے۔ تمہارے باورچی خانوں اور دسترخوانوں میں روٹی کی بجائے پاخانہ پڑا ہے اس پر وہ گھر والے سوچیں یا الٰہا! اگر ہمارے باورچی خانوں اور دسترخوانوں کی حالت یہ ہے تو پھر صحن خانہ میں کیا کچھ گندگی نہ ہوگی۔

غور کیجئے! معترضین سے تو آپ کو کچھ سروکار ہے نہیں کہ ان کا اعتراض بجا ہے یا بے جا اور وہ جھوٹے ہیں یا سچے۔ ادھر سمجھایا مسلمانوں کو جا رہا ہے۔ کہ معترضین کے بقول تمہاری صحیح ترین کتب حدیث میں یہ اور یہ لکھا ہے۔ اور اس پر یہ اور یہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ کیا تمہیں آج تک اس کا پتہ چل سکا ہے۔ کہ وہ غلط اور قابل اعتراض ہیں[1]۔ صحیح اور غلط کا جب یہ معیار قرار پایا کہ جس حدیث پر اعتراض وارد ہوا وہ غلط سمجھی گئی تو پھر قرآن کے بعض مقامات پر جب کہیں سے اعتراض وارد ہوا تو اس کا علاج یہ ہو گا کہ اس مقام کے معنی ایسے کر لیئے جائیں گے جن سے اعتراض باقی نہیں رہے گا چنانچہ یہی وجہ ہے

---

[1] بعد میں جو ائمہ حدیث ان کی تنقید کے لئے کھڑے ہوئے ان کے پاس ..... کوئی ایسا معیار نہ تھا جس سے کھری کھوٹی حدیث کو پرکھ کر الگ کر سکتے اس وجہ سے ... غیر مسلم معترضین ... کی بنیاد ان جعلیات پر ہوتی ہے جنکو مسلمانوں نے صحیح سمجھ کر تسلیم کر لیا مگر اصل میں وہ موضوع ہیں۔ مقام حدیث[1] ص ۱۲۵

نواں وعظ۔ اتباعِ رسول

دسواں وعظ۔ خدا کی بندگی

کہ پرویز صاحب لکھتے ہیں۔ اطاعتِ رسول کے معنی ہیں اطاعتِ امیر۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پھر ایسے
چوروں کو چور کیوں کہا جائے جو آئیں تو مال چرانے کو مگر بتلا کے یہ جائیں کہ تمہارے گھر میں صفائی کا
معیار ناقص ہے۔ ایسے لوگوں کو تو غیر مسلم معترضین کا نام دینے کی بجائے انہیں اپنا رہنما ماننا
چاہیئے جو آپ کو بے لاگ طریقہ پر اپنے آبائی دین کی غلطیوں سے آگاہ کر رہے ہیں۔

شانِ اقدس

"کتب روایات کی جمع و تدوین انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک وہ بھی
تنقید کی حد سے بالاتر نہیں ...... یہ سوء ادبی نہیں بلکہ انتہائے ادب و احترام ہے کہ ایسی باتیں
جو حضورؐ کی شانِ اقدس کی سطح سے گری ہوتی ہوں۔ ان کے متعلق صاف صاف کہہ دیا جائے کہ
وہ حضورؐ کی نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ غلطی سے آپ کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔" ص ۲

ذرا اس خلوص کا اندازہ ہو۔ فرض کیجئے کہ ایک حدیث آپ کی سب شرائط پر صحیح اور معیار
کے مطابق ہے۔ پھر آپ اسے آخری انعام اس کے صحیح ہونے کا کیا دیں گے؟ یہی نہ کہ نہ ملوں
یعنی ہمارے ہاں یہ دینی حجت نہیں۔ اور نہ وحی ہے۔ پھر اس دھوکہ میں کیا رکھا ہے۔ کہ انکار کو کھل
سامنے لانے کی بجائے آپ تنقید کا نام دیتے ہیں۔ تنقید کے معنی ہیں سونے چاندی کو پرکھنا۔ اگر
ایک شخص کہے کہ میرے ہاں سونے اور چاندی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ تو بالکل ظاہر ہے کہ
اس بیکار پرکھنے اور کھرے سے کھوٹا الگ کرنے کے شغل میں کبھی نہیں پڑیگا۔ کیونکہ جو چیز
کے ہاں بیکار محض ہے۔ اس کے بھلے برے کی شناخت سے اسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔
ی شناخت کا کوئی مقصد تو صرف اس وقت ہو سکتا ہے کہ وہ سونے اور چاندی کو کارآمد
سمجھے۔ آپ کے ہاں جب حدیثِ رسولؐ کو دینی حیثیت سے کوئی حیثیت حاصل نہیں تو آپ اس
تنقید میں کیا جان کھپا رہے ہیں۔ کیا یہ بھی کوئی فنِ تنقید کی کوئی قسم ہے کہ آدمی ہر حدیث پر

گیارہواں وعظ۔ دنیا

کہنا ہے کہ حدیث کو نہ مانا جائے۔

یہ بات کہ رسولؐ کی شانِ اقدس سے کیا چیز گری ہوئی ہے اس کا فیصلہ کرنا ہر انسان کا اپنا کام نہیں۔ بلکہ اس کے لئے وحی کی رہنمائی ضروری ہے۔ اس لئے کہ بھلائی اور برائی کا معیار قائم کرنا ہر انسان کا ذاتی منصب نہیں۔ بلکہ یہ وحی کا کام ہے کہ وہ بتلائے کہ نیکی کیا ہے۔ اور برائی کیا۔ قرآن ہمیں جہاں نیکی اور برائی کی تمیز سکھاتا ہے۔ وہاں ہمیں وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ رسول کا ہر کام نیکی اور محض نیکی ہے خواہ وہ قصداً کرے یا بلا ارادہ۔ اس کے کاموں میں برائی کا کوئی عنصر کبھی ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی کرنے آتا ہے۔ اور اگر وہ خود برا ہو تو رہنمائی کا یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ قرآن میں ہے۔

وجعلنا هم ائمة يهدون بامرنا واوحينا اليهم فعل الخيرات واقام الصلوٰة وايتاء الزكاة۔

ان رسولوں کو ہم نے ایسا امام بنایا ہے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے ہیں۔ اور ان کی طرف ہم نے نیکی میں مشغول رہنے کی وحی کی۔ اور نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے کی۔

اس آیت میں واضح ہے کہ انبیاء اور رسولوں کی طرف نیکی کا فعل کرنے کی وحی کی گئی۔ اور اس کے ساتھ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی۔ فعل ہر اس حالت کو کہا جاتا ہے جس پر ایک زندہ انسان قائم ہے۔ یہاں تک کہ سونا اور جاگنا بھی انسان کا فعل ہوتا ہے۔ اور عمل وہ ہوتا ہے۔ جو ایک خاص نظم کے تحت واقع ہو۔ آیت میں واضح ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہر حال نیکی پر قائم رہنے کی وحی کی گئی یعنی یہ کہ ان کا فعل نیکی اور بھلائی ہو۔ جیسے انسان ہر وقت کچھ دیکھتا اور سنتا ہے اور بولتا یا ہنستا ہے۔ نبی اور رسول کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے یہ اور اس طرح کے سب کام نیکی ہوں۔

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ رسول کی طرف جو نیکی کی وحی [illegible] ... ایک وجوہ سے غلط ہے۔ اوّل اس [illegible] ایسے ہیں جو رسول [illegible]

[illegible] لاحاصل اور غیر مفید [illegible] تھا [illegible]

بارہواں وعظ تکمیلِ اسلام

کام جن سے خدا نے منع فرمایا ہے۔ رسول ان سب سے پاک تھا جس کا مطلب ہوا کہ جو سبق لوگوں کو دلایا گیا وہ اسے پہلے سے ہی یاد اور نوکِ زبان تھا جو کچھ اسے پڑھایا گیا وہ یہ تھا کہ وہ نہ صرف نیک ہو بلکہ اس کا اوڑھنا بچھونا نیکی ہو۔ یہ سبق بھلا دوسروں کے حصّہ میں کب اور کہاں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن میں ہے کہ فرعون اور اس کے لوگوں کو ہم نے برے لوگوں کا لیڈر اور امام بنایا تھا۔ اگر ہم کہیں کہ فرعون بھی اپنے عوام ہی کی طرح بُرا تھا۔ تو پھر اس کی امامت کیا ہوئی۔ اس کے برائی کا امام ہونے کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کا ہر سانس برائی ہی سمجھا جائے اگرچہ ممکن ہے کہ اس کے رعایا میں کئی لوگ ایسے بھی ہوں جو کبھی برائی سے بچ رہتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح فرعون سب انسانیت کے قتلِ عام کا مجرم ہو کر برائی کا امام ہوا اُس وقت بنا جبکہ قرآن نازل نہ ہوا اور جہاں قرآن خاموش ہے تیسرے اس لیئے کہ دوسرے لوگوں کو قرآن میں جو حکم یا ممانعت ہوئی وہ اسے بار بار بتلائے گئے۔ اور انہیں بار بار سمجھانے بجھانے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ اور یہ حال رسول کا کبھی نہیں ہوا کہ اسے کام کے لیئے ایک سے زیادہ مرتبہ کہا گیا ہو۔ اور جب کہیں جا کر وہ اس کی تعمیل پر آمادہ ہوا ہو اگر اس کے اور سب دوسرے لوگوں کے لیئے ایک ہی قرآن تھا۔ تو دوسرے کیوں ایسے نہ ہو سکے کہ بار بار کی تعلیم کے محتاج نہ ہوتے اور اشارہ کو سمجھتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول کسی خصوصی ذریعہ تعلیم کا مالک تھا۔ جو دوسروں کی دسترس سے باہر ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف سب لوگوں کو نیکی کا حکم دیا گیا جن کے اندر نبی بھی شامل ہے۔ اور اس کے ساتھ اسے خاص طور پر الگ نیکی کا حکم دیا گیا تو اس کا مقصد یہی تو ہے کہ نبی کا عمل ہی نیکی کا معیار ہو۔ اور اس کے عمل کے پیشِ نظر نیکی کا تصور قائم کیا جائے۔ اور جو کام اس نے چھوڑا ہو اسے برائی سمجھا جائے جس طرح قرآن میں مسلمانوں کو پاکیزہ چیزیں کھانے اور ناپاک چیزیں چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ رسول کو بھی پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ کبھی نہیں کہ وہ پہلے ناپاک چیزیں کھاتا تھا۔ بلکہ مقصد یہ تھا کہ چونکہ وہ تو پہلے سے ہی ناپاک چیزوں کا تارک تھا۔ اور شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید اس نے بعض پاک چیزوں کو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

حمد باری تعالیٰ

اے خدا اے مہرباں مولائے من / اے انیسِ خلوتِ تنہائے من
اے کریم کارسازِ بے نیاز / دائم الاحساں شہِ بندہ نواز
اے کہ نامت راحتِ جان و دلم / اے کہ فضلِ تو کفیلِ مشکلم
ما خطا آریم و تو بخشش کنی / نعرۂ انی غفورٌ مے زنی
اللہ اللہ زیں طرف جرم و خطا / اللہ اللہ زاں طرف رحم و عطا
اے خدا بہرِ جنابِ مصطفےٰ / چار یارِ پاک و آلِ باصفا

پُر کن از مقصد تہی دامانِ ما!
از تو پذ رفتن زما کردن دعا

اعلیٰحضرت قدس سرہٗ

تری اس شان کے قربان یا غفار یا اللہ
مجھے تو نے دیا عشقِ شہِ ابرار یا اللہ
ترے فضل و کرم نے کی یہ میری عزت افزائی
بنایا مجھ کو مداحِ شہِ ابرار یا اللہ

نیاز القادری

بھی اپنی سنت احتیاط اور پرہیزگاری سے چھوڑ رکھا ہوگا۔ اس لئے اسے پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دیا گیا۔ تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ وہ پاک چیزیں کھانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا حکماً پابند ہے۔ اور صرف انہیں چیزوں کو چھوڑ سکتا ہے جو ناپاک ہوں۔ اس سے ایک عام آدمی بڑی خوبی کے ساتھ نبی کے عمل سے پاک اور ناپاک چیزوں کی فہرست مرتب کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے جیسا حال نبی کا نہیں۔ کہ اسے حکم تو ہو پاکیزہ چیزوں کے استعمال کا۔ مگر اس کے باوجود وہ ناپاک چیزوں سے رہ نہ سکے۔

جب ہم یہ جان گئے کہ جس طرح پاک اور ناپاک چیزوں کے درمیان تفریق کرنے کے لئے رسول کا عمل معیار ہے۔ اسی طرح نیکی اور برائی کے درمیان بھی اسی کا عمل معیار ہے۔ تو پھر یہ اجازت باقی نہیں رہ جاتی کہ ہم برائی اور بلندی کا اپنے طور پر خود ایک تصور قائم کریں اور پھر اس پر رسول کے کردار کو جا پہنچیں اور کہنے لگ جائیں کہ جو خیال یا عمل ہمارے اس تصور کے موافق نہیں وہ رسول کی شانِ اقدس کے خلاف ہے۔ اس لئے اس نے ایسا کام کبھی نہیں کیا ہوگا۔ بخلاف اس کے لازم یہ ہوگا کہ ہم رسول کے عمل سے اپنے اس بلند تصور کی اصلاح کریں جسے اپنے دماغ میں قائم کر رکھا ہو۔

یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ رسول کے عمل اور کردار کا ریکارڈ رکھنا ہمارے لئے کیوں ضروری ہے۔ اگر ہم خود ہی نیکی اور برائی کا علم رکھتے ہوں تو پھر یہ مہارت و قابلیت بہم پہنچانے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ کہ فلاں عمل رسول کی شانِ اقدس کی سطح سے گرا ہوا ہے۔ اور فلاں اس کے موافق ہے۔ کیونکہ یہ چیز کوئی مقصد نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ نیکی کا صحیح معیار حاصل کر کے اس کے مطابق اپنے آپ کو نیک بنائیں۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہمارا بنایا ہوا معیار ایسا ہی غلط ہوگا جیسے ہمارے دوسرے کاموں میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ قرآن کے دیئے گئے قاعدہ کے رو سے نیکی کا یہ معیار رسول کی ذات اقدس ہے۔

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ رسول کی شانِ اقدس کے خلاف ایک خبر کو کسی ایسی خارجی دلیل

نعت

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحٰی تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا
دھارے چلتے ہیں عطا کے وہ ہے قطرہ تیرا
تارے کھلتے ہیں سخا کے وہ ہے ذرّہ تیرا
فرش والے تری شوکت کا علو کیا جانیں
خسروا عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا!
میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا!
تیری سرکار میں لاتا ہے رضا اسکو شفیع
جو مرا غوث ہے اور لاڈلا بیٹا تیرا

اعلیٰحضرت بریلوی قدس سرہٗ

کے ذریعہ رد کیا جائے جو فریق مخالف کے ہاں قابل قبول ہو۔ چنانچہ حضرت یوسف کے خلاف زنا کی جو تہمت لگائی گئی تھی اسے دلیل کے ساتھ رد کیا گیا تھا۔ ورنہ وہاں یہ کہنا تو کچھ بھی مفید نہ تھا کہ چونکہ یہ الزام ان کی شانِ اقدس کے خلاف ہے اس لئے قابل قبول نہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ پر خون ناحق کا الزام قائم کر کے آپ کے قتل کی سکیم بنائی گئی تو ایک بھلے آدمی نے آنجناب کو اس سکیم کی اطلاع دے دی۔ اس وقت اگر وہ یہی کہہ دیتا کہ قتل کا الزام آنجناب کی شانِ اقدس کے خلاف ہے اس لئے نہ مانا جائے تو اسے کوئی بھی مان کر نہ دیتا کیونکہ مخالفین کے ہاں یہ کونسی دلیل ہو سکتی تھی کہ آپ کی شان اقدس کیا ہے۔ اس وجہ سے اس نے اس دلیل کو بیکار پاکر حضرت موسیٰ کو جاکر بتا دیا اور وہ چلتے بنے۔ آج بھی اگر حدیث پر اعتراض کرنے والوں کو کہا گیا کہ چونکہ یہ حدیثیں رسول کی شانِ اقدس کے خلاف ہیں اس لئے نہ مانی جائیں تو یہ بات مشکل ہی سے وہ مانیں گے۔ البتہ مفید طریقہ یہ ہے کہ ان کا رد اسی معیار کے مطابق کیا جائے جو اُن کے ہاں مسلم ہے۔

حضرت یوسف کے واقعہ سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ایک الزام کو رد کرنے کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ واقعات کی سمجھ بوجھ رکھنے والے کی رائے سے کام لیا جائے۔ ورنہ مجرد انکار کے تو کبھی کچھ معنی نہیں ہوتے۔ آج بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ روایات کی تحقیق کر کے ثابت کیا جائے کہ ان کے خلاف اعتراضات کی حقیقت کیا ہے۔ اور ان کے اندر تصنع کس قدر ہے۔

اقبال مرحوم نے جنت فردوس کا ایک واقعہ بیان فرمایا ہے۔ وہی جنت جو پرویز صاحب کہتے ہیں۔ کہ ایک فرضی نام ہے۔ جس کی کوئی حقیقت نہیں۔[1] علامہ فرماتے ہیں کہ جنت میں ایک دفعہ مولانا روم سے حکیم ثنائی کہہ رہے تھے کہ ہندوستان کا دیس ابھی تک بالکل پرانی طرز پر چل رہا ہے جس میں وہی پرانا رہن سہن اور کھانا دانہ ہے۔ کچھ بھی تغیر واقع نہیں ہوا۔

---

[1] جنت یا جہنم کسی خاص مقام کا نام نہیں۔" فردوس گمگشتہ ص ۳۲۹

پہلا وعظ
توحید

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ط

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (پ۳۰ ع۲)

"فرما دو وہ اللہ ایک ہے"

حضرات! اس وقت توحید باری کے متعلق کچھ عرض کرنے کو حاضر ہوا ہوں۔ مجھے یہ بتانا ہے۔ کہ اللہ ایک ہے۔ اور اس کی ذات و صفات میں دوسرا کوئی شریک نہیں۔ یہ حقیقت بیان کرنے سے پہلے وجودِ باری کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ یعنی پہلے یہ جان لیا جائے۔ کہ اللہ ہے اور یقیناً ہے۔ میرے بھائیو! اس ملحدانہ دور میں کتنی بے دین لیسے بھی ہیں۔ جو سرے سے ہستیٔ باری ہی کے منکر ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ خدا وُدا کوئی نہیں (معاذ اللہ) اور پھر لطف یہ۔ کہ یہ لوگ اپنے آپ کو پڑھے لکھے اور عقلمند بھی گمان کرتے ہیں۔ حالانکہ وجودِ باری کا انکار ساری جہالتوں سے بڑھ کر جہالت اور ساری حماقتوں سے بڑھ کر حماقت ہے ایسے ہی لوگوں کو میں بیوقوف عقلمند کہا کرتا ہوں۔ وجودِ باری تعالیٰ کا ثبوت نقلاً

سوائے اس کے کہ حلاج منصور کی روایت ہے کہ صرف ایک ہی قلندر صفت انسان یعنی اقبال نے خودی کا راز فاش کر کے اور نشر کر کے چھوڑا ہے۔

اس مقام پر پرویز صاحب یہی ظاہر کرتے ہیں کہ شاید غیر مسلم مورخین کی کتابیں پڑھ کر ان سے فیض حاصل کرنے کی سعادت بس آپ ہی کے حصہ میں آتی ہے۔ اور دنیا بھر میں کسی کو یہ توفیق ارزانی نہیں ہوئی کہ ان کی زیارت کر تا۔ یہ شاید اسی لیے کہنے کی ضرورت پیش آئی کہ چونکہ دوسرے اگر پڑھتے بھی ہیں تو آپ کی طرح اپنا دل اور دماغ ان کے ہاتھ میں ہبہ کر کے نہیں آتے۔ اس لیے ان کا پڑھنا نہ پڑھنے کے برابر ہے۔ ورنہ پڑھنے والوں کی تو کہیں کمی نہیں۔ مگر یہ ظرف ان کے پاس نہ تھا چنانچہ شبلی مرحوم نے تاریخ ہند کے اس حصہ کی صفائی دینا بھی ضروری سمجھا جس میں عالمگیر پر تہمت تراشی کی گئی تھی۔ اگر ہوتے پرویز صاحب تو پہلے چند ایک خون کے آنسو روتے اور پھر کہتے کہ برا ہو ان مورخین کا جنھوں نے ہماری تاریخ کو قرآن کے خلاف مرتب کیا ہمارے ہاں تاریخ کا معیار قرآن ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے قرآن میں کہیں بھی عالمگیر اور دارا وغیرہ کا نام نہیں۔ یہ صرف عجمی سازش ہے جس کی وجہ سے ہمیں آج عالمگیر اور دارا کے نام سننے پڑ گئے۔ ورنہ حقیقت میں نہ کوئی عالمگیر ہوا۔ اور نہ کبھی اس نے کسی گورو گوبند سنگھ کو قید کیا ہے۔

تاریخ و حدیث کی حفاظت

"جو کچھ زیادہ سے زیادہ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے علماء نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ سبت کے دن لوگوں کو جمع کر کے انہیں روایت بالمعنی کے طریق پر تورات کا وعظ سناتے۔ یعنی تورات کے الفاظ نہیں بلکہ اس کا مفہوم اسی کو روایت بالمعنی کہتے ہیں۔ ہماری کتب احادیث بھی اسی طرح مرتب ہوئی ہیں یعنی ان کے الفاظ رسول اللہ کے نہیں بلکہ مفہوم دوسروں کے الفاظ میں ہے"

تو ہے ہی۔ عقلاً بھی ہے۔ اور عقل کا بھی یہ اقتضاء ہے۔ کہ اس کائنات کا خالق و مالک یقیناً ہے ؂

وجودِ باری کا عقلی ثبوت

دیکھئے! آپ اگر ایک میز یا کرسی کو دیکھتے ہیں۔ تو اس میز یا کرسی کے بنانے والے کا تصور یقیناً آپ کے دماغ میں آجاتا ہے۔ اور جب آپ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ تو یوں کہتے ہیں۔ خوب ہے صاحب یہ کرسی اور بڑا مضبوط ہے یہ میز۔ کمال ہی کر دیا ہے بنانے والے نے۔ گویا بنانے والے کا ذکر کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے کہ عقل کا یہ فتوے ہے۔ کہ مصنوع کے لئے صانع کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ ایک بنی ہوئی چیز ہو۔ مگر اس کا بنانے والا کوئی نہ ہو۔ بغیر فاعل کے فعل کا صدور کب ممکن ہے اور اگر اس کرسی ہی کی آپ تعریف کئے جائیں۔ بنانے والے کا بظاہر چاہے نام نہ بھی لیں۔ تو بھی وہ ساری تعریف دراصل اس بنانے والے ہی کی تعریف ہوتی ہے۔ مثلاً آپ یوں کہتے ہیں۔ کہ واہ واکیسی خوبصورت کرسی ہے، کیسا اچھا ڈیزائن ہے۔ کس قدر مضبوط ہے۔ کیسا نفیس رنگ ہے۔ تو یہ سارے تعریفی جملے در اصل اسی کرسی کے بنانے والے ہی کی تعریف میں ہیں۔ کہ بنانے والے کا ہی تو یہ کمال ہے۔ کہ اس نے ڈیزائن بھی اچھا بنایا ہے۔ مضبوط بھی بنائی۔ اور رنگ بھی اچھا کیا۔ ورنہ کرسی کا خود اپنا ذاتی کمال تو کوئی بھی نہیں ؂

انبیاء و اولیاء کی تعریف

بزرگو! یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے۔ کہ خالقِ کائنات نے جو کچھ بھی پیدا فرمایا ہے۔ اس میں سے ہم جس مخلوق کی بھی تعریف کریں گے۔ وہ تعریف دراصل اسی خالق کائنات کی ہوگی۔ مثلاً ہم ایک گلاب کے پھول کو دیکھ کر اسکے رنگ و بو کی تعریف کریں۔ تو یہ درحقیقت گلاب کو رنگ و بو بخشنے والے کی تعریف ہے۔ کسی خوبصورت پرندے یا کسی دوسرے جانور کو دیکھ کر اس کی تعریف کریں۔ تو یہ بھی در اصل اس کے خالق کی تعریف ہے۔ اسی طرح

قرآن میں بکثرت مقامات پر ظن اور انکل پچو سے بات کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ ظن کی ایک قسم یہ ہے کہ انسان اپنی اور کائنات کی عاقبت کے متعلق کہہ دے کہ کوئی نہ قیامت ہے اور نہ جنت و دوزخ اور نہ موت کے بعد زندگی ہے۔ اور نہ کوئی آخرت کا حساب ہے۔ ایسا کہنے والوں کو قرآن میں بار بار سمجھایا گیا ہے کہ آخر آنے والے جن امور کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں۔ ان کے ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ کرنا تمہارا کام کس طرح ہو سکتا ہے۔ خود تمہیں اپنے کل کا علم ہے نہیں کہ اس میں کیا ہوگا۔ اور کیا نہ ہوگا۔ پھر قیامت کا معاملہ تو اور بھی تم سے کہیں دور ہے۔ پھر قرآن میں ہوش و حواس سے ٹھیک ٹھیک کام لینے کو کہا گیا ہے۔ اور ایسا نہ کرنے پر باز پرس کا خوف دلایا گیا ہے۔ اور علم کے بغیر ایک بات کی پیروی سے روکا گیا ہے۔ قرآن کریم کی ان ہدایات کے ہوتے ہوئے ایک مسلمان کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ ان کے خلاف عمل کرے۔ اور ایک بات بلا تحقیق فرض کر لے۔ اور پھر اس پر غلط قسم کے مفروضات قائم کر کے ان سے غلط نتائج کا ایک اچھا خاصا محل تعمیر کر ڈالے۔ اور پھر اسے یقین کی طرح دوسروں سے منوائے۔ جیسے وہ بالکل اندھیرے میں رہ کر پیش کر رہا ہو۔

ایک طرف پرویز صاحب کہتے ہیں کہ شاید بنی اسرائیل نے اپنی روایات کو بابل کی اسیری کے زمانے میں بنا کر مرتب کیا ہوگا۔ اور دوسری طرف یہ یقین قائم کر لیتے ہیں کہ ہماری کتب حدیث بھی اسی بے ڈھنگے طریقہ پر مرتب ہوئی ہیں یعنی بنی اسرائیل کے معاملہ میں جو کچھ ہوا تھا وہ یہاں بنا دیا گیا اگرچہ مسلمانوں کی پوری تاریخ کبھی ایسے حادثہ سے خالی ہے۔ جس میں وہ بنی اسرائیل کی طرح سارے کے سارے قید کر ڈالے گئے ہوں۔ کوران کا پورا دینی تعلیمات کا ذخیرہ ناپید ہو گیا ہو۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کی تورات ناپید ہوئی تھی۔ جب ایسا نہیں ہوا تو پھر یہ کہنا کس قدر غلط اور خلاف واقع ہے۔ کہ ہماری حدیث اور ہمارا قرآن یا تنہا حدیث بنی اسرائیل کی تورات کی طرح لوگوں کے دماغ کی پیداوار ہے۔ اور رسول کے اپنے الفاظ نہیں کیا یہ بھی کوئی تحقیق کی قسم ہے کہ ایک اچھے خاصے دلائل کے شریف اور اکلوتے بیٹے کو ملنے جانے والا زنا کہہ دیا جائے۔

خدا کی جس مخلوق کی بھی تعریف کی جائے گی۔ وہ دراصل اسی ربِ کائنات کی تعریف ہوگی۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

یعنی "سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں۔ جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔" — گویا مخلوق کی تعریف خالق کی تعریف ہے۔

تو اسی طرح اللہ کے نبیوں، ولیوں اور اس کے مقبولوں کی بھی جس قدر تعریف کی جائے گی وہ تعریف بھی سب اللہ ہی کی تعریف ہوگی۔ آپ حسنِ یوسف کی تعریف کرتے ہیں۔ تو یہ تعریف دراصل حسنِ یوسف کے خالق کی تعریف ہے۔ اس لئے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ آپ دمِ عیسیٰ کی تعریف کرتے ہیں۔ تو یہ تعریف بھی دراصل عیسیٰ علیہ السلام کو یہ اعجاز بخشنے والے کی تعریف ہے۔ اس لئے کہ الحمد للہ رب العلمین۔ آپ یدِ بیضاء توسے کی تعریف کرتے ہیں۔ تو یہ تعریف بھی موسیٰ علیہ السلام کو یدِ بیضاء عطا فرمانے والے کی تعریف ہے۔ اس لئے کہ الحمد للہ رب العلمین۔ اسی طرح آپ اپنے آقا و مولے حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے حسن بیمثال اور جمال و کمال کی تعریف کرتے ہیں۔ یا آپ کے علمِ ما کان و ما یکون اور آپ کے تصرف و اختیار کی توصیف کرتے ہیں۔ یا آپ کے ان بے مثل و بے نظیر اوصاف وکمالات کی جو خدائی بھر میں کسی دوسرے میں نظر نہیں آتے۔ تعریف کرتے ہیں۔ نثر میں تعریف کرتے ہیں۔ یا حضور کی جامع کمالات ذات منبع البرکات کو دیکھ کر اعلیحضرت کی طرح نظم میں تعریف کرتے ہیں۔ اور یوں کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں:۔

سرور کہوں کہ مالک و مولیٰ کہوں تجھے — باغِ خلیل کا گلِ زیبا کہوں تجھے
حرماں نصیب ہوں تجھے امید گہ کہوں — جانِ مراد و کانِ تمنا کہوں تجھے
بے داغ لالہ یا قمرِ بے کلف کہوں — بے خار گلبن چمن آرا کہوں تجھے
مجرم ہوں اپنے عفو کا ساماں کروں شہا — یعنے شفیع روزِ جزا کا کہوں تجھے
اس مردہ دل کو مژدہ حیاتِ ابد کا دوں — تاب و توانِ جانِ مسیحا کہوں تجھے

جس کے متعلق کسی نے کچھ پوچھا بھی نہ ہو۔

اصل میں جب آدمی ایک حقیقت کے خلاف بے جا تعصب کا شکار ہو جائے تو وہ اس کی بدگوئی میں اپنے کسی بڑے سے بڑے نقصان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اور بدگوئی ضد رکھ کے رہتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ جب حضرت یوسف کے بھائی آنجناب کے برادر حقیقی کو چوری[1]

---

۱ قرآن حکیم میں چوری کا یہ واقعہ اس طرح پر ہے کہ جب مصر میں حضرت یوسفؑ کی عملداری تھی تو قحط سالی کی وجہ سے آپ کے بھائی وہاں سے غلّہ حاصل کرنے کو گئے۔ آپ نے انہیں غلّہ دینے کے ساتھ ان کی وہ پونجی بھی خفیہ طور پر ان کے سامان میں ڈال کر واپس بھیج دی جو غلّہ کی قیمت کے لئے وہ لائے تھے۔ اور جب وہ دوسری دفعہ اسی غرض کو آئے اور آنجناب کے برادر حقیقی کو بھی ہمراہ لائے تو آپ نے ان کا سامان سفر درست کرتے ہوئے ایک قیمتی پیالہ برادر حقیقی کے سامان میں ڈال دیا۔ جب چلنے لگے تو ایک پکارنے والے نے پیچھے سے پکار کر کہا کہ تم چور ہو۔ اور آخر کار آپ کے بھائی کی بوریوں سے وہ پیالہ برآمد ہوا۔ اور اسے اس کے الزام میں ملزم بنا کر رکھا گیا۔ جو آپ کے بھائیوں کی بتائی ہوئی سزا کے مطابق عمل میں آیا۔

قرآن کا یہ بیان جو اپنے معنوں میں بالکل واضح ہے۔ اس پر بعض لوگوں نے نکتہ اٹھا کر حضرت یوسفؑ کو فریب کار کہنا چاہا۔ اور اس طرح فریب دہی کو جائز سمجھنے لگ گئے۔ اہل شیعہ نے اس سے بڑھ کر اسی سے تقیہ کو فرض بنا لیا۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے حضرت امام جعفر صادقؓ سے ایک روایت بھی بیان کی ہے کہ تقیہ اصل میں یہ ہے کہ بات کو خلاف واقع بیان کیا جائے۔ خواہ اس کے صحیح بیان کرنے میں کوئی خوف موجود ہو یا نہ ہو کیونکہ حضرت یوسفؑ نے جب اپنے بھائی کے خلاف چوری کا یہ الزام قائم فرمایا تھا۔ اس وقت انہیں اس کے متعلق کوئی خوف نہ تھا اور یہ کہ اس طرح کا تقیہ دین کے دس میں سے نو

تیرے تو وصف عیب تناہی سے ہیں بری حیراں ہوں میرے شاہ میں کیا کیا کہوں تجھے
لیکن رضا نے ختم سخن اس پہ کر دیا
خالق کا بندہ خلق کا مولا کہوں تجھے

تو یہ سب تعریفیں بھی درحقیقت اس اللہ کی ہی تعریفیں ہیں جس نے اپنے محبوب کو اس قدر فضائل و کمالات عطا فرمائے۔ اس لئے کہ الحمد للہ رب العالمین۔

خدا اپنے محبوبوں کی تعریف سے خوش ہوتا ہے

دوستو! اس مثال سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہے۔ کہ کسی کاریگر کی بنی ہوئی چیز کی جب تعریف کی جائے۔ تو وہ کاریگر اپنی مصنوع کی تعریف سے خوش ہوتا ہے۔ دیکھئے جب آپ کرسی کی تعریف کرینگے۔ تو تعریف کرسی کی ہو رہی ہے۔ اور خوش کرسی کا بنانے والا ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ تعریف در اصل میری ہے۔ اور اگر آپ اس کرسی میں نقص نکالنے لگیں۔ اور یوں کہنے لگیں۔ کہ یہ کس قدر بھونڈی ہے۔ اس کا رنگ اچھا نہیں۔ اس کی فلاں جگہ خراب ہے۔ تو اس تنقیص سے کرسی کا تو کیا بگڑے گا۔ کاریگر کو غصہ آئیگا۔ تو بلاشبہ جو لوگ انبیاء کرام و اولیاء عظام کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ ان کی اس تعریف سے انبیاء و اولیاء کا خالق خوش ہوتا ہے۔ اور جو گستاخ ان اللہ والوں کی تنقیص میں لگے رہتے ہیں۔ کہ اُن میں یہ خوبی بھی نہیں۔ یہ کمال بھی نہیں۔ ان کی اس تنقیص سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ اور اپنے جلال میں یوں فرماتا ہے:۔

ذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ — (پ۲۹ ع۱۳) یعنی (یا رسول اللہ) چھوڑ دیجئے مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو۔

گویا ان بے دین گستاخوں کا مقابلہ خدا سے ہوتا ہے۔ اسی لئے اعلیحضرت نے لکھا ہے۔ ؎

عقل ہوتی تو خدا سے نہ لڑائی لیتے ٭ یہ گھٹائیں اسے منظور بڑھانا تیرا

کے الزام سے چھڑانے کے لئے گئے تو وہاں اس کی صفائی دینے کی بجائے یہ کہنے سے بھی باز نہ رہے کہ اگر ہمارے اس جوان کو چوری کی سوجھی تو تعجب کی کونسی بات ہے. اس کا برادر بزرگ یوسف بھی تو چور تھا. حضرت یوسف نے یہ سنا تو انگشت بدنداں رہ گئے کیونکہ ان لوگوں کا آپ کو مختلف طرح

---

* حصے ہیں. اور ایک حصہ دین کے دوسرے احکام ہیں.

پرویز صاحب کا حدیث کے خلاف ایک الزام یہ بھی ہے. کہ اس سے مسلمانوں کے اندر فرقہ بندی کو فروغ ہوا ہے. حدیث کے الفاظ کے اندر اختلاف ہوتا ہے. ایک مسئلہ میں کسی روایت کے الفاظ کچھ ہوتے ہیں اور کسی کے کچھ. اور یہ حال قرآن کا نہیں کہ اس کے الفاظ کے اندر کسی طرح کا اختلاف ہو. اس میں البتہ سمجھ اور فہم کا اختلاف ہوتا ہے. جو کسی میں فرقہ بندی کا باعث نہیں ہوتا کیونکہ سب کے ہاں قرآن کے الفاظ ایک طرح کے موجود ہیں. مگر قرآن کی سورۂ یوسف کا وہ مقام جہاں یوسف کے بھائی کی چوری کا یہ واقعہ موجود ہے. پرویز صاحب کے اس دعویٰ کو باطل ٹھہراتا ہے. اس لئے کہ یہ ہے بھی قرآن میں اور ہے بھی فرقہ بندی کا باعث. اہل سنت بھی اس مقام کی آیتوں کو بالکل اسی طرح پڑھتے ہیں جیسے اہل شیعہ پڑھتے ہیں. اور پہلے اس سے تقیہ کا سبق لیتے ہیں حضرت یوسف کی ہتک سمجھتے ہیں. اور دوسرے اسی کو فرض قرار دیتے ہیں. اور اس مقام سے یہ اخذ کر لیا اور فرقہ کی بنا ڈالتے ہیں. اسی سے ثابت ہوا کہ فرقہ بندی کا باعث نہ حدیث ہے اور نہ اس کے مختلف الفاظ بلکہ اس کے اسباب کچھ دوسرے ہیں. اور ایک انسان جب ایک فرقہ بنانا چاہے تو اس نے کبھی نہیں سوچا کہ وہ کن الفاظ سے یہ کام لے چنانچہ اہل شیعہ نے قرآن ہی سے پاؤں پر مسح کرنے کا حکم سمجھ رکھا ہے. اور خود پرویز صاحب اطاعت رسول کے معنی اطاعت امیر سمجھتے ہیں. پھر کیا یہ صرف فہم کا فرق ہے جو آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے.

حماقت

اور یہیں سے اندازہ کر لیجئے۔ اس حماقت کا بھی۔ جو ہمیں یہ کہا جاتا ہے۔ کہ یہ اہل سنت تو نبیوں اور ولیوں کی اس قدر تعریف کرتے ہیں۔ اور انہیں اتنا بڑھا دیتے ہیں۔ کہ انہیں خدا ہی بنا ڈالتے ہیں۔ حالانکہ جو مخلوق ہے۔ اس کی چاہے کتنی تعریف کی جائے۔ وہ خالق بن ہی نہیں سکتی۔ کیوں صاحب! اگر کوئی کرسی کی جی بھر کے تعریف کرے۔ اور ایک احمق اس کی اس تعریف کو سن کر یوں کہنے لگے۔ کہ دیکھئے صاحب! آپ نے تو کرسی کی اس قدر تعریف کر ڈالی ہے کہ اس کرسی کو بڑھئی بنا ڈالا ہے۔ یا اگر کوئی کسی کوٹ یا واسکٹ کی تعریف کرے اور کوئی بیوقوف کہنے لگے۔ کہ صاحب آپ نے تو اس کوٹ اور واسکٹ کو درزی بنا ڈالا ہے۔ تو فرمائیے! تعریف کرنے والا غلطی پر ہے یا یہ اعتراض کرنے والا جاہل و بیوقوف ہے؟ یقیناً یہ معترض ہی احمق ہے۔ جو نہیں سمجھتا کہ مصنوع کی چاہے کس قدر تعریف کی جائے۔ وہ صانع بن ہی نہیں سکتی۔ تو اسی طرح کسی نبی یا ولی کی چاہے کتنی تعریف کی جائے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ نبی یا ولی خدا بن جائے۔ مگر کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

خدا جب دین لیتا ہے حماقت آ ہی جاتی ہے

تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ ایک کرسی کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کا تصور خواہ مخواہ آ جاتا ہے۔ اسی طرح ایک زیور کو دیکھ کر سنار کا تصور آ جاتا ہے۔ ایک تالے کو دیکھ کر لوہار کا تصور آ جاتا ہے۔ آپ ایک جنگل میں جا رہے ہوں۔ اور آپ کو زمین پر انسانی پیروں کے نشان نظر آئیں تو ان نشانوں کو دیکھ کر آپ کی عقل یہ فتویٰ دیتی ہے۔ کہ یہاں سے ضرور کوئی انسان گزرا ہے۔ اور آپ عقل کے اس فتویٰ کو تسلیم کر لیتے ہیں اور اس گزرے ہوئے انسان کو بغیر دیکھے بھی مان لیتے ہیں۔ کرسی کے بنانیوالے کو دیکھا نہیں۔ مگر مانتے ضرور ہیں۔ زیور کے بنانے والے کو دیکھا نہیں۔ مگر مانتے ضرور ہیں۔ زیور کے بنانے والے کو دیکھا نہیں۔ مگر مانتے ضرور ہیں۔ تالے کے

کی سختیوں کے بعد کنوئیں میں ڈالا۔ اور پھر آپ کو وہاں سے بیگانوں کے نکال لینے کے بعد انہیں کیسے ہاتھ بیچ کر دینا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد عمر کا ایک بڑا حصہ بسر کر کے جب وہ کسی وجہ سے آپ کے پاس پہنچے تو ان کے منہ سے اپنے مظلوم بھائی کے حق میں یہ کلمہ نکلا کہ وہ چور تھا۔ اور ایسے موقعہ پر نکلا جبکہ اس بات سے وہ خود اپنے ہی کیس کو نقصان پہنچا کر اپنے بھائی کو چور اور سزا کا مستحق ثابت کر رہے تھے۔ اور بتا رہے تھے کہ یہ چور اور عادی چور ہے پھر اگر وہ چور ہے تو اسے چھوڑا کیوں جائے؟ اس کے متعلق کچھ بھی نہ سوچا۔ اور اس کے الزام کی تصدیق کر دی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ جب انسان کسی معاملہ میں حسد اور عناد کا شکار ہوتا ہے۔ تو کس طرح اپنے نفع و نقصان سے بے پروا ہو کر اپنے عناد کو بروئے کار لانے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور اپنے آپ کو نقصان پہنچا کر یہ کام کرتا ہے۔

یہی حال پرویز صاحب کا ہے۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ اگر یہ فرض کریں کہ مسلمان بھی ایسے ہی حالات سے دوچار ہوئے جو بنی اسرائیل کو بابل کی اسیری کے زمانہ میں پیش آئے تو پھر ایسے حالات میں اس کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے کہ قرآن محفوظ رہا ہوگا۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سننے والا اس کا وہی حصہ مانے جو حدیث کے خلاف ہو۔ اور قرآن کے متعلق وہ کچھ بھی غور نہ کرے۔ کہ وہ کونسا دانا دشمن تھا۔

٭ جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے اس میں حضرت یوسف کا کردار بالکل صاف ہے۔ آپ نے پہلی مرتبہ بھائیوں کو غلہ کی قیمت واپس کر دی جس میں نہ کوئی دھوکہ تھا اور نہ کوئی فریب۔ اور دوسری دفعہ جب وہ خالی ہاتھ آئے تو انہیں ایک قیمتی پیالہ دیدیا۔ مگر چونکہ آپ کے عمال کو اس کا علم نہ ہو سکا اس لئے وہ اس کی تلاش میں نکلے۔ اور آپ کے بھائیوں کے ہاں اسے پایا۔ قرآن کے

بنانے والے کو دیکھا نہیں۔ مگر مانتے ضرور ہیں۔ تو میرے بھائیو! جب کرسی کا بنانے والا ہونا ضروری ہے۔ زیور و تالا بغیر بنانے والے کے نہیں بن سکتا اور ان بنانے والوں کو بغیر دیکھے بھی عقلاً تسلیم کر لیتے ہو۔ تو یہ اتنی بڑی زمین اور یہ اس قدر بلند و رفیع آسمان اور یہ کائنات کے عجائب و غرائب جو تمہارے سامنے ہیں۔ کیا ان کا بنانے والا کوئی نہیں؟ کیا وہ عقل جو ایک معمولی تالے کے لیئے اس کے بنانے والے کا وجود ضروری بتاتی ہے اتنے بڑے جہان کے بنانے والے کا وجود ضروری قرار نہ دے گی؟ دے گی اور ضرور دے گی۔ اور دو جہان کے خالق پر بن دیکھے بھی ایمان لے آئیگی ؎

ہیچ چیزے خود بخود چیزے نہ شد ٭ ہیچ آہن خود بخود تیغے نہ شد
ایں سبب ہا در نظر ہا پردہا است ٭ درحقیقت فاعل ہر شئے خدا است

ایک دانا بڑھیا

دوستو! خدا کے منکروں اور دو دو تین تین خدا ماننے والوں کی عقل تو ایک بڑھیا کی عقل سے بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایک دانا بڑھیا کی حکایت ہے۔ کہ وہ بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ کہ کسی عالم نے اس سے دریافت کیا۔ "بڑھیا! ساری چرخہ ہی کاتتے ہیں گزری یا کوئی خدا کی پہچان بھی حاصل کی؟" بڑھیا نے جواب دیا "بیٹا خدا کا شکر ہے۔ کہ تھوڑی بہت اس کی پہچان ہے" عالم نے پوچھا "اچھا بتاؤ تو خدا ہے یا نہیں؟" بڑھیا نے جواب دیا۔ "ہے اور یقیناً ہے" عالم نے پوچھا "دلیل کیا ہے؟" بڑھیا بولی "دلیل یہ میرا چرخہ" عالم نے پوچھا۔ "یہ کیسے؟" بولی "جب تک میرے اس چرخے کو کوئی چلانے والی نہ ہو یہ نہیں چلتا تو میں نے اس سے یہ سمجھ لیا۔ کہ جب میرے چھوٹے سے چرخے کو کسی چلانے والے کی ضرورت ہے۔ اور یہ بغیر چلانے والے کے چل نہیں سکتا۔ تو زمین و آسمان کا اتنا بڑا چرخہ بغیر کسی چلانے والے ہی کے چل رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کا چلانے والا بھی ہے۔ مولوی صاحب یہ جواب سن کر بڑے خوش ہوئے۔ اور پھر پوچھا۔ اچھا اب یہ بتاؤ۔ کہ آسمان کا چرخہ چلانے والا ایک ہے یا دو؟" بڑھیا نے جواب دیا۔ "ایک ہے" مولوی صاحب نے پوچھا۔

جس نے حدیث جاننے والوں کو تو چن چن کر ختم کر دیا ہوگا اور قرآن پڑھنے والوں سے کوئی بھی تعرض نہ کیا ہوگا کیونکہ گیہوں کے ساتھ گھن کبھی نہیں پستا۔

بیان سے واضح ہے کہ پیالہ ڈالنے والے حضرت یوسفؑ تھے۔ اور انہیں پیچھے سے پکارنے والے آپ خود نہ تھے۔ بلکہ کوئی دوسرا تھا۔ اگر آپ خود ہی پکارتے تو اس میں فریب وغیرہ کا کوئی سوال پیدا ہوتا۔ اس میں تو کس طرح کی کوئی الجھن ہے نہیں۔ جہاں منڈیوں اور بازاروں میں ایک سے زیادہ آدمی ایک ساتھ کام پر ہوں۔ وہاں سینکڑوں ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ جب آنجناب کے سامنے چوری کا یہ مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے اصل معاملہ کو کیوں نہ کھول کر ظاہر کر دیا اور اس سے بڑھ کر پھر آپ نے اپنے بھائی کو قابل سزا کیوں ٹھیرایا۔ جبکہ آپ اصل حالات سے باخبر تھے۔ یہ معاملہ قرآن پر غور کرنے سے آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بھائیوں کو پیچھے سے پکارنے والے نے انہیں پیالہ کے حاصل ہونے پر ایک ...... اونٹ کا بوجھ غلہ دینا کہا تھا۔ اس پر تو انہیں فائدہ پہنچ رہا تھا اور وہ اس کا اعتبار بھی دلا سکتے تھے۔ کہ انہیں اس پیالہ کا علم نہیں اس لئے اس موقعہ پر آپ کا بولنا کچھ ضروری نہ تھا۔ پھر جب بھائیوں نے خود ہی کہہ دیا کہ اگر ہمارے پاس چوری کا مال ہو تو جس پر ثابت ہو اسی کو قید میں رکھ لینا ہوگا۔ تو اس طرح بھی وہ خود اپنی مرضی سے آپ کے برادر حقیقی کو آپ کے پاس چھوڑ رہے تھے۔ اس لئے اس قرارداد کے خلاف بولنا بھی آپ کا فرض نہ تھا۔ اس کے بعد جب کیس پیش ہوا

۸۴۰۶

یہ کیسے ؟ وہ بولی۔ یہ ایسے کہ چرخہ چلانے کے لئے اگر دو عورتیں بیٹھ جائیں۔ تو یا تو وہ دونوں ایک ہی طرف کو چرخہ چلائیں گی۔ اور یا ایک، ایک طرف اور دوسری، دوسری طرف، پہلی صورت میں چرخہ معمول سے زیادہ تیز چلنے لگے گا۔ اور دوسری صورت میں یا رک جائے گا۔ یا ٹوٹ جائے گا۔ اور اگر اسے چلانے والی ایک ہوگی۔ تو اپنی مرضی سے اسے معمول کے مطابق ایک ہی طرف کو چلاتی رہے گی۔ تو اس سے میں نے یہ سمجھ لیا۔ کہ اگر زمین و آسمان کے چرخے کو چلانے والے دو خدا ہوتے۔ اور اگر وہ اس چرخے کو ایک طرف چلاتے۔ تو اس کی رفتار میں معمول سے زیادہ تیزی پیدا ہو جاتی۔ دن رات بجائے چوبیس گھنٹے کے دس بارہ گھنٹے کے رہ جاتے۔ ان کے نظام میں فرق آ جاتا۔ اور اگر ایک خدا اس کو ایک طرف، اور دوسرا دوسری طرف چلاتا۔ یعنی ایک کہتا کہ میں آج مینہ برساؤں گا۔ دوسرا کہتا۔ نہیں میں تو آسمان صاف رکھوں گا۔ ایک کہتا میں زید کا مرض دور کر کے اُسے شفا دوں گا۔ دوسرا کہتا۔ میں تو اس کے پاس ملک الموت بھیج رہا ہوں۔ تو اس صورت میں یہ زمین و آسمان کا چرخہ ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ مگر چونکہ ایسا نہیں ہوا۔ لہذا ثابت ہوا کہ خدا ہے اور ایک ہے"۔ مولوی صاحب بڑھیا کے یہ ایمان افروز دلائل سن کر بڑے خوش ہوئے۔ دیکھئے! اس دانا بڑھیا نے اپنے چرخے سے کیا کچھ حاصل کر لیا۔ یہی وہ مبارک عقل ہے جو آج کل کے ملحدین اور دہریوں کے پاس نہیں ہے۔ اور جو سولہ آنہ لا یعقلون کے مصداق ہیں۔ یہ لوگ اپنی حماقت سے اپنی برائے نام عقل اور سائنس پر نازاں ہو کر خدا تعالیٰ کی ہستی کا انکار کر دیتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو بعض اوقات اس دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے مثنوی شریف میں لکھا ہے۔ کہ

ایک فلسفی کی حکایت

ایک فلسفی جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے ایک قاری سے قرآن کی یہ آیت سنی۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا

فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَاءٍ مَّعِيْنٍ ـ (پ ۲۹ ع ۲)

پھر ذرا اس مقدمہ پر غور کیجئے جس کا ہر جزو مفروضات سے مرکب ہے جس طرح کہا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک بڑا اونچا مینار دیکھ کر یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ یہ کیسے تیار ہوا ہوگا۔ ایک نے کہا خیال ایسا ہے کہ اس مینار کی بالکل لمبائی اور موٹائی کے برابر ناپ کر ایک کنواں سا کھودا گیا ہے۔ اور پھر اس کو اینٹوں اور روڑوں کے ساتھ زمین کے برابر تک بھر کر اخیر میں بنا بنایا مینار زمین میں سے کھینچ کر نکال لیا گیا ہوگا۔ دوسرے نے کہا جب مینار پہلے موجود نہ تھا تو اس کے بغیر ناپ کر کنواں کیسے کھودا گیا۔ یہ غلط ہے اور اصل یہ ہے کہ اس کو زمین کے اوپر ہی پوری لمبائی کے ساتھ بنایا گیا ہوگا اور پھر بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہوگا۔ تیسرے نے کہا ایسا کرنے کے لئے تو پھر ضروری تھا کہ کوئی آدمی اسی کے برابر یا اس سے بڑھ کر اونچا ہوتا جو اسے کھڑا کر سکتا ورنہ ایک عام طرح کا چھوٹا آدمی اسے ایک سرے سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے اس کے ساتھ بلندی پہ کیسے پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے یہ صحیح نہیں ہوا اصل میں یہ ہوگا اور زیادہ سے زیادہ جو کچھ کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ یہاں قریب کہیں درخت اُگے ہوں گے۔ اور ان کی دیکھا دیکھی یہ بھی اُگ کر کچھ ان سے زیادہ بلند ہو گیا ہے یعنی جو پہلے ہوگا تھا وہ بعد میں ہے ہو گیا۔ اس نے کہا اسی لحاظ سے ہمارا مینار درختوں سے کچھ بھی مختلف نہیں اور یہ کسی کی محنت کا نتیجہ نہیں۔ اور نہ کسی نقشہ کے مطابق بنا۔

پڑا۔ تو بھائیوں نے وہ کچھ کہا کہ اگر حضرت یوسف کی بجائے کوئی اور ہوتا تو ان سب کو کچھ کہے سنے بغیر نہ جانے دیتا۔ یہ آنجناب کا مزید احسان تھا کہ آپ نے صرف ایک کے روک رکھنے پر اکتفا فرمایا۔ اور دوسروں کو چھوڑ دیا۔ اور خود انہیں کے فیصلہ پر عمل کیا۔ اور اسی کو پھر ایا جسے انہوں نے خود ٹھہرایا تھا۔ اب اگر اس واقعہ کے پیش نظر اس کے کسی پہلو سے کوئی آج قرآن کیا حضرت یوسف کے خلاف اعتراض کرے تو اس کا کیا علاج ہوگا۔ کیا یہی کہ اسے حدیث کی طرح جھٹلا دیا جائے یا یہ کہ اعتراض کنندہ کی غلطی کو واضح کیا جائے۔ اگر دوسری بات کو ہی اختیار کرنا ہوگا تو پھر حدیث کے متعلق ایسا کیوں نہ کیا جائے۔

"تم فرما دو بھلا دیکھو تو اگر صبح کو تمہارا پانی زمین میں دھنس جائے تو وہ کون ہے جو تمہیں پانی لا دے۔ نگاہ کے سامنے بہتا۔"

خدا تعالےٰ نے اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے۔ کہ ان تمہارے پانیوں کو میں اگر زمین میں دھنسا لوں۔ اور تمہارے کنوئیں کا پانی اگر اس قدر نیچے چلا جائے۔ کہ کوئی ڈول وول وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ پانی کو بالکل خشک ہی کردوں تو وہ کون ہے۔ جو اس پانی کو واپس لے آئے۔ واقعی یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ خدا کے سوا کوئی بھی وہ پانی پھر واپس نہیں لا سکتا۔ مگر وہ فلسفی جسے اپنے آلاتِ سائنس پر ناز تھا۔ یہ آیت سن کر طنزیہ ہنسی ہنسا اور کہنے لگا ؎

مابزخم بیل و تیزیِ تبر ✽ آب را آریم از پستی زبر

"اس پانی کو ہم اپنے آلات سے اوپر لے آئیں گے۔ اس میں کونسی مشکل بات ہے۔"

شب بخفت و دید آں یک شیرمرد ✽ زد طمانچہ بر دو چشمش، کور کرد

"فلسفی رات کو سویا۔ تو خواب میں اُسے ایک بہادر اور قوی شخص نظر آیا اس شخص نے آتے ہی اس فلسفی کو زور سے ایک طمانچہ دے مارا۔ طمانچہ لگتے ہی فلسفی کی دونوں آنکھوں میں سے جو نور کے قطرے تھے۔ بہ گئے اور وہ اندھا ہوگیا۔ اور پھر اس قوی شخص نے کہا ؎

گفت زیں دو چشمۂ چشمِ شقی ✽ با تبر نورے بیار اَر صادقی

"اے فلسفی! اگر واقعی تو سچا ہے۔ اور تیرے آلاتِ سائنس کچھ ایسا ہی کمال رکھتے ہیں۔ تو پہلے اپنی ان دو آنکھوں کے چشموں کا پانی واپس لاکر دکھا۔"

وہ فلسفی صاحب صبح اٹھے۔ تو اندھے تھے۔ اور ان کی ساری سائنس دھری دھرائی رہ گئی۔

مشرکین کے خدا میرے بھائیو! وجود باری تسلیم کر لینے کے بعد بعض گمراہوں نے دو دو اور تین تین خدا قرار دے لئے ہیں۔ اور بعض نے اس سے بھی زیادہ۔ ان ہندوؤں کو دیکھئے۔ انہوں نے کئی کتنے دیوتا اور خدا بنا رکھے ہیں۔ سانپ ان کا دیوتا ہے۔ بندر ان کا دیوتا۔

بالکل اسی طرح پرویز صاحب فرض کر لیتے ہیں کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں ان کی تاریخ جس شان کے ساتھ مرتب ہوئی ہوگی اسی طریقہ پر ہماری کتب حدیث بھی مرتب ہوئی ہیں۔

یہ کہنا کہ حدیث اسی شان بے اعتنائی کے ساتھ عالم وجود میں لائی گئی ہوگی جیسے بنی اسرائیل کی تاریخ۔ یہ اسی آدمی کا کام ہو سکتا ہے جس کے نزدیک حدیث "الحیاء من الایمان" قرآن کے خلاف ہو۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ حدیث میں رسول کے اپنے الفاظ نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے ہیں۔ مگر یہ نہیں بتاتے کہ رسول کے اصل الفاظ میں کیا خرابی تھی کہ انہیں چھوڑ کر دوسرے الفاظ لائے گئے۔ اور انہیں تجویز کرنے کی الگ محنت اٹھانی پڑی۔ اور ان اصل الفاظ چھوڑ دیا گیا۔ جن کا سن کر اخذ کر لینا آسان تھا۔ اور اگر ایسا ہی ہوا تو اس کا ثبوت کیا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ بعض غالی اہل شیعہ کا خیال تھا کہ قرآن کی ترتیب صحیح نہیں۔ اور اس میں رد و بدل ہوا ہے۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ جس صحیح قرآن کے ذریعہ آپ کو اس موجودہ قرآن کی خامیوں کا علم ہوا وہ تو آپ کے پاس موجود ہوگا ہی پھر اسے ظاہر کیوں نہیں کرتے۔ تاکہ اس پر عمل کیا جائے اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا یہی حال پرویز صاحب کا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ موجودہ حدیث اپنے اصل الفاظ کے لحاظ سے صحیح نہیں۔ اور اسے چھوڑ دیا جائے۔ مگر یہ نہیں بتاتے کہ اصل حدیث کہاں ہے۔ اور یہ ہے تو وہ کیوں نہیں دنیا میں رات کے شانہ بشانہ دن بھی موجود ہے۔ پھر اصل حدیث پر کیا افتاد پڑ گئی۔

قرآن میں ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے جیل کے جس ساتھی کو خواب کی تعبیر بتائی وہ قید سے رہا ہونے کے کافی مدت بعد بادشاہ کا ایک عجیب پیچیدہ قسم کا خواب سنکر جب آنجناب کے پاس اس کی تعبیر کے لئے پہنچا تو بادشاہ کا خواب بالکل حرف بحرف اسی کے اپنے الفاظ میں بغیر کسی تغیر کے جاکر پیش کیا اور پھر اس کی تعبیر سن کر بالکل اسی طرح بلا تغیر آکر بادشاہ کے سامنے انہیں الفاظ میں پیش کر دیا جو حضرت یوسفؑ نے فرمائے تھے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس شخص نے خواب اور اس کی تعبیر کے صحیح الفاظ کا اور ان کی ترتیب کا یہ کچھ اہتمام کیوں کیا۔ اور جب کیا تو حدیث رسول کے متعلق ایسا اہتمام کیوں ممکن نہیں۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ وہ شخص بادشاہ کو اپنا

پانی ان کا خدا۔ آگ ان کا خدا۔ ایک شاعر نے کیا خوب لکھا ہے کہ ؎

جو حقہ پئیں تو ہویدا خدا ہو — جو چولھا جلائیں تو پیدا خدا ہو
ذرا اس خدا پر جو انڈیلیں پانی — تو مخلوق باقی اور اللہ فانی

یونہی آگ بھی ان کا خدا اور پانی بھی ان کا خدا۔ اب ان دونوں کی جنگ کا نظارہ چولھے پر دیکھئے۔ ایک دیوتا نیچے جل رہا ہے۔ اور ایک اوپر اُبل رہا ہے۔ اگر نیچے والا دیوتا زیادہ گرم ہو جائے۔ تو اوپر والے دیوتا کا معاملہ صاف اور اگر اوپر والے دیوتا صاحب جوش میں آ جائیں اور باہر نکل کر نیچے والے دیوتا کے اوپر آ کودیں۔ تو نیچے والے دیوتا کا معاملہ صاف تو فرمایئے یہ بھی کوئی عقل ہے۔ کہ ایسی چیزوں کو دیوتا مانا جائے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ ہندو ان چیزوں کو دیوتا مانتے ہیں۔ میرے خیال میں جو چیز ان لوگوں کو زیادہ طاقتور، مہیب یا عجیب نظر آتی ہے۔ اسے جھٹ یہ لوگ دیوتا تسلیم کرنے لگ جاتے ہیں۔

لطیفہ مجھے خوب یاد ہے۔ ایک مرتبہ دہلی کے ایک جلسہ میں مولانا محمد شفیع صاحب المعروف بہ دلہن میاں نے اپنی تقریر میں یہ بات سنائی۔ کہ دلی میں جب پہلی مرتبہ ریل گاڑی آئی ہے۔ ان دنوں میں اپنے ایک بوڑھے ہندو دوست کے ساتھ بغرض سیر دلی سے کچھ دور نکل گیا۔ اتفاقاً ریلوے لائن قریب آ گئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے ریل گاڑی گزری۔ میرے ہندو دوست نے اس سے پہلے کبھی ریل گاڑی نہ دیکھی تھی۔ جب اس نے زور شور سے گاڑی کو گزرتے دیکھا۔ تو فوراً سجدہ میں گر کر کہنے لگا۔ " ہے بھپ بھپ ماتی تیری جے ہو" دیکھا آپ نے شرک و کفر نے انسان کو کس قدر ذلیل کر دیا۔ کہ بندروں، درختوں، اور گاڑیوں کے آگے جھکا دیا۔

اسی طرح جو لوگ تین خدا مانتے ہیں۔ وہ بھی مشرک ہیں۔ اور یہ سب بے عقلی۔ اور گمراہی کی باتیں ہیں۔ اسلام نے آ کر ان حماقتوں، جہالتوں، گمراہیوں اور ذلتوں کو مٹایا۔ اور اپنے محبوب صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

حاکم اور مرکز ملت سمجھتا تھا۔ اور حضرت یوسف کا اس وجہ سے معتقد تھا کہ آپ نے اسے ایک خواب کی تعبیر بتائی تھی۔ اور یہ حال صحابہ رسول کا نہ تھا کہ وہ آپ کی باتوں کا ایک ایسا اہتمام کرتے کیونکہ آنحضورؐ نہ ان کے بادشاہ تھے اور نہ ہی آپ نے انہیں کوئی خواب بتایا تھا۔

غیر مسلموں کا اعتراف

"جیسا کہ غیر مسلموں تک کو اعتراف ہے یہ خصوصیت بھی نبی اکرمؐ کو حاصل ہے کہ آپ کی سوانح حیات کی جزئیات تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔" صفحہ ۱۷۶

اس مقام میں پرویز صاحب کی حالت بہت ہی عجیب ہے۔ ایک طرف اس پر آپ پھولے نہیں سماتے کہ ہمارے رسولؐ کے تاریخی ریکارڈ کا غیر مسلموں کو بھی اعتراف ہے۔ کہ اس کا ذرہ ذرہ آج تک محفوظ ہے۔ دوسری طرف آپ اس پر کڑھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ کہ تاریخ دین کو اور حدیث رسولؐ کو محفوظ رکھا گیا جو قابل[1] حفاظت نہ تھی۔ اس طرح جس چیز کو غیر مسلموں کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے محفوظ ہونے کا انہیں بھی اعتراف ہے۔ اسی کو جب مسلمانوں کے سامنے لانے کا وقت آتا ہے۔ تو اس کی حفاظت کا صاف انکار کر دیتے ہیں۔

---

[1] اللہ تعالیٰ نے نہ تو احادیث کو جمع کیا۔ اور نہ ان کے جمع کرنے کا حکم دیا اور نہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ (مقام حدیث۔ صفحہ ۳۲)

رسول اللہ صلعم سے بہتر کوئی شخص قرآن کو نہیں سمجھ سکتا لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کی جو تفسیر رسول اللہ نے فرمائی وہ آج ہے کہاں؟ (مقام حدیث صفحہ ۸)

[2] دین کی اصلی سند قرآن تھا۔۔۔ باقی چیزیں وقتی تھیں۔۔۔ اس لئے انہیں محفوظ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ (اسباب زوال امت صفحہ ۱۳۷)

سے کہلوایا۔ کہ میرے محبوب قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔ "تو کہہ دے کہ اللہ ایک ہے" سبحان اللہ! اپنی توحید کا اعلان اپنے محبوب سے کرایا جاتا ہے۔ اور فرمایا جاتا ہے۔ پیارے تو کہہ دے۔ گویا اے محبوب ہزاروں پیغمبروں نے میری توحید کا ڈنکا بجایا۔ مگر یہ گمراہ اور مشرک پھر بھی شرک و گمراہی سے باز نہیں آئے۔ اب اے محبوب تو کہہ دے۔ کہ اللہ ایک ہے۔ ؎

قل کہہ کے اپنی بات بھی منہ سے ترے سُنی ❊ اللہ کو ہے اتنی تری گفتگو پسند

چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے علی الاعلان فرما دیا۔ "اللہ ایک ہے"۔ میرے آقا و مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ مبارک آواز مشرق و مغرب، جنوب و شمال میں گونجی۔ دنیائے کفر و شرک میں لرزہ طاری ہُوا بت منہ کے بل اوندھے گرے۔ شیطان اپنے سر پر خاک ڈالنے لگا۔ گویا ؎

وہ کڑکا تھا بجلی کا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

حضور کی اس مبارک آواز کا یہ اثر دیکھا۔ کہ دنیا کی توجہ توحید کی طرف ہونے لگی۔ مشرکین میں سے بعض لوگ توحید کو اپنانے لگے۔ چنانچہ آجکل کے ہندوؤں میں سے آریہ اور سکھ بزعم خویش توحید پرست ہیں۔ اور سناتن دھرمیوں کے اسی لئے خلاف ہیں۔ کہ وہ مورتی پوجا کرتے ہیں۔ عیسائیوں میں بھی ایک ایسا فرقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جو مریم و عیسےٰ علیہما السلام کی تصویروں کی پوجا کا مخالف ہے۔ تو یہ سب کچھ میرے آقا و مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ توحید کا کرشمہ ہے۔ مجھے یہاں اکبر الہ آبادی کا ایک مزیدار واقعہ یاد آ گیا ہے۔

اکبر کا ایک مزیدار شعر

اکبر الہ آبادی ایک انگریز افسر سے ملنے کے لئے دفتر میں گیا۔ انگریز کے آفس میں جو گھڑی لگ رہی تھی۔ وہ خراب تھی۔ تین بجے کا ٹائم تھا۔ اور اس گھڑی کی سوئی جب تین کے نشان پر آئی۔ تو بجائے تین کے اس نے ایک بجایا۔ اکبر کی رگِ ظرافت پھڑکی اور جھٹ بولا ؎

اور اس کے متعلق غیر مسلموں اور مسلمانوں کا اعتراف کچھ بھی کام نہیں آتا۔ بہر حال اس مسئلہ میں پرویز صاحب کو دوسرے لوگوں سے تین طرح کا اختلاف ہے۔ جو بنیادی اہمیت رکھتا ہے
ایک یہ کہ رسول کی بات کسی طرح بھی قابلِ حفاظت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس کی باتیں تمام تر ان حالات سے متعلق ہوتی ہیں۔ جن کے اندر رہ کر وہ کام کرتا ہے۔ ان حالات میں اگرچہ اس کی ہدایات مفید ہوتی ہیں۔ مگر بعد میں جب حالات بدل جاتے ہیں۔ تو وہ ہدایات نہ صرف بیکار ہو جاتی ہیں بلکہ نقصان دہ ہوتی ہیں۔ جیسا کہ انسان کی سوچی ہوئی عام باتوں کا حال ہوتا ہے۔[1] لیکن مسلمان کہتے ہیں کہ جس طرح قرآنی احکام دائمی ہیں۔ اسی طرح رسول کی بات بھی ہر زمانہ میں دائمی اور مفید ہے۔ اور اسے ایسا نہ سمجھنا محض نظر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ یا تعمیل سے جی چرانا۔ اس لئے کہ اختلاف احوال اصل میں نام ہے۔ انسان کے بدپرہیز ہونے اور اطاعت سے نکل جانے کا۔ ورنہ جہاں تک حالات کی حقیقی تبدیلی کا تعلق ہے۔ اس کا لحاظ ایک عام عقل کا آدمی بھی حکم دیتے وقت رکھتا ہے۔ اور اسے سننے والے بھی اس تبدیلی سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ مثلاً جہاں آگ بجھانے کا حکم دیا جائے تو حکم دینے والے کا بھی یہی منشا ہوتا ہے۔ کہ آگ کے بجھ جانے کے بعد یہ حکم باقی نہیں رہے گا۔ اور سننے والے بھی اس سے یہ نہیں سمجھتے کہ آگ بجھانے کا یہ حکم تمام عمر کے لئے لازم ہو گیا خواہ آگ کی جگہ پانی کے سیلاب اور طوفان نے لے رکھی ہو۔ پھر ابتدائی دور میں احکام پر عمل کرنے اور کرانے والوں کے خیالات کو اگر محفوظ نہ رکھا جائے تو سرے سے احکام کی عملی شکل ہی باقی نہیں رہ جاتی مثلاً قرآن میں نکاح کر لینے کا حکم آیا اور آنحضورؐ نے اس کے متعلق سمجھایا۔ کہ یہ تنہا ایک عورت اور مرد کا ذاتی معاہدہ نہیں۔ بلکہ اس میں

---

[1] صدیوں پہلے کی ذہن انسانی کی سوچی ہوئی ... باتیں بیکار بھی ہو جاتی ہیں مسلمانوں پر سالانہ بچت کا چالیسواں حصہ کس نے فرض کر دیا۔ خدا نے تو یہ حکم نہیں دیا۔ (قرآنی فیصلے ص ۲۰)

"تثلیث کے قائل نے کہا مجھ سے خدا ایک"

یعنے یہ انگریز کی گھڑی ہے۔ جو عیسائی ہے۔ اور تین خداؤں کا قائل ہے تو اس تثلیث کے قائل کی گھڑی نے بھی اس وقت جبکہ تین ہی بجے کا ٹائم ہے۔ بجائے تین کے ایک بجایا ہے۔ گویا تین خداؤں کے قائل نے آج ایک خدا ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔

"تثلیث کے قائل نے کہا مجھ سے خدا ایک اور اگلا مصرعہ سنئے کیا خوب ہے تھی تین پہ سوئی میری ہیبت سے بجا ایک

یعنے اس عیسائی کی گھڑی نے تین پر سوئی ہونے کے باوجود ایک کیوں بجایا؟ اس لئے کہ اس نے دیکھ لیا کہ ایک "محمدی" آ بیٹھا ہے۔ بس یہ میری ہیبت تھی۔ کہ وہ عیسائی گھڑی تین نہ بجا سکی۔ اور میری ہیبت سے بجا ایک۔ تو میرے بزرگو! یہ حضور صلے اللہ علیہ و آلہ و سلم کے اعلان توحید کی برکتیں ہیں کہ آج فرزندانِ توحید کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

توحید کیا ہے؟

میرے بزرگو! اب دیکھنا یہ ہے کہ توحید کہتے کسے ہیں۔ اس زمانہ میں کئی عیسائی۔ آریہ اور سکھ بھی بظاہر توحید کو اپناتے نظر آتے ہیں۔ مگر کیا وہ موحد ہیں؟ مومن ہیں؟ ہرگز نہیں یاد رکھیئے اللہ کو ایک ماننا اور لاشریک جاننا اور اسے اس کی صفات سمیت ماننا۔ یہ توحید ہے۔ اب جو اللہ کو ایک تو مانے۔ مگر اس کی کسی صفت پر ایمان نہ لائے۔ تو وہ موحد و مومن نہیں۔ بلکہ بے ایمان ہے۔ مثلاً یوں کہے کہ اللہ ہے اور ایک ہے۔ مگر وہ رازق نہیں۔ یا وہ مالک نہیں۔ یا یوں کہے کہ اللہ ہے اور ایک ہے مگر وہ قادر نہیں۔ عالم نہیں۔ تو اس کا اللہ کو ایک کہنا بیکار ہے۔ اور وہ اللہ کی کسی ایک صفت کا بھی انکار کر کے مومن و موحد ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے ایمان کا بے ایمان ہے۔

تو میرے بھائیو! اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات میں سے ایک صفت مُرسِلِ مُحمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ہے۔ یعنی وہ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھیجنے والا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ خود فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْٓ

ان دونوں کے کنبہ کی رضا کے ساتھ دو گواہوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اب اگر کہا جائے کہ نکاح کی تشکیل میں آنحضور کا حکم وقتی تھا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نکاح کے بارہ میں ہر انسان کو اجازت ہے۔ کہ وہ اس کا جو تصور بھی چاہے اپنی مرضی سے قائم کرے۔ اس طرح پھر نکاح اور زنا میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اور نکاح کا حکم بیکار ہو[1] کے رہ جاتا ہے۔

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ آپ کہتے ہیں۔ قرآن کے علاوہ سب کچھ جزئیات میں سے ہے۔ جو ہمیشہ وقتی ہوتی ہیں۔ خواہ ان کا نافذ کرنے والا رسول ہو یا کوئی اور۔ اس لیے انہیں باقی نہ رکھا جائے۔ بخلاف اس کے مسلمان کہتے ہیں کہ احکام شریعت میں اصول اور جزئیات کی یہ تقسیم ہی سرے سے غلط اور باطل ہے۔ جس کے تحت انسان خود ہی اپنی مرضی سے بعض احکام کو وقتی اور بعض کو دائمی بنالے۔ اور پھر جنہیں دائمی بنائے انہیں جب بھی چھوڑنا چاہے وقتی کہہ کر چھوڑ دے۔ اور اس پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہ سمجھے۔ کیونکہ یہ حال ایک ضابطہ کا کبھی نہیں ہوتا۔ کہ جن لوگوں کو ان کا پابند بنانا ہو وہی اس کے احکام کو لازم و متروک

---

[1] پرویز صاحب کہتے ہیں کہ نکاح کا حکم اس طرح بیکار نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی تشکیل کے اختیارات بعد کی قرآنی حکومتوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر یہ طے کرنا ان کا منصب ہوتا ہے۔ کہ آئندہ نکاح کی شکل کیا ہونی چاہیئے۔ یہ بھی کافی دلچسپ ہے فرض کیجیے کہ ایک حکومت نکاح کے دو گواہ ٹھہراتی ہے۔ اور دوسری ایک اور بعد کی بازاری طوائفوں کو نکاح کے عام لائسنس جاری کر دیتی ہے۔ تو اس پر غیر مسلم حکومتوں کے علاقوں کے اندر رہنے والے مسلمانوں کے لئے ان میں سے ہر صورت جائز ہوگی۔ چنانچہ ان کی بیٹیوں کے ساتھ جو غنڈہ بھی چاہے گا نکاح کر گذرے گا اور کسی کو اس نکاح کی خبر تک نہیں ہوگی۔ بلکہ ایک ایک بیوی کے کئی مدعی بن گئے ہوں

اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ۔ تو جو شخص اللہ کو مانے۔ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو نہ مانے۔ تو اس نے خدا کی ایک صفت "مرسل محمد" کا انکار کر کے خدا کو نہیں مانا۔ اور وہ موحد و مومن ہرگز نہیں ہوا۔ بلکہ کافر کا کافر ہی رہا۔ موحد و مومن وہ ہے۔ جو اللہ کو مانے اور اس کے رسول کو بھی مانے۔

بعض لوگ ایمان باللہ کے بعد ایمان بالرسول کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (پ ا ع ۸)

یعنی جو لوگ ایمان والے ہیں۔ اور جو لوگ یہودی اور عیسائی اور ستارہ پرست ہیں۔ ان میں سے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائیں۔ اور نیک کام کریں۔ ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے۔ اور انہیں نہ کچھ اندیشہ ہے۔ اور نہ کچھ غم۔

اور کہتے ہیں۔ کہ دیکھ لو۔ اس آیت میں صرف ایمان باللہ۔ اور ایمان بالقیامت ہی کا ذکر ہے۔ ایمان بالرسول کا کوئی ذکر نہیں۔ تو اے میرے بھائیو! یہ کہنا بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اس آیت میں جو ایمان باللہ کا ذکر ہے۔ اسی میں ایمان بالرسول بھی آ جاتا ہے۔ بات در اصل وہی ہے جو میں کہہ چکا کہ اللہ کو اس کی ساری صفات کے ساتھ جب تک نہ مانا جائے۔ ایمان کا وقوع ناممکن ہے۔ تو اللہ کی ایک صفت یہ بھی ہے۔ کہ وہ حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو نبی اور رسولوں کا سردار بنا کر بھیجنے والا ہے۔ تو جو اللہ کو مانے گا اسے یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور رسولوں کے سردار ہیں۔ تو آیت مذکورہ میں مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ کا مطلب صاف ہو گیا۔ کہ عیسائیوں، یہودیوں اور ستارہ پرستوں میں سے جو اللہ اور اسکے رسول محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ اور قیامت پر بھی ایمان لائیں۔ اور پھر شریعت محمدیہ کے مطابق نیک عمل کریں۔ تو اُن

اور وقتی و دائمی ٹھہرانے کے مجاز ہوں۔ اور نہ یہ صحیح ہے کہ رسول کے حکم کو وقتی ٹھہرایا جائے اس لئے کہ اس کی اطاعت کے وقتی ہونے کا قرآن میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ قرآن کی حفاظت یقینی ہے۔ اور رسول کی باتیں جو حدیث کی شکل میں ہمارے ہاں موجود ہیں۔ وہ اس طرح محفوظ نہیں۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ دین کا ایک حصہ قرآن میں محفوظ ہو اور دوسرا نہ ہو۔ اس بناء پر حدیث کو دائمی نہ سمجھا جائے۔ مگر مسلمان کہتے ہیں کہ حدیث بھی یقینی اور محفوظ ہے۔ اور عمل کے میدان میں قرآن کے برابر ہے۔ اسے غیر محفوظ ٹھہرانا اس کے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس لئے ہے کہ اس کی تعمیل سے اپنے آپ کو بچایا جائے اور اس کے بعد قرآن* کے ہر حکم کو اپنے ڈھب پر ڈھال لیا جائے۔ ورنہ ایک حکم کے جب دو الگ پہلو ہوں تو ان کا ہر لحاظ سے برابر ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ خود قرآن میں قرضہ کے وثیقہ کی کئی صورتیں جائز رکھی گئی ہیں۔ جو آپس میں سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں مثلاً ایک یہ کہ قرضہ کو تحریر میں لاکر اس پر شہادت قائم کی جائے۔ اور تحریر نہ ہو تو پھر شہادت دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی ہو۔ اور اگر یہ سب کچھ نہ ہو سکے تو قرضہ کی بابت کچھ مال رہن رکھا جائے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو تو ایک دوسرے کی امانت و دیانت پر بھروسہ کیا جائے۔ یہ سات مختلف صورتیں ہیں مگر جہاں تک قرضہ لازم ہونے کا تعلق ہے وہ مقروض پر ہر حالت میں لازم ہوتا ہے خواہ اس کی جو بھی شکل ہو۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ اگر سرکاری اسٹام پر قرضہ کو باقاعدہ رجسٹرڈ کرایا جائے۔ تو وہ لازم ہو ورنہ اور کسی طرح لازم نہ ہو۔ اس بناء پر ایک مومن قرضہ کی ادائیگی کو قرآن کے تحت لازم سمجھے گا۔ خواہ وہ رجسٹرڈ ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح وہ یہ کہنا بھی جائز نہیں سمجھیگا کہ جو قرضہ رجسٹرڈ نہ ہو وہ اس قرضہ کی طرح کیوں لازم رکھا گیا۔ جو رجسٹرڈ ہو۔ اس لئے کہ ایسا کہنا خدا کے حکم پر

---

* اس صورت حال سے بچ رہنے کی ان کے ہاں واحد صورت یہی ہوگی کہ وہ صرف عہد رسالت کے نکاح کو نکاح تسلیم کریں۔ اور بعد کے قائم ہونے والے قانون نکاح کو فساد کا نام دیں۔

کے لئے نجات ہے ورنہ نہیں!

بھائیو! حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے پیغمبروں کا بھی بھیجنے والا اللہ ہی ہے۔ وہ آدم کا بھیجنے والا ہے۔ نوح کا بھیجنے والا ہے۔ ذکریا کا بھیجنے والا بھی ہے۔ موسےٰ کا بھیجنے والا بھی ہے۔ عیسےٰ کا بھیجنے والا بھی ہے (علیہم السلام) تو یہ حقیقت ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اللہ پر ایمان لائے۔ مگر اللہ کے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے کسی ایک رسول کی بھی رسالت کو نہ مانے۔ تو اس نے اللہ کو ہرگز نہیں مانا۔ جو اللہ پر ایمان لائے گا۔ اسے اللہ کے سارے رسولوں پر ایمان لانا پڑے گا۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں۔ کہ یہ تو اللہ کے پیارے مقرب اور رسول ہیں۔ مجھ کو دیکھئے ایک گنہگار امتی ہوں۔ مگر یہ حقیقت ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اللہ پر ایمان لائے۔ اور ساتھ ہی وہ یہ کہہ دے۔ کہ اللہ بشیر کا خالق نہیں (معاذ اللہ) تو یہ کہنے سے بھی وہ مومن باللہ نہ رہے گا۔ اس کا ایمان جبھی صحیح ہوگا۔ جبکہ وہ اللہ کو خالق بشیر بھی مانے۔ تو بھائیو! جو شخص زید۔ عمر۔ بکر کے متعلق کہے۔ کہ یہ اللہ کی مخلوق نہیں اور اللہ نے انہیں پیدا نہیں کیا وہ ایماندار نہیں ہو سکتا۔ تو جو اللہ کے محبوب اور سارے نبیوں کے سردار حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو نہ مانے اور کہے۔ کہ یہ اللہ کے رسول نہیں۔ اور اللہ ان کا مرسل نہیں۔ (معاذ اللہ) تو وہ بے ایمان "مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ" میں کیسے آ سکتا ہے؟

قرآن کا ارشاد

دوستو! قرآن اپنی تفسیر آپ بھی فرماتا ہے۔ آیئے اس "اٰمَنَ بِاللّٰہِ" کی تفسیر قرآن ہی سے ملاحظہ فرمایئے۔ یہ دیکھئے ارشاد ہوتا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ۔ (پ۵ ع۱۷)

"اے ایمان والو! اللہ کو مانو اور اس کے رسول کو مانو۔ اور اس کتاب کو مانو۔ جو اللہ نے اپنے رسول پر اتاری۔ اور اس کتاب کو مانو جو اس نے پہلے اتاری۔

اعتراض کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر قرآن کا فیصلہ یہ ہو کہ رسول کی بات مانی جائے تو وہ ہر صورت میں ماننی ہوگی۔ خواہ قرآن کی طرح محفوظ ہو یا نہ ہو۔

ان تینوں وجوہ کی بنا پر قرآن میں جن انبیاء اور رسولوں کا ذکر ملتا ہے ان کی جزئیات اور وقتی بلکہ بالکل غیر ضروری قسم کی باتوں کو بھی بیان میں لایا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی ہر بات ضروری اور اہم ہوتی ہے۔ اور قابل حفاظت۔ یہاں ان میں سے بعض کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پہلے حضرت آدمؑ کے حالات پر غور کیجئے جو پرویز صاحب کے نزدیک نہ حضرت ہیں اور نہ آدم بلکہ محض ایک فرضی قسم کا نام ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اس کا قصہ بالکل افسانہ ہے۔ اور وہ افسانہ بھی قرآن میں ایک جگہ نہیں۔ بلکہ اس کے متواتر مقامات پر اوّل سے آخر تک پھیلا دیا گیا ہے۔ حضرت آدم کی تخلیق کا خداوند تعالےٰ نے فرشتوں سے تذکرہ فرمایا تو انہوں نے اس نئی مخلوق کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اس کی ضرورت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر خدا نے ان کی ہر بات کو نظر انداز کرتے ہوئے حضرت آدم کو پیدا فرما دیا۔ اس واقعہ سے پرویز صاحب کا یہ اصول باطل ٹھہرتا ہے۔ کہ قرآن میں صرف اصولی اور دائمی امور کو لایا گیا ہے۔ اگر اس واقعہ کے دائمی ہونے کا مطلب یہ ہو کہ لوگوں کی ایک معاملہ میں رائے معلوم کر کے اس کے خلاف چلا جائے تو یہ دائمی ہے۔ ورنہ اور کسی طرح بھی دائمی نہیں اس سے ثابت ہوا کہ قرآن میں نہ تو صرف دائمی احکام ہیں اور نہ صرف دائمی احکام قابل حفاظت ہوتے ہیں۔ اور نہ صرف وہی احکام دائمی ہوتے ہیں جنہیں ایسا فرض کر لیا جائے۔

اس کے بعد حضرت نوحؑ کے تذکرہ میں ہے کہ آنجناب کو اللہ نے کشتی بنانے کا جب حکم فرمایا تو اس میں یہ بھی تھا کہ اسے ہماری وحی میں اور آنکھوں میں رہ کر بناؤ۔ اور اس کے ساتھ انہیں کشتی میں سوار ہونے اور اس سے اترنے کی دعائیں سکھائی۔

دیکھ لیجئے! اس جگہ صاف صاف ارشاد ہو رہا ہے۔ کہ اللہ کو مانو۔ اور اس کے رسول کو مانو۔ اور جو کتاب حضور پر اس نے اتاری اس کو بھی مانو۔ اور جو کتاب پہلے اتری اس کو بھی مانو۔ یہ ہے آمَنَ بِاللّٰہِ کی پوری تفسیر۔ اب ذرا اس آیت کو پڑھنے سننے کے بعد نجدی توحید کا اعلان پھر سنئے۔ کہ "اللہ کے سوا کسی کو نہ مان" اور انصاف کیجئے۔ کہ کیا توحید اسی کا نام ہے ؎ گر ولی این است لعنت بر ولی۔

خدا کو سب مانتے ہیں

حضرات! آج کسی عیسائی۔ سکھ۔ آریہ سے بھی پوچھئے۔ تو وہ خدا کا انکار نہ کریں گے۔ اور یہی کہیں گے۔ کہ ہم خدا کو مانتے ہیں۔ اور اسی طرح پہلے کافر بھی اللہ کے منکر نہ تھے۔ وہ اللہ ہی کو زمین و آسمان کا خالق مانتے تھے۔ اور اللہ ہی کو مینہ برسانے والا اور دیگر انعامات فرمانے والا جانتے تھے۔ دیکھ لیجئے خدا خود فرماتا ہے :-

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ — یعنی اگر تم ان مکہ کے کافروں سے پوچھو کہ یہ آسمان، اور زمین کس نے بنائے ہیں تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے "

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ (پ ۲۱ ع ۲)

اور جو تم ان سے پوچھو۔ کہ آسمان سے پانی کس نے اتارا، اور اس کے سبب زمین زندہ کر دی مرے پیچھے تو ضرور کہینگے۔ اللہ نے "

ان آیات سے ثابت ہوا۔ کہ وہ کافر اللہ کو مانتے تھے۔ مگر باوجود اس ماننے کے وہ کافر کیوں قرار دیئے گئے؟ صرف اس لیئے۔ کہ وہ حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہ لائے۔ گویا انہوں نے اسی تقویۃ الایمانی توحید کا مظاہرہ کیا۔ کہ "اللہ کے

جہاں سوچنے کی چیز یہ ہے کہ آخر ایک رسول کی اور دوسرے لوگوں کی کشتی سازی میں کیا فرق ہے۔ بنانے کو دوسرے بھی وحی کی رہنمائی کے بغیر کشتیاں بنا کر ان سے کام لے رہے تھے۔ اور اگر حضرت نوح بھی ان سے بنوانا چاہتے تو وہ آپ کو بنا دیتے۔ لیکن اللہ نے یہ کام ان سے لینا پسند نہ فرمایا۔ اور خود اپنی راہنمائی کے اندر اس کام کو انجام دلایا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دین کا جو کام لوگ نہیں جانتے تھے اور اس کے مخالف تھے اس میں تو قدم قدم پر وحی کی راہنمائی اور زیادہ ضروری تھی، اور کشتی کے اس واقعہ سے بڑھ کر اس کا محفوظ ہونا لازم ٹھہرتا ہے۔ یعنی حضرت نوح کو دعوت دین کے سلسلہ میں جو حالات پیش آئے۔ وہ اسباب سے زیادہ قابل حفاظت ہیں۔ کہ انہوں نے ایک کشتی بنائی تھی

ان کے بعد حضرت ہود اور صالح کے حالات میں ان کی دعوت کو اور اس کے جواب میں مخالفین کے اٹھائے جانے والے نکات کو بھی قرآن میں مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ حضرت صالح کے تذکرہ میں ان کی اونٹنی کے حالات کو بھی محفوظ رکھا گیا اور اونٹنی بھی وہ جو پرویز صاحب کے نظام ربوبیت کی عدالت میں گردن زدنی تھی۔ کیونکہ وہ تمام لوگوں کا پانی اور چارہ چٹ کر جانے والی اور رزق کے سرچشمہ[۱] کے لئے بلائے بے درماں سے کم نہ تھی۔ اس واقعہ کو جو قرآن میں محفوظ رکھا گیا تو کیا اس لئے کہ ایک ایسی اونٹنی پر زیادتی کرنے سے پوری قوم کی شامت کا آجانا ایک اصولی حکم تھا جو ہر زمانہ کے انسانوں کے لئے محفوظ رکھنا ضروری تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ ایک پیغمبر کا واقعہ ہونے کی وجہ سے اس کی یہ کچھ اہمیت ہوئی کہ

۱؎ دین یہ کہنے آیا تھا کہ ہر وہ فساد انگیز قوت جو رزق کے سرچشمہ کو اپنے باپ دادا کی ملکیت قرار دے کر اس پر سانپ بن کر بیٹھ جائے۔ اس قابل ہے کہ اس کی گردن مروڑ دی جائے (اسباب زوال امت) صفحہ ۸۵

سوا کسی کو نہ مانے تو اس قسم کی توحید انہیں لے ڈوبی۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

پس یاد رکھئے کہ صرف لا الٰہ الا اللہ کہہ لینے سے ایمان کی کبھی تکمیل نہیں ہوتی - اور نجات کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو کافر اپنی موجودہ تعداد سے دنیا میں بہت کم تعداد میں ہوتے۔ اس لئے کہ لا الٰہ الا اللہ کو کسی نہ کسی رنگ میں سب ہی مانتے ہیں۔ تو یہ کفر و اسلام میں ما بہ الامتیاز جو چیز ہے۔ وہ ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت، اور لا الٰہ الا اللہ کے بعد محمدٌ رسول اللہ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

پس خوب یاد رکھو۔ کہ بجز حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے توحید، توحید نہیں، ایمان، ایمان نہیں۔ اور جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر خدا کو پانا چاہے گا۔ ہرگز نہ پا سکے گا کہ ؎

خدا کے سب ہیں بندے پر خدا ملتا نہیں ان کو
خدا ملتا ہے ان کو جو بنے بندے محمدؐ کے

اسے قرآن میں محفوظ کیا گیا۔ ورنہ اور اس کے اندر اہمیت کا کوئی بھی پہلو موجود نہیں۔

اس کے بعد حضرت لوط کے حالات کا وہ حصہ بھی خاصا غور طلب ہے۔ جہاں انہوں نے غنڈوں کے حملہ آور ہونے پر ان کے سامنے مہمانوں کی بجائے اپنی بیٹیوں کو پیش کر دیا۔ جہاں تک رشتہ کے انتخاب کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی آدمی بھی اپنی بیٹی کا رشتہ کسی غنڈے سے کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ پھر ایک غیرت مند باپ اپنے لیے ایسا پھر کا دل کہاں سے لائے۔ جھکے ہوتے ہوئے وہ غنڈوں سے کہے کہ یہ لیجئے! تمہاری خدمات کے لئے میری بیٹیاں حاضر ہیں۔ یہ تو اسی وقت ممکن ہے کہ عزت کے نقصان سے بڑھ کر فساد یعنی لونڈے بازی کے کھلے بندوں رواج کو مٹانے کا مسئلہ درپیش ہو۔ بہر حال حضرت لوط کے غنڈوں کے ساتھ شرافت سے مقابلہ کرنے کی وجہ خود کچھ رہی ہو۔ جہاں تک نفس واقعہ کا دائرہ ہے۔ یہ ایک نبی کا واقعہ ہونے کی وجہ سے ریکارڈ رکھا گیا اور بس۔

اس کے بعد حضرت شعیب کے حالات ہیں۔ ان میں ناپ تول کے اندر انصاف کرنے کے احکام کا جو حصہ ہے۔ وہ نظام سرمایہ داری کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور اسے بھی ایک پیغمبر کے حالات کے طور پر محفوظ رکھا گیا۔ خواہ اس سے انفرادی ملکیت اور نظام سرمایہ داری کی جڑ کٹنے یا کٹنے کی بجائے محفوظ ہو۔ اسی طرح ان کی لڑکیوں کے نکاح وغیرہ کے واقعات جو ہیں ان میں بھی کسی ایسے اصولی حکم کا سراغ نہیں ملتا جو فرض کے درجہ پلیسا ہو۔

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے واقعات میں ہے۔ کہ انہوں نے اپنی اولاد کی اور اہل مکہ کی ہدایت و خوشحالی کی دعا مانگی تھی۔ پھر انہوں نے اپنی اولاد کو دین حق کی جو وصیت فرمائی اسے بھی اور اسی طرح حضرت یعقوب کی وصیت کو بھی قرآن میں محفوظ رکھا گیا جس کا مقام حدیث رسولؐ سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ اس

دوسرا وعظ
رسالت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ
مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

محمد اللہ کے رسول ہیں (پ۲۶ ع ۱۲)

حضرات! اس آیت کریمہ میں آپ نے سن لیا کہ کس کا نام نامی اور اسم گرامی لیا گیا ہے۔ اور یہ آیت کون سے پیارے نام سے شروع ہوتی ہے؟ سبحان اللہ! یہ وہ نام پاک ہے جسکے متعلق اعلیٰ حضرت نے کیا خوب لکھا ہے کہ ؎

لب پہ آجاتا ہے جب نام جناب ۔ منہ میں گھل جاتا ہے شہد نایاب
وجد میں ہوکے ہم اے جانِ بیتاب ۔ اپنے لب چوم لیا کرتے ہیں

یہ وہ نام پاک ہے۔ کہ جس کو سن کر بھی مسلمان کی روح وجد میں آجاتی ہے۔ اور اس کا دماغ فرش سے عرش تک جا پہنچتا ہے۔ اس نام پاک کی لذت کو اہل ایمان جانتے ہیں اور اہل ایمان

طرح کا جو حکم اور وصیت قرآن کے مطابق ہو. وہ خواہ حدیث میں بھی ہو تو ہم اسے مان لیتے ہیں. مگر ہم پوچھتے ہیں کہ قرآن کے موافق رسول کی ایسی حدیث اور وصیت کو کیوں ماننا ضروری ہوگا. کیا اس لئے کہ اس نے قرآن کی کسی کمی کو پورا کیا. یا اس لئے کہ نبی کی بات کو قرآن سے زیادہ اہم سمجھ لیا گیا. دونوں میں سے جس بات پر ہاں کی جائے وہی موجب کفر ہو سکتی ہے. سوائے اس کے کہ قرآن کو بھی وحی مانیں اور رسول کی وصیت و حدیث کا احترام بھی صرف اس کے وحی ہونے کی وجہ سے ہو. ورنہ جو بات قرآن کے موافق ہو. اس میں رسول کی کیا خصوصیت ہے. وہ تو اگر ایک چور اور ڈاکو بھی بتائے تو اسے ماننا ہوگا. نہ اس لئے کہ اس کے بتانے والا چور ہے. بلکہ اس لئے کہ وہ قرآن کے موافق ہے. پھر قرآن میں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اس دعا کو محفوظ رکھا گیا جو انہوں نے تعمیر کعبہ کے دوران خدا سے رسول مکی کی تشریف آوری کے لئے مانگی تھی. اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو نزول قرآن کے وقت اور اب بھی ایک دنیا کی دنیا اپنا پیشوا و ہادی مانتی ہے. ان سب ماننے والوں کو اللہ نے اس دعا کے ذریعہ آگاہ فرمایا کہ جس شخص کو تم اپنا امام دائمی مانتے ہو اسی کی پیروی کا تقاضا ہے. کہ تم رسول مکی پر ایمان لاؤ. اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر حضرت ابراہیم کی پیروی صرف وقتی طور پر ایک امیر کی طرح ہوتی تو انہیں ماننے والوں کو یہ کچھ سمجھانے کی بجائے الٹا یہ کہا جاتا کہ تم ان کو دائمی امام و پیشوا سمجھنے کی بجائے خدا کی کتاب کو مانو! نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حدیث رسول کا اصل منشاء یہ ہے کہ اس پر اس کے حدیث رسول ہونے کی حیثیت سے غور کیا جائے. اور بعد میں یہ دیکھا جائے کہ وہ کس کے ذریعہ ہم تک پہنچ رہی ہے. اس لئے کہ قرآن کے جس ذریعہ سے حضرت ابراہیم اور یعقوب کی وصیت و دعا کو پہنچایا گیا ہے. وہ مخالفین کے ہاں کچھ بھی قابل اعتماد ذریعہ نہ تھا. اور پھر بھی اس سے ان پر حجت قائم کی گئی.

ہی جان سکتے ہیں۔ خدا کی قسم! اس نام پاک میں بڑی لذت، بڑا کیف اور بڑا ہی سرور ہے۔ مگر ایمان شرط ہے۔ دیکھئے قرآن میں خدا نے دودھ کے متعلق فرمایا ہے:۔ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِيْنَ ط (پ۱۴ ع ۱۵)

"خالص دودھ اور پینے والوں کے لئے گلے سے سہل اترنے والا یعنی مزے دار"

مگر جس شخص کو ملیریا کا بخار ہو اور اسے دودھ پلایا جائے تو وہ یہی کہے گا۔ اَخ تھُو۔ کڑوا ہے اور گلے سے نہیں اترتا۔ تو فرمایئے خدا تو دُودھ کو مزیدار فرما رہا ہے۔ مگر یہ کہہ رہا ہے کہ بدمزہ ہے۔ تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ خدا کا فرمان تو سچا ہے۔ اور دودھ واقعی مزیدار ہے۔ مگر بخار زدہ کا خود اپنا منہ ہی کڑوا اور بدمزہ ہے۔ تو اسی طرح نام نامی اسم گرامی محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم۔ خدا کی قسم بڑا ہی مزیدار اور میٹھا نام ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ مزاج صحیح ہو۔ ایمان موجود ہو۔ اور اگر کسی کو اس نام میں مزہ نہیں ملتا اور نعرۂ رسالت کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ تو وہ اپنی فکر کرے کہ کہیں اس کا اپنا مزاج ہی خراب نہ ہو۔ سچ ہے ؎

بے عشقِ محمد جو پڑھاتے ہیں بخاری
آتا ہے بخار اُن کو بخاری نہیں آتی

تو میرے مسلمان بھائیو! تقریر سے پہلے آؤ مل کر اس نام پاک کا ورد کرلیں۔ میں نے اس نامِ پاک کے متعلق ایک نظم لکھی ہے۔ جس کا عنوان ہے:۔

"شہد سے میٹھا محمدؐ نام"

اس نام پاک محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چار حرف ہیں۔ "م، ح، م، د"۔ میں نے انہیں چار حرفوں کے متعلق چند شعر لکھے ہیں۔ سنئے اور سر دھنئے! اس نظم کا مطلع "شہد سے میٹھا محمدؐ نام" آپ سب کے سب ذوق شوق کے ساتھ میرے ساتھ ساتھ کہیں۔ اور باقی کے اشعار خاموشی سے سنیں:۔

اس کے بعد حضرت یعقوب، یوسف اور حضرت موسیٰ کے حالات کی قرآنی تفصیلات کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ان کے واقعات بہت مفصّل اور تکرار کے ساتھ آئے ہیں اور پیدائش و بچپن سے لے کر جوانی اور وفات کے واقعات کو لایا گیا ہے۔ اور بیداری سے گذر کر ان کے خوابوں کا بھی ذکر ہے اور اسی طرح ان سے خواب پوچھنے والوں کو بھی ان کے تذکرہ میں لایا گیا یہی کچھ حضرت داؤد اور سلیمان کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔

سب سے آخر سیدنا حضرت عیسیٰ کا نمبر آتا ہے ان کے واقعات میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے پنگوڑے میں لوگوں سے خطاب کر کے اپنی ماں کی پاکدامنی کے ساتھ اپنی نبوّت کا بھی اعلان فرمایا۔ انہوں نے بے شمار معجزات دکھلائے۔ بیماروں کو تندرست اور مردوں کو زندہ کیا۔ ان کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ مٹی سے پرندہ کی شکل بنا کر جب اس میں پھونکتے تو وہ سچ مچ پرندہ بن جاتا تھا۔ انہیں خدا نے توریت و انجیل پڑھائی۔ توریت تو ان کی آمد سے پہلے بھی زمین پر موجود تھی۔ جس کے پڑھانے والے بھی کثرت سے پائے جاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود آنجناب کو خدا نے توریت بھی خود ہی سکھائی۔ کیونکہ نبی وہ قابلیت بھی خدا سے حاصل کرتا ہے جو لوگوں سے حاصل ہو سکتی ہو۔ اس لئے کہ اس کا سب سیکھنا سکھانا جب وحی کے ماتحت ہوتا ہے تو وہ ایسے لوگوں سے کب کچھ سیکھنے لگا جو ایک صحیح چیز پڑھانے کے دوران بھی کئی غلطیاں اور گناہ کر بیٹھتے ہوں۔ یہ اور اس طرح کے بے شمار واقعات کے قرآن میں محفوظ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ نبی اور رسول کا ہر واقعہ ریکارڈ کے قابل ہے۔ خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ ان کے اندر اہم اور غیر اہم کی تفریق سرے سے موجود ہے نہیں۔

پرویز صاحب کہتے ہیں۔ کہ رسول کو ماننے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ

شہد سے میٹھا محمدؐ نام

"میم" مئے توحید پلائے اور "ح" حق سے آکے ملائے دوسری میم مراد دلائے
اور یہ "دال" محمدؐ یارو دور کرے آلام شہد سے میٹھا محمدؐ نام
شہد سے میٹھا محمد نام شہد سے میٹھا محمد نام

"میم" سے ہیں ہر دکھ کے مداوا "ح" سے حامیٔ ہر بیچارہ دوسری "میم" یتیم کی ملجا
"دال" بچا کر دوزخ سے فردوس کا دے پیغام شہد سے میٹھا محمد نام
شہد سے میٹھا محمد نام شہد سے میٹھا محمد نام

"میم" سے ہیں محبوب وہ رب کے "ح" سے حاکم عجم و عرب کے دوسری "میم" سے مالک سب کے
"دال" سے داتا دونوں جہاں کے جود ہے ان کا عام شہد سے میٹھا محمدؐ نام
شہد سے میٹھا محمد نام شہد سے میٹھا محمد نام

"میم" محبت کی مے لایا "ح" نے حق کا جام پلایا دوسری "میم" نے مست بنایا
"دال" سے دلبر شبیر کے انکی یاد ہے صبح و شام شہد سے میٹھا محمد نام
شہد سے میٹھا محمد نام شہد سے میٹھا محمد نام

درود شریف پڑھئے:۔

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ سَلَّمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ سَلَّمَ يَا حَبِيْبَ اللّٰهِ!

حضرات! اس آیت کریمہ میں اللہ نے اپنے محبوب کا نام لے کر ان کی رسالت کا ڈنکا بجایا ہے۔ آپ میرے پہلے وعظ میں سن چکے ہیں کہ اللہ نے اپنے محبوب سے فرمایا۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ اے محبوب آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے توحید حق کا اعلان فرمایا اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا نعرہ لگایا۔ تو اس آیت کریمہ میں اللہ نے "محمد رسول اللہ" فرما کر گویا اس امر کا اظہار فرمایا ہے۔ کہ محبوب! تم نے ہماری توحید کا ڈنکا بجایا اور یوں کہا۔ "لآ الٰہ الا اللہ" اور ہم تمہاری رسالت کا ڈنکا بجاتے ہیں۔ اور یوں فرماتے ہیں۔ "محمد رسول اللہ" گویا تم تمہارے اور ہم تمہارے سے

اسکی کتاب کو مانا جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کا مخالف و منکر رہ کر بھی کتاب کو مانا اس کے منشاء کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ مگر قرآن کے یہ بیان کردہ واقعات اس کی تردید کرتے ہیں اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اور کتاب[1] کی ایمان اور پیروی میں یکساں اہمیت ہے اگر تنہا کتاب کافی ہوتی تو پھر قرآن میں کسی نبی کا کچھ بھی ذکر نہ ہوتا۔ اب جو قرآن ان کے تذکرہ سے بھرا پڑا ہے اور ان کی کتابوں کا کہیں ایک صفحہ بھی درج نہیں تو یہ اسی وجہ سے ہے کہ ان کی کتابوں میں جو احکام تھے۔ ان کی جگہ تو قرآن کے احکام نے لے لی۔ باقی خود ان کا ذاتی کردار اور وعظ جو تھا اسے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔ اس طرح ان کی کتابوں کے متعلق کچھ بیان کرنا ضروری نہ رہا۔ قرآن کے اس تاریخی ریکارڈ سے یہ امر بالکل نمایاں ہے کہ جس طرح پہلے انبیاء کی سیرتوں کو محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ اسی طرح آگے کے لئے بھی قرآن کے ساتھ سیرت محمدی کا ریکارڈ ہونا لازم و ضروری ہے۔ پھر یہ کتنی زیادتی ہے کہ اللہ کی طرف سے ایک چیز کا حکم دیا جائے اور انسان اس حکم کو چھوڑ کر اپنی طرف اس حکم کا ایک مقصود اور ایک غرض خود بنا لے۔ اور اس کے حکم کے منشاء کو پورا کرنے لگے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ قرآن پر ایمان لانے سے مقصود یہ ہے کہ اس کے احکام کا مخول اڑایا جائے۔

---

[1] رسالت محمدیہ پر ایمان سے مقصود اس کتاب پر ایمان ہے جو حضور کی وساطت سے دنیا کو ملی۔

(فردوس گمگشتہ)

ص ۳۸۳

جنابِ محمدؐ برائے الٰہی جنابِ الٰہی برائے محمدؐ

ایک نکتہ کلمہ طیبہ انہیں دو جملوں سے بنا ہے۔ ایک جملہ تو اعلانِ مصطفےٰ ہے۔ اور وہ ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اور دوسرا جملہ اعلانِ کبریا ہے۔ اور وہ ہے محمدٌ رسول اللّٰہ۔ اور یہ خدا کی شان اور اس کی محبت ہے اپنے محبوب سے کہ کلمہ طیبہ میں اپنے محبوب کے اعلان کو پہلے رکھا۔ اور اپنے اعلان کو مؤخر کر دیا۔ اور ایک دوسرا نکتہ بھی ہے۔

دوسرا نکتہ جو مولانا حسن میاں علیہ الرحمۃ نے پیدا فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں۔ کہ کلمہ طیبہ۔ اذان۔ تشہّد میں اور ہر جگہ ذکرِ حق کے ساتھ ساتھ ذکرِ مصطفےٰ موجود ہے۔ لیکن ہے ذکرِ حق کے بعد۔ مثلاً اسی کلمہ طیبہ میں دیکھ لو۔ پہلے ذکرِ حق ہے۔ "لا الٰہ الا اللّٰہ" اور اس کے بعد ہے ذکرِ مصطفےٰ "محمد رسول اللّٰہ" اس کی وجہ کیا ہے؟ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

اذاں کیا جہاں دیکھو ایمان والو!
پسِ ذکرِ حق ذکر ہے مصطفےٰ کا

تو اس "پسِ ذکرِ حق ذکر ہے مصطفےٰ کا" کی وجہ لکھتے ہیں اور کیا خوب لکھتے ہیں

کہ پہلے زباں حمد سے پاک ہو لے
تو پھر نام لے وہ حبیبِ خدا کا

سبحان اللّٰہ! کیا ہی ایمان افروز بات لکھی ہے کہ خدا نے چاہا کہ جو میرے محبوب کا پاک نام لینا چاہے وہ پہلے میرا نام لے کر اپنی زبان پاک کر لے۔ پھر میرے پاک محبوب کا نام لے۔ اس لئے "لا الٰہ الا اللّٰہ" پہلے ہے۔ اور "محمد رسول اللّٰہ" بعد میں ہے۔

پاکستان بھائیو! اس موقعہ پر مجھے اپنا ایک شعر یاد آ گیا۔ پاکستان بننے سے پہلے، جب کہ "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے مسلمانوں کے دلوں کو گرما رہے تھے۔ اور پاکستان بنانے کی خاطر مسلمان پشاور سے بمبئی اور کراچی سے کلکتہ تک متحد اور منظم ہو چکے تھے۔ انہیں دنوں الٰہ آباد یو۔ پی میں میری ہر روز تقریریں ہو رہی تھیں اور وہیں میں نے

شانِ رسالت اور قرآن

"یہ معاندین اسلام کی مذموم کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے روایت وضع کی اور امام بخاری نے اسے اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا۔ اب مسلمان ہزار برس سے اسے سینے سے لگائے پھر رہا ہے اور نہیں سوچتا کہ یہ قرآن کی تصریحات کے کس قدر خلاف ہے اور نبی اکرم کی عظمت شان کے کس درجہ منافی ہے۔" صفحہ ۳۱۲

اس عبارت کی عجیب کیفیت کا اندازہ کرنا مشکل ہے اس میں پہلی چیز یہ ہے کہ مسلمان اس قدر سادہ اور بے وقوف ہیں کہ وہ آج تک معاندین اسلام کی مخالف کوششوں سے واقف نہیں ہو سکے اور ان کو کسی نے بھی اس سے واقف نہیں کیا۔ دوسری چیز اس میں عجیب تر ہے کہ ایک طرف مسلمان ہیں اور دوسری طرف غلط حدیثیں بنانے والے معاندین اسلام اور ان دونوں فریق کے درمیان امام بخاری گویا اعراف کے مقام پر کھڑے دکھائی دے رہے ہیں جن کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ وہ مسلمانوں میں سے ہیں یا معاندین سے یا کچھ بھی نہیں۔ نہ انہیں معاند ہونے کا ڈھنگ آتا ہے نہ مسلمان۔ کیونکہ اگر معاند ہوتے تو کھل کر اسلام کی مخالفت کرتے اگر مسلمان ہوتے تو اپنی کتاب میں ایسی حدیثیں جمع نہ کرتے جو پرویز صاحب کے نزدیک شان رسول کے خلاف ہیں۔ اب آپ مسلمانوں کو شان رسول کے متعلق غیرت دلا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ امام بخاری کے متعلق پہلے بتایا جائے کہ وہ کون ہیں۔ مسلمان ہیں یا معاند اسلام۔ اگر وہ ایسی روایتیں جمع کرنے کے باوجود بھی نہ صرف مسلمان رہے بلکہ امام ہو گئے تو ان کے استادوں کا کیا جرم ہے کہ وہ انہیں روایتیں بتانے کی وجہ سے

ایک یہ شعر کہا تھا۔ ؎

پاک اللہ۔ پاک احمد۔ پاک جسم و جان ہو
کیوں نہ پھر رہنے کو اپنا گھر بھی پاکستان ہو

مطلب یہ کہ ہمارا اللہ پاک ہے۔ ہمارا رسول پاک ہے۔ ہمارا دین پاک ہے اور اسلام کی بدولت ہمارا جسم اور ہماری روح بھی پاک ہے۔ تو پھر ایسے لوگوں کے لئے جو وطن ہو۔ اس کا نام بھی پاکستان ہی ہونا چاہیئے۔

مگر میرے بھائیو! افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ہم نے اس نام کی لاج نہیں رکھی۔ اور پاکستان کے باشندے ہو کر ہم نے جو بھی ناپاک کام ہے اسے اپنا رکھا ہے۔ فرمایئے شراب جوا۔ زنا۔ چوری۔ رشوت۔ بلیک۔ بے حجابی و بے حیائی وہ کونسی ناپاک چیز ہے۔ جسے ہم نے اپنے ملک سے نکال دیا ہے۔ سبھی کچھ ہے پاکستان میں۔

لندن میں ۱۹۵۶ء کے یوم اقبال کی تقریب میں ہمارے پاکستانیوں نے عین رمضان شریف کے مہینہ میں یہ تقریب مناتے ہوئے عصر سے پہلے چائے نوشی کی۔ اور اس مقصد کے لئے کچھ دیر کے لئے اجلاس کی کاروائی ملتوی کی گئی۔ اسی واقعہ کے پیشِ نظر مرزا رہبر ایم۔ اے نے ایک نظم لکھی ہے۔ جو نوائے وقت لاہور ۳۰ر اپریل ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ رہبر صاحب لکھتے ہیں ؎

دیکھ اے اقبال تیرے جشنِ رحمت بار میں
کیا مزہ آیا ہمیں سہ پہر کے افطار میں
دیکھ کیا رکھا ہے تیری مذہبی تکرار میں
کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
دیکھ پاکستان کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
دیکھ اے اقبال اپنے خواب کی تعبیر دیکھ

مٹ گئی قیدِ حرم آزاد ہر انسان ہے
ہر طرف جلوے ہی جلوے ہیں خدا کی شان ہے
میکدہ ہی میکدہ ایمان ہی ایمان ہے
دیکھ اے اقبال یہ اسلامِ پاکستان ہے
پی کے مے ہم مارتے ہیں نعرۂ تکبیر دیکھ
دیکھ اے اقبال اپنے خواب کی تعبیر دیکھ

تو میرے عزیزو اور بزرگو! پاکستان چاہیئے تو آپ خود بھی پاک ہو۔ ورنہ تمہارا

اسلام کے معاند ہوں ۔ اور اگر وہ خود بھی معاند اسلام ہیں تو پھر ایسی دھوکہ میں کیا رکھا ہے کہ انہیں امام کا معزز لقب دیا جائے ۔ اور ملامت کا نشانہ صرف ان کے پڑھانے والوں کو بنایا جائے پھر اگر آج پرویز صاحب کی اپنی باتوں کے پیش نظر آپ کو اسلام کا معاند کہا جائے تو آپ کے پاس اس کا جواب کیا ہوگا ۔ کیا یہی کہ آپ قرآن قرآن کا ورد کرتے ہیں ۔ اگر آپ کا جواب یہی ہوگا تو بخاری کے حامی کہہ دیں گے کہ ان کے پاس قرآن اور تعلیم قرآن دونوں ہیں ۔

قرآن میں اس طرز عمل سے بہت ممانعت کی گئی ہے کہ آدمی کو جن لوگوں سے اختلاف یا عناد ہو انہیں گالیاں دینے لگ جائے ۔ کیونکہ گالیوں سے نہ تو دوسروں کا کچھ بگڑتا ہے اور نہ گالیاں دینے والے کا کچھ بنتا ہے اور نہ یہ گالیاں کبھی کسی اصلاحی پروگرام کا کوئی حصہ ہو سکتی ہیں ۔ قرآن میں یہود و نصاریٰ کی اس حرکت پر انہیں ٹوکا گیا ۔ کہ وہ دونوں فریق ایک دوسرے کو خدا کی کتاب پڑھنے کے باوجود کافر کہتے ہیں ۔ ادھر مسلمانوں کے گذشتہ واقعات اور حال کے تجربات گواہ ہیں کہ انہیں سب سے بڑھکر ان کی گالیوں نے نقصان پہنچایا ہے ۔ اور ان واقعات کا سبق یہ ہے کہ اگر انہیں تباہی سے بچنا ہو تو گالیوں سے بچنا چاہیئے ۔ ایک قرآن کے پیرو کو قرآن سے کوئی نہیں روکتا ۔ مگر یہ کیا ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو اسلام کا معاند کہے بغیر نہ رہے ۔ اور ایک حدیث کے پیرو کو ضروری نہیں کہ حدیث کی پیروی کے ساتھ وہ حنفی اور مالکی وغیرہ کو مشرک بھی کہے ۔ اسی طرح اگر آپ بریلوی رسول کی اور اولیاء اللہ کی محبت کا دم بھرتا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ اٹھتے بیٹھتے یا رسول اللہ کہنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو وہابی اور دشمن رسول کا نام

پاکستانی کہلانا ایسا ہی ہوگا۔ جیسا بھنگی کو مہتر کہہ لیا جائے۔ یا کسی جاہل کا نام محمد فاضل رکھ دیا جائے۔

ہاں تو اللہ نے فرمایا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ۔ محمد اللہ کے رسول ہیں خداوندِ کریم نے اپنے محبوب کا نامِ نامی لے کر ان کی رسالت کا اعلان فرمایا ہے۔ آیئے پہلے نامِ نامی

"مُحَمَّد"

—— کا ذکر پاک کریں۔ اور دیکھیں کہ محمد کا معنےٰ کیا ہے؟

محمّد کا معنےٰ تو میرے بھائیو! "محمد" حمد سے مشتق ہے۔ اور اسم مفعول ہے۔ اور اس کا معنیٰ ہے اَلَّذِیْ یُحْمَدُ حَمْدًا بَعْدَ حَمْدٍ۔ جو بار بار اور متواتر تعریف کیا جائے۔ اور ہر آن ہر زمان جس کی نعت پڑھی جائے۔ یعنی جو وجود باجود سرتا پا حمد و تعریف کے لائق ہو۔ اور ہر لمحہ و ہر ساعت جس کی حمد و ثنا بیان کی جاتی رہے اور جو عیوب و نقائص سے پاک ہو وہ مُحمّد ہے۔

میرے دوستو! خدا کو علم تھا۔ کہ ایسے لوگ بھی پیدا ہونگے جو میرے محبوب کے بزعمِ خویش نقائص بیان کیا کریں گے۔ اور ہمیشہ بکواس ہی کیا کریں گے۔ خدا تعالیٰ کی حکمت دیکھئے کہ اپنے محبوب کا نام ہی رکھ دیا "محمّد" کہ اگر کوئی بے دین میرے محبوب کی بدگوئی کرنے لگے گا۔ تو میرے محبوب کا نام ہی تو لے کر کچھ بکے گا۔ تو اللہ نے محبوب کا نام ہی ایسا رکھا۔ کہ کوئی بے دین جب بھی یہ نام لے کر کچھ بکنے لگے۔ تو بدگوئی سے پہلے وہ محمد کہہ کر اس امر کا اقرار کرلے کہ ہے تو یہ ذات حمد و ثنا ہی کے لائق۔ اور عیوب و نقائص سے پاک ہی۔ مگر آگے جو کچھ میں بکنے لگا ہوں۔ وہ میری اپنی ذاتی بے ایمانی کا مظاہرہ ہے۔

مُذَمَّم یہی وجہ ہے کہ کفار قریش نے سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا نام بجائے محمّد کے مُذمم رکھ لیا تھا (مرقاۃ) ان کا خیال تھا کہ جب محمد کو محمد مان لیا تو پھر جھگڑا کیا باقی رہ گیا۔ پھر تو گویا ہم نے اُسے سب

بھی دیتا رہے اور نہ کسی اہلِ شیعہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بغیر سب کو اہلِ بیت کا دشمن فرض کرے اور کہے۔ مگر گالیوں کی سب سے ترقی یافتہ شکل یہ ہے کہ جس کو آپ معاندِ اسلام کہیں اسے امام بھی کہہ دیں۔ اس کے ساتھ ہی مزید حیرت اس میں ہے کہ جس طرح سٹالن کے زیرِ سایہ رہنے والوں کو آبادی کا اکثر حصہ کمیونزم کا معاند نظر آتا رہا اسی طرح مسلمانوں کے اندر بھی جب ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں حدیث کی کتابیں مرتب ہوتی اور نشر ہوتی رہیں اور صدیوں میں کسی نے ان کے خلاف کچھ کہنا ضروری نہ سمجھا تو گویا وہ سب اسلام کے معاند ہی رہے اور ان کے اندر کوئی بھی اسلام کا خیر خواہ نہ تھا۔ پرویز صاحب کی قرآن دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ ان سب کو اسلام کا معاند سمجھا جائے۔

یہاں خاص طور پر وہ روایت پرویز صاحب کے پیشِ نظر ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ہونے کی وجہ سے کچھ روز آپ کا یہ حال ہو گیا کہ جو کام کر بیٹھتے تھے اس کے متعلق سمجھتے تھے کہ نہیں کیا۔ پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ مسلمان سوچتے نہیں کہ یہ واقعہ رسول کی عظمتِ شان کے اور خود قرآن کے کس قدر خلاف ہے۔ اور یہ قرآن کے خلاف کیسے ہے اس طرح کہ قرآن میں آنحضور صلعم کو مسحور کہنے والوں کو خدا نے ظالم ٹھہرایا ہے جس کا مطلب ہوا کہ یہ جادو کے اثر کی تہمت آپ پر غلط طور پر لگائی گئی۔ ایسے اوٹ پٹانگ استدلال کا بالکل وہی نتیجہ ہوتا ہے جیسے قرآن میں کفار کے متعلق بیان ہے کہ انہوں نے کہا۔ "کیا ایک انسان اور بشر ہماری رہنمائی کو آیا۔ اس بنا پر وہ کافر ہی رہے"۔ تو اس سے بعض نکتہ ورعقل نے یہ نص صریح حاصل کر لی کہ جو رسول کو بشر سمجھے وہ کافر ہے گویا رسول کو بشر کہنے والوں کو اس کی ہدایت و راہنمائی سے تو کوئی انکار تھا نہیں اور وہ ہر طرح وہ سو فیصدی مسلمان تھے۔ جو کفر انہوں نے کیا وہ یہی کچھ تھا۔ کہ بس رسول کو بشر

کچھ مان لیا۔ حمد و ثنا کے لائق اور، عیوب و نقائص سے پاک تسلیم کر لیا۔ بنا بریں وہ لوگ حضور علیہ السلام کی جناب میں گستاخیاں کرتے وقت سرکار کا نام بجائے محمد کے مذمم لیتے اور گالیاں دیتے۔ صحابہ کرام کو جب یہ بات معلوم ہوتی۔ اور انہوں نے حضور سے یہ بات عرض کی۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

يَشْتِمُوْنَ مُذَمَّمًا وَيَلْعَنُوْنَ مُذَمَّمًا وَاَنَا مُحَمَّدٌ۔ (مشکوٰۃ شریف ص۵۱۰)

"یعنی وہ گالیاں کسی مذمم کو دیتے ہیں اور ہم تو محمدؐ ہیں"

صلی اللہ علیہ وسلم۔ دیکھا آپ نے! اللہ نے اپنے محبوب کو بے ایمانوں کی گستاخیوں سے کس طرح بچایا۔ تو میرے دوستو! جو محمد ہے۔ وہ گویا ہر عیب سے محفوظ و معصوم ہے۔ اور ہمارا یہ ایمان ہے۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے ہر عیب سے پاک پیدا فرمایا ہے۔ اور یہ ہمارا ہی ایمان نہیں۔ بلکہ ہر صاحبِ ایمان کا یہی ایمان ہے۔ چنانچہ آیئے حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے درباری شاعر و نعت خواں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی نعت خوانی ملاحظہ فرمایئے:۔

حضرت حسّان رضی اللہ عنہ

حضرت حسان رضی اللہ عنہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مقبول شاعر اور نعت خواں تھے۔ یہ حضور کے سامنے حضور کی نعت خوانی کیا کرتے تھے۔ اور حضور خوش ہو کر دعا فرمایا کرتے تھے:۔

اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۔۔۔ (مشکوٰۃ شریف ص۴۱۲)

اے اللہ" حسان کی روح قدس کے ساتھ امداد فرما"

دیکھیئے! حضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنے نعت خواں کے لئے کیسی پیاری دعا فرما رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ سرکار کا نعت خواں مقبول بارگاہ ہے اور مؤید من اللہ ہے۔ میرے بزرگو! یہ جو آجکل کہا جاتا ہے۔ کہ نعت خوانی بدعت ہے

نعت خوانی

ان بدعت کہنے والوں کو یہی آیت جو میں نے ابتداء وعظ میں پڑھی ہے۔ یعنے "محمد رسول اللہ" دیکھ لینی چاہیئے۔ کہ

کہہ بیٹھے۔ اور اتنا کہہ دینے سے کافر ہو گئے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی حال ہے کیونکہ آنحضور
کو مسحور کہنے والے جن لوگوں کو قرآن میں ظالم ٹھہرایا گیا ہے وہ صرف ان کے ایسا
کہنے کی وجہ سے کب تھا ان کے تو اور بھی بہت سے کام ظالموں کے تھے اور اگر ایسا
نہ کہتے تو بھی وہ ظالم تھے۔ پھر بخاری میں صرف یہ ہے کہ آنحضور جادو کے عارضہ
سے کچھ روز ایسے ہو گئے تھے کہ ایک کام کرنے کے باوجود سمجھتے تھے کہ شاید نہیں
کیا حالانکہ مخالفین کو آپ سے ایسے جادو اور ایسے کاموں سے کچھ بھی گلہ نہ تھا۔ بلکہ
ان کا دعویٰ یہ تھا کہ آپ دائمی طور پر جادو کا شکار ہیں اور ایسی باتیں کرتے ہیں کہ
معلوم ہوتا ہے آپ پر جادو ہو چکا ہے۔ اس عارضی جادو کا تو نہ انہیں دعویٰ تھا
اور نہ خدا نے اس کا رد فرمایا۔ پھر یہ حدیث قرآن کے خلاف کیسے ہو گئی۔ اور نہ
ہی اس سے قرآن کی خلاف ورزی ہوتی ہے کہ ایک کئے گئے کام کو آدمی سمجھے
کہ وہ نہیں کیا گیا۔ اس لحاظ سے حدیث اگر غلط ہوتی تو اس کے گھڑنے والے کو یہ
کہنا چاہیئے تھا کہ مثلاً آپ جادو کے اثر سے چوری اور ڈکیتی میں مشغول ہو گئے تھے
ورنہ کسی کام کا شبہ ہونا کونسی قرآن کی مخالفت ہے۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ پرویز صاحب نے اسی کتاب کے بکثرت مقامات
پر سحر کے معنی جھوٹ لکھا ہے۔ اور اس کی تائید میں اپنی کئی اور کتابوں کا حوالہ بھی
دیا ہے مگر جب اس روایت پر نظر پڑی تو یہ بھول گئے کہ سحر کے معنی جھوٹ ہیں
اور آنحضور کو کسی نے کچھ جھوٹ بتایا جس سے آپ یہ سمجھے کہ جو کام کیا تھا وہ شاید
نہیں ہوا۔ بجائے ایسے معنی لینے کے آپ تاؤ میں آ کر لگے حدیث کو قرآن کے
خلاف ٹھہرانے۔ حالانکہ وہی لفظ سحر حدیث میں بھی ہے جس کے معنی آیت
میں آپ نے جھوٹ کیے تھے

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جو واقعہ رسول کی عظمت شان کے خلاف سامنے

یہ آیت خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نعت ہے۔ اور یہ نعت پڑھنے والا خود خداوند کریم ہے۔ نعت کس چیز کا نام ہے؟ اور نعت خوانی میں کیا ہوتا ہے؟ یہی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات کا بیان و اعلان! تو آیت "محمد رسول اللہ" میں بھی حضور کے نام نامی اور آپ کی رسالت کا بیان و اعلان ہے۔ تو یہ آیت بھی نعت رسول نہ ہوئی تو اور کیا ہوئی؟ اجی یہ تو پورا جملہ ہے۔ آپ صرف نام نامی "محمد" کو ہی لیجئے۔ یہ نام پاک خود نعت کے مفہوم کو لئے ہوئے ہے۔ ابھی ابھی آپ سن چکے کہ محمد کے معنی ہیں تعریف کیا گیا۔ نعت پڑھا گیا۔ اَلَّذِیْ یُحَمَّدُ حَمْدًا بَعْدَ حَمْدٍ۔ جو بار بار اور متواتر تعریف کیا جائے۔ اور ہر آن ہر زمان جس کی نعت پڑھی جائے۔ تو جو شخص محمد کہے گا۔ وہ گویا یہ نام لینے کے ساتھ ساتھ حضور کی نعت خوانی کا اقرار کرے گا۔ پھر کس قدر حماقت ہے۔ ان لوگوں کی جو حضور کو محمد بھی کہتے ہیں اور آپ کی نعت خوانی سے بھی روکتے ہیں۔ اسی طرح کلمہ طیبہ میں ہر مسلمان محمد رسول اللہ کہہ کر حضور کی نعت خوانی کرتا ہے۔ گویا مسلمان وہ ہے جو حضور کی نعت خوانی کرے۔ پھر جو نعت خوانی سے روکتا ہے۔ کس قدر بیوقوف ہے۔ کہ کلمہ بھی پڑھتا ہے۔ اور نعت خوانی سے بھی روکتا ہے — بھائیو! اگر ہماری نعت خوانی بدعت ہے۔ تو پھر کلمہ طیبہ کو بھی بدعت کہنا پڑے گا۔ اور اگر یہ کہا جائے۔ کہ نعت میں ردیف و قافیہ کا وجود موجب بدعت ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ اول تو کلمہ طیبہ کے دونوں جملوں ہی کو دیکھ لیجئے۔ دونوں میں ردیف "اللہ" ہے۔ یونہی قرآن پاک کے اسلوب کلام کو بھی دیکھ لیجئے۔ بالعموم آیات قرآنیہ ہم قافیہ الفاظ پر ختم ہوتی ہیں۔ مثلاً اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ میں "تضلیل"۔ "ابابیل"۔ "سجیل" اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ میں "وانحر" اور "ابتر" — "قُلْ هُوَ اللّٰهُ احد" میں "صمدا" اور "یولد" — "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ میں "وسواس" و "خناس" اور سورۃ الرَّحْمٰن کو پڑھئے تو آخر تک فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کی مقدس تکرار کے ساتھ ساتھ ہم قافیہ الفاظ پر اختتام آیات فصاحت و بلاغت پر چار

آئے اس کی اہمیت رسول کے اور ملت کے مجموعی تعامل سے متعین کی جانی چاہیے
چنانچہ قرآن سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰ پر جو خون ناحق کا الزام لگایا گیا تھا
اس کو آپ نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اسی طرح آنجناب کی امت کے لوگوں
نے بھی قطعاً قابل التفات نہ پایا۔ پھر جب قرآن میں یہ واقعہ بیان ہوا تو مسلمانوں
نے بھی اس کو آج تک شان رسالت کے خلاف نہ کہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حقیقت
میں یہ واقعہ کچھ بھی اہم نہیں۔ اور جب نہیں تو آج اگر اس پر کوئی مخالف یا موافق
اعتراض کرنے لگے تو اس کا اعتراض بے معنی سمجھا جائیگا۔ اگرچہ خون ناحق بجائے
خود کوئی معمولی الزام نہیں اور رسول تو کجا ایک عام مسلمان اور عام انسان
کے مرتبہ سے بھی یہ بات گری ہوئی ہے کہ وہ کسی بے گناہ انسان کو قتل
کر دے مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس الزام کو بے
وقعت ٹھیراتے ہوئے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ کام مجھ سے اس وقت
صادر ہوا جبکہ میرا حال کچھ دوسری طرح کا تھا۔ اور آپ کے لوگوں نے بھی مطلقاً
اس پر کوئی توجہ نہ دی اور بعد کے مسلمانوں نے حضرت موسیٰ کے اس جواب سے
سمجھا کہ شاید اس وقت آپ منصب رسالت پر قائم نہیں ہوئے تھے۔ اب
جو شخص حضرت موسیٰ کے ساتھ ان کی قوم کا اور قرآن کا اور مسلمانوں کے تعامل کا
اندھا مقلد نہ ہو اسے تو اس معاملہ کا ہر پہلو قابل اعتراض نظر آتا ہے۔
سب سے پہلے حضرت موسیٰ کے جواب کو لیجیے۔ اگر آنجناب کا حال پہلے
کچھ اور طرح کا تھا تو جب آپ دعوت دین کے لیے فرعون کے دربار
میں پہنچے تھے اس وقت تو آپ اچھے حال میں گئے تھے۔ پھر کیوں نہ
فرعون کی طرف سے الزام قتل سننے سے پہلے اپنے آپ کو قصاص
کے لیے پیش کر دیا اور اگر خواہ مخواہ اسے سننا ہی تھا تو سننے کے بعد

چاند لگا کر کیا ہی روحانی کیف و سرور پیدا کرتا ہے۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ قرآن میں اشعار ہیں۔ مجھے تو یہ بتانا ہے کہ ہمارے اشعار نعتیہ میں وجود قافیہ کوئی ناجائز چیز نہیں ہے۔ بلکہ اچھی ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے۔ کہ کسی مردود کا نفس نعت ہی سے قافیہ تنگ ہو تو ایسے بدبخت کا تو کلمہ پڑھنا بھی بیکار ہے۔ اور ایسے ہی کے لئے اعلیحضرت نے فرمایا ہے سے

ذِیَابٌ فِیْ ثِیَابٍ لب پہ کلمہ دل میں گستاخی
سلام اِسلام ملحد کو کہ تسلیم زبانی ہے

تو ردیف قافیہ کی پابندی کے ساتھ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و تعریف کوئی نئی بات یا بدعت نہیں ہے۔ بلکہ ایسی نعت خوانی حضور کے سامنے ہوتی رہی۔ اور حضور سنا کرتے اور اپنے نعت خواں کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ سن چکے۔ کہ حضور نے حضرت حسان کے لئے دعا فرمائی کہ اے اللہ اس کی روح قدس سے امداد فرما" اسی طرح

حضرت عباس کیلئے دُعا

ایک مرتبہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حق میں بھی حضور نے دعا فرمائی تھی۔ اور یہ وہ موقعہ تھا۔ جبکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے۔ اور آپ صحابہ سمیت جب مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ تو حضرت عباس نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔ حضور مجھے اجازت دیجئے۔ میں نعت خوانی کروں حضور نے فرمایا:۔

—— قُلْ لَا یُفْضِضِ اللّٰہُ فَاکَ۔ (مواہب لدنیہ ص۱۲۷ ج۱)

"اے عباس! اجازت ہے کہو جو کہنا ہے اللہ تمہارے منہ کو سلامت رکھے"۔

اس کے بعد دیکھ لیجئے مواہب لدنیہ کو کہ حضرت عباس نے ایک طویل نعت پڑھی۔ تو مبارک ہو حضور کے نعت خوانوں کہ حضور نے ان کے لئے "منہ سلامت رہے" کی دعا فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ منکرین نعت کے منہ کالے اور ٹیڑھے ہی نظر آتے ہیں۔ سے

اُسے اپنی گردن سے اتارتے۔ آپ کی طرح کا جواب اگر ایک قاتل کو بری کر دینے میں کافی ہو سکتا ہے تو پھر دنیا میں کسی بھی اقراری مجرم کو سزا نہیں ہونی چاہیے۔ نہ اگر اس الزام کو اہمیت دیتے تو آپ کہہ سکتے تھے کہ اگر معاملہ شخصی قصاص کا ہے تو پھر دونوں میں سے جو پہلا قاتل ہے اسی سے پہلے قصاص لیا جانا چاہیے اس طرح فرعون کا نمبر پہلے آنا یقینی تھا۔ اور اگر قومی قصاص لینا ہوتا تو آپ کہتے کہ بنی اسرائیل کے مقتولوں کی تعداد کے برابر جب فرعونی قوم کے لوگوں کو قتل کیا جانے لگا تو جس خون کا مجھ پر الزام ہے اس کی وجہ سے ایک قتل کم کر دینا ہوگا اور اگر قصاص وغیرہ کچھ بھی نہیں تو اس خون کا فائدہ ہی کیا کم ہے کہ اس کی وجہ سے آپ لوگوں کے ہاں انسانی جان کے احترام کا مسئلہ بھی پیش تو آ گیا۔ اور اس کی قیمت کے متعلق کچھ سوچنے تو لگے اور اسی قتل کی وجہ سے سوچنے لگے جو کسی خاص کوشش کا نتیجہ نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ کا اس الزام کو اہمیت نہ دینا مزید اشکال یہ پیدا کر رہا ہے کہ کیا آپ جس دعوت کو لیکر آئے تھے اسے پیش کرنے والے انسان کا ہر الزام سے بری ہونا آپ کے ہاں کچھ بھی اہم نہ تھا۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ کی جماعت کیوں اس پر خاموش رہی شاید انہیں حقائق کے پیش نظر جو اوپر بیان ہوئے ہیں اور ان کے علاوہ کئی اور کیونکہ ان کی لکھی توراۃ دن رات ان کی آنکھوں کے سامنے کھل رہی تھی۔ پھر آخر میں مسلمانوں کو اس واقعہ پر کیوں توجہ نہ ہوئی۔ ان کی طرف سے یہ صفائی کہ اس خون کے وقت حضرت موسیٰ ابھی منصب نبوت پر فائز نہیں ہوئے تھے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ جس شخص کو بھی نبی ہونا ہو اسے پہلے قاتل ہونا چاہیے۔ آخر منصب نبوت پر فائز نہ ہونے کا تقاضا یہ کب ہے کہ اس سے پہلے قتل جائز ہو۔ جب ایسی صفائی

منکرینِ نعت ہیں کامل سیہ
ان کے چہرے ہیں سیہ اور دل سیہ

سبھی نعت خواں

بزرگو! حضرت امام بوصیری علیہ الرحمۃ کا قصیدہ بردہ شریف ایک مشہور و معروف ایمان افروز قصیدہ نعتیہ ہے۔

حضرت امام بوصیری علیہ الرحمۃ کو مرض فالج ہو گیا تھا۔ کوئی علاج مفید و کارگر نہ ہوتا تھا۔ آخر انہوں نے یہ قصیدہ نعتیہ لکھا۔ رات کو خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ حضور نے یہ قصیدہ خود امام بوصیری سے سنا۔ اور پھر انعام میں اپنی چادر عطا فرمائی۔ اور فالج سے شفا بھی۔ اسی طرح بڑے بڑے صحابہ کرام اولیاء عظام حضور کی نعت خوانی میں رطب اللساں رہے اور ہیں۔ فاروق اعظم امام اعظم، غوث اعظم، مولانا جامی، مولانا رومی۔ اعلیٰ حضرت وغیرہم رضی اللہ عنہم ان سب بزرگوں نے نعتیں لکھیں۔ اور پڑھیں۔ سنیں اور سنائیں۔ گویا سبھی حضور کے نعت خواں ہیں۔ اور جو حضور کا نعت خواں نہیں وہ مسلمان ہی ہی نہیں۔ حضور کی نعت نظم میں یا نثر میں مسلمان کے لئے ایک بڑی نعمت ہے۔ اور بھائیو۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نعتِ رسول پڑھتے رہنے کی توفیق بخشے۔ اور نعت رسول پڑھتے ہوئے ہی ہمارا دم نکلے۔ ؎

بشیر اُن کی ثنا کرتے ہوئے گر تیرا دم نکلے
فرشتے غسل دیں لاشے ترے کا آبِ زمزم سے

شعر و شاعری

بزرگو! اور دوستو! آج کل شعر و شاعری کا بڑا چرچا و رواج ہے۔ مگر یاد رکھو کہ شعر و شاعری بھی وہی محمود ہے۔ جس کا موضوع یہی نعتِ رسول یا حمد باری ہو۔ یا کوئی دوسرا اچھا موضوع ہو۔ شاعری بذاتہٖ کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ اگر موضوع بُرا ہو۔ تو بُری ہے۔ اور موضوع اچھا ہو تو اچھی ہے۔ گویا یہ ایک گلاس ہے۔ جس میں شراب ڈالئے تو گلاس ناپاک، اور دودھ ڈالئے تو پاک ہے یا ایک تلوار ہے جس سے کفار کے ساتھ جہاد کیجئے تو اچھی ہے اور کسی بے گناہ پر اٹھائیے تو بری ہے میرے بھائیو! آج کل کی جو شاعری ہے۔ وہ کچھ اسی قسم کی شاعری ہے۔ کہ گل و

کچھ بھی نہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ کے جواب کے پیش نظر اور بس وجہ سے کہ قرآن اس بارہ میں خاموش ہے بہتری اور بھلائی اسی میں دیکھی کہ اس معاملہ میں خاموش رہا جائے۔ یعنی بات وہی ہوئی کہ قرآن اور حضرت موسیٰ کی اندھی تقلید میں کام بنتا نظر آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول کے متعلق پہنچنے والے کسی الزام میں اولین چیز دیکھنے کی جو ہے وہ یہ ہے کہ اس کا ذریعہ درآمد کیا ہے نہ یہ کہ وہ اس کی شان و عظمت کے موافق ہے یا نہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کا یہ واقعہ جو ہمیں ماننا پڑا تو نہ اس لئے کہ یہ ہماری عقل کے موافق ہے بلکہ محض اس لئے کہ قرآن کے جس ذریعہ سے یہ واقعہ ہم کو پہنچا ہے۔ وہ ذریعہ کافی سے زیادہ معتمد ہے ورنہ حضرت موسیٰ کے بغیر کبھی اور پیغمبر کے حق میں ہم ایسی کوئی بات بھی سننے کو تیار نہیں نہ اس لئے کہ حضرت موسیٰ سے بڑھ کر ہمیں ان سے عقیدت و محبت ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ ان کے متعلق ہمیں کوئی ایسا صحیح واقعہ پہنچا نہیں۔

اس کے ساتھ دیکھنے کی چیز یہ بھی ایک ہے کہ یہ اور اس طرح کی کئی اور حدیثیں جو کئی صدیوں سے کتب حدیث میں موجود ہیں تو آخر ان کے خلاف آج تک پہلے مسلمانوں نے کیوں نہ لنگر لنگوٹے کس کر جہاد شروع کیا۔ جب نہیں کیا تو ہو سکتا ہے کہیں ہمارے ہی دماغ میں کوئی فتور ہو۔ بجائے اس کے یہ فرض کر لیتا کہ وہ سب کے سب عقل اور ایمان سے خالی تھے۔ یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور صریح طور پر قرآن اور عقل کے خلاف ہے۔

بلبل کی تعریف، ہجر و وصال کے جھوٹے قصے۔ اور حسن فانی کی خیالی تعریفیں، اور مبالغہ آمیز دعاوی اس کے موضوع خاص ہیں۔ اور یہ لوگ جس قدر زیادہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اسی قدر شعر کو زیادہ معیاری اور بلند سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کی مبالغہ آرائی اور سرتاپا دروغ و کذب کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ایک مجلس مشاعرہ میں ایک شاعر صاحب اٹھے اور بولے میں نے عرض کیا ہے ؎

ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

دیکھا آپ نے؟ شاعر صاحب کی آنکھیں نہ ہوئیں ٹیوب ویل ہو گئیں۔ کس قدر جھوٹ ہے۔ اس شعر پر واہ واہ ہوئی۔ تو دوسرے شاعر صاحب اٹھے۔ اور بولے۔ اور میں نے عرض کیا ہے۔ ؎

رات کو رویا ہوں میں اس قدر ہجر یار میں
سو سمندر۔ نو سو نالے۔ لاکھ ندیاں بہ گئیں

لیجئے صاحب! ۱۹۵۵ء کا فلڈ آ گیا۔ یہ جو سیلاب کی روک تھام کے لئے مختلف منصوبے تیار کئے جاتے ہیں۔ سب فضول ہیں۔ اصل منصوبہ تو یہ ہونا چاہیئے۔ کہ شاعر صاحب کو چپ کرایا جائے۔ اور انہیں رونے نہ دیا جائے۔ اس شعر پر اور بھی واہ واہ ہوئی۔ تو تیسرے حضرت اٹھے اور کمال تو کیا سچ کو پامال ہی کر کے رکھ دیا۔ بولے۔ اور بندے نے عرض کیا ہے۔ ؎

رونے پہ باندھ لے جو مری چشم تر کمر
کیسی زمیں فلک پہ ہو پانی..... کمر کمر

جَلَّ جَلَالُہٗ! گویا طوفان نوح بھی تو آخر زمین پر ہی رہا تھا۔ مگر شاعر صاحب اگر رونا شروع کر دیں۔ تو زمین کے علاوہ آسمان پر بھی کمر کمر پانی ہو جائے استغفر اللہ! یہی وہ شاعری ہے جو مذموم ہے۔ اور جس کے علمبرداروں کے لئے خود حالی شاعر ہی نے لکھا ہے کہ ع

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

اے مسلمانو! ایک شاعری وہ ہے۔ جس کا میں تذکرہ کر رہا ہوں۔ یعنی

مُنکرِ حدیث کا الزام

اگر کوئی کہہ دے کہ ان کتابوں کے مشمولات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لینا چاہیئے۔ اور جو قرآن کے خلاف ثابت ہوں انہیں وضعی مان کر ان کتابوں سے نکال دینا چاہیئے۔ تو ایسا کہنے والے پر منکرِ حدیث[1] کا لیبل لگا کے اسے کافر بنا دیا جاتا ہے۔ ص ۳۱۶

یہ ایک حقیقت ہے کہ پرویز صاحب کا ادارہ دعوت و اشاعت تمام تر حدیث کے خلاف جہاد میں شبانہ روز مصروف ہے پھر اگر آپ کو منکرِ حدیث کے نام دیئے جانے پر شکایت ہو تو یہ بالکل بے جا شکایت ہو گی۔ بجز یہ امر کہ آپ حدیث کو قرآن کے مطابق بنانے پر زور دیں۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس سے کسی مسلمان کو اختلاف ہو۔ دراصل آپ کے خلاف منکرِ حدیث ہونے کا الزام تو اس وجہ سے ہے کہ آپ نے حدیث کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والا جہاد اور محاذ قائم کر رکھا ہے۔ آپ جو اس جہاد کو اتباعِ قرآن کا نام دے کر اپنے خلاف عائد شدہ الزام کی صفائی اس کے ذریعہ دیتے ہیں۔ تو یہ کہاں کا انصاف

---

[1] حدیثیں بھی اگر وحی تھیں تو رسول اللہ صلعم نے انکو قرآن کی طرح لکھایا کیوں نہیں۔ (مقام حدیث ص ۱۵۲)
احادیث کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں وہ رسول اکرم کے الفاظ بھی نہیں ہیں (مقام حدیث) ص ۳۰۴
گذشتہ قومیں اپنے انبیاء کی روایات لکھنے کی بدولت گمراہ ہوئیں (رسالے ۱۱۶) ص ۶۰
یا نعوذ باللہ۔ اللہ میاں میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اپنی پوری بات اپنے الفاظ میں کہہ دے۔ اور یا جو کچھ خدا نے کہا وہ ناتمام تھا اور اس کی تکمیل رسول نے کر دی۔ (مقامِ حدیث) ص ۲۷

وہ شاعری جس کا موضوع نعت رسول ہو۔ سبحان اللہ ! یہ وہ شاعری ہے جو محمود ہے۔ اور جس کے علمبردار انشاء اللہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے زیرِ عَلَم جنت کی سیر کریں گے :

نعتیہ مشاعرہ آپ نے مذموم شاعری کا مشاعرہ ملاحظہ فرمایا۔ آیئے اس محمود شاعری کا بھی ایک مشاعرہ سنتے جایئے۔ اعلیحضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ کا قصیدہ نور۔ سبحان اللہ ! ایمان والوں کے لئے موجب صد سرور قصیدہ ہے۔ اس کا ایک ہی شعر پڑھتے ہوئے جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ آپ نے اس قصیدہ میں ایک جگہ فرمایا ہے۔ ؎

باغِ طیبہ میں سہانا پھول پھولا نور کا
مست بو ہیں بلبلیں پڑھتی ہیں کلمہ نور کا

حضرت مولانا اسیر بدایونی علیہ الرحمۃ اعلیحضرت کے تتبع میں اٹھے اور فرمایا ؎

مرحبا آیا عجب موسم سہانا نور کا!
بلبلیں گاتی ہیں گلشن میں ترانہ نور کا

اعلیٰ حضرت نے فرمایا ؎

پشت پر ڈھلکا سرِ انور سے شملہ نور کا
دیکھیں موسیٰ طور سے اُترا صحیفہ نور کا

حضرت بدایونی نے فرمایا ؎

نور کا سر پر عمامہ اور شملہ نور کا
اڑ رہا ہے عرشِ اعظم پر پھریرا نور کا

شبِ معراج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب جنت کا دولہا بنایا گیا۔ تو اس وقت کے نظارہ نور کا نقشہ اعلیحضرت نے یوں کھینچا۔ ؎

کیا بنا نامِ خدا اَسرا کا دولھا نور کا
سر پہ سہرا نور کا بر میں شہانہ نور کا

اور حضرتِ بدایونی نے نقشہ یوں کھینچا ؎

معنیٔ نورٌ علیٰ نورِ شبِ اسریٰ کھلے

ہے۔ اگر ایک آدمی زید کی باتوں کو نہ ماننے کی مہم جاری کر دے۔ تو اسے اتباعِ قرآن
کا نام دینا جائز نہیں تو یہ کب جائز ہے کہ آپ رسول کی باتوں سے لوگوں کو نفرت دلائیں
تو آپ کو نہ منکرِ رسول اور نہ منکرِ حدیث بلکہ متبعِ قرآن کہا جائے تو آپ راضی رہیں
اس الزام سے آپ کا غصہ میں آنا بالکل قادیانیوں کی طرح ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نہ
تو ختمِ نبوت کے منکر ہیں اور نہ دین کے کسی اور حکم کے۔ صرف مرزا صاحب کو تھوڑا
سا نبی مانتے ہیں۔ اور اس پر ہمیں بے دھڑک کافر کہہ دیا جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے
کہ یہی تھوڑا سا کسی کو نبی بنا لینا ہی تو ختمِ نبوت کے منافی اور کفر ہے جس طرح
کسی انسان کا قتل کر ڈالنا یہ ہے کہ ذرا سا اس کے سر کو جسم سے جدا کر دیا جائے۔
پرویز صاحب بھی نہیں سمجھتے کہ حدیث کا مذاق اڑانا اس کی پیروی سے لوگوں کو ہٹانا
اور دین میں اسے سند نہ ٹھہرانا اور اسے گمراہی کا باعث بتانا ہی تو منکرِ حدیث ہونا ہے۔
ورنہ اس کے تاریخی سند ہونے سے تو کبھی کسی غیر مسلم کو بھی انکار نہیں ہوا پھر اس
سے زیادہ بیہودہ بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ حفاظتِ حدیث کو گمراہی کا باعث
ٹھہرایا جائے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی عقل کا اندھا یہ کہنے لگ جائے کہ حاتم
طائی کے قصوں کی بدولت لوگ کنجوس ہوتے ہیں اور افلاطون و حکیم اجمل خاں کی
کتابیں پڑھنے سے انسان بیمار ہوتا ہے اور جب کچھ زیادہ لوگ انہیں پڑھنے لگیں
تو بیماری کی وبا پھیلتی ہے اسی طرح سعدی کی کتابیں پڑھنے سے انسان احمق ہوتا
ہے اور رستم کے حالات پڑھنے سے آدمی بزدل ہوتا ہے اور جو نوشیرواں کے حالات
پڑھے وہ ظالم ہو کر رہتا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن کے مطابق ایک بات کو اس کی روشنی میں پرکھنے کے اندر بھی
خاصا اختلاف ہے۔ اگر دو آدمی رسول سے ایک ہی بات سنیں اور ایک اسے اس لئے
مان لے کہ وہ رسول کی فرمائش ہے۔ دوسرا اس لئے کہ وہ قرآن کے موافق ہے اور اس

چہرۂ پُرنور پر باندھا جو سہرا نور کا

"دوشالہ" کا لفظ دیکھئے اعلیٰ حضرت نے کس طرح نبھایا ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں حضور کی دو صاحبزادیاں آئیں۔ اس چیز کو اعلیٰ حضرت اس شعر میں بیان فرماتے ہیں ؎

نور کی سرکار سے پایا دوشالہ نور کا
ہو مبارک تجھ کو ذوالنورین جوڑا نور کا

حضرت مولانا اسیر بدایونی علیہ الرحمۃ نے اس دوشالہ کو جس طرح نبھایا ہے۔ وہ بھی دیکھئے ؎

حبّذا صلّ علیٰ حسنین کاندھوں پر سوار
مرحبا دوشِ نبی پر ہے دوشالہ نور کا

لفظ "پسینہ" کو بھی اعلیٰ حضرت اور مولانا بدایونی نے نبھایا ہے اور بڑے ہی ایمان افروز طریقے سے، قرآن پاک کی جلد پر سونے کا پانی چڑھایا جاتا ہے۔ تو جلد سنہری، اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے رخِ انور پر پسینہ آتا ہے۔ تو اعلیٰ حضرت اس کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں ؎

آبِ زر بنتا ہے عارض پر پسینہ نور کا
مصحفِ اعجاز پر چڑھتا ہے سونا نور کا

یعنے سرکار کا چہرۂ انور قرآن ہے۔ اور یہ جو اس چہرۂ انور پر پسینہ آ رہا ہے۔ یہ سونے کا پانی ہے۔ جو اس قرآن پر چڑھایا جا رہا ہے۔ سبحان اللہ! حضرت بدایونی نے پسینہ آنے کا ذکر یوں فرمایا ؎

آگیا ریشِ مبارک پر پسینہ نور کا
نور کے خوشے ہیں ہے ہر دانہ دانہ نور کا

الغرض یہ وہ شاعری ہے جو کلید در جنت ہے اور ہمارے اسلاف علیہم الرحمۃ نظم و نثر میں حضور کی نعت خوانی کرتے رہے تو خود ہی فیصلہ کر لیجئے۔ کہ یہ نعت خوانی بدعت ہے یا سنتِ اسلاف؟ تو بھائیو! ہم تو حضور کے نعت خواں بنے۔ ہیں، اور رہیں گے اور بقول اعلیٰحضرت ؎

کے عمل پر دونوں متفق ہو جائیں تو شاید کچھ بھی مضائقہ نہ ہو مگر مصیبت یہ ہے کہ دوسرے
کو رسول کی بات سننے اور اُسے موافق قرآن تسلیم کرنے کا پابند بنانا ممکن نہیں سوائے
اس کے کہ اُسے قرآن کے ذریعہ اس کا پابند بنایا جائے۔ پرویز صاحب کہتے
ہیں کہ اسے اس کا پابند بنانے کا ذریعہ ہے حکومت کا ڈنڈا[1] اور قانون کا شکنجہ
جس سے اگر وہ تنگی محسوس کرے تو خوشی سے مرتد ہو جائے اور اسلام کو چھوڑ دے
لیکن ہم کہتے ہیں کہ اُسے پابند بنانے کا ذریعہ اول و آخر قرآن ہونا چاہیے۔ ورنہ
ڈنڈا اور شکنجہ تو پیغمبر کو اس وقت میسر ہونے کی امید ہو سکتی ہے کہ لوگ اس پر
ڈنڈے برسانے کی بجائے اس کی بات پر توجہ دینے کو آمادہ ہو جائیں چنانچہ اگر
کوئی اس پر آمادہ ہو گیا تو اُسے قرآن ہی کے ذریعہ اس کا معتقد بنانا ہوگا کہ اس زمین
پر رہنے والے لوگوں میں تنہا رسول ہی اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے اس
طرح جب وہ اطاعت رسول کے حلقہ میں آ گیا تو وہاں نہ صرف استنجا اور مسواک
ہوگا بلکہ زندگی بھر کے اور اس سے بڑھ کر آخرت کے مسائل بھی پیش آئیں گے۔
جن میں اس کے لیے رسول کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ انہیں مسائل میں سے ایک
اہم مسئلہ فہم قرآن بھی ہے اور جو انسان ان سب مسائل و معاملات کو رسول کے
ہمراہ اس کی پیروی میں انجام دیتا رہا ہو۔ اسے رسول کی وفات کے بعد یکایک
یہ سمجھانا ممکن نہیں کہ اس وقت سے تم قرآن کے تحت اس کے پابند ہو کہ رسول
کو نہ صرف عام انسان کے اور اس کی باتوں اور فیصلوں کو عام انسانوں کی باتوں
کے برابر مانو بلکہ یہ مان لو کہ رسول کی باتوں کا ریکارڈ کر رکھنا بھی گمراہی کا موجب
ہے۔ یہ چیز جہاں عملاً ممکن نہیں وہاں اس سے قرآن بھی تضاد کا شکار ہو کے رہتا ہے

---

[1] قرآن اس کی اجازت دیتا ہے کہ اگر کسی شخص کا دل ایمان سے منحرف ہو گیا ہے۔

خاک ہو جائیں عدو جل کر مگر ہم تو رضاؔ
دم میں جبتک دم ہے ذکر انکا سناتے جائینگے

ارشادِ حسّان

ہاں تو میں حضرت حسّان رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنے لگا تھا اور یہ بتانے لگا تھا۔ کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بے عیب ہیں۔ اور یہی ہمارا ایمان ہے۔ اور نہ صرف ہمارا بلکہ ہر صاحبِ ایمان کا یہی ایمان ہے۔ چنانچہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے آقا کی ان لفظوں سے تعریف فرمائی ؎

وَ اَجْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَیْنِیْ ٭ وَ اَکْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

"یعنی یا رسول اللہ! میری ان آنکھوں نے آپ سے زیادہ حسین وجمیل کسی کو نہیں دیکھا"

اور پھر عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ! شاید کوئی یوں کہہ دے۔ کہ تمہاری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ تو یہ تمہاری آنکھوں کا قصور ہے۔ ممکن ہے حضور سے زیادہ حسین وجمیل کوئی دوسرا بھی ہو۔ تو اس امکان کی دوسرے مصرعہ میں تردید کردی کہ ــــ وَ اَکْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ ــــ یعنی حضور آپ سے زیادہ کامل حسین وجمیل کسی ماں نے جنا ہی نہیں؛ گویا ؎

رخِ مصطفٰے ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا کوئی اور آئینہ
نہ ہماری چشمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

آگے سنئے حضرت حسّان کیا کہتے ہیں ؎

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ ٭ کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

حضور! آپ ہر عیب سے پاک پیدا فرمائے گئے ہیں۔ گویا جیسے آپ نے خود چاہا ویسے ہی اللہ نے آپ کو بنا دیا"

سبحان اللہ! دیکھا آپ نے صحابہ کا عقیدہ! قربان جائیں اس ایمان افروز اور باطل سوز شعر پر کیا ہی پیارا ارشاد ہے کہ حضور! آپ کو تو اللہ نے آپ کی منشاء کے مطابق بنایا ہے۔ میرے دوستو! آؤ اس شعر کو سمجھنے کے لئے پہلے اپنی خلقت کے متعلق قرآن کا ارشاد سنو!

کہ ایک انسان کو پہلے قرآن کے تحت یہ منوایا جائے کہ رسول کی بات ماننی لازم ہے اور پھر یہ بھی قرآن ہی سے اسے منوایا جائے کہ اس کی باتوں کا یاد رکھنا گمراہی کا موجب ہے۔ قرآن کو اس تضاد سے بچانے کی واحد صورت یہی ہے کہ ایک مسلمان ہونے والا انسان اوّل روز سے رسول کو جس حیثیت سے مانے اسی پر آخر دم تک قائم رہے۔

یہ بات ذرا اور زیادہ وضاحت کے قابل ہے کہ یہاں اصل نزاع یہ نہیں کہ حدیث قرآن کے موافق ہو یا نہ ہو بلکہ یہ ہے کہ رسول کی بات وحی اور قرآن کی طرح لازم ہے یا نہیں مسلمان کہتے ہیں کہ لازم ہے اور قرآن کی طرح لازم ہے۔ اور اس کا رسول کی بات ہونا ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ قرآن کے موافق ہے۔ اور ایک مسلمان کے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں کہ وہ رسول سے ایک بات کو سنکر پھر اسے قرآن پر جانچے پرکھے اور اپنی یا دوسرے کی سمجھ سے کام لے کر معلوم کرے کہ وہ قرآن کے موافق ہے یا نہیں۔ ایک اس لئے کہ رسول کی بات وحی ہوتی ہے اور دوسرا اس لئے کہ اس کی سمجھ تمام دوسرے انسانوں سے فائق ہوتی ہے اور جب ایک بات میں کسی اور کی رائے کو معیار بنایا گیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ رسول سے زیادہ سمجھدار ہے۔ اور جب یہ ہے تو پھر ضروری طور پر خدا کی طرف سے معلّم قرآن و حکمت بن کر اسی کو آنا چاہیئے تھا۔ نہ کہ رسول کو۔ بخلاف اس کے پرویز صاحب کہتے ہیں۔ کہ نہ رسول کی بات وحی ہے اور نہ ہی اس کی سمجھ دوسرں

تو وہ اسلام کو ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کرلے لیکن وہ اسکی اجازت نہیں دیتا کہ جماعت کے اندر رہتے ہوئے اس کے فیصلوں سے سرکشی اختیار کی جائے۔ نظام مملکت کے فیصلوں کی حیثیت قانون کی ہوتی ہے اور قانون کی اطاعت لازمی

صفحہ ۶۲

ہماری خلقت

مجھے اور آپ سب کو بھی اللہ ہی نے بنایا ہے۔ مگر ہمارے لئے خدا کا ارشاد ہے :-

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَاءُ۔ (پ۳ع۹)

"وہی ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری تصویر بناتا ہے جیسی چاہے"

یعنی ہمیں جب اللہ نے پیدا فرمایا تو ہماری شکل و صورت کو اس نے جیسا کہ خود چاہا بنا دیا۔ کسی کو خوبصورتی دے دی۔ کسی کو نہ دی۔ کسی کو رنگ کالا دے دیا۔ کسی کو گورا رنگ عطا فرما دیا۔ کسی کا قد لمبا رکھا۔ کسی کو پست قد بنا دیا۔ اسی لئے فرمایا کَیْفَ یَشَاءُ۔ جیسا کہ اس اللہ نے چاہا۔ ویسا بنا دیا۔ تو میرے بزرگو! آیت کے اس کَیْفَ یَشَاءُ کو سامنے رکھو۔ اور پھر حضرت حسّان کا یہ مصرعہ پڑھو۔

"کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ"

اور اس میں "کما تشاء" کو دیکھو اور پھر دیکھو کہ حضرت حسان کیا کہہ گئے ؟ فرماتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ساری مخلوق کو تو اللہ نے اپنی مرضی سے بنایا۔ مگر جب آپ کو بنایا۔ تو آپ سے پوچھ لیا تھا۔ کہ پیارے تو خود بتا کہ تجھے کیسا بناؤں ؟

سبحان اللہ! کیا بات کہہ گئے۔ گویا محبوب سے اگر پوچھ کر اس کی صورت کو بنایا جائے گا۔ تو محبوب کب چاہے گا۔ کہ اس میں کوئی عیب بھی رکھا جائے۔ تو چونکہ ہمارے حضور سے پوچھ کر اللہ نے آپ کو بنایا ہے۔ لہذا ہمارے حضور میں کوئی عیب نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے فرمایا۔ خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ۔ اور اسی لئے اعلیٰ حضرت نے بھی یوں فرمایا کہ ؎

وہ کمالِ حسن حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

کیوں دوستو! سمجھے آپ کہ "محمد" کسے کہتے ہیں۔ خوب یاد رکھو۔ اور اس حقیقت پر ایمان رکھو کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو

سے فائق ہے۔ مگر صفائی اس میں بھی نہیں برتے۔ بلکہ ایک طرف کہتے ہیں کہ رسول نے
قرآن کے خلاف کچھ بھی نہیں کیا۔ اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ وہ غلطیاں بھی کرتا رہا۔
اور آگے چلئے! اگر ایک مسلمان رسول کا حکم خود رسول کی بجائے کسی اور کی زبانی
سنتا ہے تو اسے یہ کہنے اور سمجھنے کا کوئی حق نہیں کہ چونکہ رسول خود اپنا حکم اسے پہنچانے
نہیں آیا۔ اس لئے نہ وہ معلم قرآن رہا اور نہ اس کی بات وحی ہے۔ کیونکہ ایک پیغام
کی قدر و قیمت اس کے بھیجنے والے کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے لانے
والے کی وجہ سے۔ اور چونکہ وہ بتانے والا بات کو رسول کی طرف سے بتائے گا اس
لئے اس کی اہمیت رسول کی بات ہونے کی حیثیت سے ہوگی۔ اگر اطمینان ہوگیا کہ یہ
بات رسول کی ہے مثلاً وہ بتلائے کہ رسول نے سچ بولنے کو کہا تو اس کی بات کو مان
لیا جائے گا۔ اور اگر ایسا اطمینان نہ ہو سکا تو اس کی دیانت و سچائی کو پرکھنا ہوگا۔ وہ اگر
سچا انسان ظاہر ہوا تو پھر اس کی بات مانی جائے گی۔ اور عام حالات میں یہ سوال ہی
نہیں اٹھائیں گے کہ وہ قرآن کے مطابق بتاتا ہے یا نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے
رسول کے سامنے اس کی بات سن کر ایسا سوال نہیں کیا جاتا۔ لیکن اگر رسول کی طرف
سے بات بتلانے والا قابل اعتماد نہ ہوا تو پھر ضرور سوال پیدا ہوگا کہ وہ قرآن کے
مطابق کہہ رہا ہے۔ کیا اس کے خلاف یہ نہیں کہ اس کی بات کو بلا تحقیق رد کر
دیا جائے۔ چنانچہ قرآن میں واضح ہے کہ ایک بدکار آدمی تمہارے ہاں کوئی خبر
لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ بے خبری کے عالم میں کسی قوم کے
خلاف کوئی اقدام کر گذرو۔ اور پھر اپنے کئے پر ندامت اٹھاؤ۔ اس کا مطلب یہی
تو ہے کہ اسکی خبر کو محض اس کے بدکار ہونے کی بنا پر رد نہ کیا جائے اور نہ اس
خیال سے کہ وہ قرآن کے خلاف ہے بلکہ اگر وہ بدکار ہو یا اس کی خبر قرآن کے
خلاف معلوم ہو۔ تو بھی تحقیق کے بغیر جائز نہیں اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک بدکار

بے عیب خدا نے ـــــ بے عیب پیدا فرمایا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے۔ کہ کسی مسلمان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ کہ معاذ اللہ حضور میں کوئی عیب تھا۔ بلکہ ہر مسلمان کا ایمان یہ کہتا ہے۔ کہ ہمارے حضور کا بال

مُسلمان کا ایمان

بال شریف بے عیب ہے۔ کیوں مسلمانو! کیا ہے کوئی ایسا مسلمان؟ جو یہ کہے کہ معاذ اللہ حضور میں کوئی عیب تھا۔ توبہ! توبہ!! کسی کی مجال نہیں۔ کہ ایسا کہہ سکے۔ جس سے پوچھو یہی کہے گا۔ کہ حضور کا وجودِ باجود سرتاپا کمال ہی کمال اور نور ہی نور ہے۔ آپ کے کسی عضو انور میں کوئی عیب نہیں۔ حتیٰ کہ حضور کے لباس انور میں بھی کوئی عیب نہیں۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:۔

مَیل سے کس قدر سُتھرا ہے وہ پتلا نور کا
ہے گلے میں آج تک کورا ہی کُرتا نور کا

تو بھائیو! جن کے لباس انور تک میں کوئی عیب نہیں۔ ان کے کسی عضو انور میں کوئی عیب ہو سکتا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں!! ؏

تو ہے سایہ نور کا ہر عضو ٹکڑا نور کا!

تو فرمائیے جو شخص حضور کے بال شریف میں کوئی عیب بتائے یا حضور کے چہرۂ انور میں کوئی عیب بتائے یا حضور کے کانوں میں کوئی عیب بتائے یا حضور کی نظر میں کوئی عیب بتائے۔ کیا ایسا شخص مسلمان ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں!! تو آیئے لگے ہاتھوں یہ مسئلہ بھی سمجھ لیجئے کہ کانوں کا عیب کیا ہوتا ہے۔ یہی نا! کہ دُور کی آواز نہ سُن سکیں۔ آنکھوں کا عیب کیا ہوتا ہے۔ یہی نا! کہ دور کی چیز نہ دیکھ سکیں۔ تو فرمائیے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ ہمارے نعرۂ رسالت یا درود شریف کی آواز حضور کے کان نہیں سن سکتے۔ انہوں نے حضور کے کانوں میں عیب ٹھہرایا یا نہیں؟ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور کی چشمانِ مقدس دیوار پیچھے کی چیز کو بھی نہیں دیکھ سکتیں۔ انہوں نے حضور کی مبارک آنکھوں میں عیب ٹھہرایا یا نہیں؟ یقیناً ان لوگوں نے حضور کی سماعت و بصارت میں عیب ٹھہرایا اور یہ حقیقت ہے کہ اہل سنت ہی

آدمی سچ کہہ دے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے فہم قرآن میں قصور ہو۔ مثال کے طور پر ایک شدید آدمی خبر لاتا ہے کہ فلاں قوم تمہارے خلاف حملہ کی تیاری کر رہی ہے تو قرآن کا فیصلہ ایک طرف یہ ہے کہ بدکار آدمی کو نیکی اور سچائی سے دور سمجھا جائے۔ اور دوسری طرف اس کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ بدکار آدمی ہر وقت بدکار ہو سکتا ہے اور ضروری نہیں کہ وہ ہر موقعہ پر جھوٹ بولے اسی طرح قرآن کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ جس قوم پر تم نے کوئی زیادتی نہیں کی ایسے اپنا دشمن اور فریق جنگ نہ ٹھہراؤ۔ اور دوسری طرف قرآن کا فیصلہ یہ بھی ہے۔ کہ ضروری نہیں کہ جس سے تمہیں بگاڑ نہ ہو اسے تم سے بھی بگاڑ نہ ہو۔ ان وجوہ کی بنا پر نہ یہ جائز ہے کہ ایسی خبر کو باطل ٹھہرا کر امن سے بیٹھا جائے اور نہ یہ ٹھیک ہے کہ اسے صحیح سمجھ کر جنگی کاروائی کر دی جائے بلکہ لازم صرف یہ ہے کہ تحقیق کیجائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر حدیث رسول بھی ایک ناقابل اعتماد آدمی کے واسطہ سے پہنچے تو اسے خلاف قرآن فرض کر کے اس کی تحقیق سے نہیں بچا جا سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے ردّ وقبول سے بالکل بے تعلق رہنا تو ممکن نہیں نہ اہل حدیث کے لئے اور نہ منکر حدیث کے لئے بلا تحقیق نہ تعمیل ممکن ہے اور نہ انکار۔ دھاندلی کی بات دوسری ہے۔

پرویز صاحب اس طرح معاملہ کو صفائی سے سمجھانے کی بجائے ایسے ایسا گڑبڑ کر دیتے ہیں کہ نہ موافق یہ سمجھتا ہے کہ میں کس کا موافق ہو رہا ہوں اور نہ مخالف سمجھ سکتا ہے کہ آپ کس طرح قرآن کے خلاف جا رہے ہیں۔ آپ کبھی حکم رسول کو وقتی اور کبھی غیر وحی کہتے ہیں۔ اور کبھی راویوں کا رونا روتے ہیں۔ اور کبھی کلیات و جزئیات کا باب لکھ کر کہتے ہیں کہ رسول کا حکم

ایک ایسی جماعت حقہ ہے۔ جو حضور کو ہر عیب سے پاک جان کر اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے کان مبارک

کان مبارک وہ شان رکھتے ہیں۔ کہ دور و نزدیک کی آوازیں سن لیتے ہیں۔ ۵

دور و نزدیک کے سننے والے وہ کان
کانِ لعلِ کرامت پہ لاکھوں سلام

حضور صلے اللہ علیہ و سلم خود فرماتے ہیں:۔

اِنِّیْ اَرٰی مَالَا تَرَوْنَ وَ اَسْمَعُ مَالَا تَسْمَعُوْنَ۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ خصائص ص ۱۱۶ ج ۲) " میں وہ دیکھتا ہوں۔ جو تم نہیں دیکھتے۔ اور وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے"

حضور کے اس اچھے ارشاد سے صاف ظاہر ہو رہا ہے۔ کہ جو آوازیں ہمارے کان نہیں سن سکتے ان آوازوں کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک کان سن لیتے ہیں۔ بہت ممکن ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ و سلم کے فضائل و کمالات کے دشمن یہ حدیث سن کر ضعیف و صحیح کا قصہ چھیڑ دیں۔ اور اپنے کمزور اور ضعیف بلکہ بالکل مردہ اور برائے نام ایمان کا مظاہرہ کرنے لگیں اس لئے آئیے پہلے قرآن سے آپ کو بتائیں کہ نبوت کے کان کیا شان رکھتے ہیں۔

قرآن کا ارشاد اور سلیمان علیہ السلام کا قصہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبردست حکومت اور وسیع سلطنت کو کون نہیں جانتا؟ سُبْحَانَ اللّٰہِ! جن تک آپ کے محکوم تھے اور ہوا بھی آپ کی خادم تھی۔ آپ کو جہاں جانا ہوتا۔ ہوا کو حکم دیتے وہ آپ کا تخت اڑا کر وہیں لے جاتی۔ اللہ اکبر! کیا شان ہے انبیاء کرام علیہم السلام کی۔ اور اے نبیوں کو اپنی مثل کہنے والو! ایک تم بھی ہو کہ تمہیں گدھا بھی اپنی پشت پر نہیں بیٹھنے دیتا۔ پھر کس منہ سے تم ان ارفع و اعلےٰ ہستیوں سے مماثلت

جزئیات میں داخل تھا اور ان میں سے کسی بات پر بھی قائم نہیں رہتے۔ ورنہ جو شخص کہے کہ رسول کی بات وحی نہیں وہ رسول کو پورا وحی کا پابند کیسے مان سکتا ہے اور جو اس کی بات کو وقتی کہے وہ یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اگر وہ قرآن کے مطابق ہو تو مان لی جائے کیا قرآن وقتی ہے اور جو آدمی علم رسول کو جزئیات سے جانتا ہو وہ روایت کے صحیح ہونے اور نہ ہونے کی بحث میں کب پڑتا ہے اس طرح جب کسی پہلو سے بھی بات نہیں بنتی تو اس الزام کو دوہرا دیا جاتا ہے کہ آپ کو منکر حدیث کہا جاتا ہے:

رسول کا آئینہ

"نبی اکرم کی سیرۃ مقدسہ کا آئینہ قرآن ہے"۔ ص ۳۸

اس ضابطہ کے صحیح ہونے پر کچھ سوچنے سے پہلے اس کے معقولات پر غور کیجئے جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں۔ اس میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جس انسان کو ایک حکم نامہ بھیجا ہو اس میں احکام کے ساتھ اس کے شخصی حالات کو بھی درج کیا جائے اس لئے کہ جس آدمی کے پاس حکم نامہ جاتا ہو اسے یہ بتانا کچھ ضروری نہیں ہوتا کہ تم فلاں ہو اور فلاں کے بیٹے ہو اور نہ فلاں جگہ رہتے ہو اور فلاں وقت پیدا ہوئے ہو۔ ایسی باتوں سے تو وہ خود واقف ہوتا ہی ہے اگر نہ ہو تو اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے کسی تعمیل کا اہل سمجھا جائے۔ قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی پیدائش اور پرورش کے اور حضرت یوسفؑ کے خوابوں کے واقعات تو بتائے گئے کہ ہم ان سے واقف نہ تھے مگر حضرت یوسف کو خدا کی طرف سے جو کتاب ملی ہوگی اس میں یہ بیان کہیں نہیں ہوگا کہ تمہیں بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تھا۔ اور

کا دم بھرتے ہو ۔ ؎

خدا کی شان تو دیکھو کہ کلچڑی گنجی !
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی !

تو حضرت سلیمان علیہ السلام ایک مرتبہ اپنے تخت عالی پر تشریف فرما تھے۔ اور جن و انس اور پرندے سب آپ کی بارگاہ میں حاضر تھے۔ اور یہ تخت بڑی شان و شوکت سے اڑ رہا تھا۔ اس شان و شوکت کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھا۔ تو آپ کے دل میں یہ[1] خیال آیا۔ کہ میری بڑی شان ہے۔ اس شان کا اس وقت کوئی دوسرا تو نہ ہوگا۔ علامہ عبدالرحمٰن صفوری علیہ الرحمۃ نزہۃ المجالس میں لکھتے ہیں۔ کہ اس خیال کے آتے ہی تخت کچھ ٹیڑھا ہو گیا ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھا تو جلال میں آکر تخت کو حکم دیا اِسْتَقِمْ اَیُّھَا الْعَرْش۔ "اے تخت سیدھا ہو" اسی وقت تخت سے یہ آواز آئی ۔ وَاسْتَقِمْ قَلْبَکَ ۔ "اور آپ بھی اپنے دل کو سیدھا کریں" یہ آواز سنتے ہی سلیمان علیہ السلام فوراً سجدہ میں گر گئے۔ اور خدا کی عظمت و بڑائی بیان کرنے لگے۔ میرے بھائیو! اللہ کے مقرب و مقبول بندوں کی یہ شان ہے۔ کہ ان کے دلوں میں اس قسم کا کوئی معمولی سا خیال بھی آجاتے۔ تو خداوند کریم فوراً ان کے صاف و شفاف آئینہ دل سے اس قسم کی معمولی سی گرد کو بھی جھاڑ دیتا ہے۔ اور کوئی دھبہ نہیں پڑنے دیتا۔ اور ایک ہم بھی ہیں۔ کہ دن میں ہزاروں اس قسم کے بلکہ اس سے بہت زیادہ اور کبر و غرور کے خیال آتے ہیں۔ اور یہاں کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ ایک سفید چادر پر معمولی سا بھی سیاہی کا دھبہ برا لگتا ہے۔ اور فوراً دھو لیا جاتا ہے۔ اور جو چادر خیر سے ہو ہی ساری کی ساری سیاہ اس پر پوری دوات بھی انڈیل دیجئے تو بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور آئینہ

حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک مرتبہ آئینہ دیکھا۔ اور جب اپنا بیمثل حسن و جمال ملاحظہ

[1] یہ خیال اپنے اللہ کے انعام و اکرام پر شکریہ کے طور پر آیا۔

نہیں ایک خواب بھی آیا تھا جس کا مطلب انہیں بابے نے بتایا تھا۔ اسی طرح وہ سب حالات جو آنجناب کو پیش آئے تھے انہیں اگر بیان کیا جاتا تو نہ وہ خود ان کے لئے مفید ہوتے اور نہ دوسرے لوگوں کے لئے۔ بلکہ دوسرے تو اس طرح کے واقعات کو سن کر اس خیال میں پڑ جاتے کہ یہ کتاب انکی اپنی تصنیف ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآنی آئینہ کے اس ملمع میں کتنی کچھ حقیقت ہے۔ اور پھر جس کتاب میں پیغمبر کے حالات کا درج ہونا کچھ معنے نہ رکھتا ہو۔ وہ بھلا اس کی سیرۃ کا آئینہ کیسے ہو سکتی ہے۔ اس بے حقیقت نعرہ میں عوام فریبی کا جو سامان ہے اس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں

اب ذرا قرآن کے اس آئینہ میں رسول کی شکل کو دیکھئے۔ نزول قرآن کے وقت لوگ جن بڑی بڑی برائیوں اور گمراہیوں میں مبتلا تھے انہیں قرآن میں ان سے منع کیا گیا یہاں اگر کسی بھی خارجی شہادت کو کام میں نہ لایا جائے تو اس کا مطلب ہو گا کہ پیغمبر بھی ان سب برائیوں میں لوگوں کے ساتھ برابر کا شریک تھا کیونکہ قرآن میں واضح ہے کہ وہ بھی انسانوں میں سے ایک انسان تھا۔ پھر جب اس کی طرف وحی بھیجی گئی تو اس نے قرآن سن کر جیسے جیسے لوگ برائیاں چھوڑتے گئے وہ بھی ان کے ساتھ نیک بنتا گیا اور جو دیوانی اور فوجداری پابندیاں اور سزائیں قرآن میں جاری کی گئیں ان کا تختۂ مشق پہلے اسی کو بننا پڑا۔ کیا خوب رہا سیرۃ رسول کا یہ آئینہ۔

پھر یہاں دیکھنا یہ ہے کہ ایسا آئینہ ہمیں کیا کردیگا ہمارے لئے اس میں جان کھپانا کیا ضروری ہے کہ سیرۃ نبوی کا کون سا واقعہ قرآن کے موافق ہے یا نہیں۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اسطرح غیر مسلموں کے ان اعتراضات سے بچا جاسکتا ہے جو وہ سیرۃ رسول کے خلاف کرتے ہیں۔ گویا اگر اعتراضات کا یہ مسئلہ موجود نہ ہو تو پھر خود ہمیں اپنے لئے سیرۃ رسول سے کوئی سروکار نہیں

فرمایا۔ تو دل میں اتنا خیال سا پیدا ہوا۔ کہ دنیا بھر کے خزانے بھی میرے حسن و جمال کی قیمت نہیں ہو سکتے۔ اس خیال کے آنے پر خدائے بے نیاز نے اپنی بے نیازی یوں دکھائی۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے سالارِ قافلہ کے ہاتھ حضرت کو معمولی قیمت پر بیچ دیا۔ چنانچہ قرآن میں ہے وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ۔ "یعنے بھائیوں نے انہیں چند کھوٹے اور گنتی کے روپوں پر بیچ دیا۔" اس کے بعد مصر کے بازار میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بیچنے کو سالارِ قافلہ نے ان لفظوں کے ساتھ اعلان کیا

مَنْ يَّشْتَرِيْ غُلَامًا حَسِيْنًا جَمِيْلًا لَيْسَ كَمِثْلِهٖ فِي الدُّنْيَا۔ یعنی کون خریدتا ہے ایک ایسے غلام کو جو بڑا حسین و جمیل ہے۔ جس کی مثال دنیا بھر میں نہیں "

یوسف علیہ السلام نے یہ اعلان سنا۔ تو آپ کو اپنا آئینے میں چہرہ دیکھ کر آنے والا خیال یاد آ گیا۔ اور آپ نے سالارِ قافلہ سے فرمایا۔ میرا اعلان ان لفظوں سے کرو۔

مَنْ يَّشْتَرِيْ غُلَامًا مَظْلُوْمًا غَرِيْبًا لَيْسَ كَمِثْلِهٖ فِي الدُّنْيَا "کون خریدتا ہے۔ ایک ایسے غلام کو جو بڑا مظلوم اور غریب ہے۔ جس کی مثال دنیا بھر میں نہیں "

بس حضرت کا یہ فرمانا اور آپ کی یہ تواضع اللہ کو پسند آ گئی۔ اور پھر جو عروج و وقار حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ نے عطا فرمایا۔ وہ آپ جانتے ہیں۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اللہ والوں کے دل میں کوئی معمولی سا بھی خیال آ جائے۔ تو اللہ تعالیٰ فوراً انہیں کسی آزمائش میں مبتلا فرما کر ان کے دلوں کو صاف فرما دیتا ہے۔

ہاں! تو میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی بات کر رہا تھا۔ کہ آپ ایک مرتبہ انسانوں۔ جنوں اور پرندوں کے زبردست لشکر کے ساتھ اپنے تخت پر تشریف فرما تھے۔ اور تخت اڑ رہا تھا۔ تو قرآن پاک فرمایا ہے۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا

ہوگا۔ یہ ہے سیرۃ رسول کا مصرف جس طرح قرآن کا مصرف یہ رہ گیا ہے کہ جہاں کہیں جھوٹی قسم اٹھانی ہو تو اس سے کام لیا جاتا ہے، اسی طرح سیرۃ رسول کا مصرف آپ کے ہاں یہ ہے کہ جب غیر مسلموں سے جھگڑا پڑے تو قرآن کی روشنی میں سیرۃ رسول کو پیش کر دیا جائے۔ بخلاف اس کے دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ سیرۃ رسول سے واقف ہونا مسلمان ہونے اور مسلمان رہنے کے لئے ضروری ہے۔ اور جس طرح آغاز امر میں قرآن کا رسول کے بغیر دستور زندگی بنا ممکن نہ تھا اسی طرح اب بھی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ قرآن میں آنحضور کے ان مٹ نقوش کو خدا نے جو ثبت فرمایا تو یہ اسی لئے تاکہ آپ مسلمانوں کے لئے اسوہ ہیں۔ نہ اس لئے کہ اس سے دشمنوں کی آنکھیں خیرہ ہوں۔ جس طرح پہلے انبیا کے اور خود اپنے ذاتی حالات سے آنحضور کو سبق دلایا گیا۔ اسی طرح دوسروں کے لئے بھی یہ سبق ضروری اور لازم ہے بلکہ دوسرے اس کے زیادہ محتاج ہیں۔ قرآن میں واضح ہے کہ آپ کو یتیم بنایا گیا تاکہ آپ یتیموں پر شفقت کریں اور غریب رکھا گیا تاکہ سائل اور محتاجوں کو نہ جھڑکیں اور غنی کیا گیا تاکہ خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کریں۔ اگر عملی نمونہ کا سبق زیادہ موثر نہ ہوتا تو آپ کو بجائے اپنے حالات سے سبق لینے کے یہ فرمایا جاتا کہ یتیموں اور غریبوں کو بھلائی سے پیش آیا کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض سیرۃ نبوی کو قرآن سے ہٹ کر لکھنے میں نہ تو کوئی معقولیت ہے اور نہ فائدہ اور نہ یہ کوئی کمال کا فن ہے۔ اگر اس سیرۃ کا مسلمان ہونے اور مسلمان رہنے سے کوئی تعلق نہ ہو تو قرآن کو چھوڑ کر اس کے شغل میں پڑے رہنے سے زیادہ نکما کام اور کوئی نہیں۔ اس میں اگر کوئی مفید پہلو ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ اس کے ذریعہ کامل انسان بنا جائے۔

مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (پ۱۹ع۱۷)

"یہاں تک کہ جب چیونٹیوں کی وادی پر آئے ایک چیونٹی بولی۔ اے چیونٹیو! اپنے گھروں میں چلی جاؤ۔ تمہیں کچل نہ ڈالیں سلیمان اور ان کے لشکر بے خبری میں!"

یعنے یہ تخت ایک ایسے مقام پر پہنچا۔ جہاں چیونٹیاں بہت کثرت سے تھیں ان چیونٹیوں کی ملکہ نے اپنی رعایا کو حکم دیا کہ سب اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ یہ لشکر تمہیں پیروں تلے مسل دے۔

ہمارے امام کی فقاہت

دوستو! اس موقعہ پر ہمارے امام۔ امام اعظم رضی اللہ عنہ کی فقاہت بھی سنتے چلئے۔ حضرت قتادہ کوفہ میں داخل ہوئے۔ اور کوفہ کی خلقت آپ کی گرویدہ ہوئی۔ تو آپ نے لوگوں سے کہا۔ جو چاہو مجھ سے پوچھو۔ میں جواب دوں گا۔ ہمارے امام نے ان سے دریافت کیا کہ فرمایئے! حضرت سلیمان علیہ السلام کے وادی النمل پر تشریف لانے پر جس چیونٹی نے سب چیونٹیوں کو اپنے اپنے بلوں میں داخل ہوجانے کا حکم دیا تھا۔ وہ چیونٹی نر تھی یا مادہ؟ حضرت قتادہ اس سوال پر خاموش ہو گئے۔ امام اعظم نے فرمایا۔ وہ مادہ تھی۔ قتادہ نے پوچھا؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ فرمایا! قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔ قَالَتْ نَمْلَةٌ۔ اگر نر ہوتی۔ تو یوں ارشاد ہوتا۔ قَالَ نَمْلَةٌ (خزائن العرفان) سبحان اللہ! اس سے ہمارے امام ہمام کی شانِ علم معلوم ہوتی ہے۔ تو وہ چیونٹی ان چیونٹیوں کی ملکہ تھی۔ اور اس نے حکم دیدیا۔ کہ سب چیونٹیاں اپنے اپنے بلوں میں گھس جائیں۔ اب آگے سنیئے۔ قرآن کیا فرماتا ہے۔ فرمایا:۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا "تو سلیمان علیہ السلام اس چیونٹی کی اس بات سے ہنس پڑے"

دیکھ لیجئے۔ حضرات! قرآن سے کس طرح صاف طور پر یہ بات ثابت ہو رہی ہے۔ کہ سلیمان علیہ السلام نے اس چیونٹی کی بات سن لی۔ اور ہنس پڑے مفسرین کرام علیہم الرحمۃ نے لکھا ہے۔ کہ سلیمان علیہ السلام نے اس چیونٹی کی یہ بات تین میل دور سے سن لی تھی۔ (خزائن العرفان) تو فرمایئے! آج

اور بس! یہ مقصد اگر سامنے نہ ہو تو پھر سیرۃ نبوی کا مقام یہ ٹھہرتا ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھے ہوں اور آپ کے سامنے عہد رسالت کے واقعات کو پیش کیا جائے تو آپ ان کے موافق قرآن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ دیدیں۔ اور اس طرح آپکو ان واقعات سے انکار نہ ہو۔ بشرطیکہ انہیں تاریخی واقعات کی بجائے دینی معلومات نہ سمجھا جائے۔ اور بھی بے شک ان سے شاہنامہ اور سکندر نامہ کی طرح دل بہلایا جائے۔ اس سے آگے یہ مت پوچھیئے کہ اگر مسلمانوں کے ہاں سیرۃ رسول کا بھی یہی مقام ہو تو پھر ایک غیر مسلم اسے اس سے زیادہ کیا سمجھتا ہے۔ کیا معلوم وہ اسے تاریخ کی بجائے کوئی گھٹیا یا بعض سمجھتا ہو۔

خدا کے فیصلوں کو دبانا

"یوں سمجھیئے کہ خدا نے انبیاء کو بذریعہ وحی دیا۔ لیکن بعد میں علماء نے سوچا کہ خدا کا یہ فیصلہ معاذ اللہ درست نہیں۔ لہذا اس وحی کو دبا لینا ہی بہتر ہے" (ص ۱۶)

انسان کے اندر یہ ایک خاص کمزوری ہے کہ وہ جب دوسروں کو طعنہ کا نشانہ بناتا ہے تو اپنے آپ کو بالکل بھول جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے وہ جاگیر دار اور خان بہادر لوگ جو جنگ عظیم میں انگریزوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑکر بغداد اور بصرہ تک کو فتح کرنے میں بہادری کے جوہر دکھا کر اس کے صلہ میں اب بھی قوم کی زمین کے ایک بڑے حصہ کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ وہ بھی یہ کہنے سے باز نہیں رہتے کہ یزید بڑا ظالم تھا۔ پرویز صاحب

ہم میں سے کس کے ایسے کان ہیں کہ تین میل دُور سے نہ سہی ۔ چیونٹی کے منہ سے لگ کر بھی اس کی بات سُن سکیں ؟

سُلیمان علیہ السلام اور چیونٹی کا پُرلطف مکالمہ

علامہ عبدالرحمٰن صفوری نے نزہتہ المجالس ص۲۰۵ جلد۱ میں سلیمان علیہ السلام اور اس چیونٹی کا پر لُطف مکالمہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس چیونٹیوں کی ملکہ سے سلام فرمایا۔ تو اس ملکہ نے سلام کا جواب عرض کیا۔ اور پھر کہا " حضور! آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ ہی صاحبِ امر و نہی اور مالکِ تخت و تاج ہیں ۔ میں ایک ضعیف چیونٹی ہوں۔ مگر خدائے بزرگ و برتر نے میرے ماتحت بھی چالیس سپہ سالار کر رکھے ہیں ۔ اور ہر سپہ سالار کے ماتحت چالیس چالیس ہزار چیونٹیوں کی بے حد طویل صفیں ہیں ۔ ان سب پر میں حاکم ہوں" سلیمان علیہ السلام نے فرمایا " اچھا اے ملکہ! یہ تو بتا کہ تمہارا لباس سیاہ کیوں ہے ؟" وہ بولی! حضور! دنیا مصیبتوں کا گھر ہے ۔ اور دنیا والے اہل مصائب ، اور اہل مصائب کا لباس اسی رنگ کا ہوتا ہے ۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا ۔ اچھا اب یہ بتاؤ ۔ کہ " تمہارے جسم کے وسط میں یہ گہرائی کیوں ہے ؟" اس نے عرض کیا ۔ عالیجاہا ! یہ بندگی کا پٹکا ہے ۔ خدا کی اطاعت و عبادت کے لئے میں نے کمر کس رکھی ہے ۔ سلیمان علیہ السّلام نے پھر پوچھا " اور تم مخلوق سے دور کیوں رہتی ہو ۔ اور یہ باہر جنگل میں ڈیرا کیوں لگا رکھا ہے ؟ وہ بولی اے اللہ کے رسول ! سلام ہو تم پر ! دنیا والے خدا سے غافل ہیں ۔ اور غافلوں سے دوری ہی اچھی ہے ۔ سلیمان علیہ السلام نے پھر پوچھا ۔ اور یہ تو بتاؤ کہ تم ننگی کیوں رہتی ہو ؟ اس نے جواب دیا ۔ حضور ! اس لئے کہ دنیا میں آئے بھی ننگے اور جانا بھی ننگے ہی ہے ۔ پھر تھوڑی سی مدت کے لئے لباس کی کیا ضرورت ؟ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تم اپنے کھانے کے لئے کس قدر بوجھ اٹھا لیتی ہو ؟ وہ بولی ! زیادہ سے زیادہ ایک دانۂ گندم ۔ فرمایا ۔ اتنا کم ؟ بولی قبلہ ! اس لئے کہ میں مسافر ہوں ۔ اور مسافر کے لئے جتنا بوجھ کم ہو بہتر ہے ۔ سلیمان علیہ السلام نے پوچھا ۔ تمہارا

کہتے ہیں کہ مسیحی علماء نے خدا کی وحی کو دبا لیا۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ خود آپ کا اپنا شغل سوائے اس کے اور کیا ہے کہ وحی کو دبایا جائے اور کہا جائے کہ وہ سرے سے تھی ہی نہیں۔ آپ کے ایسے کارناموں کی فہرست اتنی بڑی ہے کہ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ نمونہ کے طور پر چند ایک کا تعارف کافی ہوگا۔

(۱) سب سے پہلے اطاعت رسول کے مسئلہ کو لیجئے! آپ کو خیال گذرا کہ حدیث رسول پر غیر مسلموں کی طرف سے اعتراض ہونے کا اندیشہ ہے نیز وہ قرآن کی طرح محفوظ بھی نہیں اور نہ رسول کے اندر خدائی خصوصیات کا کوئی عنصر تھا کہ اس کی بات کو غیر معمولی اہمیت دی جائے اس لئے قرآن کے اندر جو اطاعت رسول کا بار بار حکم دیا گیا اور اس کی ہر بات کو وحی کا نام دیا گیا۔ تو اس بارہ میں شاید معاذ اللہ اللہ میاں کو غلطی لگ گئی ہے اس لئے وحی کے اس حصہ کو دبا لینا ہی بہتر ہے

(۲) ڈارون کے الہام کو ماننے والے لوگوں نے جب ظاہر کیا کہ حضرت انسان کے آباؤ اجداد بندر تھے تو پرویز صاحب کو خیال آیا کہ قرآن میں جو اللہ میاں نے آدم کو انسان اور سب انسانوں کا باپ ٹھیرایا یہ ٹھیک نہیں۔ لہٰذا وحی اس فیصلہ کو دبا لینا ہی بہتر ہے۔

(۳) مغربی جمہوریتوں نے جو عورت کے حال زار پر خصوصی توجہ دے کر اسے مرد کے مقام پر لانا چاہا تو پرویز صاحب نے سمجھا کہ قرآن میں جو مرد کو چار بیویاں کرنے اور انہیں طلاق دینے کی اجازت دی گئی ہے اور مرد سے عورت کا نصف حصہ ٹھیرایا گیا تو یہ عورت کی جان ناتواں پر صریح ظلم ہے۔ لہٰذا قرآن کے اس فیصلہ کو دبا لینا ہی بہتر ہے۔

(۴) مارکس کے دین میں جب زمینداری اور انفرادی ملکیت کی بیخ کا مسئلہ نکلا تو آپ نے سوچا کہ شاید قرآن میں جو زمینوں کی ملکیت

نام ؟ بولی ہندی کا نام مُنْذِرَۃٌ ہے - یعنی ڈرانے والی — اُنْذِرُ اَصْحَابِی عَنِ الدُّنْیَا السَّاحِرَۃِ وَاُرَغِّبُھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ — میں اپنے ملنے والوں کو اس جادوگر دنیا سے ڈراتی اور آخرت کی رغبت دلاتی ہوں"

کیوں بھائیو! اے ترقی یافتہ لوگو! اے اپنی سائنس پر ناز کرنے والے جنٹلمینو! ہے کوئی تم میں سے ایسا جس کے کان چیونٹی کی باتیں سن سکیں۔ اگر ہے تو دکھاؤ۔ ورنہ اس بات پر ایمان لاؤ۔ کہ جن باتوں کو ہمارے کان نہیں سن سکتے۔ ان کو نبی کے کان سن لیتے ہیں۔ اور بھائیو! یہ تو سلیمان علیہ السلام کے کان ہیں اور ہمارے حضور تو سلیمان کے بھی سردار ہیں (علیہم السلام) پھر حضور کے اس ارشاد میں کسی کو شبہ کیوں ہو کہ اَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ — میں وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے" بیشک، بیشک یا رسول اللہ! آپ سنتے ہیں۔ پاکستان کی سنتے ہیں۔ ہندوستان کی سنتے ہیں۔ زمین و آسمان کی سنتے ہیں۔ بلکہ ہر دو جہان کی سنتے ہیں ؎

دور و نزدیک کے سننے والے وہ کان
کانِ لعلِ کرامت پہ لاکھوں سلام

حدیث کا ارشاد

لیجئے لگے ہاتھوں ایک حدیث اور بھی سن لیجئے۔ طبرانی شریف کی حدیث ہے۔ حضرت ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:-

بَاتَ عِنْدِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فَقَامَ لِیَتَوَضَّأَ لِلصَّلٰوۃِ فَسَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ فِیْ مُتَوَضَّئِہٖ بِاللَّیْلِ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ نُصِرْتَ نُصِرْتَ نُصِرْتَ — حضور صلے اللہ علیہ و سلم ایک رات میرے ہاں سوئے۔ آپ نماز تہجد کے لئے اٹھے اور مقام وضو پر بیٹھے۔ تو میں نے سنا کہ آپ نے کسی سے جیسے کوئی پاس ہوتا ہے۔ تین بار فرمایا۔ لبیک! لبیک!! لبیک!!! اور نُصِرْتَ نُصِرْتَ نُصِرْتَ۔ یعنی حاضر ہوں، حاضر ہوں، حاضر ہوں۔ تم مدد کئے گئے۔ مدد کئے گئے۔ مدد کئے گئے۔

اور انفرادی لین کی اجازت ہے۔ اور اس لین دین کے ضوابط و احکام اور ملکیت کو چرانے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا موجود ہے تو یہ ٹھیک نہیں اس لئے ایسی وحی کو دبا ہی لینا بہتر ہے نہ ملکیت ہونی چاہیے اور نہ اس ملکیت میں وراثت جاری ہونی چاہیے اور نہ ہی اس ملکیت کی چوری میں کسی کے ہاتھ کاٹے جائیں۔

اسی طرح اور بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن میں پرویز صاحب کو خدا کی وحی کے دبا لینے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ اور یہ حال جب اپنا ہے تو پھر بیچارے علماء کے خلاف آپ کا غصہ میں آنا بالکل بلا وجہ ہے۔

روایت حدیث کا منظر

"ہم روایات کو دینی حجت تسلیم نہیں کرتے۔ دین کا مرکز فقط قرآن ہے۔"

نکتہ:

ان ھذا الا سحر یوثر ان ھذا الا قول البشر۔ یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک جھوٹ ہے۔ جو دوسروں سے سنکر نقل کر دیا جاتا ہے۔ بہر حال یہ کچھ بھی نہیں مگر انسانی کلام ہے۔ اور بس۔ ص ۲۲۷

روایت کو اور خاصکر روایت حدیث کو حجت اور دلیل نہ ماننا عجیب معنی رکھتا ہے۔ ایک طرف ایسا کہنے والا احادیث رسول کے ادب و احترام میں بھی کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔ اور دوسری طرف ایسا کہہ کر وہ حدیث کے پورے ذخیرہ کو بالکل جھوٹ اور باطل بھی ٹھیرا سکتا ہے اور پھر حدیث کو حجت نہ ماننے کے بعد اس کا مصرف یہی رہ جاتا ہے کہ خوب دل کھول کر اس کا مخول کیا جائے اور عوام کو بتایا جائے کہ حدیثیں بیان کرنے اور سننے

ام المومنین فرماتی ہیں۔ میں نے حضور سے دریافت کیا۔ حضور! آپ یہ کسے فرما رہے تھے۔ یہاں تو کوئی نہ تھا۔ تو حضور نے جواب میں فرمایا:۔
هٰذَا رَاجِزُ بَنِیْ کَعْبٍ وَهُمْ بَطْنٌ مِنْ خَزَاعَةَ یَسْتَصْرِخُنِیْ وَیَزْعَمُ اِنَّ قُرَیْشًا اَعَانَتْ عَلَیْهِمْ بَنِیْ بَکْرٍ ۔۔ یہ بنی کعب کا راجز (جو اس وقت مکہ میں تھے۔ اور حضور یہاں مدینہ منورہ میں) مجھ سے فریاد کر رہا ہے۔ کہ قریش عہد کو توڑ کر بنی بکر کی مدد کر کے ہم کو قتل و غارت کرنے پر آمادہ ہیں۔ اور میں اسے لبیک کہہ رہا تھا۔ (طبرانی شریف ص۲۰۱)

گویا مظلوم مکہ معظمہ میں حضور سے فریاد کر رہا ہے اور حضور مدینہ منورہ میں اس کی آواز سن کر لبیک فرما رہے ہیں۔ تو دوستو! پھر ہم کیوں نہ کہیں کہ ؎

فریادِ امتی جو کرے حالِ زار کی!
ممکن نہیں کہ خیرِ بشر کو خبر نہ ہو

اور کیوں نہ مل کر اس شعر کا ورد کریں ؎

دور و نزدیک کے سننے والے وہ کان!
کانِ لعلِ کرامت پہ لاکھوں سلام

برکاتِ نامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

میرے بزرگو اور دوستو! اس نامِ پاک کا معنے تو آپ سن چکے۔ اب آیئے اس نامِ پاک کے فیوض و برکات سنئے۔ یہ واقعہ اور حقیقت ہے کہ دنیا و ما فیہا۔ عرش و فرش۔ جنان و ما فی الجنان اور زمین و آسمان کا قیام و بقا اسی نام پاک کی بدولت ہے ؎

نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے

آدم علیہ السلام کی توبہ اسی نام کے صدقہ میں قبول ہوئی۔ نوح علیہ السلام کی کشتی اتنے بڑے طوفان میں اسی نام کی برکت سے محفوظ رہی ؎

والے اصحابہ رسول اور ان کے شاگرد اور آئمہ و محدثین اور فقہا و مجتہدین امت سب کے سب اس قدر بے وقوف اور احمق تھے کہ ان کے طریق روایت پر غور کرنے والا انہیں چڑی چڑا کی کہانی گھڑنے والے انسان سے بھی زیادہ احمق سمجھے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ چڑی چڑا کی کہانی کا مصنف اپنی واہی فضولیات کو دین کے علم کے طور پر کبھی پیش نہیں کرتا مگر وہ ایمان و عقل کے دشمن اپنی خرافات کو دین کے نام سے پیش کرتے رہے اور سننے والے بھی عقل کے اندھے ہو کر ان پر اعتماد و یقین کرتے رہے غور تو کیجئے کہاں ایک بات کا حجت نہ ہونا اور کہاں اس کا ہنسی مخول کا سامان ہونا کیا ایک آدمی کو ضمانت کے قابل اگر نہ سمجھا جائے تو پھر یہ بھی لازم ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے خاندان کو بازاری غنڈوں کا نام دیکر ان کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں تشہیر کیجائے اور ظاہر یہ کیا جائے کہ ہم اسے قابل ضمانت نہیں سمجھتے۔

جہاں ایک بات کو بیان کرنے والے کئی لوگ ہوں اور جس کی بات ہو وہ آدمی زندہ ہو تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک یہ کہ جس آدمی کی بات ہو وہ بھی ان سب بیان کرنے والوں کی تصدیق کر دے۔ اس صورت میں ان کی بیان شدہ بات یقینی ہو جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ ان کے بیان جھٹلا دے۔ ایسی صورت میں دیکھنا یہ ہوگا کہ دونوں فریق میں سے قابل اعتماد کون ہے۔ اور اگر دونوں

ص[1] حدیث کی صورت یہ ہے۔ کہ زید نے کہا میں نے سنا عمر سے اس نے سنا بکر سے اس سے بیان کیا تھا۔ خالد نے اس سے بتایا تھا۔ اصغر نے اس سے سنا تھا اکبر سے۔ ایسا بیان روایت در روایت در روایت نہ علم ہے نہ شہادۃ اور نہ دنیا کی کسی عدالت میں قابل سماعت ہے۔ (مقام حدیث) ص۱۷

اگر نامِ محمد را نیاوردے شفیع آدم!
نہ آدم یافتے توبہ نہ نوح از غرق نجیناً

گناہوں کو مٹانے والا

حضرت علامہ نبہانی علیہ الرحمۃ نے حجۃ اللہ علے العالمین میں یہ روایت درج فرمائی ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا۔ جس نے دو سو سال خدا کی نافرمانی کی۔ وہ مر گیا تو لوگوں نے اس کی لاش کو روڑی (گندی جگہ) پر پھینک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے موسےٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم اُسے وہاں سے اٹھا کر با عزت دفناؤ۔ اور اس کے لئے ہم سے دعائے مغفرت کرو۔ موسےٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ لوگ تو اس کے گنہ گار اور نافرمان ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ ارشاد ہوا۔ کہ ٹھیک ہے وہ واقعی گنہ گار اور نافرمان تھا۔

اِلَّا اِنَّہٗ کَانَ کُلَّمَا نَشَرَ التَّوْرٰۃَ وَ نَظَرَ اِلٰی اِسْمِ مُحَمَّدٍ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) قَبَّلَہٗ وَ وَضَعَہٗ عَلٰی عَیْنَیْہِ وَ صَلّٰی عَلَیْہِ فَشَکَرْتُ لَہٗ ذٰلِکَ وَ غَفَرْتُ ذُنُوْبَہٗ۔ (حجۃ اللہ علے العالمین ص۱۲۴)

"مگر وہ جب تورات کھولتا اور میرے محبوب محمد کا نام دیکھتا تو وہ اس نام کو چومتا اور اپنی آنکھوں پر لگاتا تھا۔ اس لئے مجھے وہ پیارا لگتا ہے۔ میں نے اس کے دو سو سال کے گناہ بخش دیئے۔"

جہنم سے بچانے والا

دلائل النبوۃ میں یہ حدیث مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ لَا اُعَذِّبُ اَحَدًا تَسَمّٰی بِاِسْمِکَ فِی النَّارِ۔

"مجھے میری عزت و جلال کی قسم! جس شخص کا نام محمد ہوگا اُسے کبھی جہنم میں نہ ڈالوں گا۔"

دیکھا مسلمانو! ہمارے آقا کا پیارا نام کس قدر مفید و نافع، اور بلاؤں کا دافع ہے۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے ؎

اے صلِّ علیٰ نام ہے کیا نام محمدؐ

فریق ایک ہی جیسے ہوں تو پھر دیکھنا ہو گا کہ ان دونوں کے بیان کے اغراض و مقاصد کیا ہیں جس کے تحت وہ ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہیں۔ ان سارے پہلوؤں کو اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد یہ فیصلہ معقول ہوتا ہے کہ جو بیان کرنے والے ہیں وہ سچے ہیں یا جس کے متعلق وہ بیان کر رہے ہیں وہ سچا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ دونو فریق زندہ ہوں لیکن اگر وہ آدمی زندہ نہ ہو جس کی بات کو ایک یا چند انسان بتا رہے ہوں۔ تو پھر اس کی تحقیق کے لئے وہ زیادہ سے زیادہ قابل اعتماد ذریعہ کام میں لایا جاتا ہے جو حالات کے لحاظ سے میسر ہونا ممکن ہو۔ اور اسی کے مطابق فیصلہ چکایا جاتا ہے۔ اس کے ثبوت میں اسلام کے چار بڑے بڑے اہم قانونی مسائل کو لایا جا سکتا ہے جن میں سے ہر ایک مسئلہ بجائے خود انسانی معاشرہ کا بنیادی مسئلہ ہے۔

پہلا مسئلہ قصاص و خون بہا کا ہے۔ جب ایک انسان قتل ہو جاتا ہے اور اس کے لئے اس کے قاتل کی جان یا مال سے بدلہ چکایا جاتا ہے تو صرف واقعہ قتل کی شہادت دینے والوں کے بیان پر فیصلہ کا دارومدار ہوتا ہے۔ خواہ وہ سچے ہوں یا جھوٹے۔ کیونکہ اس سے زیادہ اور کچھ بھی ممکن نہیں ہوتا۔ ان کی شہادت سے مقتول کو تو کچھ فائدہ پہنچتا نہیں مگر قاتل ملزم کی جان جاتی ہے۔

دوسرا مسئلہ میت کے قرضہ کا ہے۔ اس میں قرض خواہوں کے گواہوں کے بیان پر اوران کے نہ ہونے پر خود ان کے اپنے بیان پر انہیں قرضہ کا مستحق بنایا جاتا ہے۔ خواہ وہ سچے ہوں یا جھوٹے۔

تیسرا مسئلہ وصیت کا ہے۔ جب ایک آدمی مرتے دم وصیت کر جائے تو جس کے حق میں کرے۔ اس کے گواہوں کے بیان پر اور اگر وہ نہ ہوں تو خود اس کے اپنے بیان پر اسے مال وصیت کا مالک بنایا جاتا ہے۔

گرتوں کو یہ لیتا ہے بچا نام محمدؐ
یہ نام کوئی کام بگڑنے نہیں دیتا
بگڑی کو بھی لیتا ہے بنا نامِ محمدؐ

وہ جن کا یہ نام ہے

میرے بھائیو! مقامِ غور ہے کہ یہ تو اس نام کا فیض و کمال ہے۔ کہ یہ دو سو سال کے گناہوں کو مٹا دے۔ جہنم سے بچالے۔ تو وہ جن کا یہ نام ہے۔ وہ خود کس قدر فیوض و برکات کے مالک ہوں گے۔ جب نام اتنا رافع و نافع ہے۔ تو نام والا کیوں نہ رافع و نافع و شافع ہوگا؟ خوب فرمایا اعلیحضرت نے۔ ؎

رو تی آنکھ ہنساتے یہ ہیں — جلتی آگ بجھاتے یہ ہیں
ہلتی نیویں جماتے یہ ہیں — چھوٹی نبضیں چلاتے یہ ہیں
رافع نافع، دافع شافع — کیا کیا رحمت لاتے یہ ہیں

جامع کمالات

بزرگو! تقریر سابق سے روز روشن کی طرح واضح ہوگیا۔ کہ "محمدؐ" کہتے ہی اسے ہیں۔ جو بے عیب ہو۔ اور جامع کمالات ہو۔ پھر وہ لوگ جو حضور کو محمد بھی کہتے ہیں۔ اور معاذ اللہ حضور کے علم میں آپ کے اختیار میں، آپ کے تصرفات و دیگر کمالات میں عیب بھی بیان کرتے ہیں۔ کس قدر جاہل اور گمراہ ہیں۔ ان لوگوں کو چاہیئے۔ کہ یا تو حضور کو محمدؐ کہنا چھوڑ دیں یا پھر حضور کے جملہ کمالات کو بھی مانیں۔

لطیفہ

کہتے ہیں۔ رمضان کی تیسویں تھی۔ اور شام کے وقت مرد عورتیں سب اپنے اپنے چھتوں پر عید کا چاند دیکھ رہے تھے۔ ایک عورت اپنے چھوٹے بچے کو پاخانہ کرا رہی تھی۔ کہ ایک دم شور اٹھا کہ چاند ہوگیا۔ چاند ہوگیا۔ یہ عورت چاند دیکھنے کی خاطر جلدی میں اٹھی۔ اور اسی افراتفری کے عالم میں بچے کی پیٹھ صاف کرتے ہوئے اس کی انگلی کو نجاست لگ گئی۔ کوٹھے پر گئی اور عورتوں

چوتھا مسئلہ وراثت کا ہے۔ اگر ایک آدمی مر جائے تو اس کے وارثوں کے گواہوں کے یا خود ان کے اپنے بیان پر انہیں اس کے ترکہ کا مالک بنایا جاتا ہے۔ ان چاروں مواقع پر میّت کا اپنا بیان لینا ممکن نہیں ہوتا۔

ان چاروں مسائل میں معاملہ کی اصل صورت واضح کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کو کام میں لایا جاتا ہے۔ اور اس کے بغیر فیصلہ کرنے میں جلدی نہیں کیجاتی۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ چونکہ مرنے والا انسان خود قبر سے باہر آ کر اپنے معاملہ کو بیان کرنے کے حال میں نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ کہکر مقدمہ کو داخل دفتر کر دیا جائے کہ ہم روایات کو دینی حجت نہیں مانتے اور ایسا کرنا قرآن کے خلاف ہوتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر عقل عامہ بھی ایسا کہنے میں مانع ہوتی ہے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص قتل یا قرضہ اور وصیت یا وراثت کی شہادت دے اور کہے کہ میرے سامنے فلاں آدمی قتل ہوا۔ یا اس نے قرضہ دیا اور وصیّت کی تو یہ ضرور مان لیا جائے لیکن اگر وہ کہے میرے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں حکم فرمایا۔ یا۔ فلاں کام کیا تو یہ نہ مانا جائے۔ اس لئے کہ ہم روایات کو یا روایات رسول کو دینی حجت نہیں مانتے۔ اسے کہتے ہیں اندھیر گردی۔

قرآن میں یہ بھی واضح ہے کہ جہاں ایک مسافر آدمی مر رہا ہو اور وہ کسی کے حق میں وصیّت کرنے تو اسے دو مسلمان گواہ بنانے چاہئیں۔ اور اگر یہ نہ ہوں تو غیر مسلم ہی سہی۔ یہ ہوئی روایت۔ پھر جب وہ آکر وصیّت کا نقشہ بیان کریں تو ان سے نماز کے بعد[1] قسم لینی چاہیئے۔ کہ وہ جھوٹ نہیں کہیں گے۔ مگر جب بیان کریں اور

---

[1] پرویز صاحب کہتے ہیں کہ نماز کے معنی ہیں۔ خدا کے قانون کے پیچھے چلنا۔
"اقامۃ الصلوٰۃ۔۔ یعنی وہ طریق عمل جس سے انسان خدا کے قانون کے پیچھے پیچھے

کی عادت کے مطابق اپنی وہی نجاست آلود انگلی ناک پر رکھ کر چاند دیکھنے لگی۔ اُدھر چاند نظر آیا۔ اور ادھر اس کی نجاست آلود انگلی سے اس کی ناک میں بدبو پہنچی۔ تو حیران رہ کر اپنی ساتھ والی عورتوں سے کہنے لگی۔ "بہنو! چاند تو واقعی ہو گیا۔ مگر یہ کیا بات کہ اس سال کا چاند ہے بڑا سڑا ہوا۔ کہ اس سے بڑی بدبو آرہی ہے۔ اُن عورتوں نے جب یہ بات سُنی۔ تو غور سے دیکھ کر کہنے لگیں۔ بے وقوف! چاند اور بدبو؟ یہ کب ممکن ہے۔ یہ دیکھ تیری اپنی ہی انگلی نجاست آلود ہے۔

تو میرے بھائیو! "محمد" اور علم نہ ہو؟ "محمد" اور اختیار نہ ہو؟ "محمد" اور تصرف فی الکون نہ ہو؟ "محمد" اور جمیع کمالات نہ ہوں؟ یہ کب ممکن ہے۔ اے بدبخت منکرو! خود اپنے نجاست آلود ایمانوں کو دیکھو کہ خود تمہارے ایمان ہی نجاست آلود ہیں۔ پڑھیئے درود شریف۔

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللہ!
اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا حَبِیْبَ اللہ!

رَسُوْلُ اللہ

اسم پاک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بیان ختم ہوا۔ اب آیئے "رسول اللہ" کے متعلق کچھ عرض کروں تو سنیئے! اس آیت شریفہ میں اللہ نے اپنے محبوب کی رسالت کا ڈنکا بجایا ہے۔ اور فرمایا ہے "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ"۔ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش پیغمبر تشریف لائے۔ اور سب نے یہی اعلان کیا کہ اللہ ایک ہے۔ مگر آہ! دنیا نے کما حقہٗ خدا کی ہستی و وحدانیت کو تسلیم نہ کیا۔ حتیٰ کہ خدا نے اپنے آخری پیغمبر "محمد رسول اللہ" کو مبعوث فرمایا۔ اور فرمایا اے پیارے! ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں آئے۔ اور سب نے یہی درس دیا۔ کہ اللہ ایک ہے۔ مگر ان لوگوں نے میری توحید کو تسلیم نہیں کیا۔ (الا ماشاء اللہ) پیارے محبوب! اب تو اپنی زبان سے میری توحید کا اعلان کر اور قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ۔ کہہ

معاملہ کا فریق اسے تسلیم نہ کرے تو وہ خود گواہ لائے جو دلائل کے ساتھ اور اپنی حلفیہ شہادت کی بنا پر ان کے بیان کو جھوٹا ثابت کرے۔ یہ ہوئی روایت در روایت در روایت اور اس سہ بارہ "در" روایت پر قرآن کریم میں وصیت کا فیصلہ چکانے کا حکم دیا گیا ہے کیا یہ اس لئے دیا گیا ہے کہ دنیا کی کسی بھی عدالت میں یہ طریقہ شہادت قابل سماعت نہیں۔ یا حدیث کے لئے ایسا ہونا جائز نہیں۔

قرآن کے اس بیان کو سمجھنے کے لئے فرض کیجئے کہ زید نے عمر کے حق میں وصیت کی اور اس پر خالد اور بکر کو گواہ بنایا۔ ان دونوں نے عمر کو بتایا کہ زید نے فلاں مال کی تمہارے حق میں وصیت کی ہے اس پر عمر کو ان دونوں کی دیانت کے بارہ میں شک گذرا۔ اور اس نے اپنی طرف سے دو اور واقف حال گواہوں کو کھڑا کر دیا جو اس کے رشتہ داروں میں سے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ زید کی موت پر کہیں بھی حاضر نہ تھے۔ انہیں عامر اور ناصر کہیئے۔ وہ بھی حلفیہ بیان کریں گے کہ زید نے عمر کے حق میں جو وصیت کی ہے اسے بیان کرنے میں بکر اور خالد نے جو کچھ کہا ہے وہ ہمیں درست معلوم نہیں ہوتا۔ لہذا ہم حلفاً بیان کرتے ہیں کہ وصیت کا مال اس سے زیادہ ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ ان دونوں کے دلائل کو معقول ماننے کے بعد ان کے بیان کے مطابق فیصلہ ہو گا۔ جیسے صادق آگے اس طرح بیان کرتا ہے۔

پیچھے جا رہا ہو"۔ نظام ربوبیت۔ صفحہ ۸۲

قرآن کے اس بیان میں جو گواہوں سے نماز کے بعد قسم لینے کا حکم ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جب وہ گواہ خدا کے قانون کے پیچھے جا چکیں تو اس کے بعد ان سے قسم لی جائے۔ اسی طرح قرآن میں ہے کہ نماز کے وقت وضو کر لیا کرو تو اس کا مطلب بھی یہ ہو گا جب قانون کے پیچھے چلنا ہو تو وضو سے ہونا ضروری ہے۔ ورنہ نہیں۔ *

دے۔ اللہ ایک ہے" تیرے اعلان سے ہی میری توحید کا پرچم لہرائے گا۔ چنانچہ حضور کے اعلان توحید سے یہ انقلاب نظر آیا کہ ع

اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا!

کے مطابق نہ صرف یہ کہ بت پرست بلکہ خود بت بھی۔ "اللہ ایک ہے" "اللہ ایک ہے" کا نعرہ لگانے لگے۔ تو اللہ تعالیٰ "قل ہو اللہ احد" کا حکم فرما کر گویا یوں فرما رہا ہے کہ پیارے تم کہو۔ "اَللّٰہُ اَحَدٌ" اللہ ایک ہے اور میں کہتا ہوں "محمد رسول اللہ" محمد اللہ کے رسول ہیں۔ تم میری توحید کا پرچم لہراؤ۔ اور میں تمہاری رسالت کا ڈنکا بجاتا ہوں۔ گویا تم میرے اور میں تمہارا۔ اسی لئے اعلیٰ حضرت نے لکھا ہے سہ

جنابِ الٰہی برائے محمد جنابِ محمدؐ برائے الٰہی

میرے بھائیو! دیکھا آپ نے اللہ کو اپنے محبوب سے کس قدر پیار ہے۔ اور کس طرح اپنی توحید کا اعلان اپنے محبوب کی زبان سے کرا رہا ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں۔ کہ توحید وہی توحید ہے۔ جو بزبانِ رسالت اور وسیلۂ رسول سے ہمیں ملی۔ اور وہ توحید جس میں رسالت کا دخل نہ ہو۔ شیطانی توحید ہے۔ ہم ایسی توحید کے قائل نہیں۔ معرفت الٰہی کی دولت ہمیں درِ رسالت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی در سے سب کچھ ملتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے "محمد رسول اللہ" کہہ کر حضور کی رسالت کا ڈنکا بجا کر پھر ہمیں اپنے اس رسول کا ہی دست نگر بنایا ہے۔ اور یوں حکم دیا ہے کہ:۔

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (پ۲۸ع۴)

جو کچھ رسول تمہیں عطا فرمائیں لے لو اور جس چیز سے روکیں رُک جاؤ۔"

گویا "محمد رسول اللہ" اللہ کی نعمتوں کے قاسم ہیں۔ اور حضور ہمیں دیتے ہیں اور ہم لیتے ہیں۔ خدا کی طرف سے جو کچھ ہمیں ملتا ہے اسی در سے، اور جو اس در سے محروم ہے۔ وہ پھر محروم ہی ہے۔ اُس کے لئے کچھ بھی نہیں سہ

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مَفَر مَقَر!

جو وہاں سے ہو یہیں آکے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

یمنؔ[1] نے عامر اور ناصر[2] سے سنا۔ انہیں عمر[3] نے بتایا کہ اس سے بکر۔ اور خالد[4] نے بیان کیا کہ انہیں زید نے اس بات پر گواہ ٹھہرایا کہ اس[5] نے عمر کے حق میں اس مال کی وصیت کی ہے جو اسے باقر[6] سے ملا تھا۔ صادق کہتا ہے کہ عامر اور ناصر نے خالد اور بکر کے خلاف بیانات جو دیئے تو انہیں کے مطابق فیصلہ چکایا گیا اگرچہ وہ وصیت کے موقعہ پر موجود نہ تھے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ صادق کے اس بیان کو کہانی کے طور پر مانا جائے تو مضائقہ نہیں کہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے مگر آگے کے لیئے اس طریق پر کسی اور کی شہادت قبول نہیں کی جا سکتی۔ ہم کہتے ہیں کہ یا تو سب کے بیان کو کہانی مانیں تاکہ سرے سے عدالتی نظام کا خاتمہ ہو اور یا پھر سب کے بیان کو دینی سند کے طور پر مانیں۔ یہ کیا ہے کہ آدھا تیتر، آدھا بٹیر۔ جسے جی میں آیا روایت کہہ دیا۔ اور جسے جی چاہا تاریخ کی قبر میں دفن کر دیا۔ یہ آخر کیسے معقول ہو سکتا ہے کہ زید سے سننے والے کے متعلق تو ہم فرض کر لیں کہ اس نے ٹھیک ٹھیک سنا اور یاد رکھا۔ مگر اس سے سننے والے نے آگے جس جس کو بھی بتایا وہ سب اندھے اور گونگے، بہرے ہوتے چلے گئے اور کوئی بھی ضبط میں نہ لا سکا

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں بیان شدہ وصیت کے اس طریقہ سے روایت حدیث کا وہ سلسلہ کچھ بھی مختلف نہیں جس کا چیراج پوری صاحب نے کتاب مقام حدیث میں مذاق اڑایا ہے اور اس سے ظاہر کیا ہے کہ محدثین پاگل تھے۔

اس کے بعد دوسری عبارت میں خط کشیدہ الفاظ جو ہیں وہ لفظ یؤثر کے معنی ہیں۔ جس کا مصدر اثارہ ہے۔ اثارہ کے معنی ہیں کسی دوسرے کی طرف سے بیان اور نقل کیا ہوا واقعہ۔ اور دین میں اسی طرح

منکرین حدیث

میرے بزرگو! اور عزیزو! اس آیت میں دیکھ لیجئے۔ خدا تعالیٰ نے کس شان سے اپنے محبوب کا نام لے کران کی رسالت کا اعلان فرمایا ہے۔ مگر اس ملحدانہ دور میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ جو "رسالت" کے منکر ہیں۔ اور قرآن کا لبادہ اوڑھ کر حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات با برکات اور آپ کے ارشادات سے برگشتہ کرنے کی ناپاک کوششوں میں ہیں۔ یہ لوگ "رسالت اور حدیث" کے خلاف منظم طور پر سازش کر رہے ہیں۔ مگر۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَ لَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ۝ (پ۲۸ ع۹) یہ لوگ اللہ کے نور کو، اپنے مونہوں سے بجھانا چاہتے ہیں۔ اور اللہ اپنے نور کا پورا کرنیوالا ہے۔ اگرچہ کافر برا منائیں"

اللہ تعالیٰ جب اپنے محبوب کی رسالت کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ تو یہ منکرینِ رسالت اور دشمنانِ حدیث بھلا خدا کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ ؎

عقل ہوتی تو خدا سے نہ لڑائی لیتے!
یہ گھٹائیں اُسے منظور بڑھانا تیرا

مسلمانو! ان لوگوں نے محض دھوکا دینے کے لئے اپنے آپ کو مسلمان مشہور کر رکھا ہے۔ حالانکہ جانِ اسلام اور روحِ ایمان یعنے رسالتِ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے دل میں وقار ہی نہیں۔ اور وہ حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھتے (معاذ اللہ) چنانچہ ان لوگوں نے صاف صاف یہ لکھ دیا ہے کہ:۔

"قرآن کی تشریح و توضیح کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے" (طلوع اسلام صفہ ۲۶ نومبر ۵۲ء)

دیکھا آپ نے! یہ "خارجی سہارے" سے ان کی کیا مراد ہے؟ اس سے مراد ان کی حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا ان کے لئے قرآن ہی بس ہے۔ اس کے بعد اب "رسول" کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ یہی قرآن

نقل شدہ واقعہ کو بھی دلیل اور حجت کا مقام دیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے۔

ائتونی بکتاب من قبل ھذا او اثارۃ من علم ان کنتم صدقین — میرے پاس اس قرآن سے پہلے کی کوئی کتاب یا علمی خبر لاؤ۔ اگر تم اپنے شرک میں سچے ہو۔

اس آیت میں قرآن سے پہلی کتابوں کے ساتھ علمی خبر کو بھی حجت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اور نہ صرف تسلیم ہی کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا تقاضا بھی کیا گیا ہے۔ حدیث کے خلاف پرویز صاحب کے دعوی کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ وہ صحیح نہیں۔ دوسرا یہ کہ اگر صحیح ہو بھی تو وہ چونکہ وحی نہیں۔ اس لئے حجت نہیں۔ اور وحی صرف قرآن ہے۔ اس آیت میں ان دونوں باتوں کو باطل ٹھیرایا گیا ہے۔ پہلی بات کو اس طرح رد کیا گیا کہ وہ لوگ جو قرآن کے ساتھ اس کے لانے والے کو بھی یکساں جھٹلاتے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ تم اپنے مذہبی معلومات کے ذخیرہ سے اپنے طریقہ کے حق ہونے میں کوئی سنی سنائی نقلی دلیل ہی لاؤ اور پھر ان کی دلیل اور جگہ جانچنے کے لیے (انہیں) کوئی معیار مہیا نہ کیا۔ ادھر پرویز صاحب کہتے ہیں۔ کہ راویان حدیث کے لئے جھوٹی حدیثیں گھڑ لینا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ مشرکین مکہ کے لئے ان کے اپنے معیار پر جھوٹی مذہبی روایتیں بنا لینا کیا مشکل تھا۔ جب خدا نے انہیں اسکی کھلی چھٹی دیدی کہ وہ اپنی صداقت پر جو دلیل چاہیں بنا لائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ روایت سازی کے مشکل و آسان ہونے کے علاوہ اس معاملہ میں کچھ اور قابل لحاظ معیار بھی ہوتا ہے۔ اور وہ ہے ذرائع خبر و اخبار اور نقل و انتقال کا عقلی بنیادوں کے مطابق ہونا۔ اور ان کے مطابق ہونے والے واقعہ کو ماننے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔

دوسری بات کو اس طرح باطل ٹھیرایا گیا ہے۔ کہ پہلی کتاب کے ساتھ اس کے علاوہ

ہمیں رسول کے دروازے پر لا رہا ہے۔ اور یہی قرآن ہمیں "اطاعتِ رسولؐ" کا درس دے رہا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے۔ کہ قرآن کی تعلیم پر بجز ارشادِ رسول کے عمل ہو ہی نہیں سکتا۔

نماز اور زکوٰۃ کا حکم

مثلاً نماز اور زکوٰۃ ہی کو لے لیجئے۔ قرآن فرماتا ہے:۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ۔

نماز قائم کرو۔ اور زکوٰۃ دو۔ اور رسول کی فرماں برداری کرو۔ (پ ۱۸ ع ۱۳)

دیکھ لیجئے! اجمالاً فرما دیا کہ نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو۔ مگر نماز کی ہیئت اور تفصیل؟ زکوٰۃ کی تفصیل و تشریح؟ یہ قرآن میں نہیں ہے۔ یہ تو فرما دیا کہ نماز پڑھو۔ مگر نماز میں کیا کیا پڑھیں؟ کس کس وقت پڑھیں؟ اور کس طرح پڑھیں! — زکوٰۃ کون دے، کون نہ دے؟ کب دے، کس کس چیز کی دے؟ اس کی تفصیل قرآن میں نہیں ہے۔ بھائیو! یہ سوچنے کی بات ہے، کہ اگر اللہ تعالیٰ نماز اور زکوٰۃ کی پوری پوری تفصیل بھی قرآن میں بیان کر دیتا۔ تو یہ قرآن بجائے تیس پاروں کے اگر اکتیس پارے بھی ہو جاتا تو کیا ہرج تھا؟ تفصیل تو سمجھ میں آجاتی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور ایسا کیوں نہیں کیا؟ صرف اس لئے کہ لوگ اس کے رسول سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔ بس اتنا فرما دیا کہ "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ" نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو"۔ اور جب ہم نے یہ سوال کیا کہ الٰہی نماز پڑھیں کیسے اور زکوٰۃ دیں کیسے؟ تو ساتھ ہی یہ فرما دیا وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ "اور رسول کی فرماں برداری کرو" گویا تفصیل درکار ہے۔ تو میرے رسول سے پوچھو۔ نماز و روزہ کا اجمالی حکم میں نے دے دیا۔ اور اس کی مکمل تفصیل و تشریح میرا رسول کرے گا۔

بھائیو! دیکھ لو۔ خود قرآن ہی کس واضح طریق پر اپنی تفصیل و تشریح کے لئے رسول کی ضرورت بیان کر رہا ہے۔ مگر یہ لوگ کس ناعاقبت اندیشی سے یوں کہہ رہے ہیں کہ ہمیں کسی "خارجی سہارے کی ضرورت نہیں"

ہاں صاحبو! آپ کو چونکہ اسلامی قیود و ضوابط اور شرعی پابندیوں

کوئی اور نقلی دلیل بھی لانے کو کہا گیا تو اس نقلی دلیل کو بھی کتاب کے ساتھ برابر کی حجت ٹھیرایا گیا۔ اور چونکہ دین کے اندر حجت کا مقام صرف وحی کو حاصل ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ وحی وہی نہیں جو صرف کتاب کے اندر ہے بلکہ اس سے خارج بھی ہے۔ جو انبیاء کی طرف سے بیان کی جاتی اور اسے دینی حجت نہ ماننا قرآن کے خلاف ہے۔"

قربانی قرآن اور آدم ؑ

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین

کہہ دے میری نماز اور میری قربانی حتیٰ کہ میری زندگی اور موت سب ایک اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے۔ ص ۱۵۴

اب اس مقام پر ذرا اس شان ارتقا کو بھی نظر میں لائیے۔ معراج انسانیت میں تو پرویز صاحب کے نزدیک رب اور رب العالمین کے معنی وہی عام فہم قسم کے تھے جو دوسروں کے ہاں مشہور ہیں۔ مگر بعد کو کچھ اور ہو گئے۔ جو یہ ہیں اور بالکل اسی آیت کے ہیں۔

"میری نماز اور میری قربانیاں میرا جینا مرنا سب اللہ رب العالمین یعنی اللہ کی ربوبیت العالمین کو عام کرنے کے لئے ہے۔" سلیم کے نام ص ۲۰

"اب خدا کا قانون ربوبیت جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔" نظام ربوبیت ص ۸۶

گویا معراج انسانیت میں مقصود بندگی و زندگی کا مقام خدا کی رضا کو حاصل بلا

ہی کی ضرورت نہیں۔ اس لئے آپ کو رسالت و ارشاداتِ رسالت کی بھی ضرورت نہیں۔کہ یہ ساری پابندیوں کی تفصیل تو حدیث ہی میں ہے۔ اور" اجمالِ قرآن" میں آپ اپنی من مانی کارروائیوں کی طفیل اپنے لئے جملہ چھپتی راہیں کھول سکتے ہیں۔ اور خود قرآن ہی کی زبان سے یہ سرٹیفیکیٹ حاصل کر سکتے ہیں۔کہ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا یعنے (ارشاداتِ نبویہ کو چھوڑ کر) قرآن کے ذریعہ خدا بہت سوں کو گمراہ بھی کر دیتا ہے۔

رسالت

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ اللہ نے اپنے محبوب کا نام لے کر آپ کی رسالت کا اعلان فرما دیا۔ اور یوں کہا۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔" محمد اللہ کے رسول ہیں"۔ میرے بزرگو! ہمارے آقا و مولے صلے اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں مبعوث ہوئے ہیں۔ اس وقت ساری دنیا میں شرک و کفر کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ لوگوں نے اپنے اللہ سے منہ موڑ کر اغیار سے رشتہ جوڑ رکھا تھا۔ بالخصوص ملک عرب میں شرک و ضلالت کا بڑا زور تھا۔ سینکڑوں ان کے معبود تھے۔ حتیٰ کہ استنجہ کے ڈھیلوں تک کو وہ پوج لیا کرتے تھے۔ کئی ایک بت تھے۔ جو انہوں نے بڑی بڑی محنتوں سے خود بناتے تھے۔ اور پھر ان کے آگے سجدے بھی کرتے تھے۔ اس قدر پستی و ذلت میں وہ لوگ گھر چکے تھے۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم تاجِ رسالت پہنے ہوئے جلوہ افروز ہوئے۔ اور اس شان سے کہ آپ کے تشریف لاتے ہی سارا جہانِ تاریک بقعۂ نور بن کر چمک اٹھا۔ بقول شاعر ؎

جہاں تاریک تھا ظلمت کدہ تھا سخت کالا تھا!
کوئی پردے سے کیا نکلا کہ گھر گھر میں اجالا تھا

حضور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس عالم میں جو اپنا قدم مبارک رکھا۔ تو دنیائے شرک و کفر اور عالم بت کدہ میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ حضور کی باطل شکن ندائے حق سے شیطان تھرا اٹھا۔ اور دنیائے بت پرستی لرز اٹھی ؎

"فصل لربک وانحر۔ لہٰذا اپنے پروردگار کے لئے نماز قائم کرو اور قربانی کرو۔"
"ھم الذین کفروا وصدوکم عن المسجد الحرام والھدی معکوفا ان یبلغ محلہ۔ اے پیروان دعوۃ ایمانی یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے انکار کی راہ اختیار کی اور تم کو عمرہ سے باز رکھنے کے لئے مسجد الحرام کے داخلہ سے روکا۔ اور نیز قربانی کے جانور کو اس کے خاص موقعہ پر پہنچنے سے باز رکھا۔" ص ۵۵۹

"قرآن کی رو سے قربانی کا مقام خانہ کعبہ بیت العتیق ہے"۔ ص ۳۶۹

"واتل علیھم نبا ابنی آدم بالحق۔ اذ قربا قربانا فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الاخر قال لاقتلنک قال انما یتقبل اللہ من المتقین۔ ان سے آدم کے دو بیٹوں کا تذکرہ حق کے ساتھ بیان کرو۔ جب انہوں نے اپنی اپنی قربانیاں پیش کیں جب ایک کی قربانی قبول کرلیگئی اور دوسرے کی قبول نہ کیگئی۔ جس کی قربانی قبول نہ کی گئی۔ اس نے دوسرے سے کہا میں یقیناً تمہیں قتل کردوں گا۔ دوسرے نے کہا میرے خلاف جذبہ انتقام کیسا؟ اللہ فقط متقیوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔" (ابلیس آدم) ص ۹۵

ان آیتوں میں نسک۔ نحر۔ ہدی۔ محل اور قربان کے الفاظ کے معنے قربانی کے ہیں۔ یہ ہیں بھی سب کی سب قرآن ہی کی آیتیں۔ اور انہیں کے اندر جو الفاظ وارد ہیں۔ انہیں کے معنی پرویز صاحب نے خود ہی قربانی کے کئے ہیں۔ مگر ایک مدت کے بعد

٭ تھا اور بعد میں یہ مقام مخلوق کی رضا کو مل گیا۔ اور آپ سے آپ مل گیا۔ اسی طرح معراج انسانیت میں لفظ "رب" خدا کا نام تھا اور نظام ربوبیت میں یہ خلق کے قانون کا نام ہوگیا۔ بالکل یہی حال اللہ خدا کے اسم ذاتی کا ہوا۔ اور وہ آئیڈیل اور تصور بن کر رہ گیا۔

تری آمد تھی کہ بیت اللہ مجرے کو جھکا!
تری ہیبت تھی کہ ہر بت تھرتھرا کر گر گیا

حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ:۔

يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ — (پ۳۰ ع۲۴)

اے کافرو! یہ جنہیں تم پوجتے ہو۔ میں ان کو نہیں پوجتا؟

یہ تمہارے معبود! لات و ہبل اور عزیٰ — نادانو! ان کے آگے کیوں جھکتے ہو۔ آؤ! میری سنو! اور ایک اللہ کو پوجو۔ کافرو! تم ایسے "خداؤں" کو مت پوجو! جنہیں خود تم نے بنایا۔ بلکہ آؤ اس خدا کو پوجو۔ جس خدا نے تم کو بنایا۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ۔ (پ۱ ع۳)

اے لوگو! تم اُس رب کی عبادت کرو۔ جس رب نے تمہیں بنایا۔

حضرات! ہمارے حضور کی یہ آوازِ رسالت زمین و آسمان میں گونج اٹھی اور سرزمینِ عرب میں اس آوازِ حق کا یہ اثر ہوا کہ ؎

وہ کڑکا تھا بجلی کا یا صوتِ ہادی!
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

بت پرست اپنے طلسم پاش پاش ہوتے دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ اور حضور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و سلم کے درپئے آزار ہو گئے۔ چنانچہ ان لات و عزیٰ کے پجاریوں نے جب دیکھا۔ کہ "محمد" (صلے اللہ علیہ و سلم) نے ہمارے "خداؤں" کو جھوٹا اور ہمیں کافر کہنا شروع کر دیا ہے۔

عزم واستقلال

تو ان لوگوں نے ایک میٹنگ کی۔ اور سب نے یہ مشورہ کیا۔ کہ چلو سارے مل کر محمد (صلے اللہ علیہ و سلم) کے چچا ابوطالب کے پاس چلیں۔ اور ابوطالب سے کہیں کہ وہ اپنے بھتیجے کو اس کام سے روکے۔

ابوطالب

دوستو! ہمارے حضور صلے اللہ علیہ و سلم اس وقت ابوطالب کے پاس ہی تھے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے والدین

آپ یہ بھی بھول گئے۔ کہ قربانی قرآن کا لفظ ہے۔ اور یہ بھی کہ اس کا مقام کعبہ ہے۔ پھر آپ نے کعبہ اور غیر کعبہ کی ہر قربانی کو ایک بیہودہ رسم کہہ کر اپنی روشن خیالی کا ثبوت دیا۔ اور نہ صرف اسی پر اکتفا کیا۔ بلکہ ہر قربانی کی اوسط قیمت کا تخمینہ لگایا۔ اور پھر ان سب کے مصارف کو ہر انسان کی طرف سے ایک ایک قربانی کے حساب سے جمع کر کے ظاہر کیا کہ اس طرح عید قربان کے موقع پر ہر سال مسلمان قوم کا مجموعی طور پر لکھو کھہا روپیہ کا نقصان ہوتا ہے مسئلہ قربانی کا یہ حال کر دینے کے بعد لطف یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی کہے کہ پرویز صاحب قربانی کے منکر ہیں تو اس کی بات کو معراج انسانیت کی ان عبارات سے رد کر کے کہا جا سکتا ہے کہ آپ نہ صرف قربانی کے قائل ہیں بلکہ اسے قرآن کا حکم سمجھتے ہیں

کتاب ابلیس و آدم میں جہاں پرویز صاحب واقعات آدم کو تمثیلی داستان کا نام دے کر حضرت آدم کے خلاف ناحق میں اپنے ہاتھ رنگ رہے تھے۔ وہاں ان کے بیٹوں کے واقعہ قربانی کی یہ آیت دیتے وقت آپ بالکل بھول گئے۔ کہ یہ قرآن ہی کی آیت ہے اور اس میں لفظ قربانی جس کلمہ کا ترجمہ ہے۔ وہ قرآن کا ہی لفظ ہے۔ پھر آپ یہ بھی بھول گئے۔ کہ آیت میں جو لفظ ابنا آدم ہے۔ وہ افسانہ اور جھوٹی کہانی کے لئے قطعاً

لے یہ ساری دنیا میں اپنے اپنے طور پر قربانیاں ایک رسم ہے اسی طرح حاجیوں کی وہ قربانیاں جو آجکل کرتے ہیں محض ایک رسم کی تکمیل رہ گئی ہے۔ ایک ایک حاجی پانچ پانچ سات سات دنبے انفرادی طور پر ذبح کر دیتا ہے "قرآنی فیصلے" ص ۵۶

یہ جو ہم بقر عید کے موقعہ پر شہر شہر اور قریہ قریہ گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں بکرے اور گائیں ذبح کرتے ہیں۔ یہ قرآن کے کس حکم کی تعمیل ہے۔ اور جواب یہ ہے کہ قرآن میں اس کے متعلق کوئی حکم نہیں۔ یہ ایک رسم ہے۔ "قرآنی فیصلے" ص ۵۷

کریمیں رضی اللہ عنہا چونکہ وصال فرما چکے تھے۔ اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ابوطالب کے پاس مقیم تھے۔ اور اس بات سے کوئی یہ نہ سمجھے۔ کہ ابوطالب نے حضور کو اپنے پاس رکھ کر حضور پر کوئی احسان کیا تھا۔ حاشا و کلاّ! ہمارے حضور پر بجز اللہ کے اور کسی کا احسان نہیں ہے۔ اور نہ ہی اللہ کو یہ بات منظور تھی۔ کہ کسی دوسرے کا اس کے محبوب پر کوئی احسان رہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت عرب کے غیر سرسبز علاقے میں ہوئی۔ تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے۔ کہ حضور جو اس قدر علوم و اسرار کے مالک ہیں۔ یہ تاثیر زمین کے باعث ہے۔

چنانچہ حضور کے لئے اللہ نے ایک ایسی زمین کا انتخاب فرمایا جس کے متعلق قرآن "بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ" فرماتا ہے۔ یعنی بالکل غیر آباد اور غیر سرسبز علاقہ تو حضور پر اس علاقہ کا کوئی احسان نہیں۔ بلکہ حضور ہی کا اس علاقہ پر بھی احسان ہے۔ کہ آپ کی بدولت یہ خطہ مبارک اور متبرک ہو گیا۔ بعض اوقات مجلس اور سوسائٹی کا بھی اثر ہوتا ہے۔ ایک شخص کراچی یا بمبئی سے آئے۔ اور اپنے علوم اور معلومات کا ذکر کرے۔ تو کہنے والا کہہ سکتا ہے۔ کہ چونکہ یہ شخص کراچی یا بمبئی جیسے مرکزی شہر کا رہنے والا ہے۔ اور ایک ایسے شہر میں مقیم ہے۔ جہاں ہزاروں پڑھے لکھے آدمی رہتے ہیں۔ سینکڑوں علمی کتابیں مل سکتی ہیں۔ بیسیوں کالج اور سکول ہیں اس لئے اس کی اس قدر معلومات ہیں۔ تو اللہ نے یہ بات بھی اپنے محبوب کے لئے پسند نہ فرمائی۔ کہ کوئی یوں کہے۔ کہ حضور کے علوم کسی علمی مجلس یا کسی کالج و سکول کے رہینِ منّت ہیں۔ اس لئے آپ کو غیر تعلیم یافتہ اور ان پڑھ لوگوں میں مبعوث فرما کر یہ اعلان فرمایا کہ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا گویا ایسی زمین پر اور ایسے لوگوں میں حضور تشریف لائے۔ جہاں نہ کوئی علمی چرچا تھا۔ نہ کوئی سکول یا کالج تھا۔ بلکہ سب کے سب ان پڑھ اور اُمّی تھے۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر کسی سوسائٹی یا

نہیں بلکہ سچ اور یقینی امر واقعہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس لئے واقعات آدم کا بیان افسانہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

ولقد جاءك من نبا المرسلين۔ اور تمہارے پاس رسولوں کی خبر آچکی ہے۔

یہاں اگر آپ کہیں کہ نبا کے معنی من گھڑت قصہ ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ خدا کی طرف سے رسولوں اور کتابوں کا بھیجا جانا بھی افسانہ اور جھوٹ ہے۔ ایک اور مقام پر ہے:

نتلو عليك من نبا موسى وفرعون بالحق لقوم يومنون

ہم تجھ پر موسیٰ اور فرعون کی خبر حق کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں مسلمان قوم کے لئے۔

اس آیت میں بھی نبا کا لفظ ہے اور اس میں بھی اسی طرح تلاوت حق کا بیان ہے جس طرح حضرت آدم کے بیٹوں کی قربانی کے بیان میں تلاوت حق کا ذکر ہے۔ اور سوچا جا سکتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کا اور اسی طرح فرعون کا وجود فرضی اور ان کے حالات کا بیان افسانہ و داستان نہیں تو حضرت آدم کا وجود کیوں فرضی ٹھیرا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ نبا کے معنی تمام قرآن کے اندر تو ہوں بیان واقعہ اور حضرت آدم کے قصہ میں ہو افسانہ اور داستان۔

اس کے بعد سوچنے کی چیز یہ بھی ہے کہ افسانہ میں فلسفہ اور حکمت کیا ہے۔ اور یہ کس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ایک انسان کو نیک بنانے کے لئے ہم نیکی کا ایک افسانہ تراشیں اور اس کے ذریعہ اسے نیک بنائیں اور اگر کسی کو برائی سے روکنا ہو تو اس کے لئے برے انسان کا ایک جھوٹا قصہ گھڑیں اور اسے وہ سنائیں اور ایک اس طرح لمبا چوڑا جھوٹ گھڑنے کی بجائے اسے یہ نہ کہیں کہ نیک بنو۔ اگر سوچا جائے تو افسانہ

قوم کا بھی احسان نہیں۔ بلکہ آپ ہی کی بدولت یہ اَن پڑھ لوگ بھی علوم و اسرار کے مالک بن گئے۔ اور دنیا بھر کے اُستاد بن گئے ؎

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے بے شک حضور کو کچھ عرصہ کے لیئے دودھ پلایا۔ مگر کیا یہ اس کا حضور پر احسان تھا۔ یا حضور کا حلیمہ پر احسان تھا۔ کہ ایک غریب بدویّہ عورت کے گھر کو برکتوں سے معمور کر دیا۔ یہ حلیمہ خود فرماتی ہیں کہ :-

"میری چھاتی میں دودھ آتا ہی نہ تھا۔ اور اگر آتا بھی تھا۔ تو بہت کم۔ حتیٰ کہ میرا بیٹا پیٹ بھر دودھ نہ پی سکتا تھا۔ اور رات بھر نہ سوتا اور نہ سونے دیا کرتا۔ مگر جب حضور کو لائی ہوں تو آپ نے اپنے منہ مبارک میں جب دودھ ڈالا۔ تو میری چھاتی میں اتنا دودھ پیدا ہو گیا۔ کہ میرے بچے نے بھی اس دن پیٹ بھر کر دودھ پیا۔ اور پھر اس رات ایسا مزے سے سویا کہ اس طرح کبھی میٹھی نیند سویا ہی نہ تھا۔ نیز ہم ایک بکری لکہ سے لائے تھے۔ جو بڑی لاغر اور دبلی تھی۔ کبھی کبھار اس سے دودھ کی ایک دو دھاریں دوہ لیتے تھے جو اپنے بھوکے بچے کو پلا دیا کرتے تھے۔ حضور جب تشریف لائے۔ تو اس بکری کو بھی ہم نے دیکھا۔ کہ خلافِ معمول اس کے تھن، دودھ سے بھرے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس بکری سے اتنا دودھ دوہا۔ کہ ہم سب نے خوب پیٹ بھر کر پیا۔ اور مزے سے سب سوئے۔"

اسی طرح حضور کی برکت سے حلیمہ کی خشک زمین بھی ہری بھری ہو گئی۔ اور وہ مویشی جو گھر اور باہر بھی بھوکے ہی رہتے تھے۔ حلیمہ فرماتی ہیں۔ کہ اب وہ ہمارے مویشی بھی خوب کھانے لگے۔ اور موٹے ہونے لگے

کسی حقیقی ضرورت کو پورا نہیں کرتا لیکن اگر فرض کرلیں کہ وہ کسی ضرورت اور فائدہ کا پہلو رکھتا بھی ہے تو وہ صرف انسان کے لئے ہے جس کا علم ناقص ہوتا ہے اور اس کے علمی ریکارڈ میں گذشتہ اور موجودہ صحیح واقعات محفوظ نہیں ہوتے اور اس وجہ سے اسے ایک مثال کو سامنے لانے کے لئے کوئی مصنوعی قصہ بنانا پڑجاتا ہے۔ مگر یہ حال خدا کے علم کا تو کسی طرح بھی نہیں کہ اس کے ہاں صحیح واقعات کی کمی ہو۔ اور اسے اپنے بندوں کو علم دیتے وقت اس کی تعمیل پر انہیں آمادہ کرنے کے لئے افسانہ بنانا اور سنانا پڑے۔ حالانکہ جہاں تک جھوٹے ہونے کا تعلق ہے کیا یہ مان لیا جائے کہ ایک طرف خدا نے جھوٹ سے بچنے کا حکم دیا اور دوسری طرف خود افسانوں سے کام لیا۔ زید کے متعلق اگر ہم کہیں کہ وہ انسان نہیں تو یہ جھوٹ ہوگا۔ اور ایسا کہنے والے پر خدا کی لعنت مسلط ہو کر رہے گی لیکن جہاں کچھ بھی موجود نہ ہو اور ہم خود ہی اپنے خیال سے ایک انسان بنا کر اسے زید کا نام دیں۔ جو بیوی بچوں کا مالک اور پوری دنیا کا باپ ہو۔ حاتم کی سخاوت اور عقیل نوشیروانی کا مالک ہو وہ جنگیں کرے اور لڑائیاں لڑے۔ میدان کا رستم اور فتوحات کا سکندر ہو۔ سوچئے کیا ان دونوں میں سے دوسرا جھوٹ مقدار میں کچھ زیادہ ہے یا کم۔ اگر پہلا ناجائز اور موجب لعنت ہے تو دوسرے میں کیا خوبی ہو سکتی ہے کہ ہم یہ کہنے کی جرأت کر گذریں۔ کہ خود ذات رب العالمین نے اس کا ارتکاب کیا۔

سید صاحب کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں قصۂ آدم کے جھوٹ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ڈارون کا خیال ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔ اور فرد نہیں بلکہ نوع تھا۔ اس لئے ہمیں یہ مان لینا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے آدم کا جو قصہ قرآن کے متواتر مقامات پر پھیلا دیا ہے وہ افسانہ کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ نہ کوئی آدم ہے

اور فرماتی ہیں کہ میرے شوہر نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ برکتیں دیکھیں تو کہا۔

وَاللہ یا حلیمۃ لقد اخذنا نسمۃ مبارکۃ

"بخدا! اے حلیمہ ہم نے جس بچے کو لیا ہے۔ یہ بہت مبارک ہے۔"

یہ سارا تفصیلی واقعہ حجۃ اللہ علے العالمین کے صفحہ ۲۵۴ پر دیکھئے اور فیصلہ کر لیجئے۔ کہ یہ احسان حلیمہ کا حضور پر تھا یا حضور کا احسان تھا حلیمہ پر!

میرے بزرگو! اسی طرح ہمارے حضور جب ابوطالب کے گھر تشریف لائے تو ابوطالب ایک کثیر العیال شخص تھے۔ خصائص کبریٰ میں امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت درج فرمائی ہے کہ ابوطالب کے بچے ہمیشہ بھوکے رہتے تھے۔ مگر حضور کے تشریف لانے پر اس کے کھانے میں کچھ ایسی برکت پیدا ہوتی کہ سارے بچے پیٹ بھر کر کھانا کھانے لگے اور بعض اوقات ابوطالب کے بچے حضور کی انتظار کئے بغیر کھانے کو بیٹھ جاتے۔ تو ابوطالب کہتے۔ اے بچو! اگر بھوکا رہنا ہے تو محمد کی انتظار کئے بغیر کھانا کھالو۔ اور اگر پیٹ بھر کر کھانا چاہتے ہو۔ تو محمد کو آ لینے دو۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معلوم ہوا کہ ابوطالب پر بھی حضور ہی کا احسان تھا۔

دھمکی

تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ بت پرستوں نے مشورہ کیا۔ کہ ابوطالب کے پاس چلیں۔ اور اُسے جا کر کہیں۔ کہ وہ اپنے بھتیجے کو ہمارے بتوں کی مخالفت سے باز رکھے۔ چنانچہ یہ لوگ ابوطالب کے پاس آئے۔ اور ابوطالب سے کہا۔ کہ تم اپنے بھتیجے کو روکو۔ اور اگر تم نے اُسے نہ روکا۔ اور نہ اس کی حمایت ترک کی۔ تو پھر ہم اعلانِ جنگ کرتے ہیں۔ ہم سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ہم لڑیں گے اور خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ ابوطالب نے ان لوگوں کی یہ دھمکی سنی۔ تو فکر لاحق ہوئی۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اسی مجلس میں بلایا حضور تشریف لائے تو پوچھا اے چچا! کیا بات ہے۔ ابوطالب نے کہا۔ بیٹا! یہ دیکھو! یہ مکہ کے فلاں صاحب ہیں۔ اور یہ فلاں! یہ سب کے سب میرے پاس اس

اور نہ اس کے بیٹے۔ آدم ہیں تو ہم ہیں اور اس کے بیٹے ہیں تو خود ہم۔ اور قربانی کے موقعہ پر ایکدوسرے سے لڑتے ہیں تو ہم خود لڑتے ہیں اور یہ قصہ اگر ہے تو خود ہمارا ہے۔ ہر سال یہی ہوتا ہے۔ کہ ہم میں سے جس کی قربانی قبول نہ ہو وہ دوسرے کو قتل کر دیتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ اگر ایک انسان کوئی واقعہ بیان کرے اور وہ خود ہی اس کے افسانہ ہونے کا اظہار نہ کرے۔ تو دنیا بھر میں کسی بھی فریشر کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ کہ اس کے بیان کردہ واقعہ کو بعض خارجی معلومات کی بنا پر افسانہ کا نام دے ڈالے۔ اس لیئے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ جن معلومات کی بنا پر اسے افسانہ ٹھیرایا جائے ان کا تعلق کسی اور قصے سے ہو۔ دنیا بھر کے اس مسلمہ اصول کے بالکل خلاف یہاں یہ حال ہے کہ خدا نے قرآن کے متواتر مقامات پر قصہ آدم کی تفصیلات کو بیان فرمایا اور کہیں بھی یہ نہیں بتایا کہ یہ افسانہ ہے۔ مگر پرویز صاحب اسے خود ہی اپنے بعض مفروضات کی بنا پر افسانہ ٹھیراتے ہیں اور یہ سوچنے کو تیار نہیں کہ شاید ڈاروین نے جس آدم کو بندر ٹھیرایا ہے وہ کوئی اور ہوگا۔ اور خدا نے جس آدم کو انسان اوّل کی حیثیت سے قرآن میں پیش فرمایا ہے وہ کوئی اور آدم ہوگا۔ آخر ڈاروین کے دائرہ معلومات کے باہر بھی تو کائنات کی انواع و اقسام کی کوئی کمی نہیں۔

لئے آئے ہیں۔ کہ تم اپنی تبلیغ بند کر دو۔ اور انہیں اپنے حال پر رہنے دو۔ اگر تم نے اپنی یہ تبلیغ بند نہ کی تو یہ اعلانِ جنگ کرتے ہیں۔ اور لڑنے مرنے کے لئے تیار ہیں۔ بیٹا! مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ کہ میں ان سے ٹکر لے سکوں۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں۔ کہ تم اپنی تبلیغ بند کر دو۔

دھمکی کا جواب

حضرات! آپ دیکھئے! ہمارے حضور نے اس نازک وقت میں جواب کیا دیا۔ کوئی لیڈر ہوتا یا مصنوعی نبی تو یقیناً ایک لمبا چوڑا معافی نامہ لکھ دیتا۔ اور آئندہ کے لئے اپنے خیالات سے رک جاتا۔ مگر یہاں تو جانِ صداقت، اور روحِ حقانیت تھی اور اللہ کی سچی رسالت جلوہ فرما تھی۔ اس نازک وقت میں ہمارے حضور کا جواب یہ تھا۔ جیسے شاعر نے نظم میں قلمبند کیا ہے کہ ؎

جفا و جور کی آندھی چلے طوفان آجائیں
مٹانے کو مرے شداد اور ہامان آجائیں
مرے ہاتھوں پہ لا کر چاند سورج بھی اگر رکھ دیں
مرے پیروں تلے روئے زمیں کا مال و زر رکھ دیں
خدا کے حکم سے میں باز ہرگز رہ نہیں سکتا!!
یہ بت جھوٹے ہیں میں جھوٹوں کو سچا کہہ نہیں سکتا

اے چچا! کچھ بھی ہو جائے۔ مگر یہ بات نہیں ہو سکتی کہ میں اپنی تبلیغ کو بند کر دوں۔ چچا نے جو یہ جرأت آمیز اور عزم و استقلال کا اعلانِ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سنا تو کہا۔ جانِ عمّ! تو جو چاہے کر۔ تمہارا کوئی کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔"

ہماری حالت

میرے بھائیو! حضور کے اس عزم و استقلال سے تم بھی سبق حاصل کرو، اور شریعت کے معاملہ میں کسی دھمکی سے مرعوب ہو کر دامنِ شرع چھوڑ دینے پر آمادہ نہ ہو جایا کرو۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ آج ہمیں اگر برادری کے افراد بھی شریعت سے ہٹانا چاہیں۔ تو ہٹا بیٹھتے ہیں۔ کسی کے لڑکے کی شادی ہوتی ہے۔

دعائے خلیلؑ

"اور خدایا اپنے بذلِ کرم سے ایسا کیجو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو انہیں میں سے ہو اور تیرے احکام سے لوگوں کو آگاہ کرے۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔ ان کے جوہرِ انسانیت کو بالیدگی عطا کرے۔ یقیناً تو غالب حکمت والا ہے۔" صفحہ ۱۹۹

"حکمت قرآن سے الگ کوئی چیز نہیں۔ کتاب قوانین کا نام اور حکمت ان احکام کی علت و غایت اور مقصود و مطلوب دونوں منزل من اللہ ہیں اور دونوں قرآن کے اندر محفوظ۔" صفحہ ۲۶۱

یہاں اوپر کی عبارت اس دعا کے ایک حصّہ کا ترجمہ ہے۔ جو قرآن میں ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے تعمیر کعبہ کے دوران اپنے رب سے مانگی تھی۔ اس دعا کا ایک ایک جزو خلوص و صداقت سے لبریز ہے۔ پرویز صاحب کہتے کہ اس دعا میں کعبہ کے شہر مکہ میں جس رسول کے مبعوث ہونے کی حضرت ابراہیم و اسماعیل نے خدا سے دعا مانگی تھی۔ وہ رسول نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ قرآن میں تو ایسا کہیں موجود نہیں کہ ان دونوں حضرات نے جس رسول کے لئے دعا مانگی تھی۔ وہ محمدؐ ہی ہے۔ اس خیال کی بنیاد صرف یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں نبی آخر الزمان کے سوا اور کوئی نبی نہیں ہوا۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک تاریخی چیز ہے جس کی پرویز صاحب کے ہاں[1] دین میں کوئی حیثیت نہیں۔ اور جب نہیں تو پھر دینی اعتبار سے اس

---

[1] تاریخ یا اخبارات ہمارے لئے دین کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ (مقام حدیث صفحہ ۱۴۲)

تو برادری مجبور کرتی ہے۔ کہ اس شادی میں خلافِ شرع سب امور موجود ہونے ضروری ہیں۔ باجا بھی ہو۔ آتش بازی بھی ہو۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوئیں۔ تو ہم شادی میں شرکت نہ کرینگے۔ برادری کا یہ اعلان ہوتا ہے۔ اور سرکار دو عالم کا یہ اعلان ہوتا ہے۔ کہ دیکھو اگر تیرے ہاں یہ خرافات ہوئیں۔ تو میں اس شادی میں شرکت نہ کرونگا۔ آہ! کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ آجکل کا برائے نام مسلمان برادری سے مرعوب ہو کر شریعت کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ اور برادری کو تو اپنے ہاں بلا لیتا ہے۔ مگر سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی پرواہ نہیں کرتا۔ فرمایئے۔ شریعت کا دامن چھوڑ کر اور حضور سے رشتہ توڑ کر پھر باقی رہا کیا؟ اور اس برائے نام اپنی مسلمانی سے ہم نے اسلام کو بدنام کیا یا نہیں؟ ایسی مسلمانی بھی کیا ہوتی جس میں سب وہی غیر مسلموں والی حرکتیں پائی جائیں۔

ایک مجوسی کی حکایت

مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے مثنوی شریف میں ایک مجوسی کی حکایت لکھی ہے۔ یہ مجوسی حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ کے زمانہ میں تھا۔ ایک مسلمان نے جو بڑا بے عمل مسلمان تھا۔ اس مجوسی سے کہا۔ (اردو نظم میں ترجمہ سنیئے) ؎

کیوں نہیں ایمان لے آتا شتاب — کیا خدا کو دیگا ظالم تو جواب
آگ کو کیوں پوجتا ہے بےخرد — آگ کیا دیگی بھلا تجھ کو مدد
اس خدائے پاک پر ایمان لا — آگ کو بھی جس نے ہے پیدا کیا

مجوسی کو جب اُس بے عمل مسلمان نے دعوتِ اسلام دی۔ تو اس مجوسی کا عبرت آموز جواب سنیئے۔ وہ بولا ؎

دیکھئے اے مہربانِ اسلام کے — دو نمونے ہیں میرے اب سامنے
ایک تو اسلام شیخ بایزید — شوکتِ اسلام کی جس نے مزید
تاب و طاقت اسکی میں رکھتا نہیں — کون رکھ سکتا ہے اس کا سابقین
ایسے تو اسلام کا میں ہوں غلام — پر نہیں وہ ہر کس و ناکس کا کام
دوسرا اسلام جو ہے آپ کا — ایسے ایماں سے تو میں کافر بھلا
میل دل گر اس طرف لاتا ہوں میں — دیکھ کر حضرت کو رک جاتا ہوں میں

تاریخی واقعہ بیں کیا جاتا ہے۔ کہ حضرت اسماعیل کی اولاد میں صرف ایک رسول ہوا۔ اس میں اگر اطمینان کا کچھ سامان ہے تو صرف ان لوگوں کے لئے ہے۔ جو قرآن وحدیث کے ساتھ تاریخ کا اعتبار بھی کرتے ہیں۔ ورنہ ایک منکر تاریخ تو کہہ سکتا ہے کہ کیا معلوم حضرت اسماعیل کی اولاد میں کس قدر رسول ہو گذرے ہیں۔ اور کس قدر بعد میں ہوں گے۔ اس مشکل کا حل صرف یہ ہے کہ زمانہ قرآن سے پہلے کی تاریخ کو مانا جائے۔ اور جب وہ مان لیں تو پھر بعد کی تاریخ کو بھی ماننا لازم آتا ہے۔ جس کی پہلی بسم اللہ حدیث رسول ہے۔

اس دعا میں نبی آخر الزمان کی ڈیوٹی کو چار امور میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تلاوت آیات، تعلیم کتاب تعلیم حکمت اور تزکیہ۔ اس کے علاوہ بھی قرآن کی کئی آیات میں آنحضور کے فرائض میں انہیں چیزوں کو گنوایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نہ صرف حضرت ابراہیم واسماعیل کی خواہش تھی، بلکہ خدا کا منشا بھی یہی تھا۔ کہ آپ یہ چاروں امور لگے بندھے طریقہ پر انجام دیں۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ تلاوت آیات، تعلیم کتاب اور حکمت ایک ہی چیز ہے۔ اور آپ کے بیان میں تضاد کا یہ عالم ہے کہ آپ کہتے ہیں کتاب قوانین کا نام ہے اور حکمت ان قوانین کا مقصد ہے۔ اور کتاب اور حکمت بالفاظ دگر قوانین اور ان کے مقصد کا مجموعہ قرآن ہے۔ اس بنا پر اگر ہم قرآن کو کتاب کا نام دیں۔ تو یہ اس کا ادھورا نام ہوگا۔ حالانکہ قرآن میں متواتر مقامات پر اسے کتاب اور کتاب حکیم کہا گیا ہے۔ جو بیک وقت قوانین حکمت کی کتاب ہے۔ ورنہ یہ کیسے معقول ہو سکتا ہے۔ کہ جس ریکارڈ میں قانون درج نہ ہو اسے کتاب نہ کہا جا سکے۔ اور جس میں کسی قانون کا مقصد بیان کیا گیا ہو وہ کتاب نہ رہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہاں استدلال کا تمام طول وعرض صرف لفاظی اور تصنع ہے اور کچھ بھی نہیں۔

آپ کی بات کو صحیح فرض کر لینے کے بعد اس کلام کے معقولات پر غور کرنا ہوگا۔ اگر قانون اور اس کا مقصد۔ دونوں چیزیں قرآن کے اندر موجود تھیں تو پھر رسول کو صرف

دیکھا آپ نے! اُس مجوسی نے کتنی زبردست بات کہہ دی۔ یعنی جو مسلمان اس قدر بدعمل ہوں کہ دوسرے لوگ اُن کو دیکھ کر بجائے اسلام کی طرف راغب ہونے کے اسلام سے بھاگنے لگیں۔ تو وہ مسلمان کس منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ ع

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

مسلمانو! یاد رکھو! مسلمان وہی ہے۔ جو کسی حال میں بھی خدا و مصطفٰے کا دامن نہ چھوڑے۔ دنیا بگڑے تو بگڑے۔ برادری ناراض ہوتی ہے۔ تو ہو۔ مگر اللہ اور اس کا رسول ہرگز ناراض نہ ہو۔ دنیا بگڑے اور برادری ناراض ہو۔ تو ایسے وقت میں مسلمان وہ ہے۔ جو حضور ہی کی طرف دیکھے۔ اور برادری کی ناراضگی مول لے کر اور حضور کی خوشنودی پا کر یہ اعلان کرے کہ یارسول اللہ!

ے

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں، نہ بھائی خوش ہیں، نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا، دلیل یہ ہے، کہ آپ خوش ہیں

برادری کی خوشی

میرے عزیزو! آج جس برادری کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا یہ عالم ہے۔ کہ تم کچھ بھی کرو۔ وہ خوش ہونے کی ہی نہیں۔ کوئی نہ کوئی نقص اور عیب نکال ہی لے گی۔ دیکھئے اگر آپ شادی کی روٹی میں اپنی توفیق سے بڑھ کر خرچ کریں۔ تو یہ برادری کھا پی کر آپ کی روٹی پر تبصرہ یوں کرے گی۔

"اجی محض دکھاوا ہے دکھاوا۔ یہ جو اس نے حیثیت سے بڑھ کر خرچ کیا ہے۔ محض اس لئے کیا ہے۔ کہ اس کی واہ واہ ہو۔ مگر ہماری تو رائے یہ ہے۔ کہ جیب اتنی توفیق نہ تھی۔ تو اس قدر خرچ کی کیا ضرورت تھی" اگر آپ توفیق کے مطابق خرچ کریں گے۔ تو برادری یوں کہتی ہوئی نکلے گی۔ "اجی کیا کمال کیا ہے اس نے، رب نے دے بھی تو رکھا ہے۔ اگر اس قدر خرچ کر ڈالا۔ تو کوئی بڑی بات نہیں —— اور اگر آپ نے توفیق سے کم خرچ کیا تو برادری کی درفشانی حسب ذیل ہوگی:۔

تعلیم قرآن کا حکم دیا جاتا ، بلکہ سرے سے دو گونہ احکام ہی لا حاصل تھے ۔ اور صرف
تلاوت آیات کا حکم کافی تھا کیونکہ جب تعلیم بھی اسی قرآن کی تھی جس کی آیات کی
تلاوت بھی تو پھر تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب کے بھی کچھ معنی نہ تھے ۔ کجا یہ بات
کہ پھر اس کے ساتھ تعلیم حکمت کے حکم کا مزید اضافہ کیا جاتا ۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے ۔ جیسے
کہا جائے کہ قرآن پڑھاؤ ۔ اور قرآن پڑھاؤ ۔ اور قرآن پڑھاؤ ۔ خدا کی شان تو بہت
بلند و برتر ہے ۔ ایسا حکم تو ایک سمجھدار انسان کا بھی نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے کہ بعد
کے الفاظ نہ الگ حکم ہے اور نہ پہلے حکم کی تاکید ہے کیونکہ اگر الگ حکم ہو تو اس کے
لئے الگ مقصد کا ہونا ضروری ہے ۔ جو یہاں موجود نہیں ۔ اور اگر پہلے حکم کی تاکید ہو ۔
تو اس میں واو عطف کا ہونا خلاف قاعدہ ہے پرویز صاحب کہتے ہیں کہ حکم میں
کوئی خوبی اور کلام میں کوئی قاعدہ ہو یا نہ ہو ۔ بہر حال ہم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ قرآن
کے ساتھ رسول کسی اور حکمت کا درس بھی دیتا ہے ۔ اور پھر حکمت کے اس درس
کو بھی قرآن کی طرح ماننا لازم تھا ورنہ حدیث کو ماننا لازم آتا ہے ۔

اس سے آگے نمبر چہارم پر تزکیہ کو لیجئے جس کے معنی پرویز صاحب کے بقول
بالیدگی کے ہیں ۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر بالیدگی کے مفہوم میں ہر شخص کے
ہاں اس کا ذاتی تصور معیار ہو تو ایک سرمایہ دار کے ہاں عوام کی بالیدگی اس میں
ہے کہ انہیں بھوکا اور خستہ حال رکھا جائے تاکہ وہ مشکلات میں رہ کر کمائی کرتے
رہنے کے عادی ہوں ۔ ایک کمیونسٹ کے ہاں انکی بالیدگی اس میں ہے کہ انہیں
بانٹ کر رزق دیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کی بجائے اپنے
فرائض میں مشغول رہیں ۔ بخلاف اس کے قرآنی بالیدگی صرف وہی ہے جس
کا مظاہرہ معلم قرآن نے اپنے نظام حکومت کے اندر کیا تھا ۔ اور وہ یہ کہ
عوام کو خوشحال اور آزاد رکھا جائے ۔ مگر ایسا نہ ہونے پائے ۔ کہ وہ نرے معاشی

"بڑا کنجوس مکھی چوس ہے۔ دیکھو تو کس قدر امیر آدمی ہے۔ مگر پکایا کیا ہے اس نے!"

گویا یہ برادری ہر حال میں آپ سے شاکی رہے گی۔ اور آپ پر خوش نہ ہوگی۔ تو میرے بھائیو! پھر کس قدر ظلم ہے۔ کہ ہم ایسی بیوفا جماعت کو تو خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اور شریعت جو ہر حال میں ہماری بہی خواہ اور تمہارے دین و دنیا کی سرخروئی کی ضامن ہے۔ اس کی ہم پروا ہی نہ کریں۔ ہمارا فرض ہے۔ کہ برادری بگڑتی ہے تو بگڑے۔ مگر خدا و رسول سے نہ بگاڑیں۔ ؎

جس کام کو یاں آئے ہیں وہ کام نہ بگڑے
ہر چیز بگڑ جائے پر اسلام نہ بگڑے

شیطان کے داؤ

میرے بزرگو! یہ جو شیطان ہمارا ازلی دشمن ہے۔ اور جس نے ہمارے بہکانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ یہ بڑے بڑے حیلے بہانوں سے ہمارے ہاتھ سے دامنِ شریعت چھڑوانا چاہتا ہے۔ بیاہ شادیوں میں رنگا رنگ اور دلچسپ لہو و لعب کے امور میں ہمیں الجھا کر یہ ہمارا متاعِ دین اڑا لینا چاہتا ہے۔ مگر ہماری غفلت بھی انتہائی غفلت ہے۔ کہ اس مردود کی چالوں کو ہم نہیں سمجھتے۔ اور اس کی باتوں میں پھنس کر اپنی قیمتی سے قیمتی چیز دین و شریعت کو ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔

ایک درزی کا قصّہ

مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے ایک درزی کا قصہ لکھا ہے کہ اس کو ہزاروں لطیفے اور چٹکلے یاد تھے۔ جب کوئی گاہک کپڑا سلانے کے لئے اس کے پاس آتا۔ تو وہ گاہک کو لطیفے سنانے شروع کر دیتا تھا۔ لطیفے سن کر گاہک خوب ہنسنے لگتا۔ اور جب وہ اپنی ہنسی میں لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ تو درزی اس کی نظر بچا کر اس کے کپڑے سے کچھ کپڑا کاٹ لیتا۔

ایک دن ایک شخص اپنا کوٹ سلانے کے لئے اس کے پاس آیا۔ اور کپڑا درزی کو دیا۔ تو درزی نے حسب معمول اُسے بھی ایک لطیفہ سنا دیا۔ وہ

حیوان بن کر رہ جائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے تلاوت قرآن بھی حقیقت میں وہی ہے جس کا عملی نمونہ معلم قرآن نے پیش کیا۔ نہ وہ جیسے ہم خود اپنی طرف سے اپنا نام دیدیں۔ اس لیے پرویز صاحب کو بھی انکار نہیں۔ اور آپ بھی یہ مانتے ہیں کہ تلاوت قرآن کا معیار وہی ہے جو معلم قرآن نے قائم فرمایا تھا۔ اس سے آگے آپ تعلیم قرآن اور تعلیم حکمت وتزکیہ میں رسول کی ذات کو معیار تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ قرآن میں ان چاروں امور کے اندر کوئی بھی تفریق موجود نہیں۔ اور چاروں یکساں رسول کے فرائض ہیں۔ اور جب ہیں تو پھر ان سب میں اس کا عمل معیار ہونا چاہیئے۔ نہ کہ کسی ایک میں۔ اور نہ یہ صحیح ہے کہ صرف تلاوت آیات کو فرض تسلیم کیا جائے اور باقی تین چیزوں کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ اللہ میاں نے لغوی پریکٹس کے طور پر بجا قرآن میں ان کا تذکرہ فرما دیا ہے تاکہ الفاظ کا ذخیرہ ہو۔

اب اس سوال پر آئیے کہ یہ دعا جو حضرت ابراہیم و اسماعیل نے بیک وقت ایک جیسے الفاظ کے ساتھ خدا سے مانگی جو اس کی رضا کے عین مطابق تھی اور قبول ہونے کے لئے مانگی گئی۔ کیا یہ ان کے اپنے دماغ کی پیداوار تھی یا خدا کی وحی سے ظہور میں آئی۔ اگر یہ ان کا اپنا خیال تھا جو خدا کی منشا کے بالکل مطابق اور آنیوالی دنیا میں سورج اور چاند سے بھی زیادہ پائیدار واقع ہوا۔ تو ایسے اچھے اور صحیح خیال کا انسان دنیا میں کسی وحی کی رہنمائی کا محتاج کبھی نہیں ہوتا۔ اور نہ زندگی کے دوسرے مسائل روزمرہ میں وہ کہیں غلطی کھا سکتا ہے اور ایسے انسان کی رہنمائی سے دوسری دنیا وحی کی ضرورت کو پورا کر سکتی ہے۔ یعنی اس طرح سرے سے ضرورت وحی کا انکار لازم آتا ہے۔ اگر یہ دعا وحی کے تحت تھی تو پھر اس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ نبی اور رسول کا ہر قول و عمل وحی ہوتا ہے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا وحی کے ذریعہ رسول

شخص ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔ اتنے میں درزی نے ایک گرہ کپڑا کاٹ لیا۔ گاہک نے فرمائش کی۔ کہ ایک لطیفہ اور سناؤ۔ درزی نے دوسرا لطیفہ بھی سنا دیا۔ گاہک پھر ہنسا۔ اور درزی نے موقعہ پاکر دو گرہ کپڑا کاٹ لیا۔ گاہک نے پھر فرمائش کی۔ کہ ایک لطیفہ اور سنا دو۔ درزی نے جواب دیا۔

"تیسرا لطیفہ سنا دیتے ہیں مجھے عذر تو کوئی نہیں۔ مگر جناب کا کوٹ بہت ہی چھوٹا ہو جائے گا۔"

مولانا رومی فرماتے ہیں۔ اسی طرح شیطان بھی ہے۔ جو انسان کو مختلف قسم کی شہوات، اور نفسانی خواہشات کے چٹکلوں میں الجھا کر اس پر غفلت طاری کر کے اس کے متاعِ ایمان پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ غافل انسان! تو چالاک شیطان کے اس داؤ کو سمجھ۔ اور اس کے ان چٹکلوں میں آ کر اپنا متاعِ ایمان نہ کھو۔

انقلاب

ہاں تو میں بیان کر رہا تھا۔ کہ حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے شرک و کفر کے خلاف اپنی آوازِ حق جو بلند فرمائی۔ تو اس آوازِ پاک سے ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ بُت پرست، خدا پرست بن گئے۔ اغیار کے آگے جھکنے والے خدا کی بارگاہ میں جھکنے لگے۔ اور قعرِ پستی میں گرے ہوئے عروج و وقار کے سٹیج پر نظر آنے لگے۔ ؎

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا
خاک کے ذرّوں کو ہمدوشِ ثریا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

یہ حضور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و سلم کی رسالت کا اعجاز اور کرشمہ تھا۔ کہ دنیا کی کایا ہی پلٹ دی۔ اور اپنی بے مثل مسیحائی سے مردہ دلوں میں ابدی زندگی پیدا فرما دی۔ پڑھئے درود شریف!

سرورِ عالم ہادیِ اعظم صلے اللہ علیہ و سلم
شمعِ ہدایت نورِ مجسّم صلے اللہ علیہ و سلم

کو دُعا کے سلسلہ میں تو رہنمائی کرے مگر جب وہ لوگوں کی جان و مال کے متعلق فیصلے کرنے لگے۔ اس وقت وہ اُسے وحی کی رہنمائی سے محروم کر دے۔ وہ فیصلے[1] غلط کر رہا ہے۔ اور لوگوں کی جان و مال سے کھیل رہا ہے اور خدا اس کے ذاتی اجتہاد کا تماشا دیکھتا رہے اور جب بھی کہیں دُعا کا موقعہ آئے تو اُسے وحی کے اِلقا سے سمجھا دے کہ دیکھنا دعا میں غلطی نہ کرنا۔

تمنّائے کلیم

"جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی اُمّی ہوگا۔ اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں توراۃ اور انجیل میں لکھی پائیں گے۔ اور انہیں معروف کا حکم دیگا منکر سے روکے گا طیبات حلال کریگا۔ خبائث حرام قرار دیگا۔ اس بوجھ سے نجات دلائیگا جس کے نیچے وہ دبے ہوں گے۔ اور ان پھندوں سے نکالے گا جن میں وہ گرفتار ہوں گے۔ جو لوگ اس پر ایمان لائیں گے وہ تمام مخالفانہ قوتوں کی روک تھام کریں گے۔ اور اس کی مدد کرینگے اور اس روشنی کی پیروی کریں گے۔ جو اس کے ساتھ بھیجی جائے گی۔ وہی لوگ کامیابی پانے والے ہوں گے" صـ ۱۶۵

یہ بیان اس آیت کا مضمون ہے جو قرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰ کی ایک دُعا کے جواب میں خدا نے ان سے فرمایا۔ اس بیان میں جس نبی اُمّی کا ذکر ہے

---

[1] جن معاملات میں حضور اپنے ذاتی اجتہاد سے فیصلہ کیا کرتے تھے۔ اُن فیصلوں میں غلطی کا امکان بھی تھا۔ صـ ۶۶۹

اور توحید کا رنگ جما کر نام و نشانِ شرک مٹا کر!
صلی اللہ علیہ وسلم پھر لہرا دیا حق کا پرچم!

شانِ رسالت

میرے بزرگو! اللہ تعالیٰ نے حضور کو "محمد رسول اللہ" فرما کر گویا حضور کی شان والا کا اظہار فرما دیا۔ اور بتا دیا کہ میرے محبوب جن کا نام نامی "محمد" ہے۔ وہ "رسول اللہ" ہیں۔ انہیں اپنی مثل نہ سمجھنا۔ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو اللہ کا رسول ہو۔ اس کی شان کا کیا کہنا؟ اللہ کا رسول اپنی ذات و صفات میں مظہر حق ہوتا ہے۔ اور ساری مخلوق سے بلند و بالا ہوتا ہے۔ جو لوگ "رسول اللہ" کو اپنی مثل اور عاجز و ناکارہ سمجھتے ہیں۔ وہ دراصل اللہ کی عظمت کے منکر ہیں۔ دیکھئے! درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پیر اپنے مریدوں سے، اور استاد اپنے شاگردوں سے پہچانا جاتا ہے۔ مرید اگر نیک اور پابند شریعت ہیں۔ تو ان کے پیر کا تقوے و تدیّن ظاہر ہوگا۔ شاگرد اگر لائق ہونگے۔ تو ان کے استاد کی لیاقت ظاہر ہوگی۔ اور اگر مرید ہی بے دین ہیں۔ تو پیر بھی ان کا ویسا ہی ہوگا۔ شاگرد نالائق ہوں گے تو استاد بھی جاہل ہوگا۔ تو میرے بھائیو! اللہ کے رسول اگر بے مثل، اور بڑی بڑی طاقتوں، اور قدرتوں کے مالک تسلیم کئے جائینگے۔ تو ان کے بھیجنے والے اللہ کا بھی لاشریک ہونا۔ اور قادر مطلق ہونا بخوبی ظاہر ہوگا۔ اور اگر اس کے رسولوں ہی کو عاجز اور ناکارہ تسلیم کیا جائے گا۔ اور نفع ضرر کا مالک تسلیم نہ کیا جائیگا۔ تو اس سے یہ بات ظاہر ہوگی۔ کہ اللہ بھی ایسا ہی عاجز و غیر قادر ہے۔ (معاذ اللہ)

تو بھائیو! ہم تو بحمد اللہ اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بے مثل ہیں۔ اور اس قدر تصرف کے مالک ہیں کہ درختوں کو حکم دیں۔ تو وہ حاضر ہوں۔ جانوروں کو ارشاد فرمائیں۔ تو وہ لبیک کہتے ہوئے دوڑے آئیں۔ پتھروں کو حکم دیں۔ تو وہ کلمہ پڑھنے لگیں۔ اُدھر چاند کی طرف اشارہ کرکے اس کے دو ٹکڑے کر دیں۔

وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس میں ہے کہ اس نبی امی کا حال تورات
اور انجیل میں ہوگا۔ وہ نیکی کا حکم دیگا۔ برائی سے روکے گا۔ حلال و حرام
کے حدود کا تعین کرے گا۔ اور لوگوں کے بوجھ ہلکے کرے گا۔ اور جو لوگ اسکی
پیروی کریں گے اور اس کے ہمراہ آنے والے نور کی وہی کامیاب ہوں گے۔ پرویز
صاحب کہتے ہیں کہ نبی کی پیروی سے مراد قرآن کی پیروی ہے۔ یا اگر نبی کی
پیروی کا حکم قرآن میں ہے بھی تو وہ اس کی زندگی تک تھا۔ اور جونہی نبی امی
دار بقا کو جانے لگا تو اتباع رسول کے معنی اتباع امیر کے ہو گئے۔ مگر اس آیت
میں جس شخص کی پیروی کا حکم دے کر اس کی پیروی کو کامیابی کا باعث ٹھیرایا
گیا ہے۔ اس کی کئی خصوصیات کو بھی پیش کیا گیا ہے جو بغیر اس نبی امی کے
کسی بھی اور امیر کے اندر کبھی جمع نہیں ہوئیں۔ کیونکہ امیر جو بھی ہوگا۔ وہ نہ نبی امی
ہوگا اور نہ اس کی صفات تورات و انجیل میں ہوں گی۔ نہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ نے
اس کی بشارت دی ہوگی۔ اور اس کے ساتھ جب یہاں نبی امی اور اس کے ہمراہ
آنے والے نور کی پیروی کا یکساں حکم موجود ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک
پیروی دوسری کے اندر گم ہو جائے۔ یا ایک وقتی ٹھیرا لی جائے اور دوسری دائمی
اس بنا پر اس آیت کے رو سے نبی امی اور قرآن دونوں کی اطاعت لازم ہے اور
اس میں نہ امیر کی رعایت ہے اور نہ مامور کی اور اس کے پیش نظر جو آدمی امیر
کی اطاعت کرے مگر نبی کی نہ کرے یا خود امیر بھی نبی کی اطاعت سے منہ موڑ
دے۔ وہ کسی طرح کامیاب نہیں ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی یہاں اس پہلو سے بھی غور کرنا ضروری ہے کہ اس بیان
میں حضرت موسیٰ کو بتایا گیا کہ نبی امی کا تورات و انجیل میں بھی حال درج
ہوگا۔ اور اس کے زمانہ والے اسے ان کے اندر پائیں گے۔ یہاں سوال پیدا

غروب شدہ سورج کو واپس لے آئیں۔ تو اس قدر طاقت اور اتنی قدرت رکھنے والا رسول، جس اللہ کا رسول ہے۔ وہ اللہ کیوں نہ وحدہٗ لاشریک ہوگا۔ اور اس کی طاقتوں، اور قدرتوں کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اللہ جس نے اپنے رسول کو اتنی طاقت و قدرت اور تصرف واختیار بخش دیا ہے۔ وہ خود کتنی زبردست طاقت اور قدرت کا مالک ہوگا۔

میرے بھائیو! یہ تو ہے اہلِ سنّت کا عقیدۂ حقہ! اور جو لوگ رسول کو محض اپنے جیسا ایک بشر کہتے ہیں۔ اور اسے عاجز و ذلیل اور ذرّہ ناچیز سے بھی کمتر سمجھتے ہیں۔ ان کے اس عقیدۂ باطلہ کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ ایسے رسول کا بھیجنے والا بھی کسی کام کا نہیں۔ اور کوئی طاقت و قدرت نہیں رکھتا۔ اگر کچھ رکھتا ہوتا۔ تو اپنے رسول کو تو کچھ دے کر بھیجتا تو بھائیو! اب خود ہی فیصلہ کر لو۔ حق پر کون ہے؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

اسی طرح یہ بات بھی سمجھ لیجئے۔ کہ جو لوگ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں۔ وہ اچھا نہیں کرتے اس لئے کہ اس کا اثر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر جا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ مریدوں کے اعمال سے پیر کا اور شاگردوں کے علم سے استاد کا پتہ چلتا ہے۔ کہ مریدوں کا پیر، اور شاگردوں کا استاد کیسا ہے، مرید اچھے تو پیر بھی اچھا۔ مرید بے دین تو پیر بھی ویسا۔ شاگرد فیل ہوگئے تو گویا استاد ہی قابل نہ تھا۔ تو صحابہ کرام کو اگر یہ تسلیم کیا جائے۔ کہ وہ سارے مرتد ہوگئے (معاذ اللہ)، تو گویا یہ حضور پر اعتراض ہے۔ کہ اچھے رسول تھے۔ کہ جن کے شاگرد سب کے سب فیل ہوگئے۔ تو دوستو! اس عقیدہ باطلہ سے پناہ مانگو۔ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق یہ ایمان رکھو کہ وہ سب کے سب سچے مومن، اور ساری امت سے افضل و اعلےٰ تھے۔ اور ان سب سے بہتر حضور کے چار یار، اور پھر ان چاروں میں سب سے بہتر حضرت افضل الامۃ بالتحقیق سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

ہوتا ہے کہ جب تورات خود حضرت موسیٰ پر ہی نازل ہوئی تو پھر انہیں یہ کیوں بتانا ضروری ہوا کہ اس کے اندر نبی امی کے متعلق یہ اور یہ لکھا ہوگا۔ کیا حضرت موسیٰ خود تورات سے واقف نہ تھے اور جب واقف تھے اور پھر انہیں وحی کے ذریعہ وہ کچھ بتایا گیا جو تورات میں موجود تھا تو معلوم ہوا کہ تورات کے علاوہ بھی انہیں وحی کی جاتی تھی۔ ادھر پرویز صاحب کے انکارِ حدیث کی بنیاد ہی یہ مفروضہ ہے کہ کسی نبی کو بجز کتاب کے اور کوئی وحی نہیں کی گئی۔ چنانچہ اس آیت کا یہ بیان اس مفروضہ کو باطل کرتا ہے۔

پھر اس کا ایک اور فائدہ یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ خدا نے تورات اور انجیل میں نبی امی کا حال درج کرنے کے ساتھ حضرت موسیٰ کو اور اسی طرح حضرت عیسیٰ کو ان کتابوں کے خارج بھی اس کے حالات سے آگاہ فرمایا تاکہ بعد میں اگر کوئی جھوٹا مدعی قادیانی نبی کی طرح اپنے نبی امی ہونے کا دعویٰ لے کر میدان میں اترے تو اس کا راستہ ان کتابوں سے اور ان کے ماننے والے حضرات کے بیانات سے روکا جاسکے اور اس کے لئے لازم ٹھہرے کہ اپنے دعویٰ کو ان کے اور ان کی کتابوں کے بیانات کے حرف بحرف مطابق بنا کر پیش کرے اور اس طرح اس کا راستہ خاصا دشوار ہو۔ یہی فائدہ آج کے زمانہ میں قرآن کے ساتھ حدیث رسول کا بھی ہے تاکہ اگر کوئی قرآن کو من مانے معنی پہنانے لگے تو اس کا راستہ حدیث کے ذریعہ یہ کہہ کر روکا جاسکے کہ صاحب آپ کا قرآنی فہم اس شخص کے فہمِ قرآن کے خلاف جا رہا ہے جس پر قرآن نازل ہوا تھا۔

اس بیان کا دوسرا نقطہ یہ ہے کہ نبی امی لوگوں کو نیکی کا حکم اور برائی کی ممانعت کریگا۔ پرویز صاحب کے نزدیک اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ قرآن کے اندر جو حکم اور ممانعت وارد ہوئی تھی۔ اسی کو اس نبی کی طرف

ذرا پڑھئے تو ؎

نبیوں کے بعد ہیں سب سے بہتر	رضی اللہ تعالٰے عنہ
مولانا صدّیق اکبر	رضی اللہ تعالٰے عنہ
یار کے نام پہ مرنے والا	سب کچھ صدقے کرنے والا
منزلِ عشق و صدق کا رہبر	رضی اللہ تعالٰے عنہ
جان و مال اور کنبے والے	اللہ اللہ! ہیں کرڈالے
نامِ نبی پر سارے نچھاور	رضی اللہ تعالٰے عنہ
غار کا دیکھو تو وہ منظر	کون ہے بیٹھا گود میں لیکر
سرورِ عالم کا سرِ انور	رضی اللہ تعالٰے عنہ
نظم بشیر کی جس دم سُن لی	جن و بشر اور حور و ملک بھی
کہنے لگے یوں سارے مل کر	رضی اللہ تعالٰے عنہ

رضی اللہ تعالٰے عنہ
رضی اللہ تعالٰے عنہ

تو میرے دوستو! اپنا عقیدہ درست رکھو۔ اور "محمد رسول اللہ" صلے اللہ علیہ وسلم کی شان عالی کو خدا کے بعد سب سے بلند و بالا سمجھو۔ اور اس قدر عظیم الشان رسول سے والہانہ محبت و عقیدت رکھو۔ دیکھو" محمد رسول اللہ" صلے اللہ علیہ وسلم کچھ ایسے محبوب ہیں کہ نہ صرف خدا ہی کے بلکہ خدائی بھر کے محبوب ہیں۔ نہ صرف انسانوں ہی کے بلکہ حیوانات وجمادات بھی حضور کی عظمت و محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔ چنانچہ صحیح حدیث کا واقعہ ہے۔

استن حنانہ کا قصّہ

کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنی مسجد شریف میں منبر بننے سے قبل کھجور کے ایک ستون سے تکیہ لگا کر وعظ فرمایا کرتے تھے۔ جب منبر بن گیا۔ تو آپ نے اس پر خطبہ فرمایا۔ ستون نے دیکھا۔ تو رونے لگا۔ اس حدیث کا ترجمہ مثنوی شریف کی زبان سے سنئے! مولانا رومی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ ؎

استنِ حنانہ از ہجر رسول	نالہ می زد ہمچو اربابِ عقول

منسوب کر دیا گیا جس پر قرآن نازل ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے حکم اور ممانعت کا اصل مرکز و منبع جب قرآن تھا تو پھر مقام تعریف کا تقاضا تھا کہ حضرت موسیٰ کے سامنے قرآن ہی کی بزرگی کو پیش کیا جاتا۔ نہ کہ نبی امی کی بزرگی کو۔ اور جب ایسا نہیں ہوا تو یہ مطلب باطل ہے کہ قرآن کے حکم اور ممانعت کو نبی کا حکم اور ممانعت کہا جائے۔

اس کا دوسرا مطلب آپ کے ہاں یہ ہے کہ جو حکم اور ممانعت خدا کی کتاب میں ہوگی اسی کو نبی امی لوگوں کے سامنے پیش کرے گا۔ یہ مطلب لینے میں دو طرح کا فساد ہے ایک یہ کہ قرآن میں جب جو حکم وارد ہوا کہ نیکی کا حکم کرو۔ اور برائی سے منع کرو۔ تو اس حکم پر عمل کرنے میں کون سا کمال ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسے وضو اور تیمم کرنا کوئی بڑا کام نہیں۔ خواہ یہ کام رسول کرے یا ہم کریں پھر نبی امی کی ایسی صفت جس میں وہ دوسرے قرآن ماننے والوں سے کچھ بھی فائق نہ ہو۔ ایسے اس کی بڑائی کے طور پر حضرت موسیٰ کے سامنے بیان کرنا بالکل بے معنی تھا۔ اس وجہ آنحضور نیکی کے حکم اور برائی کی ممانعت کرنے میں دوسرے تمام لوگوں سے نہ صرف فائق تھے بلکہ اتنے اس کام میں سرگرم ورکر تھے کہ خود ذات رب العالمین کو بار بار کہنا پڑا کہ تجھے اپنے آرام کا خیال رکھو۔ اور نہ صرف آرام لو بلکہ آرام کے وقت نہ ماننے والوں کے غم میں دبلے پتلے بھی نہ ہو۔ یہ بات کسی دوسرے مبلغ کو تو قرآن میں کہیں نہیں کہی گئی کہ تم قرآن پر عمل کرتے کرتے تھک جاؤ گے تھک جانا تو کجا دوسرا کوئی ایسا بھی نہ ہو سکا جو ان احکام کی تعمیل میں پورا اترتا۔ اور اپنی تعمیل میں کوئی کسر نہ چھوڑتا۔ بخلاف اس کے نبی امی نے نہ صرف تعمیل ہی مکمل کر دی بلکہ ادائے فرض کے مقام سے کہیں آگے نکل گیا۔ یہاں تک کہ

یعنے یہ ستون فراق رسول میں عقلمند انسانوں کی طرح رونے لگا۔

در تحیرّ ماند اصحابِ رسول! کز چہ می نالد ستون با عرض و طول

صحابہ کرام حیران رہ گئے۔ کہ یہ ستون کیوں روتا ہے؟

گفت پیغمبر چہ خواہی اے ستون! گفت جانم در فراقت گشت خوں!

حضور نے فرمایا۔ اے ستون کیا چاہتے ہو؟ ستون نے عرض کیا کہ حضور آپ کے فراق میں جان خون ہو گئی ہے۔

مسلمانو! دیکھو ایک ستون حضور کی محبت میں کس طرح رو رہا ہے۔ اور عرض کر رہا ہے۔ کہ حضور آپ کے فراق میں مر رہا ہوں۔ آپ نے اب مجھ سے تکیہ لگانا چھوڑ دیا ہے۔ اور منبر کو مشرف فرمانا شروع کر دیا ہے۔

آیئے! اب آپ کو اس حدیث کے وہ الفاظ سناؤں۔ جو حضور نے اس ستون کو ارشاد فرمائے۔ حضور نے اُسے فرمایا:-

اِنْ شِئْتَ اَرُدُّكَ اِلَى الْحَائِطِ الَّذِىْ كُنْتَ فِيْهِ تَنْبُتُ لَكَ عُرُوْقُكَ وَ يَكْمُلُ خَلْقُكَ وَ يُجَدِّدُ لَكَ خُوْصٌ وَ ثَمَرَةٌ وَ اِنْ شِئْتَ اَغْرِسُكَ فِى الْجَنَّةِ فَتَاْكُلُ اَوْلِيَاءُ اللّٰهِ مِنْ ثَمَرِكَ "

یعنی اگر تم چاہو تو میں تمہیں پھر لگا دوں۔ جہاں تم پہلے تھے۔ تمہاری شاخیں پھر نکل آئیں۔ اور تمہاری خِلقت کی تکمیل ہو جائے اور تمہیں پھر سے پھل لگ جائے۔ اور اگر چاہو۔ تو میں تمہیں جنت میں لگا دوں۔ تاکہ اللہ کے اولیاء تمہارا پھل کھائیں"

حدیث میں ہے کہ حضور نے اس سے یہ فرمایا۔ تو وہ ستون بولا۔ یا رسول اللہ! آپ مجھے جنت میں لگا دیجئے۔ تاکہ اولیاء اللہ میرا پھل کھائیں۔ اور میں ہمیشہ کے لئے قائم رہوں۔

فَقَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَدْ فَعَلْتُ

حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔ "اچھا میں نے ایسا کر دیا۔ (مواہب الدنیہ ص۳۶۶ جلد ۱)

خود ڈیوٹی دینے والے خدا کو سمجھانا پڑا کہ اب ہماری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تمہیں مزید محنت کی حاجت نہیں یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول نے جو کام اپنے فرائض سے زیادہ بڑھ کر انجام دیا وہ کس ہدایت کے تحت خدا کی رضا کا باعث ہوتے۔ مثلاً اگر ایک آدمی پانچ کی بجائے چھ نمازیں ادا کرتا ہے تو اسکی چھٹی نماز چونکہ خدا کی ہدایت کے مطابق نہیں ہوگی اس لئے اس کی رضا کا باعث بھی نہیں ہوگی۔ پھر نبی امی نے جب اپنے فرض سے بڑھ کر نیکی کا حکم اور برائی کی ممانعت کی یا زندگی کے ان گوشوں میں کی جو براہ راست قرآن کی زد میں نہ آتے تھے تو اس کے لئے ہدایت کہاں سے آئی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہدایت اُسے قرآن کے خارج اس وحی کے ذریعہ حاصل ہوتی جس کے تحت وہ ہر حال میں رہتا تھا۔ نہ خودسر تھا اور نہ غلط کار۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ جزئیات میں خودسری اور غلط کاری کی پرواہ نہیں۔ مگر قرآن کا یہ دعویٰ اس مفروضہ کو باطل کرتا ہے کہ رسول کا ہر عمل وحی کے تحت انجام پاتا تھا۔

اس مطلب میں دوسرا فساد یہ ہے کہ اگر آنحضور قرآن کے بیان کے مطابق ہی نیکی کا حکم اور برائی کی ممانعت کرتے تھے تو اس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ جب تک قرآن میں ایک حکم نہ آیا مثلاً یہ کہ سچ بولو۔ تو آپ نے سچائی کا حکم نہ فرمایا اور جب تک قرآن میں جھوٹوں پہ لعنت وارد نہ ہوئی آپ نے جھوٹ سے منع نہ فرمایا مبادا کہیں قرآن میں سچائی کی ممانعت اور جھوٹ کا حکم نہ آجائے۔ اور لوگوں کے منہ شرمندہ ہونا پڑے۔ ذرا سوچئے نیکی

۱؎ قرآن میں آنحضور کو فرمایا گیا کہ تم کہو ان اتبع الا ما یوحی الی۔ میں تو وحی کی پیروی کے سوا کچھ بھی نہیں کرتا۔ پرویز صاحب اس پہ یہ اضافہ خود کر دیتے ہیں کہ وحی صرف قرآن ہے

احمدِ مختار

مسلمانو! غور کرو اس حدیث کے الفاظ مقدسہ پر۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اس ستون سے یوں فرماتے ہیں۔ کہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں یہاں دنیا میں لگا دوں اور اگر چاہو تو میں تمہیں جنت میں لگا دوں۔ گویا حضور اپنے وسیع اختیار و تصرف کا اظہار فرما رہے ہیں۔ کہ تم اپنی حاجت بیان کرو۔ تم جو کہو گے۔ ہم وہی کر دینگے پھر جب اس درخت نے جنت میں لگائے جانے کا کہا۔ تو حضور نے فرمایا قَدْ فَعَلْتُ جاؤ میں نے ایسا ہی کر دیا۔ سبحان اللہ! کیسا وہابیت کُش جملہ ہے کہ میں نے ایسا کر دیا۔ کیا کر دیا؟ تمہیں جنت میں لگا دیا۔ کیوں دوستو! کیا یہ ہمارے حضور کے اختیار و تصرف کی چمکتی ہوئی دلیل نہیں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہو رہا۔ کہ حضور جو چاہیں کریں۔ یہ ان کو اپنے اللہ سے اختیار حاصل ہے۔ اور وہ احمدِ مُختار ہیں۔ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم)

ہاں تو بھائیو! اس ستون کا قصہ ملاحظہ فرما لیا آپ نے اب آپ خود ہی انصاف کریں۔ کہ ایک خشک لکڑی تو حضور سے اس قدر محبت و الفت رکھے۔ پھر وہ جس کے دل میں ایسے محبوب کی محبت نہ ہو۔ اس سے زیادہ بدنصیب اور کم بخت کون ہوگا۔

حضرات! میں اپنی تقریر ختم کرنے سے قبل ایک اور اپنی لکھی ہوئی نعت سنانا چاہتا ہوں۔ ابتداءِ تقریر میں آپ نے نام "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حروف کے متعلق نظم سنی۔ لیجئے آخر میں بھی اسی نام پاک کے حروف ہی کے متعلق میری ایک دوسری نظم بھی سنئے اور سر دھنئے۔

پہلے درود شریف پڑھئے:۔

صَلَّی اللّٰہ علیکَ وَسَلَّمْ یا رسول اللّٰہ

صَلَّی اللّٰہ علیکَ وَسَلَّمْ یا حبیب اللّٰہ

کا حکم اور برائی کی ممانعت کرنے والے جس مبلغ کی یہ پوزیشن ہو۔ وہ اس قابل کب ہوتا ہے کہ خدا حضرت موسیٰ کے سامنے اس کی تعریف فرماتے اور تعریف بھی ان الفاظ میں کہ وہ نیکی کا حکم اور برائی کی ممانعت کرے گا۔ حالانکہ اگر وہ قرآن میں بیان شدہ حکم اور ممانعت کو ہی لوگوں کے سامنے پیش کرتا تو کبھی اس تعریف کا مستحق نہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ اسے قرآن کا پابند کہا جاتا۔

تیسرا نکتہ اس بیان میں یہ ہے کہ نبی امی پاکیزہ چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام ٹھیرائے گا۔ پرویز صاحب کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی امی کو خدا کی طرف سے جو کتاب ملیگی اسی سے وہ حلال و حرام کے احکام بیان کریگا۔ یہ مطلب بھی اوّل امر کے طور پر اس لئے باطل ہے کہ اس طرح اصل بزرگی قرآن کی ثابت ہوتی ہے جس کی بجائے نبی امی کی عظمت کو حضرت موسیٰ کے سامنے خدا کا بیان کرنا خلاف حق تھا دوسرے اس لئے کہ بہت ایسی چیزیں جن کے حلال ہونے یا نہ ہونے کا قرآن میں ابتدائے نزول کے وقت اور بعض کا آخر زمانہ تک فیصلہ نہ آیا۔ انہیں نہ صرف حلال ٹھیراتا تھا بلکہ خود بھی استعمال میں لاتا تھا۔ اور بعض نہ صرف حرام ٹھیراتا تھا بلکہ خود بھی ان سے بچتا تھا۔ ایسے حال میں یہ کیونکر ممکن تھا۔ کہ آپ قرآن کی نزولی رفتار کے ساتھ احکام کے انتظار میں رہ کر ان چیزوں کے متعلق کوئی فیصلہ دیتے اور نہ خود ان کے استعمال میں حلال اور حرام کا اہتمام فرماتے۔ بخلاف اس کے قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ نبی امی کا دامن اوّل روز سے ناپاک چیزوں سے پاک اور پاک چیزوں کو سمیٹے ہوئے تھا اس کی دلیل یہ امر واقعہ ہے کہ قرآن میں مخالفین کے الزامات و اعتراضات کا جو

حروفِ محمد

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

"م"

کلمہ میں میم اور مسلمان میں بھی "میم" — اسلام میں ہے میم تو ایمان میں بھی میم
جو صوم میں ہے میم تو رمضان میں بھی میم — رحمت میں ہے جو میم تو رحمان میں بھی میم

اس میم کا ہے جلوہ رحیم و کریم میں
کیا برکتیں ہیں دیکھو محمد کے میم میں

ہے آسماں میں میم زمیں میں بھی میم ہے — اور ہے مکان میں میم مکیں میں بھی میم ہے
الہام اور روحِ امیں میں بھی میم ہے — رقم، قلم میں لوحِ مبیں میں بھی میم ہے

اس میم کی بہار ہے باغِ نعیم میں
کیا برکتیں ہیں دیکھو محمد کے میم میں

گر حمد میں ہے میم تو حامد میں میم ہے — اور مردِ حق میں میم مجاہد میں میم ہے
اور میم ہے نماز میں مسجد میں میم ہے — اور میم ہے مرید میں مرشد میں میم ہے

اس میم ہی کا نور ہے قلبِ سلیم میں
کیا برکتیں ہیں دیکھو محمد کے میم میں

"ح"

اہلِ حیا کو "ح" سے ہی حاصل حیا ہوئی — حاصل شہیدِ حق کو حیات و بقا ہوئی!
اور دل میں پیدا "ح" سے ہی حُبِّ خدا ہوئی — "ح" سے حسین کو حُسن کی دولت عطا ہوئی

"ح" حج میں حجرِ اسود و بیت الحرام میں
کیا برکتیں ہیں "ح" کی محمد کے نام میں

یہ "ح" لحد میں ساتھ ہے راحت کے واسطے — محشر میں بھی ہے ساتھ یہ رحمت کے واسطے
وقتِ حساب ساتھ حمایت کے واسطے — ہر حال میں ہے ساتھ حفاظت کے واسطے

ریکارڈ ہے اور پرویز صاحب کے بقول نبی کی غلطیوں پر اُسے خدا کی طرف سے جو تادیب ہوئی۔ وہاں یہ کہیں بھی موجود نہیں کہ وہ پہلے بعض حرام چیزیں کھاتا رہا اور بعد میں انہیں سے منع کرنے لگا۔ یا پہلے جن چیزوں سے پرہیز کرتا تھا انہیں بعد میں حلال کہنے لگ گیا۔ تیسرے اس وجہ سے یہ مطلب باطل ہے کہ اگر ہم قرآن سے بتائیں کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام تو کوئی احمق ہوگا جو اِس پر حلال اور حرام کے اختیارات کو ہماری طرف منسوب کرے اور اگر کرے تو ہمارے ایمان کا تقاضا ہوگا کہ ہم اُسے ایسا کہنے سے باز رکھیں اور اِس الزام سے بری ہوں۔ لیکن جب حقیقت یہ ہے تو پھر وہ شخص کتنا بیوقوف ہے جو اسے ایک ایمان اور کفر کا سوال قرار دینے کی بجائے۔ یہ کہے کہ خدا نے مجازاً بھی رسول کو حلال و حرام کے اختیارات کا مجاز کر دیا ہے۔ ورنہ آپ صرف قرآن سے حلال اور حرام کے احکام بتلاتے تھے اور اس سے زیادہ کچھ بھی آپ کا منصب نہ تھا۔

اِن دوگونہ نکات میں یہ بھی قابل غور بات ہے کہ آنحضور نے جو کچھ حلال و حرام اور مطلوب و ممنوع ٹھیرایا۔ اس کی حیثیت کیا تھی۔ وہ لازم اور دائمی تھا یا نہیں۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے حلال و حرام ٹھیرایا وہ تو قانون کے طور لازم تھا۔ مگر تھا اسی وقت کے لئے۔ اور جو کچھ آپ نے حکم اور ممانعت کے طور پر فرمایا۔ اس کی حیثیت ایک مشورہ سے زیادہ کچھ

---

[1] ہے جن معاملات میں حضور اپنے ذاتی اجتہاد سے فیصلہ کیا کرتے تھے۔ ان فیصلوں میں غلطی کا امکان بھی تھا۔ چنانچہ کئی ایک موقعہ پر قرآن میں تادیب بھی آئی ہے۔ ص ۶۶۹

حل مشکلوں کو کرتی ہے ہر اک مقام میں
کیا برکتیں ہیں "ح" کی محمد کے نام میں

محبوب میں بھی "ح" ہے محبت میں بھی ہے "ح" ۔ حاکم میں ہے جو "ح" تو حکومت میں بھی ہے "ح"
گر "ح" حکیم میں ہے تو حکمت میں بھی ہے "ح" ۔ رحمٰن میں جو "ح" ہے تو رحمت میں بھی ہے "ح"

"ح" حیدر و حسین علیہ السلام میں
کیا برکتیں ہیں "ح" کی محمد کے نام میں

"م" (ثانی)

اس میم سے مراد ملی ہے مراد کو ۔ اس میم نے ملایا ہے حق سے عباد کو
اس میم نے مٹایا ہے کفر و عناد کو ۔ اس میم سے ہے موت جہانِ فساد کو

اس میم سے بہشت میں اپنا مکان ہے
کیا دوسری بھی میم محمد کی شان ہے

اس میم نے مٹائی ہے ظلمت قدیم کی ۔ اس میم نے دلائی ہے رحمت رحیم کی
اور ہے یہ میم ملجا و ماوائے یتیم کی ۔ مکہ مدینہ میں بھی تو برکت ہے میم کی

یہ میم مجرموں کو پیام امان ہے
کیا دوسری بھی میم محمد کی شان ہے

اس میم سے تو لطف ہے مولا کے نام میں ۔ اس میم ہی کا جلوہ ہے زمزم کے جام میں
اس میم ہی کا نور ہے بیت الحرام میں ۔ اس میم سے مدد ملی مشکل مقام میں

یہ میم ہی تو موجب ہر دو جہان ہے
کیا دوسری بھی میم محمد کی شان ہے

"د"

آدم ہوئے فرشتوں کے مسجود "دال" سے ۔ شیطاں جنابِ حق سے ہے مردود "دال" سے
حامد جو "دال" سے ہے تو محمود "دال" سے ۔ دونوں جہان ہو گئے موجود "دال" سے

دین اور دنیا دونوں محمد کا مال ہے

بھی نہیں تھی۔ یہ مفروضہ بھی خاصا عجیب ہے یعنی حکم دائمی اور اس کی شکل وقتی اُسے تسلیم کر لینے کے بعد پھر قرآن کا ردی کی ٹوکری کے بغیر اور کوئی مصرف باقی نہیں رہ جاتا۔

مثال کے طور پر روزہ اور نکاح کے حکم اور بے روزہ ہونے کی اور زنا کی ممانعت کو لیجئے۔[1] قرآن میں روزہ کا جب حکم آیا تو آنحضور نے اس کی تعمیل کی یہ شکل تجویز کی کہ رمضان کے تمام مہینہ میں صبح سے شام تک کچھ کھانے پینے اور شہوانی اعمال سے بچا جائے۔ پرویز صاحب کا مفروضہ یہ ہے کہ روزہ کا حکم دائمی سہی مگر اس کی اس شکل کو قائم رکھنا کچھ ضروری نہیں۔ جو رسول نے قائم فرمائی۔ اس بنا پر ہمیں اختیار ہے کہ مہینہ بھر کی بجائے چند روزے رکھیں۔ اور ان میں کھانے پینے کی بجائے ٹیکوں کے ذریعہ بھوک اور پیاس بجھائیں اور بوب وغیرہ کے ذریعہ شہوت کا دفعیہ کریں۔ نہ کہ مباشرت سے اور اس طرح حکم پورا ہو۔ اور ممانعت سے بھی بچا جائے۔

پھر نکاح کا حکم اور زنا کی ممانعت جو قرآن میں وارد ہوئی تو رسول نے اس کی شکل یہ ٹھیرائی کہ دو گواہوں کی موجودگی میں اعلانیہ طور پر ایک ایسی غیر شادی شدہ عورت سے ایک مرد کی شادی کا عقد ہونا چاہیئے۔ جو اس کے قریبی رشتہ میں سے نہ ہو۔ اور ایسا شادی کا عقد جس عورت سے نہ ہو اُسے نہ چھوا جائے۔ پرویز صاحب کا مفروضہ یہ ہے۔ کہ نکاح کا حکم اور زنا کی ممانعت ضرور دائمی ہے۔ مگر ان کی شکل کچھ بھی دائمی نہیں اس لئے انسان کو اختیار ہے کہ وہ دو آدمیوں کے سامنے ایک عورت سے

---

[1] رسالہ تجدید عہد لاہور۔ ۷/۱۰

بنیادِ دو جہان محمدؐ کا "دال" ہے

دانش میں ہے جو دال تو دانا میں دال ہے
دولت میں ہے جو دال تو دانا میں دال ہے

امداد میں ہے دال مداوا میں دال ہے
دُرِّ صدف میں دال ہے دریا میں دال ہے

ہر دل میں دال ہی کا تو دیکھو جمال ہے
بنیادِ دو جہان محمدؐ کا دال ہے

اس دال سے قبولِ خدا کو درود ہے
اس دال سے ہی دہر میں ہر اک وجود ہے

مردِ سخی کا دال سے فیض اور جود ہے
خوش دال سے شہید پہ ربِ ودود ہے

نزدیک و دور "دال" کا فیض کمال ہے
بنیادِ دو جہان محمدؐ کا "دال" ہے

★

فصلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

شادی کا معاہدہ[1] کرے۔ یا دو چار پالوں اور جیونیٹوں کے سامنے پھر کبھی شادی شدہ سے ایسا معاہدۂ شادی کرے۔ باقی جو چاہے کرتا رہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس معاملہ میں عہدِ رسالت کے احکام کو جو رعائت دیتے ہیں وہ یہی ہے کہ ان کے اندر جو کٹ وٹ کرنا ہو حکومت کرے۔ مگر سوچا جا سکتا ہے کہ یہ معیار ان مسلمانوں کے کسی کام کو نہیں آتا جو غیر مسلم حکومتوں کے رعایا ہوں اس سے پھر قرآنی احکام کے صروف کو قائم رکھتے ہیں۔ ان کی شکل کا جو حشر ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کر لینا کچھ بھی مشکل نہیں اور اس کا تدارک صرف اسی صورت ممکن ہے کہ احکام کو بعینہٖ اسی شکل پر باقی رکھا جائے جو نزولِ قرآن کے وقت ان کی قائم ہوئی اور اس طرح جو کچھ نبی امی نے حلال و حرام اور حکم و ممانعت فرمائی اسے بھی قائم رکھا جائے۔

اسی کے ساتھ ہی یہ پہلو بھی خاصا اہم ہے کہ اللہ نے تئیس سالہ مدت نزولِ قرآن کے ذریعہ نیکی و برائی اور حلال و حرام کے احکام کا ریکارڈ مکمل کرنے سے پہلے اوّل روز سے ہی آنحضور کو حلال و نیکی کو اختیار کرنے اور حرام و برائی سے بچنے کا حکم فرما دیا۔ چنانچہ اس وجہ سے آپ جہاں خود اس ضابطہ کے پابند اوّل روز سے ہو گئے وہاں اپنے پیروؤں کو بھی اس کا پابند بنایا اور وہ خود بھی اپنے آپ کو آنحضور کے قدم بہ قدم چلنے پر آمادہ پاتے تھے۔ اس سے آسانی کے ساتھ اس بات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ خدا نے اطاعت خدا و رسول کا اس تکرار و تاکید کے ساتھ کیوں حکم فرمایا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حلال اور حرام کے کسی حکم کے وارد ہونے پر نبی امی کو اپنے ذاتی عمل میں تو

---

[1] قرآن نے نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے۔ (قرآنی فیصلے) ص ۱۳۴

تیسرا وعظ

فضائلِ رسول

صلے اللہ تعالٰے علیہ وسلم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ وَالعَاقِبَۃُ لِلمُتَّقِینَ وَالصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی رَسُولِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ اَجمَعِینَ ؕ

اَمَّا بَعدُ

فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ ؕ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ؕ

تِلکَ الرُّسُلُ فَضَّلنَا بَعضَھُم عَلٰی بَعضٍ مِّنھُم مَّن کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعضَھُم دَرَجٰتٍ (پ۳ ع۲)

"یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں ایک دوسرے کو ایک دوسرے پر افضل کیا۔ ان میں کسی سے اللہ نے کلام فرمایا۔ اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلند کیا۔"

حضرات! آج میرے وعظ کا عنوان ہے "فضائلِ رسول" (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے آج حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی فضیلت و برتری اور حضور کے بیشمار فضائل و کمالات میں سے کچھ فضائل بیان کرنے ہیں۔ اس سے قبل آپ

.... کبھی کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور آپ کے پیرو بھی ہر حکم کے آنے سے پہلے سے ہی اس کے لئے تیار اور اس کی تعمیل کے منتظر رہتے تھے۔ اور احکام کا نزول ان کے لئے باعثِ "مشقت" ہونے کی بجائے انکی طلب کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوتا تھا

نویدِ مسیحا

"اور جب عیسٰی بن مریم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہاری طرف اللہ کا پیغامبر ہوں۔ اور اس تعلیم کو سچ کر کے دکھانے والا ہوں جو تمہارے پاس اس سے پہلے تورات میں آچکی ہے یاد رہیں تمہیں بشارت دینے والا ہوں اس رسول کی جو میرے بعد آئیگا۔ اور جس کا نام احمد ہوگا۔" ۱۶۱

یہ قرآن کی اس آیت کا مضمون ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت عیسٰی نے اپنی قوم کو آخری رسول کی بشارت انہیں الفاظ میں دی تھی۔ حضرت مسیح کے اس بیان میں حسب ذیل نکات قابلِ غور ہیں۔

۱۔ یہ بیان حضرت عیسٰی کی ایک حدیث ہے۔ اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ہم کے اور ہماری کتب حدیث میں درج شدہ حدیث رسول کے درمیان صرف اس قدر فرق ہے کہ اس کا راوی قرآن ہے۔ اور ہماری حدیث رسول کے راوی انسان ہیں اور اگر تھوڑا سا غور کیا جائے۔ تو یہ فرق بھی بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بشارت کو سننے والے چار فریق تھے۔ جن کے نزدیک اس بشارت کا قرآن کی سند کے ساتھ صادر ہونا بے مصرف تھا۔ پہلا فریق مسلمان لوگ تھے۔ جو آخری رسول کو پہلے ہی سے مان چکے تھے۔ اور اس کے محتاج نہ تھے۔ کہ انہیں حضرت عیسٰی کی بشارت کے ساتھ کچھ منوایا جاتا۔ دوسرا فریق مشرکین

میرے وعظ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر رسالت کا بیان سُن چکے ہیں۔ آج مجھے ذرا تفصیل سے یہ بیان کرنا ہے۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے سارے رسولوں (علیہم السلام) میں افضل و اعلےٰ ہیں۔ اور آپ سب کے سردار و سلطان ہیں (صلے اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم) آیئے وعظ سے قبل اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کی ایک نعت سارے مل کر پڑھیں۔

ہمارا نبی

سب سے اعلیٰ و اولیٰ ہمارا نبی　　سب سے بالا و والا ہمارا نبی
اپنے مولا کا پیارا ہمارا نبی　　دونوں عالم کا دولھا ہمارا نبی
بزمِ آخر کا شمع فروزاں ہوا　　نورِ اول کا جلوہ ہمارا نبی
جس کو شایاں ہے عرشِ خدا پر جلوس　　ہے وہ سلطان والا ہمارا نبی
بجھ گئیں جس کے آگے سبھی مشعلیں　　شمع وہ لے کر آیا ہمارا نبی
خلق سے اولیاء، اولیاء سے رسل　　اور رسولوں سے اعلےٰ ہمارا نبی
جیسے سب کا خدا ایک ہے ایسے ہی　　اِن کا اُن کا تمہارا ہمارا نبی
قرنوں بدلی رسولوں کی ہوتی رہی　　چاند بدلی سے نکلا ہمارا نبی
سارے اچھوں میں اچھا سمجھیے جسے　　ہے اس اچھے سے اچھا ہمارا نبی
سارے اونچوں میں اونچا سمجھیے جسے　　ہے اس اونچے سے اونچا ہمارا نبی
جس نے مردہ دلوں کو دی عمرِ ابد　　ہے وہ جانِ مسیحا، ہمارا نبی
جس کی دو بوند ہیں کوثر و سلسبیل　　ہے وہ رحمت کا دریا ہمارا نبی

غمزدوں کو رضاؔ مژدہ دیجے کہ ہے
بیکسوں کا سہارا ہمارا نبی

پڑھیے درود شریف!

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللہ!
اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا حَبِیْبَ اللہ

مکہ کا تھا۔ جو آخری رسولؐ، قرآن اور حضرت عیسیٰ تینوں کے یکساں منکر تھے۔ اور ان کے ہاں اس بشارت کا کوئی وزن نہ تھا۔ تیسرا فریق یہود کا تھا۔ اور ان کا بھی یہی حال تھا جو تھا فریق عیسائیوں کا تھا جو حضرت عیسیٰ کو تو مانتے تھے مگر قرآن کے منکر تھے اور اس کے ذریعہ دی گئی بشارت کا ان کے ہاں کچھ بھی اہتمام نہ تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر یہ بیان ہمارے رسولؐ کی حدیث سے فائق تو کیا اس کے برابر بھی نہیں۔ اور یہ کہنا کچھ بھی بے جا نہیں کہ اس حیثیت میں اسے قرآن کے اندر لانے کی ضرورت کو ثابت کرنا محال سا ہے۔ سوائے اس کے کہ ہم اپنی سمجھ پر چلتے ہوئے اسے قرآن سے بے مقصد سمجھ کر چھانٹنے کی بجائے خدا کے اس قاعدہ کو حکیمانہ ٹھیرائیں جس کے تحت اس نے اسے قرآن میں محفوظ رکھا۔ اور ایک رسول کا کلام ہونے کی حیثیت سے اس کی قدر کریں۔ پھر جب اسے اس پوزیشن میں محفوظ رکھا گیا تو کیا وجہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قابلِ حفاظت نہ ہو جسے تاریخی حیثیت سے دنیا بھر کے لوگ مانتے ہیں اور دینی حیثیت سے مسلمان مانتے ہیں۔

۲۔ اس بیان میں بشارتِ رسول کے ساتھ تورات کی تصدیق بھی موجود ہے۔ اس طرح جہاں آسمانی کتاب اور رسولؐ کی یکساں اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ وہاں اس سے اور قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تصدیق کا دائرہ کیا ہے۔ اگر ایک غیر مسلم کے پاس قرآن موجود ہو تو آپ غیر مسلم کی نہیں بلکہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس کی تصدیق کریں گے۔ اور اگر مسلمان کے پاس قرآن ہو۔ تو آپ قرآن اور مسلمان دونوں کی تصدیق کر سکیں گے لیکن اگر رسولؐ کے پاس قرآن ہو تو قرآن کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں کی تصدیق کرنا لازم ہے۔

لہ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ حدیث رسول ہماری تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ہم درخواست کریں گے کہ خدارا حدیث کے ناتواں کندھوں کو اس احسان کے بوجھ سے معاف رکھا جائے کیونکہ اس پر یہ احسان رکھنے والے غیر مسلم کافی ہیں

میرے بزرگو! دوستو!! اور عزیزو!!! اس آیت کریمہ میں جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی۔ خداوند کریم نے اپنے رسولوں کا ذکر فرمایا ہے کہ یہ رسول ہیں جنہیں ہم نے مدارج و مراتب کے لحاظ سے ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے نفسِ رسالت میں تو سارے رسول یکساں اور برابر ہیں۔ مگر مدارج و مراتب کے لحاظ سے بعض رسولوں کو دوسرے رسولوں پر فضیلت و برتری دی گئی ہے مثلاً خدا نے فرمایا :-

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ - "ان میں کسی سے اللہ نے کلام فرمایا"

یہ اشارہ ہے حضرت موسٰے کلیم اللہ علیہ السلام کی طرف۔ یعنی اللہ نے حضرتِ موسٰے علیہ السّلام سے کوہِ طور پر کلام فرمایا۔ اور اس کے آگے یوں فرمایا :-

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ - اور کوئی وہ ہے۔ جسے سب پر درجوں بلند کیا۔ یعنے ایک ذات بابرکات ایسی بھی ہے۔ جو ان تمام رسولوں سے درجوں بلند و بالا ہے۔ اور جسے سب رسولوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے۔ خدا نے یہ کس کے لیے فرمایا۔ سنئے!

لِاَنَّهٗ اَرَادَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَنَّهٗ هُوَ الْمُفَضَّلُ عَلَيْهِمْ — (روح البیان صفحہ ۲۶۷ ج۱) — اس (رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ) سے مراد حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و سلم ہیں۔ اس لئے کہ حضور نے ہی سارے رسولوں پر فضیلت پائی ہے"

تو میرے بھائیو! اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سارے رسولوں سے افضل و اعلٰے اور سب کے سردار و سلطان ہیں۔ اور یہ بات ایک ایسی حقیقت ہے۔ جسے بچہ بچہ جانتا ہے۔ اور کوئی مردود ہی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے۔ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش جتنے پیغمبر بھی تشریف لاتے۔ سب سے بلند و بالا ہیں۔ یہاں مجھے ایک پُر لطف بات یاد آ گئی۔ ایک مجلس مشاعرہ میں جہاں سارے مسلمان شعراء جمع تھے۔ ایک عیسائی شاعر بھی آ گیا۔

اور اس صورت میں صرف ایک ہی کی تصدیق پر اکتفا کرنا دونوں کو جھٹلانے کے برابر ہے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ صرف قرآن کی تصدیق کافی ہے. خواہ وہ غیر مسلم کے پاس ہو یا مسلمان کے پاس ہو یا پیغمبر کے پاس ہو. بہرحال حضرت عیسیٰ کے اس بیان سے واضح ہے کہ انہوں نے تورات کی تصدیق تو کی. مگر اس کی حامل قوم یہود کی تصدیق سے آپ خاموش رہے۔

۲. اس بیان میں ہے. کہ حضرت عیسیٰ نے ایسا فرمایا اور جب فرمایا تو انہیں وحی کے بغیر یہ کیسے پتہ چلگیا کہ آنے والا رسول آئے گا بھی اور اس کا نام احمد بھی ہوگا. پرویز کہتے ہیں کہ یہ ان کی آسمانی کتاب میں لکھا تھا. اور وہاں سے انہیں اس کا پتہ چل گیا. مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی کسی کتاب یا خط سے ایک بات نقل کرتا ہے تو اسے اس کا قائل کہنے کی بجائے کتاب کا ناقل یا قاری کہا جاتا ہے. اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہزار میل سے آیا ہوا خط پڑھ کر جب کوئی اس سے خبر بیان کرے تو سننے والے خط کے حوالہ کے بغیر مان جائے. اور اگر ہم فرض کرلیں کہ حضرت عیسیٰ نے ایسا کیا ہو تو پھر ان کی دماغی حالت کا اطمینان بھی ختم ہوجاتا ہے. اور انسان کو سوچنا پڑجاتا ہے کہ کیا انہیں یہ علم نہ تھا کہ جو بشارت ان کی کتاب میں ہے وہ ان کے بتائے بغیر بھی لوگ جان لیں گے! اور یہ کیسے معقول ہو سکتا ہے کہ پورا بیان جو ایک روانی کے ساتھ اول سے آخر تک انجام پائے اس میں تورات کی تصدیق وہ خود کریں. اور آخری رسول کی بشارت انکی کتاب دے. لیکن اگر کوئی اصرار کرے کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ کی کتاب میں موجود تھی اور اسی کی بشارت کو خدا نے حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب فرمایا تو ہم کہیں گے کہ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے نزدیک جسقدر حضرت عیسیٰ مقبول عام تھے اس قدر انکی کتاب نہ تھی. اگرچہ ایسا ماننے سے اسکا طلاق واقع ہونا پھر بھی محل نظر ہوگا.

ایک مشاعرہ میں عیسائی کو جواب

اور بڑے فخر کے ساتھ مسلمان شعراء کو مخاطب کر کے کہنے لگا ؎

فلک پر ابنِ مریم کا مکاں ہے — محمدؐ تو زمیں پہ بے گماں ہے!
جو اونچا ہے وہی افضل رہیگا — جو نیچے ہے بھلا افضل کہاں ہے؟

یعنے اے مسلمانو! تمہارا اپنا بھی عقیدہ یہ ہے۔ کہ ہمارے عیسےٰ علیہ السلام زندہ آسمانوں پر موجود ہیں۔ اور تمہارے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) زمین پر قبرانور میں آرام فرما ہیں۔ تو ہمارے پیغمبر اوپر ہوئے۔ اور تمہارے نیچے۔ تو جو اُوپر ہے۔ افضل بھی وہی ہے نہ کہ جو نیچے ہے۔

یہ سُن کر ایک مسلمان شاعر اٹھا اور بولا۔ اے عیسائی! سُن اس کا جواب۔ ؎

ترازو کو اٹھا کر دیکھ ناداں! — وہی جُھکتا ہے جو پلّہ گراں ہے

یعنے ترازو کے ایک پلہ میں سیر رکھو۔ اور ایک پلہ میں چھٹانک، اور پھر اُس ترازو کو اٹھا کر دیکھو۔ کونسا پلہ اوپر جاتا ہے۔ اور کونسا نیچے رہتا ہے؟ — عیسائی بولا۔ سیر والا پلہ نیچے رہیگا۔ اور چھٹانک والا اوپر ہو جائیگا۔ مسلمان نے کہا۔ بس تو اسی طرح ہمارے حضور کا مرتبہ بھاری تھا۔ وہ نیچے رہے۔ اور جن کا ہمارے حضور سے مرتبہ ہلکا تھا، وہ اوپر تشریف لے گئے۔ عیسائی شاعر مبہوت ہو کر رہ گیا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمۃ کا ایک عیسائی کو جواب

اسی طرح حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک واقعہ ہے۔ آپ سے بھی ایک عیسائی نے یہی بات کہی اور آپ نے بڑا پُر لطف جواب دیا۔ چنانچہ آپ خود ایک رباعی میں اس سوال و جواب کا ذکر فرماتے ہیں۔ فرمایا ؎

کسے بگفت کہ عیسےٰ ز مصطفےٰ اولیٰ است
کہ ایں بزیرِ زمیں است آں باوجِ سما است

یعنی مجھ سے کسی عیسائی نے کہا کہ عیسےٰ علیہ السلام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن کی اس روایت کو خدا نے اس عیسائی قوم کے سامنے پیش فرمایا جو قرآن کی منکر تھی صرف اس بنا پر کہ آنجناب کی بات دینی حجت نہ تھی۔ تو اس دینی حجت کو ان کے علما نے مذہب چھپا رہے تھے۔ اور قرآن کے ذریعہ اس کا پردہ سے باہر آنا ممکن تھا۔ ان کے علما کا چھپانا اور خدا کا اس بیان کو ظاہر فرمانا یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے حکم کا عوام کے ہاں اور خدا کے نزدیک یکساں دینی حجت ہونا مسلم تھا۔

۵۔ یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ رسول کی طرف سے ظاہر ہونے والا بیان اوّل مرتبہ میں اس حیثیت سے قابل غور ہوتا ہے۔ کہ وہ رسول کا بیان ہے۔ جب اس کے ایسا ہونے میں شک گذرے تو دوسرے مرتبہ میں اس کا وہ ذریعہ قابل غور ہوتا ہے۔ جو اس کی وصولی کا باعث ہوا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس عیسائی قوم کی طرف اس بیان کا روئے سخن ہے۔ اس کے نزدیک قرآن تو کچھ بھی سند کا کام نہیں دے سکتا تھا۔ ان کے ہاں اگر کچھ قابل غور بات ہے تو اس میں صرف یہ امر ہے کہ آیا یہ حضرت عیسیٰ کا بیان ہو سکتا ہے۔ یا نہیں۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ بیان ہیں اصل چیز اس کی یقینی سند ہے۔ مگر قرآن کا یہ بیان آپ کے اس مفروضہ کو باطل کرتا ہے۔ اور اسے بھی کہ ہماری حدیث رسول کی سند قرآن کی طرح یقینی نہیں۔

۶۔ قرآن میں حضرت عیسیٰ کے اس تاریخی واقعہ کو دینی حجت کا مقام دلایا گیا ہے جس کا تقاضا یہ تھا۔ کہ جس آخری رسول کی اس میں بشارت ہے۔ اسے مانا جائے اور یہ بیان انہیں ایک طرح کا حکم ہے۔ کہ تم آخری رسول کو مان لو۔ پرویز صاحب کہتے ہیں تاریخ کا یہ مقام کبھی نہیں کہ اس سے کوئی دین کا حکم ثابت ہو یا اس لحاظ سے اس بیان کا تقاضا صرف اتنا ہے کہ آدمی یہ مان لے کہ حضرت عیسیٰ نے شاید ایسا فرمایا ہوگا۔ مگر قرآن کا یہ بیان اس مفروضہ کو باطل کرتا ہے۔

سے افضل ہیں۔ اس لئے کہ یہ زمین میں ہیں۔ اور وہ آسمان پر ہیں"
جواب سنئے! ؎

بگفتمش کہ نہ ایں قولِ معتبر باشد
حباب بر سرِ دریا گہر تہِ دریا است

فرماتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارا یہ قول غیر معتبر ہے۔ جا! جا کے دیکھ لے کہ بلبلہ دریا کے اوپر ہوتا ہے۔ اور موتی اس کی تہ میں"

سبحان اللہ! کیا ہی پر لطف جواب ہے۔ عیسےٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ مگر افضل ہمارے ہی حضور ہیں" صدر ہر جا کہ نشیند صدر است" صدر چاہے کہیں بیٹھے صدر ہی ہے۔ یہ کلیہ کہ اوپر والی چیز نیچے والی چیز سے افضل ہوتی ہے۔ غلط ہے۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کلیہ کو توڑا ہے۔

مرزائی اور عیسائی

حضرات! عیسائیوں کی یہ بات مرزائی بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ مرزائیوں نے بھی اپنی احمدیہ پاکٹ بک میں یہی بات لکھی ہے۔ کہ اگر حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر مانا جائے گا۔ تو اس سے عیسےٰ علیہ السلام کی حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر فضیلت ثابت ہو جائے گی مگر آپ معلوم کر چکے کہ یہ قاعدہ ہی غلط ہے۔ کہ ہر اوپر کی چیز ضرور نیچے کی چیز سے افضل ہو۔ جب یہ کلیہ ہی غلط ٹھہرا۔ تو پھر عیسائیوں اور مرزائیوں کا یہ اعتراض ہے ہی بناء الفاسد علی الفاسد۔

عیسائیوں کا ایک دوسرا اعتراض اور اس کا جواب

میرے عزیزو! عیسائی ایک اور بات بھی کہتے ہیں۔ کہ دیکھو ہمارے عیسےٰ علیہ السلام کو جب یہودی پھانسی چڑھانے لگے۔ تو اللہ نے عیسےٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں قریش مکہ نے تنگ کیا۔ اور ان کے قتل کے درپے ہوئے۔ تو اللہ نے تمہارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آسمان پر نہیں اٹھایا۔ بلکہ انہیں زمین پر ہی رہ کر مکہ چھوڑنا پڑا۔ اور مکہ سے مدینہ آنا پڑا۔ اگر

رہ آنجناب کے اس بیان کو آپکی پیغمبرانہ حیثیت سے پیش فرمایا گیا ہے۔
جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے حقیقی رسول نے خدا کی طرف سے ایک
حق کو بیان فرمایا ہے۔ اور چونکہ حق کو بیان فرمایا اس لیے کئی صدیاں اور
زمانے گذر جانے پر بھی وہ اول روز کی طرح حق ہے۔ یعنی اسے اس کی حقانیت
کی بنا پر حضرت عیسیٰ کی زبانی سننے والے بھی ماننے کے پابند تھے۔ اور آج اسے
قرآن کے ذریعہ سننے والے بھی ماننے کے پابند ہیں، نہ اس حیثیت سے کہ یہ ایک
ایسے شخص کی بات ہے جو آج سے بیس صدیاں پہلے ایک وقت کا امیر رہ
چکا ہے جس کی بات اپنے زمانے والوں کے لیے "قانون" تھی اور آج کچھ بھی نہیں۔
پرویز صاحب کہتے ہیں کہ کسی بات کا مرتبہ قائم کرنے میں اصل معیار اس کے
قائل کا اقتدار ہے۔ خواہ وہ نبی ہو یا غیر نبی۔ اور ایک صاحب اقتدار انسان کے
بیان کی حقانیت کا ثبوت اس کا اقتدار ہوتا ہے۔ اور اگر آپ اس کے اقتدار کو
قرآنی اقتدار کا نام دیں تو پھر اس کے قول کی حقانیت کے کیا کہنے۔ اور چونکہ دنیا میں
ایک رسول کے موجود نہ ہونے سے اس کا اقتدار بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لیے اسکی
بات اپنی حقانیت کو کھو دیتی ہے۔ مگر قرآن کا یہ بیان ان مفروضات کو
باطل ٹھہراتا ہے۔ یہاں نہ اس وقت حضرت عیسیٰ موجود ہیں اور نہ ان کا اقتدار
باقی ہے۔ لیکن ان کا بیان اول روز کی طرح حق ہے۔ اور اس کے حق ہونے
پر زمین و آسمان اور سورج اور چاند گواہ ہیں۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ ہے
کہ انہوں نے جو بشارت دی وہ حق تھی اور حق ہے۔

تمہارے پیغمبر سے بھی اللہ کو پیار ہوتا۔ تو انہیں بھی خدا آسمان پر اٹھا لیتا۔

میرے بھائیو! سطحی نظر سے تو یہ بات بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے۔ مگر دراصل اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ سنئے! ایک عورت کے دو بیٹے ہوں بڑا بیٹا تو بڑا طاقتور اور شہ زور ہو۔ اور چھوٹا اس کے مقابلہ میں اسقدر طاقتور اور شہ زور نہ ہو۔ اتفاقاً اس کے گھر میں ڈاکو آ جائیں۔ تو وہ عورت اس وقت کیا کرے گی۔ وہ دیکھے گی کہ شہ زور بیٹا تو ان ڈاکوؤں سے تنہا بھی مقابلہ کر سکتا ہے۔ مگر چھوٹا بیٹا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو ماں اس چھوٹے بیٹے کو گود میں اٹھا کر کوٹھے پر چڑھ جائے گی۔ اور بڑے سے کہے گی بیٹا تم نیچے ہی رہ کر ان بدمعاشوں کا مقابلہ کرو۔

کیوں دوستو! ہے نا یہ بات اسی طرح؟ ماں اس وقت یہی سوچیگی کہ چھوٹے بیٹے کو تو دشمنوں کے نرغے میں چھوڑنا مناسب نہیں اور بڑے کو اوپر بلانا مناسب نہیں۔ اگر بڑا بھی اوپر بلا لیا۔ تو ڈاکوؤں کے لئے میدان صاف ہے۔ اس صورت میں تو میری بھی عزت و ناموس خطرے میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ ماں اس وقت یہی کچھ کرتی ہے۔ جس کا میں نے ذکر کیا۔ کہ چھوٹے بیٹے کو کوٹھے پر لے جاتی ہے۔ اور بڑے کو صحن ہی میں رہنے دیتی ہے۔ تو فرمایئے ان دونوں بھائیوں میں سے درجہ کس کا بلند ہوا۔ اس کا جو کوٹھے پر لے جایا گیا؟ یا اس کا جس نے نیچے رہ کر تنہا دشمنوں کا مقابلہ کیا؟ اور سارے ڈاکوؤں کو شکست دے کر ماں کا گھر بچا دیا؟ یقیناً مرتبہ اسی کا بلند ہے۔ جو صحن میں رہ کر ڈاکوؤں سے لڑا۔ اور جس نے فاتح بن کر ماں اور اپنے بھائی کی عزت بچا لی۔

تو میرے بزرگو! ہمارا ایمان ہے۔ کہ عیسٰی علیہ السلام اور حضور علیہ السلام دونوں ہی اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔ مگر جو برتری و کمال حضور میں ہے۔ اس کا تقاضا ہی یہ تھا۔ کہ حضور آسمان پر نہ اٹھائے جائیں۔ اس لئے یہودیوں کی سازش کے وقت خدا نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو تو آغوشِ رحمت میں لے کر آسمان پر اٹھا لیا۔ اور حضور سے یہ ارشاد ہوا کہ:-

مجموعۂ اضداد

"حضرت ابراہیمؑ بت کدہ کے سب سے بڑے پجاری کے گھر پیدا ہوئے بت پرستی اور ستارہ پرستی کے ماحول میں پرورش پائی لیکن اس رشد و سعادت کی بنا پر جو انہیں مبدأ فیض کی طرف سے شروع ہی سے عطا ہوئی انہوں نے کبھی فانی معبود کے سامنے جھکنا پسند نہیں کیا" صفحہ ۱۹۰

قرآن میں یہ کہیں بھی واضح نہیں کہ حضرت ابراہیم کا باپ سب سے بڑا پجاری تھا یا چھوٹا۔ اہل شیعہ حضرات کا خیال تو یہ ہے کہ آپ کا باپ اوّل درجہ کا مسلمان تھا۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک امام معصوم اور پیغمبر کا باپ بے دین ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو قرآن میں جگہ جگہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کو بت پرستی سے منع فرمایا۔ اور

---

[1] پرویز صاحب کا دعویٰ ہے کہ فرقہ بندی کا اصل منبع علم حدیث ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیثوں میں ایک ہی حکم اور مسئلہ مختلف الفاظ کے ساتھ وارد ہوتا ہے۔ مثلاً کہیں ہوتا ہے کہ رسول کی اطاعت کرو۔ اور کہیں یہ کہ رسول کی نہیں بلکہ اپنے امیر کی اطاعت کرو۔ اس صورت میں انسان یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس حکم پر عمل کرے۔ اور یہ حال قرآن کے کسی بھی حکم کا نہیں۔ کہ اس کے الفاظ مختلف یا متضاد ہوں

آپ کے اس مجرد دعویٰ کو یہ امر واقعہ رد کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے باپ کا مسئلہ قرآن کا ہے حدیث کا نہیں۔ اور اس کے باوجود ایک فریق کے ہاں ان کا باپ امام معصوم تھا۔ اور دوسرے کے ہاں کافر۔ یہ اختلاف صدیوں سے موجود ہے۔ جس کا تدارک قرآن سے نہیں کیا جا سکا۔ اور نہ

تُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ! — اے محبوب اللہ کی راہ میں لڑو۔
جَاہِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْہِمْ۔ اور ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو۔ اور ان پر سختی کرو۔"

گویا اے محبوب! اگر تمہیں بھی آسمان پر اٹھا لوں۔ تو پھر ان کافروں سے مقابلہ کون کرے گا۔ اور ان دین کے ڈاکوؤں کو شکست دے کر فتح و نصرت کے ڈنکے کون بجائے گا؟ پیارے! عیسٰے علیہ السلام کے بعد تو تم تشریف لانے والے تھے۔ مگر تمہارے بعد تو قیامت تک دوسرا کوئی نبی پیدا ہونے والا نہیں ایک تمہاری ہی تو ذات ہے۔ جس کے ذریعہ دین اسلام کا قیام و قرار ہے اگر تم بھی اوپر چلے آئے۔ تو پھر دین کی عزت بھی خطرے میں ہے۔ اے محبوب! تم زمین پر ہی رہ کر ان کا مقابلہ کرو۔ اور ان کو شکست دو۔ چنانچہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ و سلم نے بمصداق "ساری خدائی اک طرف۔ فضلِ الٰہی اک طرف"؛ تنہا سارے کافروں کا مقابلہ کیا۔ اور دنیا بھر کے کافروں کو شکست دے کر اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا کا پرچم لہرا دیا۔ تو فرمایئے عیسائیوں کے اُس بودے اعتراض کی کیا حقیقت رہ گئی۔ حقیقت جو ہے۔ وہ یہی ہے کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی سارے نبیوں کے سردار اور سلطان ہیں۔ پڑھیئے درود شریف :۔

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ یَا حَبِیْبَ اللّٰہِ!

موسٰے علیہ السلام اللہ کے کلیم ہیں

میرے بزرگو! قرآن پاک کی آیت آپ نے سنی۔ اس میں خدا نے حضرت موسٰے علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہے۔ مِنْھُمْ مَنْ کَلَّمَ اللّٰہُ یعنے رسولوں میں سے بعض کے ساتھ اللہ نے کلام فرمایا۔ تو بیشک ہمارا ایمان ہے۔ کہ حضرت موسٰے علیہ السلام اللہ کے کلیم ہیں۔ مگر رَفَعَ بَعْضَھُمْ دَرَجٰتٍ" کے مطابق ہمارے حضور کی شان اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔ چنانچہ آیئے آپ کو ایک حدیث سناؤں۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے :۔

جواب میں اس نے آپکو پتھروں سے مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ اور جب آنجناب نے
اس کے حق میں بخشش کی دُعا مانگی تو خدا نے اسے قبول تو کیا فرمانا تھا لوگوں کو
اس طرح کی دُعائیں آپ کے اسوہ کی پیروی سے بھی منع کر دیا۔۔۔ یہ شریر انسان
دراصل آپ کا چچا تھا۔ البتہ اس بات کا حل وہ بھی نہیں بتاتے کہ چچا اور بھتیجا
کے اِس مناظرہ کو قرآن میں اس تسلسل کے ساتھ خدا نے کیوں پھیلایا۔ اور امام
معصوم کا عقیدہ جو ان کے بقول دین کا مرکزی عقیدہ تھا اُسے ایسا الجھایا کہ
جس شخص کی پوزیشن واضح ہونے پر ہی اس عقیدہ کا دار و مدار تھا۔ اسکی شخصیت

---

* جب نہیں کیا جا سکتا تو کیا وجہ ہے کہ تنہا حدیث کو فرقہ بندی کا باعث کہا جائے۔
حقیقت یہ ہے کہ جو انسان فرقہ بنانا چاہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ خدا اور رسول کا فیصلہ
کیا ہے۔ بلکہ دیکھتا یہ ہے کہ خود اس کی عقل کا فیصلہ کیا ہے۔ ورنہ اس بات
کی گنجائش کب تھی کہ آپ مسلمان فرقوں کی اس تہمات پر خود ایک قرآنی
فرقہ کی الگ بنیاد ڈالنے کی ہمت کرتے جو یعنی امت مسلمہ کے ماضی و
حال سے جڑت سے پیوند تک جدا ہو۔

ل پرویز صاحب اس کے ساتھ اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کے
خواب کا اعتبار بھی نہ کیا جائے۔ اور سالانہ قربانی کے عمل میں بھی ان کے اسوہ کی
پیروی نہ کیجائے۔ بخلاف اس کے قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ سوائے اس کے کہ
ایک مسلمان اپنے کافر والدین کے لئے بخشش کی دُعا مانگے۔ اور ہر بات
میں حضرت ابراہیم کے اور آپ کے ساتھیوں کے اسوہ کی پیروی کیجائے۔
قرآن کے اس فیصلہ کے تحت اگر آپ غور کریں تو جہاں اس میں حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کی پیروی کا حکم ہے اس کا مطلب یہ کہ

ہمارے حضور اللہ کے حبیب ہیں

کہ ایک دفعہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام اکٹھے بیٹھے کہ انبیاء علیہم السلام کا آپس میں ذکر کر رہے تھے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم بھی وہاں تشریف لے آئے۔ آپ نے سنا کہ ایک صحابی کہہ رہے ہیں۔ کہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے خلیل بنایا ہے۔ دوسرے صحابی بولے۔ اور موسیٰ علیہ السلام سے اللہ نے کلام فرمایا ہے۔ تیسرے بولے اور عیسےٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ۔ اور روح اللہ ہیں۔ چوتھے بولے اور آدم علیہ السلام کو اللہ نے چن لیا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ان میں تشریف لائے۔ اور فرمایا۔ میں نے تمہارا کلام سنا۔ ابراہیم علیہ السلام واقعی خلیل اللہ ہیں۔ موسےٰ علیہ السلام واقعی کلیم اللہ ہیں۔ عیسےٰ علیہ السلام واقعی روح اللہ ہیں۔ اور آدم علیہ السلام کو واقعی اللہ نے چنا۔ لیکن ــــ

اَلَا وَ اَنَا حَبِیْبُ اللّٰہِ

خوب یاد رکھو۔ میں اللہ کا حبیب ہوں۔ (مشکوٰۃ شریف ص۵۰۵)

محفلِ میلاد

میرے بزرگو! اس حدیث کو سن لیا آپ نے؟ دیکھئے اس میں صاف تصریح ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام اکٹھے بیٹھ کر پہلے نبیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ اور انبیاء کرام کے اوصاف بیان کر رہے تھے۔ تو میرے بھائیو! انصاف شرط ہے۔ صحابہ کرام اگر پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر خیر سننے اور سنانے کے لئے جمع ہوتے اور ذکر انبیاء سنتے اور سناتے تھے۔ تو آج اگر ہم بھی سارے نبیوں کے سردار حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر سننے اور سنانے کے لئے جمع ہو جائیں اور سرور انبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر پاک سنیں۔ اور سنائیں۔ تو اس مبارک اجتماع کو بدعت کیوں کہا جائے؟ یاد رکھئے! یہ محفل میلاد شریف صرف اسی مقصد کے لئے منعقد کی جاتی ہے۔ کہ مسلمان جمع ہو کر اپنے آقا و مولےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر پاک سنیں اور سنائیں۔ اور ان کے اوصاف عالیہ

کو مسلمان اور کافر کے درمیان گڈمڈ کر کے رکھ دیا۔ اور نہ صرف گڈمڈ کیا بلکہ حضرت ابراہیم کے مومن باپ کا کہیں ذکر تک نہ فرمایا اور ان کے مشرک چچا کو قرآن کے بکثرت مقامات میں ان کے مشرک باپ کے نام سے پیش کیا۔ کیا دین کے ایک اہم عقیدہ کو صفائی کے ساتھ پیش کرنے کی یہی شان ہوتی ہے؟ مگر چلئے اس بارہ میں قرآن کے بیان پر اکتفا کرتے ہوئے مان لیجئے کہ حضرت ابراہیم کا باپ مشرک تھا خواہ چھوٹا یا بڑا۔ پھر یہ کہاں سے پتہ چل گیا کہ آپ نے ہمیشہ بتوں اور ستاروں کے خیال سے پرہیز فرمایا۔ قرآن میں تو یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک موقعہ پر ایک ستارہ۔ چاند اور سورج کو بھی اپنے رب کا نام دیا تھا۔ اگرچہ ہم یہ مشورہ کبھی

---

* کہ آنحضور کے عمل میں آپکی پیروی کی جائے۔ کیونکہ اگر آپکا کوئی ایک آدھ عمل پیروی کے قابل نہ ہوتا تو ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ اس کی اسیطرح نشاندہی کر دیتا۔ جیسے اس نے حضرت ابراہیم کی دعا کی نشاندہی کر کے مشرکین کے لئے دعائے مغفرت کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کے حالات زندگی کا ریکارڈ ہر حیثیت سے قابل حفاظت ہوتا ہے۔ اور اس کے اندر چھانٹ دینے اور زائل کر دینے کے قابل سرے سے کوئی عنصر ہوتا ہی نہیں۔ ورنہ قرآن میں ہم یہ نہ دیکھتے کہ خدا نے مسلمانوں کو ایک لمبا چوڑا حکم سنانے کے بعد اپنا ایک حکم واضح فرمایا۔ پہلے انہیں یہ بتایا کہ حضرت ابراہیم نے اپنے مشرک باپ کے لئے دعا مانگی تھی۔ پھر فرمایا کہ تم ایسا نہ کرنا کہ کہیں اپنے مشرک رشتہ داروں کے لئے دعا مانگنے لگ جاؤ۔ یہاں اگر پیغمبر کے حالات زندگی کی کچھ اہمیت نہ ہوتی تو ایسے حکم کی بجائے سرے سے دعا کا یہ قصہ ہی ہٹا

کا چرچا کریں۔ اور یہ ایک ایسا مقصد ہے۔ جس کی عظمت و برکت کا کوئی مسلمان تو انکار نہیں کر سکتا۔ مسلمان کے دل میں تو حبِ رسول جلوہ گر ہے۔ اور وہ بمصداق مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ ذکرِ رسول میں خوش رہتا ہے اور اس کے لئے اہتمام بھی کرتا ہے۔ مگر جس بدبخت کا دل اِس نعمتِ عظمٰے سے خالی اور محروم ہے۔ وہ ذکرِ رسول کے نام سے بھی چڑتا ہے۔ مگر بقولِ اعلٰی حضرت! سے

خاک ہو جائیں عدو جل کر مگر ہم تو رضاؔ!
دم میں جبتک دم ہے ذکر ان کا سناتے جائینگے!

صحابہ کرام اور ذکرِ رسول

میرے بزرگو! صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کا یہی ذکرِ رسول دن رات کا مبارک شغل تھا۔ آج ہم لوگ جو زمانہ نبوی علےٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے صدیوں بعد پیدا ہوئے۔ اپنے آقا و مولےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی صورتِ منورہ، اور سیرتِ مطہرہ کے پیارے پیارے حقائق و واقعات سے اسی ذکرِ رسول کی بدولت متعارف ہوئے ہیں۔ صحابہ کرام نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حسنِ صورت و سیرت کے ہر پہلو کا ذکر فرمایا ہے۔ حضور کی نشست و برخاست کیسی تھی؟ حضور خواب کیسے فرماتے۔ جاگتے کیسے؟ تناول کیا فرماتے۔ اور کیسے فرماتے؟ ہنسی مبارک آپ کی کیسی تھی؟ گریہ مبارک کی کیفیت کیا ہوتی؟ اپنے اور بیگانوں سے حضور کا برتاؤ کیسا تھا؟ چال مبارک کیسی تھی؟ آواز مبارک اور انداز گفتگو کیسا تھا؟ الغرض سیرتِ مطہرہ کے ہر گوشہ کا ذکر فرما دیا۔ حضور منبع النور صلے اللہ علیہ وسلم کا حسنِ عالمتاب کیسا تھا؟ پیشانی انور کیسی تھی؟ ناک مبارک کیسی تھی؟ دندان مبارک کی کیا شان تھی؟ گردن اطہر کی کیا کیفیت تھی؟ دستِ انور اور پائے مبارک کیا شان رکھتے تھے؟ گویا صورتِ منورہ کی بھی پوری پوری تفصیل کا صحابہ کرام نے ذکر فرما دیا۔

گیسوئے مبارک

حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے گیسوئے

نہیں دیں گے. کہ آپ قرآن کے اس بیان کو اسی طرح چھانٹنے لگ جائیں. جیسے حدیث کے ذخیرہ سے خرافات کو چھانٹنے کا ارادہ ہے. کہنا صرف یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی شان میں اس قصیدہ سرائی کا ماخذ کیا ہے. کیا کوئی حدیث و تاریخ کی کتاب ہے. یا آپ کی دماغی لائبریری. اگر دوسری بات ہے تو آپ کی لائبریری کا حدیث کے ریکارڈ سے زیادہ اعتبار کیوں کیا جائے. پھر ہمیں یہ شکایت بھی نہیں کہ حضرت ابراہیم کی یہ تعریف کیوں ہو رہی ہے. ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کے اس جدِ امجد کو مقام نبوت و رسالت پر فائز ہو جانے کے بعد اگر منطقی لور یا گل ٹھیرانا ضروری تھا تو اس کی بچپن کے زمانہ کو اس صفائی اور ستھرائی کے ساتھ بیان کرتا آپ پر کونسا فرض تھا.

چنانچہ چھوٹے میاں سو چھوٹے میاں اور بڑے میاں سبحان اللہ! کا یہ منظر خود پرویز صاحب کے اپنے بیان میں دیکھ لیجئے. اور یہ بھی اندازہ کیجئے کہ آپ نے کس طرح قرآن کو چوروں کا مال سمجھ رکھا ہے. جسے ٹھکانے لگانے کیلئے کسی اصول اور ضابطہ کی ضرورت نہیں ہوتی.

"قرآن میں ہے کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں. آپ نے سمجھا اشارہ غیبی ہے. اس لئے اس کی تعمیل ضروری ہے بیٹے سے ذکر کیا تو اس نے بھی کہا کہ اگر یہ حکم ہے. تو اس کی تعمیل میں قطعاً تامل نہ کیجئے. میں ذبح ہونے کو تیار ہوں. آپ نے بیٹے کو لٹایا اور اس کے گلہ پر

۱؎ ان کتابوں کو ان خرافات سے پاک کر دیں جو دوراول کے یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کی منظم سازش کے ذریعہ ہمارے ہاں بار پا چکی ہیں" قرآنی فیصلے. ص۲۷

✱ قرآن میں نہ لایا جاتا اور نہ یہ قصہ پیش ہی آتا ✱

مبارک کیسے تھے؟ صحابہ کرام نے یہ بھی بیان فرمایا ہے۔ مگر بعض روایات میں تو آتا ہے۔ کہ گیسوئے مبارک کانوں تک رہتے تھے۔ اور بعض روایات میں آتا ہے۔ کہ کندھوں تک رہتے تھے۔ بظاہر ان روایات میں تعارض نظر آتا ہے۔ مگر محدثین کرام علیہم الرحمۃ نے بڑے مزے کی تطبیق بیان فرماتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان جن کا ذکرِ رسول ہی شغل تھا۔ اور جن کا ہر ارشاد ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ وہ اپنے محبوب آقا و مولیٰ صلے اللہ علیہ و سلم کی صورت و سیرتِ مقدسہ کے متعلق جو بیان فرمائیں حق ہے۔ مگر پھر یہ کیا کہ کسی نے تو گیسوئے انور تا گوش بیان کئے اور کسی نے تا دوش؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے گیسوئے انور گھنگریالے تھے۔ اور شانہ مبارک نہ کرنے کی حالت میں وہ کانوں تک رہتے تھے۔ اور جب حضور شانہ مبارک فرماتے تو کندھوں تک آجاتے۔ تو جس صحابی نے گیسوئے انور شانہ مبارک نہ فرمانے کی حالت میں دیکھے۔ اس نے تا گوش بیان فرما دیئے۔ اور جس نے شانہ مبارک فرما لینے کے بعد دیکھے۔ اس نے تا دوش بیان فرما دیئے گویا دونوں روائتیں ہی حق ہیں۔ اور محبوبِ خدا کی ہر دو اداؤں کی آئینہ دار یعنے حضور کے گیسوئے مبارک تا گوش بھی رہتے تھے۔ اور تا دوش بھی اور اس کی حکمت کیا ہے۔ کہ گیسوئے مبارک تا گوش بھی رہتے تھے اور تا دوش بھی؟ اس کا جواب اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کی زبان سے سنیئے۔ فرمایا ؎

گوش تک سنتے تھے فریاد اب آئے تا دوش
تا بنیں خانہ بدوشوں کے سہارے گیسو

یعنے گیسوئے انور جب کانوں تک تھے۔ تو گویا ان کا یہ ارشاد تھا کہ اے فریادیو! تمہاری فریادیں سننے کے لئے یہ دو کان ہیں۔ اور جب کندھوں تک آئے تو یہ ارشاد ہوا۔ کہ اے بیکسو! اور بے سہارو! تم سب کا بوجھ اٹھانے کے لئے یہ دو کندھے ہیں۔ ع

چھری رکھدی کہ اللہ نے پکارا کہ اے ابراہیم تو نے خواب کو حکم خداوندی پر محمول کر کے اسکی تعمیل پوری کر دی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر تمہیں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی حکم دیا گیا تو تم اسے بلا تامل ادا کرو گے۔" قرآنی فیصلے جلد ۲

جن الفاظ پر خط موجود ہے وہی قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ باقی پرویز صاحب کے کمال کا مال ہے۔ اس پر دیکھیئے! کس دلیری کے ساتھ اس اوٹ پٹانگ بیان کو قرآن کی طرف منسوب کر ڈالا گیا ہے جس میں نہ تانا ہے نہ بانا۔ بلکہ ترچھا سیدھا کا معاملہ ہے۔ ایک طرف آپ ظاہر کرتے ہیں کہ خواب کو اشارہ غیبی سمجھنے میں حضرت ابراہیم کو غلطی لگ گئی۔ پھر یہ نہیں بتاتے کہ یہ غلطی کیسے لگ گئی۔ کیا پہلے آپ اپنے ہمسایہ یا کسی اور ماہر تعبیرات سے اپنے خواب کا حل پوچھ کر اس پر عمل کیا کرتے تھے۔ اور اس خواب میں چونکہ بیٹے ہی کی قربانی کا حکم تھا۔ اس لئے اسے معمولی خواب سمجھ کر اس کی تعبیر کسی سے دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور خود ہی اپنے طور پر اس کا مطلب قائم کر کے اس پر عمل کرنے لگ گئے۔ یا پہلے آپ کو بیداری میں وحی کی جاتی۔ اور اس مرتبہ جب خواب آیا تو اسے بھی وحی سمجھ بیٹھے۔ بہر حال غلط سمجھ کے تحت غلط تعمیل جو کی تو بجائے اس کے کہ اللہ میاں آپ کو سخت شکست کہتے اور پھر دماغی علاج کی ہدایت فرماتے انہوں نے انعامات کی بارش برسانی شروع کر دی۔ اور اس کے اندر انعام کے اسلسلے شروع ہوئے تو ان کے دوران آپ کو سمجھایا گیا کہ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی قربانیوں کا یہ فائدہ ضرور رہیگا کہ جب کبھی تمہیں اس سے زیادہ کسی بڑی قربانی کا حکم دیا گیا تو اندازہ ہوتا ہے کہ تم اسے ضرور تعمیل کر کے رہو گے۔

یہاں آپ اس بحث سے بالکل کترا کر نکل جاتے ہیں کہ جو شخص ایک خواب اور

ایک جانِ بے خطا پر دو جہاں کا بار ہے

پڑھئے درود شریف!

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ وَسَلَّمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ!

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ وَسَلَّمْ یَا حَبِیْبَ اللّٰہ!

تو میرے بھائیو! معلوم ہوا کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کا یہی ذکرِ رسول شغل تھا۔ اور ان کے اسی ذکر پاک کا صدقہ ہے۔ کہ آج ہم اپنے حضور کی صورتِ منوّرہ و سیرتِ مطہرہ سے متعارف ہیں۔ بقولِ وہابیہ اگر ذکرِ رسول ناجائز ہوتا۔ تو صحابہ کرام ہرگز ہرگز نہ کرتے۔ اور وہ اگر یہ ذکر پاک نہ کرتے تو آج ہمارے محبوب آقا و مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی صورتِ منوّرہ و سیرتِ مطہرہ کا کوئی بھی نورانی گوشہ ہمارے سامنے نہ آتا۔ مگر سَو سَو رحمتیں ان نفوس قدسیہ پر جن کے صدقہ میں حضور منبع النور صلے اللہ علیہ وسلم کی صورت و سیرتِ مقدسہ کا نورانی جلوہ بصورتِ "ذکر" آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور محبت والوں کے لئے محبوب کا ذکر بھی تسکینِ خاطر کے لئے ایک بہت بڑا سامان ہے۔ اور اہل محبت محبوب کے ذکر ہی میں وصالِ محبوب کے مزے پا لیتے ہیں۔ جیسے کہ ایک شاعر نے لکھا ہے۔ ؏

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار اور ذکرِ رسول کا عظیم فائدہ

میرے بھائیو! "ذکرِ رسول" کے بے شمار فائدے ہیں۔ ان فائدوں میں سے ایک اور بھی عظیم فائدہ سنئے۔ یہ حدیث تو آپ نے اکثر علماء کرام سے سنی ہے۔ کہ میت کو جب قبر میں دفنا دیا جاتا ہے۔ تو وہ فرشتے جن کا نام منکر اور نکیر ہے۔ امتحان لینے کے لئے قبر میں آجاتے ہیں۔ اور ان کا پہلا سوال یہ ہوتا ہے۔ مَنْ رَّبُّکَ؟ بتا تیرا رب کون ہے؟ مسلمان اس کا جواب یہ دیتا ہے۔ رَبِّیَ اللّٰہُ۔ میرا رب اللہ ہے۔ پھر وہ پوچھتے ہیں۔ مَا دِیْنُکَ؟ تمہارا دین کیا ہے؟ مسلمان جواب

وحی کی تعبیر سے بے بہرہ ہو وہ اس قابل کب ہوتا ہے کہ اسے رسول اور دنیا کا امام بنا دیا جائے۔ خوابوں کا شیدائی کبھی کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواب دیکھے اور بیٹے کو ذبح کرنے لگ جائے۔ ایک شخص جو اتنی بڑی غلطی کھا جائے۔ وہ چھوٹی غلطیوں میں کس قدر لوگوں کو غلط رہنمائی میں مبتلا نہ کرتا ہوگا۔ پھر یہ مفروضہ کس قدر قرآن کے خلاف ہے جس میں ہے کہ رسول کو آگے پیچھے سے خدا کی طرف سے نگران فرشتے ہمراہ رکھے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ خدا کی وحی پہنچانے میں کوتاہی نہ کرے۔ اگر حدیث کی کسی کتاب میں ایسا ہوتا کہ آنحضور نے خواب دیکھ کر کسی انسان کو ذبح کر دیا تھا۔ تو آپ اس حدیث پر کیسے کچھ نہ برستے۔

خواب اور قربانی کے اس واقعہ کو پرویز صاحب نے بالکل ایسے پیرایہ میں بیان کیا ہے جیسے آپ اپنے کسی ملازم کو سزا کا نوٹس دیں۔ اور وہ اسے سن کر آپ کے گرام کو آگ لگانے لگ جائے۔ اس پر آپ اسے کہیں کہ بس بس آگ نہ لگانا تمہارے خلوص میں اب کوئی شبہ نہیں رہا۔ اس دفعہ تم نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ آئندہ جب کبھی تمہیں سزا کے لیے بلایا گیا تو تم فرار نہیں ہو گے۔

آپ یہ نہیں بتاتے کہ جب حضرت ابراہیم کا یہ خواب بالکل بے حقیقت تھا تو انہیں دکھایا کیوں گیا۔ اور جب دکھایا گیا تو آپ نے اس کی پیروی کیوں فرمائی۔ اور اگر آپ اس کی پیروی بھی کر گذرے تو اس پر انہیں انعامات سے کیوں نوازا گیا۔ اور اگر نوازا بھی گیا تو بدرجہ آخر اسے قرآن میں کیوں بنایا گیا۔ اور اس کے ساتھ جو کچھ حضرت اسماعیل کی بجائے ذبح ہوا اس کا ذکر بھی کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی خدا نے یہ اہتمام تو فرما دیا کہ دعا کی ٹھیک پیروی کے متعلق ہدایت دے دی اور یہ نہ بتایا کہ حضرت ابراہیم نے اپنے

دیتا ہے۔ دِیْنِیَ الْاِسْلَام - میرا دین اسلام ہے۔ اس کے بعد فرشتے پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کرتے ہیں :-

مَا ھٰذَا الرَّجُلُ الَّذِیْ بُعِثَ فِیْکُمْ

"یعنے تم ان کے بارے میں جو تم میں مبعوث کئے گئے کیا کہتے ہو"
تو مسلمان حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مقدسہ کو دیکھ کر اس کا جواب یہ دیتا ہے :-

ھُوَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

وہ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (مشکوٰۃ شریف ص۲۶)

میرے دوستو! اس حدیثِ پاک سے ہیں جو ذکرِ رسول کا فائدہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بیان کرنے سے قبل ضمناً یہ بھی بیان کرتا جاؤں کہ دیکھ لیجئے۔ اس حدیث میں یہ موجود ہے۔ کہ فرشتے جب پہلا سوال کرتے ہیں کہ تمہارا رب کون ہے؟ اور مسلمان اس کا جواب دے دیتا ہے۔ کہ میرا رب اللہ ہے۔ تو اسی ایک جواب دے دینے پر اس کی رہائی نہیں ہو جاتی۔ اور فرشتے یہ نہیں کہتے۔ کہ بس تمہاری نجات ہو گئی۔ اب اور کوئی سوال باقی نہیں۔ نہیں بلکہ فرشتے ایک دوسرا سوال کر دیتے ہیں۔ کہ بتا تیرا دین کیا ہے؟ گویا رب رب کہنے والے تو بہتیرے ہیں۔ مگر یہ بھی تو پتہ چلے۔ کہ تمہارا دین کون سا ہے۔ اگر تم مسلمان نہیں۔ تو تمہارا رب رب کہنا بیکار ہے۔ چنانچہ مسلمان پھر دوسرے سوال کا بھی صحیح جواب دے دیتا ہے۔ کہ دین میرا اسلام ہے۔ تو اس جواب پر بھی اس کی نجات نہیں ہوتی۔ بلکہ تیسرا ایک اور سوال باقی ہے۔ نجات تو اس سوال کے صحیح جواب دے دینے پر ہے۔ چنانچہ فرشتے پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرکے پوچھتے ہیں۔ کہ بتا ان کے متعلق تو کیا کہتا ہے؟" گویا مسلمان کہلانے والے تو بہت ہیں۔ اور اپنے منہ سے مسلمان بننے والے تو بہتیرے ہیں۔ مگر صرف مسلمان کہلا لینا کافی نہیں۔ جب تک کہ اس ذاتِ مقدسہ کی بھی پہچان حاصل نہ ہو۔ چنانچہ مسلمان جب حضور صلے اللہ

بیٹے کے بچ جانے کے بعد جو کچھ ذبح کیا ان کی طرح ہم ایسا کچھ نہ کرتا۔ یہ سارے شواہد جو قربانی کو لازم کرتے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کیا عقل کا اندھا وہ شخص ہوگا جو قربانی کو لازم سمجھے۔ یا وہ جو انہیں بیہودہ ٹھہرائے۔ اور قربانی پر ہونے والے اخراجات کے اعداد و شمار کے ہولناک منظر سے دنیا والوں پر حضرت ابراہیم کی اور ان کے پیچھے چلنے والے مسلمانوں کی بیوقوفی ظاہر کرے۔

روشنی کا مینار اور تاریکی کا غار

"آپ نے ہر اسم شرک سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ ایک دعوت میں آپ کے سامنے کھانے میں اس جانور کا گوشت آیا جو کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا۔ تو آپ نے کھانے سے انکار کر دیا۔" ص ۱۸۰

"ننگے ہونے کے احساس سے آپ پر بیہوشی طاری ہو گئی۔ اور ہوش آنے پر آپ کی زبان پر تھا: میرا تہبند! حضرت عباس نے فوراً تہبند باندھ دیا۔" ص ۱۸۰

"اس تمام عمر میں حضور نے صرف ایک لڑائی میں شرکت کی۔ جو قریش اور قبیلہ قیس میں ہوئی اور جس میں قریش برسرِ حق تھے۔ لیکن چونکہ یہ لڑائی بھی ایام الحرام میں پیش آئی اس لئے حضور نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔" ص ۱۸۰

"...... حکم فتح مکہ کے زمانہ میں نازل ہوا۔ نبی اکرم نے اس سے پہلے بھی کسی جنگ میں قیدیوں کو غلام نہیں بنایا۔" ص ۵۰۹

ان عبارات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روشنی کا مینار بنا کر پیش کیا گیا ہے

علیہ و سلم کے متعلق ھُوَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ کہہ دیتا ہے تو امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

آجکل کے "صرف مسلمان"

میرے بھائیو! اس پُر فتن دورِ آزادی میں آپ نے کئی ترقی پسند اور مادر پدر آزادی کے دِلدادہ لیکچراروں سے سنا ہوگا۔ کہ بڑے فخر کے ساتھ وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو مسلمان ہیں۔ شیعہ۔ سُنی۔ حنفی۔ وہابی کے جھگڑوں میں ہم نہیں پڑتے۔ ہم نہ سُنی ہیں نہ شیعہ، نہ حنفی نہ وہابی۔ بلکہ ہم تو صرف مسلمان ہیں۔ ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اگر صرف "مسلمان" کہلانا ہی کافی ہوتا۔ اور اس کے بعد کسی دوسری قید و پابندی کی ضرورت نہ ہوتی تو قبر میں فرشتے بھی دوسرے سوال "مَا دِیْنُکَ" کا جواب "دِیْنِیَ الْاِسْلَامُ" پاکر مطمئن ہو جاتے۔ اور تیسرا سوال حضور کے متعلق ہرگز نہ کرتے اور یوں کہتے۔ کہ بس بس تمہاری نجات ہو گئی۔ اور پتہ چل گیا۔ کہ تم مسلمان ہو۔ اب اس کے بعد کسی اور سوال کی ضرورت نہیں۔ مگر نہیں صرف مسلمان بن جانے کے بعد ایک تیسرا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ اور اسی سوال کے صحیح جواب پر نجات کا انحصار ہے۔ اور وہ سوال حضور صلے اللہ علیہ و سلم کی ذاتِ گرامی سے متعلق ہے۔ اور اسی ذاتِ گرامی کی معرفت اور عدم معرفت کی بنا پر مسلمان ہونے کے باوجود، ناجی اور غیر ناجی دو فرقے بن جائیں گے۔ اور ناجی تو وہی "وَمَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ" کے مطابق اہل سنت وجماعت یعنی سنی کہلائے گا۔ اور غیر ناجی ۷۲ قسم کے ناموں سے پکارا جانے لگیگا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ جس کا کوئی سلیم العقل شخص انکار نہیں کر سکتا۔ مگر بقول شاعر ؎

خدا جب دین لیتا ہے حماقت آ ہی جاتی ہے

بہت سے لوگ یہی رٹ رٹے جاتے ہیں کہ نا صاحب! ہم کسی فرقہ سے متعلق نہیں۔ ہم تو ان سب فرقوں سے الگ ہیں۔ اور صرف مسلمان ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ کسی فرقہ سے نہ ہو کر بھی فرقہ بندی سے آزاد نہیں ہو سکتے۔

آخر اس سے بڑھ کر خیال اور عمل میں روشنی کیا ہو سکتی ہے۔ کہ ایک انسان اپنے بچپن کے زمانہ میں بھی نگانہ ہو اور ننگا ہونے کے اندیشہ سے بے ہوش ہو جاتا ہو کھانے پینے میں اول روز سے پرہیزگار ہو۔ اور حرام کا لقمہ تک نہ توڑے۔ لڑائیوں کے خون خرابہ میں کبھی اپنی قوم کا ساتھ نہ دے۔ اور قرآن میں غلامی کے متعلق ہدایات و احکام آنے سے پہلے ہی ان کا پابند ہو۔ اور کسی کو غلام نہ بنائے۔ یہ وہ بڑے سے بڑا اور اعلیٰ سے اعلیٰ کردار ہے۔ جو اس آسمان کے نیچے کسی انسان کو میسر ہو سکتا ہے۔

روشنی کے اس معیار کی اہمیت ایک لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے۔ کہ جو شخص اپنے بچپن سے ہی پاکباز و راست باز ہو اور اس حد تک رہا ہو کہ اس کی راست بازی کو معیار تسلیم کیا جاتا ہو۔ اور کسی کی زبان سے اس کے متعلق یہ سننا محال ہو کہ اس نے بھی کبھی کوئی غلطی کی ہے۔ ایسے جب خدا کی طرف وحی کی ہدایت بھی حاصل ہونی شروع ہو جائے۔ تو اس کی بزرگی اور برتری کا کیا ٹھکانہ ہو سکتا ہے۔ اور کونسا عقل کا دشمن ایسا ہو گا جو اس مقام و مرتبہ کے انسان کے متعلق اس کی بھلائی اور برائی کا میزان قائم کر کے اپنی کور ذوقی کا ثبوت مہیا کرے۔ آپ یہ سنکر حیران ہوں گے۔ ایسا عقل کل انسان ہے۔ کتاب معراج الانسانیت کا مصنف۔ کوئی ایسا ویسا انسان نہیں۔

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص ایک ذہین دماغ کا مالک ہو۔ اور ایک فن میں کسی کی رہنمائی کے بغیر ترقی کر رہا ہو۔ ایسے جب کوئی استاد کامل اپنے فن کے لئے مل جاتے تو ایسے شخص کی ترقی اور فنی قابلیت انتہائی بام عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ اور اس کے حالات کی واقفیت رکھنے والے اس کے متعلق ہمیشہ یہ رائے دیتے ہیں۔ کہ پہلے اگر اس کی فنی عبارت میں کوئی

کسی فرقہ میں نہ ہونا بھی الگ ایک فرقہ ہے

گویا کسی فرقہ سے نہ ہونا بھی خود ایک فرقہ ہے۔ مثلاً ایک شہر میں دو فرقے ہیں۔ سُنی اور شیعہ تو وہاں اگر کچھ لوگ اس خیال کے پیدا ہو جائیں۔ کہ ہم نہ سنی ہیں نہ شیعہ۔ تو ان لوگوں نے فرقہ بندی کو مٹایا نہیں۔ بلکہ بڑھایا۔ اس لئے کہ پہلے تو اس شہر میں دو فرقے تھے۔ ایک سنی اور ایک شیعہ اور اب ایک تیسرا فرقہ پیدا ہو گیا۔ جو نہ سنی ہے نہ شیعہ۔ میرے دوستو! مخنثین کا بھی تو آخر ایک گروہ ہی ہے۔ ایک گروہ مردوں کا ایک عورتوں کا۔ اور ایک گروہ ان کا جو نہ مرد ہیں نہ عورت۔ اس میں شک نہیں کہ ہیں وہ انسان ہی۔ مگر صرف "انسان" وہ بھی نہیں بلکہ ایک گروہ سے وہ بھی متعلق ہیں۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ ہم چونکہ نہ مردوں کے گروہ میں ہیں۔ نہ عورتوں کے گروہ میں۔ اس لئے ہم کسی گروہ میں نہیں۔ اسلئے کہ مردوں کے گروہ میں نہ سہی اور عورتوں کے گروہ میں نہ سہی۔ مخنثوں کے گروہ میں تو ہیں۔ گروہ ان کا بھی ضرور ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس گروہ کی تعریف یہ ہے۔ کہ جو نہ مردوں میں ہے نہ عورتوں میں۔ تو جو لوگ کسی گروہ میں نہیں۔ نہ شیعہ، نہ سنی۔ نہ حنفی نہ وہابی۔ تو وہ ان گروہوں میں نہ سہی لا مذہبی کے گروہ میں تو ضرور ہیں۔ لا مذہب ہونا بھی تو ایک مذہب ہے ہاں یہ دوسری بات ہے۔ کہ لا مذہب کی تعریف یہ ہے۔ کہ جو نہ ادھر ہو اور نہ اُدھر۔ اور بقول شاعر ؎

اسی کا نام تو لا مذہبی ہے
نہ اِلَاّ الَّذی ہے نہ اُلَاّ الَّذی ہے

حضرت فقیہ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ایک لا مذہب کو لاجواب جواب

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ سیالکوٹ میں ایک ایسے ہی ترقی پسند مقرر آئے۔ اور انہوں نے اپنی تقریر میں کہا۔ کہ مسلمانو! ہم تو صرف مسلمان ہیں۔ یہ شیعہ، سنی، مقلد، غیر مقلد کے فرقوں سے ہم آزاد ہیں۔ تم بھی ان جھگڑوں سے آزاد ہو جاؤ۔ اور صرف

نقص تھا بھی تو اب باقی نہیں رہا۔ اس بنا پر آپ ضرور غور کرتے ہوں گے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو وحی کی دولت سے مشرف ہونے سے پہلے بھی دنیا کے اعلیٰ ترین انسان تھے منصب نبوت پر فائز ہو جانے کے بعد تو آپ کے کامل انسان بننے کو چار چاند لگ گئے ہوں گے۔ اور آپ پہلے سے زیادہ بلکہ مطلقاً ہر طرح کی غلطیوں سے پاک معصوم اور طاہر و مطہر ہو گئے ہوں گے۔ مگر ہم آپ کو متنبہ کرتے ہیں کہ ایسا کیا بس آپ کم از کم آنحضورؐ کے متعلق نہ دہرائیے۔ کیونکہ آنحضورؐ اپنے بچپن اور جوانی میں لاکھ معصوم و پاکباز سہی لیکن شرف نبوت حاصل ہو جانے کے بعد پرویز صاحب کے بقول آپ روشنی کے مینار سے گر کر تاریکی کے گہرے غار میں جا پڑے۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جو شخص اندھیری رات میں دشوار گذار راستہ میں ٹھوکر نہ کھائے وہ جب دوپہر کے وقت سیدھی اور ہموار سڑک پر پھسل کر اوندھے منہ گر پڑے تو اس کے ردی انسان ہونے میں کیا شبہ ہوتا ہے۔ پرویز صاحب کا مفروضہ ہے کہ رسول عربی جیسا پاکیزہ انسان جو زمانہ نبوت سے پہلے دنیا کا واحد انسان تھا۔ جب منصب نبوت پر سرفراز ہوا تو غلطیاں کرنے لگ گیا۔ یہ اگر حقیقت ہو تو پھر یہ مینار سے گر کر غار میں پڑ جانا نہیں تو اور کیا ہے۔

چنانچہ لگے ہاتھ روشنی کے اس مینار کے نیچے تاریکی کا غار بھی دیکھ لیجئے اور رسول کی غلطیاں گن لیجئے۔

۱۔ اگر کوئی شخص جھوٹی شہادت یا غلط بیان پیش کر کے غلط فیصلہ لے جاتا ہے تو اس کا عذاب اس کے سر ہے ظاہر ہے کہ آپ کے فیصلے وحی پر مبنی نہیں ہوتے تھے ص ۶۵۹

۲۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے قیاساً ایسا کہا تھا۔ کہ اس کی ضرورت نہیں تم لوگ ان

مسلمان ہو۔ والدی المعظم حضرت فقیہہ اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے دن جامع مسجد مولانا عبد الحکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں تقریر فرمائی۔ اور فرمایا کہ اس قسم کے مقرر کہہ تو بہت کچھ جاتے ہیں۔ مگر ان کی باتوں کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ فرمایا کہ یہ کل والے مقرر صاحب ہمیں ایک ایسی نماز تو پڑھ کر دکھائیں۔ جو نہ سنیوں کی ہو نہ شیعوں کی نہ مقلدوں کی۔ اور نہ غیر مقلدوں کی۔ بلکہ "صرف مسلمانوں" کی نماز ہو۔ اگر نماز میں ہاتھ نہ باندھینگے تو شیعہ فرقے میں آجائینگے۔ اور ہاتھ باندھ کر اگر پڑھیں گے۔ تو سُنی گروہ میں شمار ہونے لگیں گے۔ اور ہاتھ اگر سینے پر باندھیں گے۔ تو غیر مقلد کہلائیں گے۔ اور اگر زیر ناف باندھیں گے۔ تو حنفی کہلانے لگیں گے۔ مرد میدان بنیں۔ اور کوئی ایسی نماز پڑھ کر دکھائیں۔ جو کسی فرقے سے متعلق نہ ہو۔ بلکہ "صرف مسلمانوں" کی نماز ہو۔ والد ماجد علیہ الرحمۃ کے اس وعظ میں میں بھی موجود تھا۔ مجھے یاد ہے۔ کہ ایک شخص اٹھا۔ اور کہنے لگا۔ حضرت! "صرف مسلمانوں کی نماز یہ ہے کہ نماز بالکل پڑھی ہی نہ جائے" اس پُر لطف بات پر لوگ ہنس پڑے۔ اور والد ماجد بھی فرمانے لگے۔ "درست ہے۔ واقعی یہ لوگ نماز پڑھتے ہی نہیں۔

ترقی یافتہ مسلمان

میرے دوستو! بات بھی یہی ہے کہ ترقی یافتہ "صرف مسلمان" مسجدوں میں آنا بھی ترقی کے خلاف، اور آوٹ آف فیشن سمجھتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب لکھا ہے ؎

اب نظر آتی نہیں ہے مسجدوں کے فرش پر
قوم نے اتنی ترقی کی کہ پہنچی عرش پر

گویا اب یہ لوگ اس قدر ترقی پا گئے ہیں۔ کہ زمین پر نظر ہی نہیں آتے۔

اندر سے مسلمان

ان لوگوں کا ایک اور بھی مسلک ہے اور وہ یہ ہے کہ چھوڑیئے صاحب ان نماز روزہ اور داڑھی کے جھگڑوں کو۔ ان ظاہری حرکات و سکنات، اور ظاہری شکل و صورت سے کیا ہوتا ہے۔ اندر سے مسلمان ہونا چاہیئے۔ اور ہم لوگ اندر سے مسلمان ہیں

معاملات کو مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ البتہ جب میں کوئی دین کے معاملہ میں فیصلہ دوں تو اسکی تعمیل فرض ہو جاتی ہے۔ صـــ۶۷۷

۲۔ حضرت خباب کو معلوم ہوا تو خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کیا یہ فیصلہ وحی کی رو سے کیا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں یہ میری اپنی رائے ہے صـــ۶۷۷۔

۴۔ آپ نے غطفان سے صلح کرنا چاہی تو انصار نے عرض کیا۔ کہ یہ فیصلہ اگر خدا کا حکم ہے تو مجال انکار نہیں لیکن اگر حضور کی رائے ہے تو ہم ہماری رائے اس کے خلاف ہے۔ صـــ۶۷۷

۵۔ بریرہ نے عرض کیا کہ کیا آپ حکم دے رہے ہیں آپ نے فرمایا نہیں حکم تو نہیں۔ تو اس نے کہا پھر معاف فرمائیے۔ مجھے مغیث کی حاجت نہیں صـــ۶۷۷

۶۔ آپ نے خود اپنی بیٹیوں کی شادی مشرکین سے کی۔ حالانکہ بعد میں قرآن کریم نے اس سے منع کر دیا ظاہر ہے کہ قرآنی فیصلے سے پیشتر آپ کا عمل وحی پر مبنی نہیں تھا۔ وقس علی ہٰذا۔ صـــ۶۸۹

۷۔ جب قرآن میں اس کے متعلق حکم صادر ہوا۔ تو آپ نے رخ کی تبدیلی فرمائی۔ صـــ۶۸۹

۸۔ افک حضرت عائشہ کے واقعہ میں آپ وحی آسمانی کے انتظار میں مضطرب و بے قرار تھے۔ صـــ۶۸۹

۹۔ کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کے واقعہ میں آپ وحی آسمانی کا انتظار فرماتے رہے۔ صـــ۶۸۹

(۱) اس الزام کا مفہوم یہ ہے کہ خود آنحضور نے کسی موقعہ پر فرمایا تھا کہ اگر تم لوگ اپنے مقدمہ کو غلط بیان اور غلط شہادت کے ساتھ قائم کر کے اپنے

دیکھا آپ نے ان کا یہ لطیفہ بھی کہ یہ اندر سے مسلمان ہیں باہر سے چاہے

سو وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اقبال کے اس شعر کی پوری پوری تفسیر ہوں۔ مگر اندر سے یہ پھر بھی مسلمان ہی ہیں۔

لطیفہ

ایک پیر صاحب سے مرید نے عرض کیا۔ حضور! میں نے ایک بھینس خریدی ہے۔ چلئے اُسے دم کر آئیے۔ پیر صاحب گئے۔ تو دیکھا۔ کھونٹی سے ایک گدھا بندھا ہے۔ مرید نے عرض کیا۔ حضور یہ ہے بھینس۔ اسے دم کیجئے۔ پیر صاحب نے فرمایا۔ مگر یہ تو گدھا ہے۔ مرید ہاتھ جوڑ کر بولا۔ حضور! چھوڑیئے اس کی شکل و صورت کو یہ اندر سے بھینس ہی ہے پیر صاحب بولے۔ بیوقوف! اگر یہ اندر سے بھینس ہوتی تو باہر سے بھی بھینس ہی نظر آتی۔ اور اگر باہر سے یہ گدھا ہے تو اندر سے بھی سولہ آنے گدھا ہی ہے۔

کیوں دوستو! سمجھے کچھ آپ؟ اگر یہ لوگ واقعی اندر سے مسلمان ہوتے تو باہر سے بھی مسلمان ہی نظر آتے۔ اور اگر باہر سے یہ کچھ اور نظر آتے ہیں تو اندر سے بھی سولہ آنے کچھ اور ہی ہیں۔

مثنوی شریف کی ایک حکائیت

حضرات! اس قسم کے "جنٹلمین" ایک اور بات بھی کہا کرتے ہیں۔ کہ صاحب اگر نماز نہ پڑھی تو کیا ہوا۔ اس بات سے کیا کوئی کافر ہو جاتا ہے؟ روزہ نہ رکھا۔ تو کیا ہوا۔ اس بات سے بھی کیا کوئی کفر لازم آتا ہے۔ زکوٰۃ نہ دی۔ تو کیا ہوا۔ حج نہ کیا۔ تو کیا ہوا۔ داڑھی نہ رکھی تو کیا اسلام جاتا رہا؟ گویا کچھ بھی نہ رہے۔ مگر مسلمان پھر بھی ہیں۔ ان کی اس بات پر مولانا رومی نے ایک حکایت لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:-

ایک شوقین اپنے بازو پر شیر کی تصویر گندھوانے مصور کے پاس گیا۔ اور مصور سے کہا۔ میرے بازو پر شیر کی تصویر بنا دو۔ مصور نے سوئی نکالی۔ اور شیر بنانے کے لئے اس کے بازو پر چبھو دی۔ شوقین صاحب کو تکلیف

حق میں مجھ سے فیصلہ حاصل کر لو تو اس کی وجہ سے تمہاری غلطی کے غلطی ہونے میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ اور اس کی سزا تمہیں دوزخ میں بھگتنا ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے فیصلے وحی کے مطابق نہیں ہوتے تھے۔ ورنہ وہ خواہ جس کے بھی خلاف اور جس کے بھی حق میں ہوتے وہ دوزخی کبھی نہ ہوتا۔

آپ کے فنی کمالات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ واقعہ کو ادھورا پیش کر کے اسے اپنے حق میں بنا لیتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ آپ کی کتاب پڑھنے والوں کے ذہن نے جب آپ کے حق میں فیصلہ دے دیا تو اس طرح رسول کی بات کو لنگڑا کر پیش کرنے کے جرم میں آپ خدا کے عذاب سے بھی بچ جائیں گے۔ ورنہ کہاں غلط فیصلہ کے حصول سے کسی کو ڈرانا اور کہاں غلط فیصلہ دے ڈالنا۔ چنانچہ اس روایت کے اخیر میں تھوڑے سے الفاظ اور ملتے ہیں جنہیں اگر سامنے رکھا جائے تو رسول کے خلاف غلط فیصلہ دینے کے بہتان کی یہ باطل عمارت کہیں جڑ نہیں پکڑ سکتی۔ اس کے آخر الفاظ یہ ہیں۔

جب دونوں فریق مقدمہ نے جہنم کے عذاب کا ڈراوا سنا تو ہر فریق رو کر پکارا تھا کہ میرا حریف سچا ہے۔ اور اپنے اپنے حق سے دونوں دستبردار ہو گئے۔ اس پر آنحضور نے ان سے فرمایا کہ جس حق کا جھگڑا ہے اسے اپنے حق کے طور پر برابر سے قرعہ اندازی کے تحت تقسیم کر لو۔ اب کوئی مائی کا لال بتائے کہ جب کسی کو خلاف حق نہ دیا گیا اور نہ کسی سے خلاف حق کچھ لیا گیا تو فیصلہ غلط کیسے ہو گیا اور نہ صرف فیصلہ بلکہ آپ کے فیصلے خلاف وحی ہو گئے۔ کیا کسی کو جھوٹ سے منع کرنا بھی وحی کے خلاف ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ آنحضور نے جو غلط فیصلے دیئے ہیں۔ وہ کائنات کے کس گوشہ میں

۱ے جنت اور جہنم کسی خاص مقام کا نام نہیں کیفیات زندگی کی تعبیر ہے۔ فردوس گمگشتہ صفحہ ۳۲۹

ہوئی۔ تو پوچھنے لگے۔ شیر کی کون سی جگہ بنانے لگے ہو؟ مصوّر بولا۔ سب سے پہلے شیر کی دم بناؤں گا۔ شوقین نے کہا۔ ارے یار! دُم رہنے دو۔ خدا نے بغیر دم کے بھی تو کوئی شیر بنایا ہی ہوگا نا! مصوّر نے دم چھوڑ دی اور پھر سوئی چبھوئی۔ شوقین کو پھر تکلیف ہوئی۔ اور پوچھا۔ اب کونسی جگہ بنانے لگے ہو۔ مصوّر بولا۔ اب شیر کی ٹانگیں بنانے لگا ہوں۔ شوقین نے کہا۔ یار! ٹانگیں بھی رہنے دے۔ خدا نے لنگڑے شیر بھی تو بنائے ہونگے نا مصوّر نے وہ جگہ بھی چھوڑ دی۔ اور پھر سوئی چبھوئی۔ شوقین نے پھر پوچھا اب کونسی جگہ بناؤ گے۔ وہ بولا! اب شیر کا پیٹ! شوقین نے کہا۔ اے یار پیٹ بھی رہنے دے۔ مصوّر اب سر بنانے لگا۔ اور شوقین صاحب کو پھر تکلیف ہوئی۔ اور پھر پوچھا۔ اب کونسی جگہ بنانے لگے ہو۔ مصوّر بولا۔ اب سر بنانے لگا ہوں۔ شوقین نے کہا۔ سر بھی رہنے دو۔ اور باقی شیر بنا دو۔ مصوّر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ قبلہ معاف فرمایئے۔ ایسا شیر نہ کہیں دیکھا۔ اور نہ کسی سے سنا۔ جس کی نہ دم ہو نہ ٹانگیں۔ نہ پیٹ ہو۔ اور نہ سر، اور ہو شیر کا شیر ہی!

مولانا رُومی فرماتے ہیں۔ اور ایسا مسلمان بھی کہیں نہ دیکھا۔ اور نہ سنا جو نہ نماز پڑھے۔ نہ روزہ رکھے۔ نہ حج کرے۔ نہ زکوٰۃ دے۔ اور ہو مسلمان کا مسلمان ہی۔ نہ ویسا کوئی شیر دیکھا۔ اور نہ ایسا کوئی مسلمان دیکھا۔ شیر وہ جس کی ٹانگیں، دم، پیٹ اور سر سب صحیح سلامت ہوں۔ مسلمان بھی وہ جس کی نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج سب صحیح سلامت ہوں۔

مگر میرے بھائیو! آج تو اکثریت ہی ان بغیر اعضاء کے شیروں کی ہے۔ خوب یاد رکھیئے۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہے۔ اور سارے جنگل پر اس کی حکومت ہے۔ سارے جانوروں پر وہ غالب ہے۔ اور سب جانور اس سے ڈرتے ہیں۔ مگر شیر کے پاؤں اگر کاٹ دیئے جائیں۔ اس کے ہاتھوں کے پنجے ضائع کر دیئے جائیں۔ اس کے منہ کا حلیہ بگاڑ دیا جائے۔ تو شیر، شیر نہ رہے گا۔ اس کا وہ رعب و دبدبہ جاتا رہے گا۔ اور حال

رکھتے ہیں۔ اور کس معیار سے جانچ کر انہیں غلط ٹھیرایا گیا۔ قرآن کا فیصلہ تو یہ ہے کہ جو مسلمان فیصلہ رسول کے خلاف زبان پر تو کیا دل میں بھی خلش محسوس کرے وہ ایمان سے محروم ہو کر رہتا ہے۔ پھر کیا کسی غلط فیصلے کے خلاف رائے دینے سے ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ چونکہ رسول حاکم وقت تھا۔ اس وجہ سے اس کے فیصلے کے خلاف چوں چرا کی ممانعت کیگئی۔ نہ اس لئے کہ اس کے فیصلے صحیح تھے بلکہ اس لئے کہ وہ حاکم وقت کے فیصلے تھے۔ جس کی دھاندلی کا کوئی علاج نہ تھا ہم پوچھتے ہیں کہ خواہ کسی بھی وجہ سے سہی جب رسول کے فیصلوں کے خلاف لب کشائی تک سے قرآن میں ممانعت ہوئی اور ان کے خلاف خیال تک لانے والے کو بھی ایمان سے محروم ہو جانے کی وعید دی گئی تو پھر ان فیصلوں کو غلط اور خلاف وحی کہنے کی گنجائش کہاں سے نکل آئی؟ کیا انہیں خلاف وحی کہنے سے ان پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ اور نہ ایسا کہنے والے کے ایمان پر کوئی حرف آتا ہے۔

یہ مفروضہ بھی حد درجہ باطل ہے۔ کہ حاکم وقت کے فیصلہ کے خلاف کچھ کہنا گناہ ہے۔ قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں رسول کے فیصلہ کے خلاف چوں چرا کرنے کی یہ کچھ ممانعت ہے وہاں دوسری طرف یہ بھی ہے کہ جو لوگ خدا کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ظالم اور فاسق ہیں۔ اور جب یہ ہے تو پھر کسی فیصلہ کی یہ پوزیشن کبھی نہیں ہو سکتی کہ ایک طرف اس کے غلط ہونے کیوجہ سے اس کے صادر کرنے والا کافر ہو۔ اور دوسری طرف اس کے حاکم وقت کا فیصلہ ہونے کیوجہ سے اس کے خلاف چوں چرا کرنے اور اس کی درستی کرنے والا بھی ایمان سے محروم ہو۔ بخلاف اس کے فرض یہ ہوتا ہے کہ غلط فیصلہ کی اصلاح کیجاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لے مرکزیت اکثریت کے فیصلوں پر مجبور نہیں ہو سکتا۔ ص ۱۵۶

یہ ہو جائے گا۔ کہ ایک گدھا بھی آکر اس اپاہج و بیکار شیر پر حملہ کرنے سے نہ چوکے گا۔ تو میرے مسلمان بھائیو! تم محمدی شیر تھے۔ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کے مطابق تمہیں اعلیٰ و حاکم تھے۔ اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ کے مصداق کفار پر تمہارا رعب و دبدبہ تھا۔ اور سب تم سے خائف و لرزاں تھے۔ مگر آہ! اس ملحدانہ ترقی نے تمہارے اسلامی اعضا کاٹ کر رکھ دیئے۔ اور ملحدینِ زمانہ نے اس اسلامی شیر کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ جس کا بھیانک نتیجہ یہ نظر آ رہا ہے۔ کہ آج وہ گدھے بھی جن پر کبھی ہمارا رعب غالب تھا۔ ہم پر وار کرنے سے نہیں چوکتے۔ یہ سب کچھ کس لئے۔ صرف اس لئے کہ ہم نے اسلامی سیرت و صورت کو چھوڑ دیا ؎

وہ سوز و گداز اس محفل میں باقی نہ رہا اندھیرا ہوا!
پروانوں نے جلنا چھوڑ دیا شمعوں نے پگھلنا چھوڑ دیا
اللہ کی رہ اب تک ہے کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا
جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصرِ عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

قبر میں دیدار

ہاں تو میرے بھائیو! میں قبر میں منکر نکیر کے سوالات کا ذکر کر رہا تھا۔ اور یہ بتانے لگا تھا۔ کہ ذکر رسول کا ہمیں قبر میں کونسا عظیم فائدہ ہوگا۔ تو آپ سن چکے۔ کہ فرشتے جب مسلمان سے پوچھیں گے۔ کہ بتا تو ان کے متعلق کیا کہتا ہے۔ تو مسلمان جھٹ سے بول اٹھے گا۔

ھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم!

وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

بھائیو! آج ہم بدنصیبوں نے بُعدِ زمانہ کی وجہ سے اپنی ان گنہگار آنکھوں سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی۔ اور آپ جانتے ہیں۔ کہ جسے کبھی نہ دیکھا ہو۔ اُسے دیکھ کر پہچان لینا کہ یہ فلاں

اور اسے[1] نہ مانا جائے۔

قرآن میں واضح ہے کہ حضرت داؤدؑ حاکمِ وقت تھے۔ اور ان کے ہاں بکریوں کے ایک کھیت اجاڑ کھانے کا مقدمہ پیش ہوا۔ انہوں نے اس کا جو فیصلہ فرمایا وہ حضرت سلیمانؑ کو قابلِ اصلاح نظر آیا۔ اور انہوں نے اس میں جو ترمیم فرمائی وہ حضرت داؤدؑ[2] کو بھی پسند آئی۔ اور انہوں نے اسے قبول کرتے ہوئے اپنے فیصلہ کی اصلاح فرمائی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حاکمِ وقت کے ایک قابلِ اصلاح فیصلہ کے خلاف لب کشائی کرنا کفر ہوتا! تو حضرت سلیمانؑ کبھی ایسا نہ کرتے اس لیے آنحضورؐ کے فیصلوں کیخلاف

---

[1] قرآن میں جب بیان ہوا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے علماء و مشائخ کو خدا بنا رکھا ہے تو انہوں نے آنحضورؐ سے کہا کہ ہم نے تو کبھی ایسا نہیں کیا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جو خدا کی کتاب کو چھوڑ کر اپنے علماء کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام مان لیتے ہو ایسا کرنا ہی انہیں خدا ماننا ہے۔

[2] قرآن مجید میں اس مقدمہ کی تفصیلات نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے گلہ والے کی بکریوں سے کھیتی کے مالک کو اس کے نقصان کا تاوان دلایا۔ اور اس پر دونوں مطمئن نہ تھے کھیتی والا تھوڑے معاوضہ کیوجہ سے اور گلے والا زیادہ تاوان کی بناء پر نالاں تھا۔ حضرت سلیمانؑ جو ابھی لڑکے تھے۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ گلے والے کو کھیتی تیار کرنے کے لیے کہا جائے اور اس کے کھیتی تیار کرنے تک اسکی بکریوں سے کھیتی والا فائدہ اٹھائے۔ اس طرح دونوں راضی ہو گئے۔

حدیز صاحب کہتے ہیں کہ اگر حضرت داؤدؑ کا فیصلہ وحی کے مطابق ہوتا تو وہ کسی طرح بھی قابلِ اصلاح نہ ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حضرت

شخص ہے۔ بڑا مشکل ہے۔ مگر حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ و سلم جنہیں ہم نے ان آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھا۔ جب قبر میں تشریف لائیں گے۔ تو ہم دیکھتے ہی پکار اٹھیں گے۔

ھو رسول اللہ صلے اللہ علیہ و سلم!

وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

یہ کبھی دیکھنے کے بغیر بھی ہم جو حضور صلے اللہ علیہ و سلم کو فوراً پہچان جائینگے۔ اور پکار اٹھینگے۔ کہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ جانتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یاد رکھئے۔ ان کی وجہ یہی ہے۔ کہ مسلمان اس دنیا میں "ذکر رسول" کا شائق رہا۔ محافل میلاد منعقد کرتا کراتا رہا۔ اور ان محفلوں میں اپنے آقا و مولی صلے اللہ علیہ و سلم کی سیرت و صورت کے مبارک تذکرے۔ نظماً و نثراً سنتا رہا۔ میلاد شریف کی محفلوں میں واعظ سناتے رہے۔ کہ ہمارے حضور کی صورت مبارکہ ایسی تھی۔ سیرت مطہرہ ایسی تھی۔ تو مسلمان ان محافل میلاد کے ذریعہ "ذکر رسول" سن سنا کر اپنے محبوب آقا صلے اللہ علیہ و سلم کی مبارک صورت کو خوب یاد کر لیتا ہے۔ اور حالت یہ ہوتی ہے۔ کہ ہر وقت محبوب کی یاد تازہ رہتی ہے۔ اور محبوب کی سیرت و صورت آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ اور جب مرتا ہے اور قبر میں سرکار تشریف لاتے ہیں۔ تو دیکھتے ہی جھٹ پہچان جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔ هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وہ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ و سلم ہیں اور قدموں سے لپٹ جاتا ہے۔ میں نے اپنی ایک نعت میں لکھا ہے ؎

قبر میں سرکار آئیں تو میں قدموں میں گروں
اور فرشتے گر اٹھائیں تو میں ان سے یوں کہوں
لحد میں پائے ناز سے اب اے فرشتو کیوں اٹھوں
مر کے پہنچا ہوں یہاں اس دلربا کے واسطے

مسلمانو! عاشقوں سے پوچھو۔ انہیں مرنے کے بعد اس "دیدار محبوب"

کچھ کہنے یا سوچنے کی جو ممانعت ہوئی تو وہ محض ان کے صحیح ہونے کی وجہ سے نہ کہ کسی اور وجہ سے ہوئی۔ ورنہ حکومت و اقتدار کی طاقت کسی غلط فیصلے کو صحیح کبھی نہیں بنا سکتی اقتدار تو صرف اس وجہ سے ضروری ہوتا ہے کہ اگر کوئی نابکار فریق مقدمہ صحیح فیصلہ کو ماننے پر تیار نہ ہو۔ تو اسے دوسری طرح اس کا پابند بنایا جائے۔

اس روایت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر آنحضور فریقہائے مقدمہ کو انکی غلط پیروی کے انجام سے نہ ڈراتے اور وہ ایسے غلط رنگ میں پیش کرتے تو ان کے غلط بیان اور غلط ثبوت کے پیش نظر آنحضور کا دیا ہوا فیصلہ بھی غلط ہوتا جو بہر حال وحی کے خلاف ہی ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا مفروضہ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ یہ ثابت کیا جائے کہ فریقہائے مقدمہ کے بیانات اور شہادتیں لینا اور ان کے مطابق فیصلہ چکانا قرآن کا حکم نہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ثابت

٭ داؤد کیطرف کبھی وحی کی نقل ملاحظہ کیجائے۔ تو وہاں ضرور موجود ہو گا کہ یہ مقدمہ حضرت سلیمانؑ کی قانونی مہارت کے امتحان کے طور پر ان کے سامنے لایا گیا جس میں وہ پورے نمبروں کے ساتھ کامیاب اترے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بچپن میں وہ اس قدر ماہر ہوں اور منصب نبوت پر فائز ہو جانے کے بعد غلط فیصلے دینے لگ جائیں۔

اس مقدمہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کے عہد حکومت میں پرویز صاحب کا قرآنی نظام ربوبیت نہ تھا جس میں روٹی اور بیوی سب کے لئے عام ہوتی۔ ورنہ کسی کے تاوان دینے اور لینے کا سوال ہی پیش نہ آتا۔ زیادہ سے زیادہ نقصان کرنے والے کو چند تھپڑ لگا دیئے جاتے اور نہ ہی ایسے نظیر کے طور پر قرآن میں لانا ذاتی ملکیت کے منافی ہے۔

کی کس قدر مسرت ہوتی ہے۔ اور وہ دیدارِ حبیب کی خاطر کس خوشی سے جان دیتے ہیں۔ حضرت مولانا آسی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں۔ ؎

آج پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسیؔ!
جسکے جویاں تھے ہے اس گل کی ملاقات کی رات

تو مسلمان اسی "ذکرِ رسول" کی بدولت قبر میں اپنے محبوب صلے اللہ علیہ وسلم کو فوراً پہچان کر لیں پکار اٹھے گا ھُوَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلے اللہ علیہ وسلم اور جو لوگ "ذکرِ رسول" کو اور ذکرِ رسول کی محفلوں کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ انہیں اس "ذکرِ رسول" کے سننے سنانے سے روکنے کا یہ پھل ملے گا۔ کہ فرشتے جب حضور کے متعلق دریافت کریں گے کہ بتا یہ کون ہیں۔ تو یوں جواب دیں گے۔ ھَاہ ھَاہ لَا اَدْرِیْ ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ دیکھا آپ نے "ذکرِ رسول" سے روکنے کا نتیجہ بجز ہائے ہائے کے اور کچھ نہیں۔

ایک اعتراض کا جواب

مسلمانو! اس حدیث کے مطابق قبر میں خود حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم ہی تشریف لاتے ہیں۔ جبھی تو فرشتے ھٰذَا الرَّجُلِ یعنی ان کے لئے کیا کہتا ہے؟ کہیں گے۔ یہ "اِن کے لئے" کا قول ہی بتا رہا ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تشریف لاتے ہیں۔ اور اگر کوئی معترض یہ کہے کہ میت کا جواب جو حدیث میں درج ہے۔ ھُوَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلے اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ہے۔ جس کا معنی ہے۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو یہاں لفظ "وہ" بتا رہا ہے کہ حضور قبر میں نہیں ہوتے ورنہ "وہ" کی جگہ "یہ" ہوتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں ہے۔ کہ زکریا علیہ السلام نے جب مریم علیہا السلام کو بیت المقدس کے محراب میں اپنی کفالت میں رکھا۔ تو آپ دروازہ مقفل کر کے باہر تشریف لے جاتے۔ اور جب واپس تشریف لاتے اور دروازہ کھول کر مریم علیہا السلام کے پاس محراب میں جاتے۔ تو اس بند جگہ میں مریم علیہا السلام کے پاس طرح طرح کے پھل موجود پاتے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا۔ (پ۳ ع۱۲)

رہنا چاہیئے۔ کہ عدالتوں کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کے گھروں میں بیٹھے بیٹھے ظالم سے مظلوم کو حق دلائیں۔ ورنہ اکثر کیس ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو عدالتوں میں لائے نہیں جاتے۔ اور ظالم و مظلوم کا پتہ نہیں چلتا۔ اس چیز کا قرآن میں ثبوت تو کیا ہوگا۔ قرآن میں تو یہ حکم ہے کہ عدل اور انصاف کرو۔ اور سچی شہادت ادا کرو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ عدالتیں لوگوں کے بیانات اور شہادتیں سنیں۔ اور انہیں الگ الگ کھونٹے سے باندھ کر چارہ پانی ڈالتے رہنے کی بجائے اس کی گنجائش اور موقعہ دیا جائے۔ کہ وہ آزادی کے ساتھ ایکدوسرے سے معاملات کو انجام دیں اور پھر جب ان معاملات میں لگاڈ پیدا ہو تو انہیں عدالتوں کے پاس لائیں اور پھر جو فریق وہاں بھی معاند رہے اسے سیدھا کیا جائے۔ یہ اگر قرآن کا منشا نہ ہوتا۔ تو پھر صحیح فیصلہ اور صحیح شہادت کا حکم دینے کی بجائے یہ کہا جاتا کہ لوگوں کو ایسے شکنجہ میں کس کر رکھو کہ وہ سرے سے ایک دوسرے پر زیادتی کرنے ہی نہ پائیں۔

اس روایت سے ایک اور قانونی مسئلہ بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ عدالت کے قاضی اور جج کو اپنے ذاتی معلومات کی بناپر مقدمہ کا فیصلہ کرنا چاہیئے یا واقعات کی شہادت کی بناپر۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کو واقعات کی شہادت پر ہی فیصلہ دینا چاہیئے۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ جب ایک خاوند اپنی بیوی کے خلاف بد معاشی کی تہمت لگائے اور کوئی گواہ نہ لائے تو اس طرح وہ بیوی کو تو کیا سزا دلائے گا۔ خود اس کی تہمت کی سزا سے بھی اس کے بغیر نہیں بچ سکتا۔ کہ چار مرتبہ اپنے بیان کی سچائی میں شہادت حلفیہ ادا کرے اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت پڑے۔ اس کے بعد وہ سزا سے بچ جاتا ہے اور اس

"جب زکریا اس کے پاس اس کی نماز پڑھنے کی جگہ جاتے۔ اس کے پاس نیا رزق پاتے۔"

حضرت زکریا علیہ السلام نے یہ پھل دیکھ کر حضرت مریم علیہا السلام سے دریافت فرمایا۔ یَا مَرْیَمُ اَنّٰی لَکِ هٰذَا ۔ اے مریم یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟

حضرت زکریا علیہ السلام نے اس پھل کے متعلق جو مریم علیہا السلام کے پاس موجود تھا۔ یوں دریافت فرمایا۔ اَنّٰی لَکِ هٰذَا ۔ یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ تو مریم علیہا السلام کا جواب قرآن میں مذکور ہے کہ

قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۔" بولیں وہ اللہ کے پاس سے ہے۔"

دیکھ لیجئے! وہ پھل مریم علیہا السلام کے پاس ہی رکھا تھا۔ اور اس کیلئے زکریا علیہ السلام نے بھی "هٰذَا" کہہ کر پوچھا کہ "یہ کہاں سے آیا" مگر مریم علیہا السلام اس قریب کی چیز کو فرما رہی ہیں هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ " وہ اللہ کے پاس سے ہے۔" تو بھائیو! یہ بھی ایک خاص انداز ہے۔ قریب کی چیز کو "وہ" کہہ کر مشارٌ الیہ کی عظمت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ چونکہ بے موسم کا پھل پھر ایک بند کمرے میں خاص حضرت مریم علیہا السلام کی خاطر بھیج دینا یہ اللہ کا ایک خاص کرم تھا۔ تو مریم علیہا السلام اللہ کے اس خاص انعام کی عظمت بیان کرنے کے لئے اُسے هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ فرما دیتی ہیں۔ تو اسی طرح مسلمان میت کے لئے بھی ایک بند کمرے میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ و سلم کا تشریف لے آنا خدا کی قسم سب سے بڑا انعام الٰہی ہے۔ تو اس خاص انعام الٰہی کو اپنی خاطر اپنے پاس دیکھ کر مسلمان گویا ایک عالم وجد میں آکر قدموں میں سر جھکا دیتا ہے۔ اور اپنی نظریں نیچی کرکے یوں پکار اٹھتا ہے:۔

هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ۔ وہ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ و سلم ہیں۔

تو اس اندازِ جواب کو عشاق ہی جان سکتے ہیں۔ ؏

بے ادب کو کیا خبر آداب کی؟

کے لگائے ہوئے الزام سے اس کی بیوی اسی صورت بچ سکتی ہے کہ وہ بھی اپنی پاکدامنی پر اسی طرح کی پانچ شہادتیں ادا کرے۔

ایسے مقدمہ میں عدالت کا جج اور قاضی اگرچہ ذاتی طور پر خاوند کو یا اسکی بیوی کو جھوٹا جانتا ہو۔ تو بھی قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر نہ انہیں ادائے شہادت سے روک سکتا ہے اور ان پر ادائے شہادت کے بعد سزا لگا سکتا ہے۔ رہا یہ امر کہ ایسے معاملہ میں جس فریق پر زیادتی ہو رہی ہو اسے نقصان سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ تو جہاں تک قرآنی حدود و تعزیرات کا تعلق ہے۔ انہیں تو وہ نافذ کرنے پر مجبور ہوگا۔ اور دوسرے معاملات میں جس فریق کے خلاف فیصلہ ہو رہا ہو اسے کسی طرح نقصان سے بچایا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ قاضی خود اپنی طرف سے اس کا تاوان ادا کرے اور قتل کے مقدمہ میں مقتول کے لوگوں کو خون کی بجائے خون بہا لینے پر راضی کرے۔ اور یہ کہ اپنے محکم استدلال سے غلط شہادت کو ناکام بنائے: یا خود فیصلہ چکانے کی بجائے کسی ثالث کے سپرد کرے۔ اور اس کے سامنے اپنا بیان دیگر غلط ثبوت کو کمزور بنائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں خدا کا خوف دلائے۔ جیسا کہ خود آنحضور نے بھی کیا۔

۲۔ اس الزام کا مفہوم یہ ہے کہ کھجوریں پیوند کرنے والے کچھ لوگوں کو آنحضور نے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرو تو کچھ ہرج نہیں۔ یہ سن کر وہ اس کام کو چھوڑ بیٹھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال کھجوروں کا پھل تھوڑا آیا۔ پھر جب لوگوں نے اس کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے خیال سے ایسا کہا تھا جس کا پابند ہونا تمہارے لئے ضروری نہ تھا۔

اس حدیث کے متعلق کچھ باتیں غور طلب ہیں۔ یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ آنحضور نے کس موقعہ پر ایسا فرمایا تھا۔ اگر وہاں جا کر فرمایا تھا جہاں لوگ اپنا کام کر رہے تھے۔ تو کیا وہ سنتے ہی اپنا کام چھوڑ بیٹھے۔ اور جس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رہ گیا جیسا کہ شراب کی ممانعت اور قبلہ کی تبدیلی پر ہوا۔ اور اگر آپ نے گھر یا مسجد میں ایسا فرمایا تو کیا تمام

اَنَا حَبِیْبُ اللہ

حضرات! میں کہاں سے کہاں آ پہنچا۔ آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے ایک حدیث پڑھی تھی۔ جس میں صحابہ کرام علیہم الرضوان کا اکٹھے ہو کر انبیاء سابقہ علیہم السلام کا ذکر کرنا مذکور تھا اور جس میں اس بات کا ذکر تھا۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ و سلم نے صحابہ کرام سے فرمایا۔ کہ بیشک ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل تھے۔ اور موسےٰ علیہ السلام اللہ کے کلیم تھے۔ لیکن میں اللہ کا حبیب ہوں۔ دوستو! اس حدیث سے ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی فضیلت و برتری ثابت ہو رہی ہے اس لئے کہ "حبیب اللہ" کا درجہ کلیم اللہ، اور خلیل اللہ سب سے بلند و بالا ہے چنانچہ اسی حدیث کے ماتحت لمعات شرح مشکوٰۃ میں ہے۔

هُوَ جَامِعٌ لِلْخُلَّةِ وَالتَّكْلِيْمِ وَالْاِصْطِفَاءِ وَالْمُنَاجَاةِ مَعَ شَيْءٍ زَائِدٍ لَمْ يَثْبُتْ لِاَحَدٍ وَهُوَ كَوْنُهٗ مَحْبُوْبُ اللهِ بِالْمُحَبَّةِ الْخَاصَّةِ الَّتِيْ مِنْ خَوَاصِّهٖ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — یعنی لفظ "حبیب، خلّت، "کلم اصطفار۔ اور مناجات، سب کا جامع ہے معہ ایک ایسی زائد چیز کے جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں اور وہ ہے۔ "اللہ کا محبوب ہونا" ایک ایسی محبت سے جو حضور علیہ السلام کے خصائص میں سے ہے۔"

مطلب یہ کہ کوئی پیغمبر خلیل ہے۔ کوئی کلیم اور کوئی نجی۔ مگر سید الانبیاء صلے اللہ علیہ و سلم "حبیب" ہیں۔ اور حبیب وہ ہے۔ جو خلیل بھی ہو۔ کلیم بھی ہو۔ نجی بھی ہو۔ اور مصطفےٰ بھی۔ گویا جو جامع الصفات ہو۔ اور "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا جو مصداق ہے۔ وہ حبیب ہے۔

کلیم و حبیب میں فرق

علامہ صفوری علیہ الرحمۃ نے نزہتہ المجالس میں لکھا ہے قَالَ النَّسَفِيُّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ يَا رَبِّ اَنَا كَلِيْمُكَ وَمُحَمَّدٌ حَبِيْبُكَ فَمَا الْفَرْقُ بَيْنَ الْكَلِيْمِ وَالْحَبِيْبِ فَقَالَ الْكَلِيْمُ يَعْمَلُ بِرِضَاءِ مَوْلَاهُ وَالْحَبِيْبُ يَعْمَلُ بِرِضَائِهٖ وَالْكَلِيْمُ يُحِبُّ اللهَ وَالْحَبِيْبُ يُحِبُّهُ اللهُ وَالْكَلِيْمُ يَاْتِيْ اِلٰى طُوْرِ سَيْنَاءَ ثُمَّ يُنَاجِيْ۔ وَالْحَبِيْبُ يَنَامُ عَلٰى فِرَاشِهٖ فَيَاْتِيْ بِهٖ جِبْرَئِيْلُ فِيْ طَرْفَةِ

علاقہ کے لوگ اسی بات پر چل پڑے۔ جو انہوں نے دوسروں سے سُنی تھی۔ اور کسی نے بھی اس کی تحقیق نہ کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کام صدیوں سے علاقہ بھر کے لوگ کر رہے تھے اور جس کے درست انجام پانے پر ہی ان کے اور ان کے پاس آنے والے مہاجرین کی معیشت کا دارومدار تھا۔ اسے چھوڑنے پر انہیں کافی غوروفکر اور تحقیق سے کام لینا چاہیئے تھا۔ اور پھر گردوپیش کے لوگوں تک بھی اس ممانعت کے پہنچنے میں وقت لگا ہوگا جس کے لئے کوئی تمہیدی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ اور ابتدائی سُننے والوں اور اُن سے سننے والوں نے بھی اس کو تحقیق کے قابل سمجھا ہوگا۔ اس تحقیق کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جو بات لوگوں کو سال گذر جانے کے بعد معلوم ہوئی وہ اس سے پہلے معلوم ہو جاتی اور سال کے بعد اس ممانعت کے متعلق نفع و خسارہ کے میزانیہ کا سوال سامنے آتا ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میرے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں وجہ یہ ہے کہ میرے پاس حدیث کی کتابیں موجود نہیں۔ اور یہ چیز کتب حدیث سے بڑھ کر شرح حدیث کی کتابوں میں پائی جا سکتی ہے۔ اس لئے جو حضرات اس راہ میں دسترس رکھتے ہوں انہیں میری رہنمائی کرنی چاہیئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر فی الواقع اتنے بڑے کام کو اس مختصر سی ممانعت کے ساتھ کلیۃً طور پر ترک کر کے رکھ دیا گیا تو یہ مزید ثبوت ہے۔ اس بات کا کہ آنحضورؐ کی ہر بات کو وحی ناطق مانا جاتا تھا۔ اور جب مانا جاتا تھا تو ایسا ماننے والوں کو آپ نے یہ نہیں سمجھایا کہ ایسا نہ مانو! بلکہ سمجھایا صرف یہ گیا کہ کم از کم میرے ایک حکم اور اظہار خیال کے درمیان فرق قائم رکھ کر تو تمہیں میری بات کی پیروی کرنا چاہیئے۔ یہ کیا ہوا کہ ادھر بات سنی اور ادھر اس پر عمل کر ڈالا۔ اس پر بھی اگر کوئی کہنے کہ آنحضورؐ کی بات وحی نہیں تھی تو اسے ثابت کرنا چاہیئے کہ آپ کو وحی کی طرف سے اظہار خیال کرنا ممنوع تھا۔ اور آپ کا یہ کچھ بھی فرض نہ تھا۔ کہ مباحات کے دائرہ سے لوگوں کو آگاہ فرماتے۔

عَيْنٍ إِلَى مَكَانٍ لَمْ يَبْلُغْهُ أَحَدٌ مِنَ الْمَخْلُوقِيْنَ ۔ (نزہتہ المجالس ص۴۳ ج ۲)

نسفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ موسٰی علیہ السلام نے رب سے پوچھا۔ کہ مولا میں تیرا کلیم ہوں ۔ اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تیرے حبیب ہیں۔ یہ تو فرما۔ کلیم اور حبیب میں فرق کیا ہے ؟ خدا نے جواب دیا کہ کلیم وہ ہے۔ جو اپنے مولا کی رضا سے کام کرے۔ اور حبیب وہ ہے۔ جس کی رضا سے مولا کام کرے۔ اور کلیم وہ ہے۔ جو اللہ کو چاہے۔ اور حبیب وہ ہے جسے اللہ چاہے۔ کلیم وہ ہے۔ جو خود طور سینا پر آکر التجا کرے۔ اور حبیب وہ ہے جو اپنے بستر ناز پر آرام فرما ہو۔ اور بحکم خدا جبریل خود حاضر ہو کر اسے ایک پل میں وہاں لے آئے جہاں کوئی نہ پہنچا ہو۔"

دیکھا آپ نے مسلمانو! ہمارے آقا کی کیا شان ہے۔ اسی لئے حضور نے فرمایا۔ کہ اَنَا حَبِیْبُ اللّٰہِ ۔کہ خوب جان لو۔ میں اللہ کا حبیب ہوں، گویا میں وہ ہوں جس سے خود خدا محبت فرماتا ہے۔ اور جس کی مرضی کو وہ پورا فرما دیتا ہے۔ میرے دوستو! اس حقیقت پر کہ خدا حضور کی مرضی کو پورا فرما دیتا ہے۔ خود قرآن شاہد ہے

تحویلِ قبلہ

دیکھئے! اور انبیاء کرام بحکم حق بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ سب کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کچھ عرصہ بیت المقدس ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مرضی یہ تھی۔ کہ میرا قبلہ "کعبہ" شریف ہو جائے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام ایک مرتبہ اسی تمنا میں بار بار آسمان کی طرف نظر فرماتے ہیں کہ خدا میری مرضی کے مطابق تحویلِ قبلہ کا ارشاد فرما دے ـــــ تو خداوند کریم نے فرما دیا :-

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ (پ۲ ع۱) ـــــ (اے محبوب!) ہم تیرا بار بار آسمان کی طرف منہ کرنا دیکھ رہے ہیں۔ تو ہم ضرور تجھے اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ جس میں تمہاری خوشی اور مرضی ہے

۳۔ اس الزام کا مفہوم یہ ہے کہ بدر کے میدان جنگ میں جب آں حضور ایک جگہ ڈیرہ ڈالنے لگے تو آپ کے ایک ساتھی نے آپکو توجہ دلائی کہ اگر اس خاص جگہ کے لئے وحی کا حکم نہیں تو پھر اس سے فلاں جگہ بہتر ہے چنانچہ آپ نے اس کی بات مانتے ہوئے۔ یہ بھی فرمادیا کہ اس جگہ کے لئے وحی کا حکم نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا پہلی جگہ تجویز فرمانا وحی کے مطابق نہ تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ چلیے ایسا ہی مان لیجئے، پھر ایسا مان لینے کے بعد قرآن کا یہ اصول کہاں قائم رہا۔ جسے قرآن میں بار بار دوہرایا گیا ہے۔ کہ رسول اتباع وحی کئے بغیر اور کچھ بھی نہیں کرتا۔ اور اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ وحی کی پیروی کرے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اصول یہ بھی ہے جسے پرویز صاحب اپنی کتابوں میں اکتا دینے والی کثرت کے ساتھ دوہراتے ہیں۔ کہ جو روایت قرآن کے خلاف ہو اسے نہ مانا جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس اصول کی پیروی کرنے میں اگر آپ کے اندر کچھ بھی صداقت ہے تو یہ روایت آپکا امتحان ہے۔ کیونکہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ آنحضور کا ہر کام وحی تھا۔ اور یہ روایت کہتی ہے کہ ایسا نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسے نہ مانا جائے۔ کیا خلاف قرآن روایت نہ ماننے کا اصول صرف اس لئے ہے کہ اس کے ذریعہ احکام شریعت سے کھیلا جائے۔

پھر قرآن میں خدا نے مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ ہم تمہیں آزمائش و امتحان کے طور پر بھلائی اور برائی میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہاں بھی یہ سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ اگر آں حضور نے اپنے ساتھیوں کی جنگی سمجھ بوجھ کا امتحان لینے کی غرض سے ایک غیر مناسب جگہ ڈیرہ ڈالنے کا خیال ظاہر کیا ہو تو یہ وحی کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے۔

اور اگر اس روایت کے اصل سوال و جواب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصل موضوع بحث یہ نہ تھا۔ کہ قرآن کے خارج کوئی وحی ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ تھا

پس ابھی اپنا منہ مسجد حرام (کعبہ) کی طرف پھیر لو۔"

کیوں میرے دوستو! اس آیت سے کیا یہ ثابت نہیں ہو رہا۔ کہ ہمارا یہ قبلہ کعبہ شریف صرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق بنایا گیا ہے ورنہ حضور سے قبل تو سب کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ اور کچھ عرصہ حضور بھی اسی قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ مگر حضور کی مرضی یہ ہو گئی۔ کہ ہمارا قبلہ کعبہ ہو جائے۔ تو اللہ نے بھی فرما دیا۔ کہ پیارے جو تمہاری مرضی، ہماری مرضی بھی وہی ہے۔ کیا خوب فرمایا اعلیٰ حضرت نے ؎

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم!
خدا چاہتا ہے رضائے محمدؐ!

میرے بزرگو! یہ حقیقت ہے۔ کہ ہمارے حضور کی زبان حق ترجمان سے جو بات نکل جائے۔ اللہ تعالیٰ اُسے پُورا فرما دیتا ہے۔ اور حضور کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ع

تمہارے منہ سے جو نکلی وہ بات ہو کے رہی

کُن کی کُنجی

اعلیٰ حضرت بریلوی قدس سرہ العزیز نے حدائق بخشش میں ایک جگہ لکھا ہے ؎

وہ زباں جس کو سب کُن کی کنجی کہیں
اس کی نافذ حکومت پہ لاکھوں سلام

یعنی سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان حق ترجمان کُن کی کُنجی ہے۔ اس زبان سے جس چیز کے لئے کُن کا ارشاد ہو جائے۔ وہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث

ایک گستاخ رسُول کا انجام

شریف میں ایک گستاخ رسول کا انجام مذکور ہے کہ ایک شخص ابوالعاص نامی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نقلیں اتار کر مذاق کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ملعون اپنا منہ ٹیڑھا کر کے حضور کی نقل اتار رہا تھا۔ کہ حضور نے اس کی یہ حرکت دیکھ کر فرمایا:۔

کُن کَذَالِکَ ...... "ایسا ہی ہو جا"

کہ اس خاص جگہ کے متعلق وحی کا حکم کیا ہے۔ حالانکہ پرویز صاحب کا بنیادی دعویٰ ہی یہ خیال ہے کہ قرآن کے خارج کوئی وحی نہیں۔ یہ دعویٰ اگر صحیح ہوتا تو وہاں سوال یہ ہوتا کہ قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ اور قرآن میں کس جگہ ڈیرہ ڈالنے کا حکم آیا ہے۔

۴۔ اس الزام کا مطلب یہ ہے کہ جنگ خندق کے موقعہ پر جب آنحضور نے قبیلہ غطفان سے صلح کرنا چاہی تو انصار کے اس پر آمادہ نہ ہونے کیوجہ سے آپ نے صلح کے اس خیال کو ترک فرمادیا معلوم ہوا کہ صلح کے متعلق آپکا خیال وحی کے مطابق نہ تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ کو وحی یہ کی گئی کہ صلح کا خیال اور اس کی تجویز پیش کر کے انصار کے عزم و استقلال کا اندازہ کیا جائے۔ اور ان کے حوصلے بڑھائے جائیں تو اس کے خلاف وحی ہونے کا الزام کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ اگر ثابت ہو کہ آں حضور کو تجویز کے طور پر صلح کی بات پیش کرنے کی قرآن میں ممانعت تھی اور آپ نے اسے پیش کر دیا۔ تو پھر اس الزام کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ قرآن میں تو آپ کو مسائل میں مسلمانوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کی پیروی میں صلح کی تجویز پیش کرنا کسی طرح بھی قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا اور نہ وحی کی رہنمائی کا مقصود یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن و افکار کو بڑھانے کا کام چھوڑ دیا جائے۔ اور سوچنے اور رائے دینے کا کہیں انہیں موقعہ نہ دیا جائے۔ اور بس عقلی پہلو سے کچھ سمجھانے بجھانے کی بجائے انہیں چار پاؤں کیطرح ہانکا اور کھینچا جائے۔

۵۔ اس الزام کا مفہوم یہ ہے کہ بریرہ لونڈی کو آنحضور نے ایک مشورہ فرمایا جسے اس نے رد کر دیا معلوم ہوا کہ آپکا مشورہ وحی نہ تھا۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے کہ مشورہ دینے کا یہ کام آپ نے وحی کے بغیر کیا ہو حالانکہ ایسا نہیں بلکہ قرآن میں آپکو اس کا حکم دیا گیا ہے۔

چنانچہ مرتے دم تک اس کا منہ ویسا ہی ہو گیا اور اسی طرح ہلتا رہا۔

(خصائص کبریٰ ص۷۹ جلد ۲)

بلا عذر بائیں ہاتھ سے کھانے والے کا انجام

ایک دوسری حدیث سنیئے۔ ایک شخص بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ حضور نے دیکھ کر اُسے فرمایا۔ "کُلْ بِیَمِیْنِكَ" دائیں ہاتھ سے کھا۔ اس نے یونہی کہدیا لَا اَسْتَطِیْعُ میرا داہنا ہاتھ بیکار ہے۔ حضور نے فرما دیا۔ لَا اسْتَطَعْتَ جا آج سے بیکار ہو گیا۔ حدیث کے الفاظ ہیں:۔

فَمَا رَفَعَهَا اِلٰی فِیْهِ ۔ (مشکوٰۃ شریف ص۲۵)

پھر وہ اپنے اس ہاتھ کو کبھی منہ تک نہ اٹھا سکا!

دیکھا آپ نے! یہ ہے ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانِ پاک کی نافذ حکومت کہ جس بات کا حکم نافذ فرمایا۔ وہی ہو گیا۔ اسی لئے اعلیٰ حضرت نے یہ لکھا ہے ؎

وہ زباں جس کو سب کُن کی کنجی کہیں!
اس کی نافذ حکومت پہ لاکھوں سلام

حضور کا ارشاد شریعت ہے

میرے بزرگو! اس زبان سے جو ارشاد بھی نکلے امت کیلئے وہی شریعت ہے۔ یہ زبانِ حق ترجمان ہے۔ اور اس زبان حق ترجمان سے جو ارشاد صادر ہو جائے وہی مرضیٔ حق ہوتی ہے۔ اور جو مرضیٔ حق ہو وہی اس زبان سے ارشاد ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:۔

مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (پ۲۷ ع ۵)

"اور وہ کوئی بات ہی خواہش سے نہیں کرتے۔ وہ تو نہیں۔ مگر وحی جو انہیں کی جاتی ہے"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اس زبانِ حق ترجمان سے وہی کچھ ارشاد ہوتا ہے۔ جو مرضیٔ حق ہو۔ گویا جو کچھ حضور ارشاد فرمادیں۔ وہی مرضیٔ حق ہے۔ اور جس بات سے حضور روک دیں خدا بھی اس بات پر خوش نہیں ہے ؎

اور یہ حکم جہاں مردوں عورتوں کے لئے عام ہے وہاں غلاموں اور لونڈیوں کے معاملات بھی اس سے باہر نہیں۔ اور جب آپ کو مشورہ لینے کا حکم تھا تو دوسروں کو مشورہ دینا بھی اس کے اندر شامل ہے۔ اور مشورہ کا دائرہ یہ ہوتا ہے کہ اسے لازم نہ سمجھا جائے۔ اس لئے اس لونڈی نے آپ کے مشورہ کو مشورہ ہی سمجھا اور اس پر عمل کرنا ضروری نہ سمجھا۔ بریز صاحب کہتے ہیں کہ مشورہ پر عمل کرنا لازم نہیں مگر جو مشورہ نہ صرف مشورہ ہو بلکہ وحی بھی ہو وہ بہرحال صحیح ہوتا ہے۔ اور اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس مشورہ کا مرکزی نکتہ بھی اگر وحی کے مطابق ہوتا تو ہرگز قابل رد نہ ہوتا۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر ہرگز قابل رد نہ ہوتا تو مشورہ کب رہتا۔ وہ تو حکم بن جاتا۔ اور خود روایت میں موجود ہے کہ وہ حکم اور فیصلہ یا قانون نہ تھا بلکہ مشورہ تھا۔ اور ہر مشورہ کا لازمہ یہ ہے۔ کہ اسے حکم کا مقام کبھی نہ دیا جائے۔ اور جب اسے مانا جائے تو بھی اس کے مشورہ ہونے کی حیثیت کو ہر حال میں باقی رکھا جائے۔ اور اس کا باقی رکھنا تمام تر ماحول اور حالات کے تحت ہی متعین کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جہاں ایک حاکم و آقا اپنے غلاموں اور رعایا کو مشورہ دے تو اس کی مشاورتی حیثیت کو اس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے مشورے کے خلاف چلیں اور ان کا خلاف چلنا اس بات کا ثبوت ہو کہ اس کی بعض باتیں حکم کی بجائے مشورہ کے درجہ میں ہوتی ہیں! اور اگر غلام اور رعایا اپنے آقا اور حاکم کو مشورہ دیں تو اس کی قدر و قیمت اور وجود کو اسی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اس پر عمل کرے۔ رہا مشورہ کی افادیت کا سوال تو اگر اس کی افادیت کا پہلو اس کے مشورہ ہونے کے پہلو پر غالب ہو تو اسے مشورہ کے رنگ میں پیش کرنے کی بجائے حکم کے طور پر سامنے لایا جاتا ہے اور فیصلہ کی حیثیت سے منوایا جاتا ہے۔ اس بنا پر ایک غلام کا اپنے آقا کے مشورہ کو نہ ماننا یہ معنی کبھی نہیں رکھتا کہ وہ اس کی افادیت کا منکر ہے۔ بلکہ مقصد

جنابِ مصطفےٰ جس سے ہوں ناخوش!
نہیں ممکن کہ ہو اس سے خدا خوش!
پسندِ حق تعالےٰ تیری ہر بات!
ترے انداز خوش تیری ادا خوش

اسی لئے تو میں نے کہا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم جو ارشاد فرماویں وہی ہمارے لئے شریعت ہے۔ اور میں کہنے والا کون ہوں۔ خود قرآن بھی فرماتا ہے۔ اور حدیث بھی۔ چنانچہ پہلے قرآن کا ارشاد سنئے:۔

قرآن کا ارشاد

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ (پ ۹ ع ۹) وہ جو غلامی کرینگے۔ اس رسول بے پڑھے غیب کی خبریں دینے والے کی۔ جسے لکھا ہوا پائینگے۔ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں وہ انہیں بھلائی کا حکم دیگا اور برائی سے منع فرمائے گا۔ اور ستھری چیزیں ان کے لئے حلال فرمائے گا اور گندی چیزیں ان پر حرام کرے گا۔ اور ان پر سے وہ بوجھ اور گلے کے پھندے جو ان پر تھے، اتارے گا۔

دیکھ لیجئے! اس آیت میں ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا نے صاف صاف فرما دیا ہے۔ کہ وہ رسول کریم نبی عظیم صلی اللہ علیہ وسلم جس کا ذکر توراۃ و انجیل میں بھی ہے۔ وہ آمر بھی ہے۔ اور ناہی بھی ہے۔ وہ بھلائی کا حکم بھی فرمائے گا۔ اور برائی سے روکے گا بھی۔ اور وہ شارع بھی ہے۔ وہ صاف ستھری چیزوں کو حلال بھی فرمائے گا۔ اور گندی چیزوں کو حرام بھی فرمائے گا۔ اور وہ دافع البلاد بھی ہے۔ وہ تکلیفوں کے بوجھ بھی اتاریگا اور مصیبتوں کے پھندے بھی کاٹے گا۔

سبحان اللہ۔ سبحان اللہ! اس آیت نے روز روشن کی طرح ہمارے

یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی افادیت کو وہی مقام دیتا ہے۔ جو اس کے آقا کو منظور ہوتا ہے۔ کہ اس کے مشورہ کو دیا جائے۔

چنانچہ قرآن میں بکثرت مثالیں اس مقصد کو واضح کرنے کے لئے موجود ہیں، مثلاً قرآن میں زیادتی کے جواب میں زیادتی کی اجازت تو ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ معاف کر دینا بہتر ہے۔ اس پر اگر ایک مسلمان زیادتی کو معاف کرنے کی بجائے اس کے کرنے والے سے بدلہ چکاتا ہے تو اس کا مطلب یہ کبھی نہیں ہو گا۔ کہ وہ معافی کا مشورہ جو خدا نے دیا تھا اس کا منکر ہے۔ شراب کے متعلق جب قرآن میں وارد ہوا کہ اس کے اندر نفع کی بجائے نقصان کا پہلو زیادہ ہے تو جلنے والے اسی وقت اس کے حرام ہونے کو جان گئے۔ کیونکہ نقصان کا ہر چیز حرام ہوتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے اسے اس وقت قطعاً چھوڑنے میں تامل کیا ان کے متعلق بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہیں شراب کے نقصان دہ ہونے میں خدائے تعالیٰ کی ہدایت کے صحیح ہونے میں شک تھا۔ اسی طرح قرض خواہ کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر مقروض غریب ہو تو اسے معاف کر دے بلکن اگر ایک آدمی ایسا نہیں کرتا تو یہ سمجھنا اچھا نہیں کہ اسے خدا کے اس مشورہ کے مفید ہونے پر اعتراض ہے۔ اور وہ اسے صحیح نہیں سمجھتا بلکہ اصل یہ ہے کہ وہ رخصت پر عمل کرتا ہے جو خدا کی طرف سے ہی اسے حاصل ہے۔ اور مفید ہونے میں بھی اسی کی طرح برابر کے قریب ہے۔

۷۔ اس الزام میں پرویز صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تکلیف میں ڈالتے ہیں جس میں اللہ نے آپ کو اور کسی کو بھی نہیں ڈالا۔ اللہ نے آنحضور کو صرف نازل شدہ وحی کا پابند بنایا۔ مگر پرویز صاحب کہتے ہیں کہ نہیں آپ کو آئندہ آنے والی وحی کا بھی پہلے سے پابند ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ ایک طرف خود تسلیم کرتے ہیں۔ کہ آنحضور نے احکام نکاح آنے سے پہلے مشرکین سے اپنی

حضور کا امر و نہی۔ شارع اور دافع ہونا ظاہر فرما دیا۔ وہ امر فرمائے گا۔ وہ روکے گا وہ حلال کرے گا۔ وہ حرام کرے گا۔ وہ بوجھ اتاریگا۔ کیوں صاحب! یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہی تو! کہ وہ مختار ہوگا۔ حاکم اور شارع ہوگا۔ جو وہ فرما دے گا۔ وہی شریعت بن جائے گی ؎

تری مرضی پہ مر مٹنا شریعت اسکو کہتے ہیں!
ترے کوچے میں ہونا دفن جنت اسکو کہتے ہیں!

منکرین حدیث اور گندی چیزیں

مسلمانو! آجکل ایک نیا فرقہ پیدا ہوا ہے۔ جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتا ہے۔ اور حدیث کا انکار کرتا ہے یہ لوگ مادر پدر آزادی کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے "حدیثِ رسول" صلے اللہ علیہ وسلم سے سخت بیزار ہیں۔ چونکہ قرآن پاک کی تفصیل و تشریح، اور شرعی و اخلاقی اور انسانی قیود و ضوابط کا مفصل بیان حدیث ہی فرماتی ہے۔ اور یہ لوگ اپنی آزاد طبع کے باعث ان ضوابط و قیود کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیئے ان لوگوں نے سرے سے حدیث ہی کا انکار کردیا ہے۔ تاکہ ان کے لیئے اپنی مادر پدر آزادی کی راہ میں کوئی روڑا نہ رہے اور یہ جو چاہیں کریں۔ اور چونکہ نام ان کا مسلمانوں کا سا ہے اور کہلاتے ہیں مسلمان اور کھلے بندوں مسٹر "ہگ" مسٹر "ڈاگ" یا گھسیٹا رام یا تارا سنگھ تو کہلا نہیں سکتے۔ اس لیئے انہوں نے اپنا نام "اہلقرآن" رکھ لیا ہے اور بظاہر نعرہ ان کا یہ ہے۔ کہ ہم قرآن کے علَم بردار ہیں۔ اور جس قدر بھی بد مذہب ہیں کوئی نہ کوئی ان کا نعرہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔ جس سے مسلمان ان کی طرف مائل ہو سکیں۔

شکاری

دیکھئے! مور چونکہ شیر کا عاشق ہے۔ اس لئے مور کے شکاری شیر کی کھال پہن لیتے ہیں۔ تاکہ مور شکاری کو شیر سمجھ کر قریب آجائے اور شکاری اُسے بآسانی پکڑ سکے۔ بٹیر کے شکاری بالعموم بٹیر کی سی آواز نکالتے ہیں۔ تاکہ بٹیر اپنی آواز سن کر دھوکہ میں آجائے۔ تو میرے بھائیو! جس قدر بدمذہب ہیں۔ تمہیں اپنے پھندے میں پھنسانے کے لیئے مسلمانوں کے بھیس

بچیوں کا نکاح فرمایا تھا۔ اور دوسری طرف یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ کہ آپ کا ایسا کرنا وحی کے خلاف تھا۔ حالانکہ ایک عام عقل کا آدمی بھی جانتا ہے کہ کسی حکم کی خلاف ورزی اور پابندی کا مسئلہ اس کے وارد اور واقع ہونے کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی کی پیدائش کے بعد ہی اس کی زندگی اور موت کی بحث میں پڑا جاتا ہے۔ بلکہ خود انہیں روایات میں ہے کہ آنحضور کی بیویں کے نکاح کا یہ قصہ زمانہ قبل نبوت کا قصہ ہے۔ جب احکام تو کیا احکام کا سرے سے کوئی مخاطب اور ماننے والا ہی موجود نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ آباد ہوئیں۔ مگر پرویز صاحب کا فنی کمال یہ ہے کہ واقعات کو غلط رنگ میں پیش کر کے ہی اپنے کیس کو مضبوط بناتے ہیں جو آپ کے کیس کے کمزور ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نہایت غلط اور گھناؤنے الزام کو آپ نے اپنی تقریباً اکثر کتابوں میں دوہرایا ہے۔ جو نہ صرف یہ کہ جھوٹ اور خلاف واقع ہے بلکہ انتہا درجہ کی بے شرمی میں بھی داخل ہے۔ اسی اندازہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ اسلامی کے جن واقعات سے پرویز صاحب کی گردن شرم میں دب جاتی ہے۔ انہیں ایسا بنا کر پیش کرنے میں خود آپ کا اپنا کتنا حصہ ہے۔

پھر ذرا اندازہ ہونا چاہیئے کہ جہاں وحی کی آمد سے پہلے ہی نظام عمل وحی کے مطابق چل رہا ہو۔ وہاں اس کے آنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے اور اگر اس کے آنے سے پہلے ہی تعمیل ہونی لگے تو اس میں کیا کچھ خرابیاں پیدا ہوں۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کو ایک خاص وقت میں کشتی بنانے اور چلانے کا حکم ہوا۔ حضرت لوطؑ۔ اور موسیٰؑ کو ایک خاص وقت میں اپنی دشمن آبادی سے چلے جانے کا حکم ہوا۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے احکام اگر وقت سے پہلے انجام پاتے تو اس کا نتیجہ کب اچھا ہو سکتا تھا۔

ہیں سامنے آتے ہیں۔ تاکہ تم انہیں مسلمان سمجھ کر قریب چلے آؤ۔ اور وہ اپنا کام بآسانی کرسکیں۔ یہ لوگ اپنی مطلب براری کے لئے تمہارے جیسی آواز بھی نکالتے ہیں۔ مرزائی جنہوں نے مرزا غلام احمد کو نبی مان لیا۔ صرف تمہارے پھانسنے کے لئے بظاہر ختم نبوت کا اقرار کرتے ہیں۔ اپنے اخبار خاتم النبیین نمبر نکالتے ہیں۔ حالانکہ وہ "ختم نبوت" کے منکر اور مرزا غلام احمد کو نبی ماننے والے ہیں روافض حضرت صدیق اکبر، حضرت فاروق اعظم، حضرت عثمان اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا سنیوں کے سامنے نام لیتے ہیں۔ تو حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر۔ حضرت عثمان اور ام المؤمنین عائشہ کہتے ہیں۔ حالانکہ ان پاک ہستیوں کے متعلق ان کے جو خیال ہیں۔ وہ جاننے والے خوب جانتے ہیں۔ وہابیوں کو بھی ہم نے دیکھا ہے۔ کہ سنیوں کے مجمع میں نامِ پاک سن کر انگوٹھے چوم لیتے۔ قیام کر لیتے۔ اور نعرۂ رسالت کا بھی اقرار کر لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ساری باتیں ان کے ہاں شرک و بدعت ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ذِیَابٌ فِیْ ثِیَابٍ۔ یہ انسانی لباس میں بھیڑیئے ہیں ؎

ذِیَابٌ فِیْ ثِیَابٍ لب پہ کلمہ دل میں گستاخی
سلام اسلام ملحد کو کہ تسلیم زبانی ہے

شیر کی کھال میں گدھا

یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ کسی شخص کا گدھا زخمی اور ناکارہ ہو گیا۔ اُس نے اُسے جنگل میں چھوڑ دیا۔ پرند اور مکھیاں اس کی رہی سہی کھال کو نوچتی تھیں۔ اور اس کے زخم اور شدید ہونے لگے۔ کسی راہ گیر مسافر کو اس کی حالت پر رحم آیا۔ اور وہ اسے گھر لے آیا۔ اس کے پاس شیر کی ایک کھال تھی۔ اس نے وہ کھال اس گدھے کے اوپر ڈال دی۔ اور کھال کا چہرے والا حصہ اس کے منہ پر ڈال دیا۔ اب گدھا بے فکری سے جنگل میں چرنے لگا۔ پرندے، درندے سب اُسے شیر سمجھ کر اس سے ڈرنے لگے۔ کوئی نزدیک نہ آتا۔ اب کیا تھا۔ بے فکری کا چرنا اور جنگل کی بادشاہی گدھے کے زخم بھی اچھے ہو گئے۔ اور خوب موٹا تازہ بھی ہو

۷۔ اس الزام کا مطلب یہ ہے کہ آں حضور تبدیلی قبلہ کا قرآن میں حکم آنے سے پہلے اسی پہلے قبلہ پر ہی رہے۔ اور یہ گویا آپ کی طرف سے وحی کی خلاف ورزی ہوئی، ہم کہتے ہیں کہ آپ پہلے قبلہ پر جب تک رہے تو وحی کے ساتھ رہے اور حضور نے اسے چھوڑ کر جب دوسرا قبلہ اختیار کیا تو بھی وحی کے مطابق کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے آں حضور کا مکہ میں رہنا اور وہاں سے ہجرت کر کے مدینہ کو آنا دونوں وحی کے مطابق تھے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ چونکہ پہلے قبلہ کا حکم قرآن میں نہیں۔ اس لیے وہ خلاف وحی تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم قرآن میں کہاں ہے؟ ان دونوں کے وحی ہونے کا ثبوت تو قرآن کا صرف یہ فیصلہ ہے۔ کہ آنحضور کا ہر عمل وحی کی پیروی میں انجام پاتا تھا۔ اور عقلاً یہ امر محال ہے کہ خدا تعالے وضو اور استنجا کے بارہ میں تو وحی کی رہنمائی فرمائے اور ہجرت اور قبلہ جیسے اہم مسائل میں ایسے رہنمائی کا خیال نہ آئے۔

۸۔ اس الزام کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت عائشہ صدیقہ پر تہمت تراشی کی گئی تو اس کے تراشنے والوں کے متعلق آپ نے قرآن میں حکم آنے سے پہلے کوئی فیصلہ نہ فرمایا۔ اور اس طرح غلطی کی۔ اور غلطی یہ کی کہ آپ کو وحی کے ذریعہ یہ علم نہ ہو سکا کہ تہمت کی حقیقت کیا ہے۔ اور اس کے لگانے والوں سے کیا معاملہ کرنا چاہیئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آنحضور کو تہمت کی حقیقت کا علم نہ تھا اور خدا کی طرف سے ہر وقت یہ علم آپ کو ہو سکتا تھا تو خدا نے کیوں آپ کو یہ علم نہ دیا کیا اسے بھی کہیں سے مانگ کر سپلائی کرنا تھا۔ اس کا حل یہی تو ہے کہ خدا کے نزدیک مناسب یہی تھا کہ کچھ وقت تک اصل حقیقت کو پردہ راز میں رکھا جائے۔ تاکہ معاملہ کے ہر فریق کی خصوصیات ظاہر ہو سکیں یہی بات آنحضور

گیا۔ گدھے کی خرمستی مشہور ہے۔ جوبن میں آ کر خرمستی نے جو زور کیا۔ تو لگے چاروں طرف جنگل میں نعرہ ہائے ڈھینچوں ڈھینچوں لگانے۔ اس آواز کو سُن کر جنگل کے تمام جانوروں میں مشہور ہوگیا۔ کہ یہ کوئی مسخرہ گدھا ہے۔ جو شیر کی کھال زیب تن کر کے آج تک ہمیں دھوکہ دیتا رہا۔ آخر سب نے جمع ہو کر گدھے صاحب کا نقاب اتارا۔ اور آپ کی اصلی شکل کو دیکھ کر آپ کو اپنے ٹھکانے پہنچا دیا۔

تو میرے بھائیو! اسی طرح آجکل بہت سے بد مذہب اہل سنت کا بھروپ بھر کے سنی، حنفی، چشتی بن بن کر پھر رہے ہیں۔ اور بقول اعلیٹحضرت ؎

سنی و حنفی و چشتی ! بن بن کے بہکاتے یہ ہیں

بالکل اس مثال کی طرح ان منکرین حدیث نے بھی قرآن کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ تاکہ مسلمان انہیں مسلمان سمجھ کر کفر و ارتداد کے تیر نہ برسائیں اور یہ ملحد بے فکری سے اسلامی کھیت پامال کرتے رہیں۔

انکارِ حدیث کے کرشمے

میرے عزیزو! آپ قرآن پاک کی آیت سے معلوم کر چکے کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم شارع ہیں۔ اور آپ ہمارے لئے صاف ستھری چیزیں حلال فرماتے ہیں۔ اور گندی چیزیں حرام فرماتے ہیں۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اس تحلیل و تحریم کا ذکر بہرحال حدیث ہی میں ہے۔ اور ہم مسلمانوں کا ایمان ہے کہ حضور کا ہر ارشاد ہمارے لئے شریعت اور واجب الاطاعت ہے۔ لہذا حدیثِ رسول نے جن گندی چیزوں کو ہمارے لئے حرام قرار دیدیا ہے۔ وہ ہمارے لئے بہرحال گندی اور حرام ہیں۔ مگر منکرین حدیث کے مسلک کا نتیجہ ملاحظہ فرمایئے۔ قرآن پاک میں صرف چار چیزوں کو صراحۃً حرام فرمایا گیا ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (پ۲ع۱۵) اس نے (اللہ نے) یہی تم پر حرام کئے ہیں۔ مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا۔

کے حق میں کیوں صادق نہیں آسکتی کہ آپ نے اس تہمت کا ردِعمل ہر فریق کیطرف سے کھل کر سامنے آنے تک معاملہ کو خدا کی منشا کے مطابق "پوشیدہ رکھا" رہا اس پہ آپ کا بے قرار رہنا تو قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں اور اگر ایسی ناکارہ تہمت پہ آپ بے قرار ہوئے تو یہ وحی کے خلاف کیسے ہوگیا۔ کیا آپکو اس پر خوش ہونا چاہیئے تھا۔ اور اس پہ مبارکبادیاں اور شادیانے بجتے تو یہ وحی کے مطابق ہوتا۔

۹۔ اس الزام میں ہے کہ جب کعب بن مالک اور ان کے ساتھی میدان جہاد سے پیچھے رہے تو ان کے ایسا کرنے کی سزا میں آں حضور نے قرآن میں حکم آنے سے پہلے کچھ فیصلہ نہ فرمایا۔ اور وحی کے انتظار میں رہے۔ گویا وحی کے انتظار میں رہنا بھی وحی کے خلاف ہوتا ہے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ وحی کے انتظار میں رہنا وحی کی ہدایت کے بغیر تھا۔ اور یہ کہاں ہے کہ آپ نے اپنی مرضی سے انتظار کا ڈھونگ رچایا۔ پھر دیکھنا ہوگا کہ وہ فیصلہ کس بات کا تھا جس میں آپ نے انتظار اور دیر کی۔ قرآن میں ہے کہ وہ ان لوگوں کے قبول توبہ کا فیصلہ تھا۔ جس کا صادر فرمانا خدا کا منصب تھا نہ رسول کا تھا اور نہ کسی دوسرے کا۔ ورنہ آپ نے تو اپنا فیصلہ اس شکل میں دے دیا تھا کہ ان سے بائیکاٹ کیا جائے۔ اس کے بعد جب تک ان کی توبہ کے قبول ہونے کا حکم خدا کی طرف سے نہ آتا آپ اس کا اعلان کیسے فرما سکتے ہیں۔ یا اگر مہینہ ڈیڑھ کے بعد ان کی توبہ قبول ہونی تھی تو آپ خدا کے حکم کے بغیر اس کی اطلاع پیشگی کیسے فرما سکتے تھے۔

رسول خدا کے خلاف اس زنانہ اور بالکل بازاری بہتان تراشی کے بعد بھی آپ خبرایں ہوں گے کہ مصنف معراج النبیین کی تسلی نہیں ہوئی۔ اور اس سے بڑھ

دیکھئے اس آیت میں خدا نے صرف چار چیزوں کے حرام ہونے کی صراحت فرمائی ہے۔ مردار۔ خون۔ سور کا گوشت اور بوقت ذبح جس پر غیر خدا کا نام لیا گیا ہو۔ وہ جانور۔ ان چار چیزوں کے علاوہ کتا۔ بلا۔ بندر۔ سانپ۔ بچھو اور گوہ۔ موت بیپ وغیرہ خبیث درندے، پرندے اور گندی اشیاء کے حرام ہونے کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں تو منکرین حدیث کا اس موقعہ پر ارشاد ملاحظہ فرمایئے۔

"قرآن کی رُو سے صرف مردار۔ بہتا خون۔ لحم خنزیر۔ غیر اللہ کے نام کی طرف چیزیں حرام ہیں۔ ان کے علاوہ اور کچھ حرام نہیں۔ یہ قرآن کا واضح فیصلہ ہے۔ جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہمارے مروّجہ اسلام میں حرام و حلال کی جو طولانی فہرستیں ہیں، وہ سب انسانوں کی خود ساختہ ہیں۔ خدا کہتا ہے۔ ہم نے صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ملا کی شریعت حرام حلال کی ایسی لمبی لمبی فہرستیں پیش کرتی ہے۔ کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے" (منکرین حدیث کا رسالہ "طلوع اسلام" بابت ماہ جون ۵۲ء ص۶۵) "ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ نے جو چیزیں حرام قرار نہیں دی ہیں۔ ان میں سے طبیعت کی رغبت اور پسند کے مطابق کھانی چاہئیں۔ البتہ جن چیزوں سے رغبت نہ ہو۔ اپنے اوپر حرام نہیں قرار دے لینا چاہیئے۔
(طلوع اسلام بابت جون ۵۲ء ص۶۹)

میرے بھائیو! دیکھ لو۔ حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ و سلم کے کئے ہوئے حلال و حرام کو چھوڑ کر کیا کیا گندی چیزیں کھانا پڑیں۔ ان لوگوں کا بظاہر یہ اعلان ہے کہ ہم قرآن کو مانتے ہیں۔ مگر اسی ایک آیت سے جو میں نے آپ کو سنائی۔ پتہ چل گیا۔ کہ یہ لوگ قرآن کو بھی نہیں مانتے۔ ورنہ قرآن تو صاف صاف کہہ رہا ہے۔ کہ یہ رسول ستھری چیزوں کو حلال، اور گندی چیزوں کو حرام فرماتا ہے۔ تو پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ و سلم کی حرام کردہ چیزوں کو ملا کی شریعت کہہ کر کیوں نظر انداز کیا گیا۔

قرآن کا حکم کہ منکرین تشریع رسالت سے جہاد کرو | میرے دوستو!

کہ آپ کتاب پڑھنے والے سے کہتے ہیں۔ وقس علی ھذا یعنی اب اس بے چارہ رسول کی غلطیوں کے لئے تم خود ہی قیاس کر لو اور یہ فرض کر لو کہ آپ نے عمر بھر غلطیوں کے بغیر کوئی کام نہیں کیا۔

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی آدمی پر چوری کا الزام لگایا گیا ہو تو اُسے دوران تحقیق تو چور نہیں کہا جا سکتا اور جب تحقیق مکمل ہو جانے کے بعد اس کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر اسے صرف چور کہتے ہیں۔ چور کے ساتھ اسے زانی شرابی، کبابی اور بھڑوا کبھی نہیں کہیں گے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ یہ اصول اگر ایک چور اور شرابی کے لئے صحیح ہو تو ہو کہ اسے ایسی غلطی کا مجرم کہا جائے جو اس کے اندر ثابت ہو۔ مگر رسول سے متعلق تو آپ کا اصول یہ ہے کہ جب اس کی کسی ایک دو باتوں کو آپ غلط ٹھیرائیں گے تو اسکے ساتھ اسکی ساری حدیثوں کو غلط کہے بغیر نہیں رہیں گے۔ معلوم نہیں یہ کہاں کا اصول ہے۔ اور حدیث کے جن واقعات کو قرآن میں غلط نہیں بتایا گیا۔ ان کے غلط ہونے کی کیا دلیل ہے۔ کیا رسول کی ذات اس الاؤنس کی بھی مستحق نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کو دیا جاتا ہے۔

ہم بڑے اور بہت بڑے

"وربك فكبر اور اپنے پروردگار کی کبریائی کا اعلان کرنا کہ اس سے انسان میں خود عظمت و کبریائی کی صفات پائی جائیں۔ ربك فكبر دائیں سے بائیں طرف اور بائیں سے دائیں طرف دونوں صورتوں میں ربك فكبر پڑھا جاتا ہے۔ یہ صرف ایک لفظی رعایت ہے۔ لیکن معنوی طور

قرآنِ پاک تو حضور صلے اللہ علیہ و سلم کو شارع تسلیم نہ کرنے والوں اور حضور کی حرام کردہ چیزوں کو حرام قرار نہ دینے والوں سے جہاد کا حکم دیتا ہے چنانچہ قرآن فرماتا ہے :-

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ (پ ۱۰ ع ۱۰) (مسلمانو!) ان لوگوں سے لڑو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ اور نہ اُن چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ جن کو اللہ اور اس کے رسُول نے حرام قرار دیا۔"

دیکھ لیجئے! صاف صاف ارشاد ہے۔ کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار نہیں دیتے۔ مسلمانو! اُن سے لڑو۔ اللہ نے تو قرآن میں چار چیزوں کو حرام قرار دیا۔ اور اس کے رسول نے دوسری گندی چیزوں کو بھی حرام قرار دیدیا۔ اور بحکم قرآن ہی ہمارے لئے وہ سب چیزیں جو اللہ نے قرآن میں اور اس کے رسول نے حدیث میں حرام قرار دے دیں۔ حرام ہیں۔ مگر طلوع اسلام کہتا ہے۔ کہ صرف اللہ نے جو چار چیزیں حرام قرار دی ہیں وہ تو حرام ہیں۔ اور جو رسول نے حرام قرار دی ہیں وہ ملّا کی شریعت ہے، ان سے اجتناب کی ضرورت نہیں۔ بلکہ" ان میں سے طبیعت کی رغبت اور پسند کے مطابق کھانی چاہئیں۔" اور ان لوگوں کی طبیعت اور رغبت کا حال کسے معلوم نہیں۔ ان کا تو یہ مسلک ہے۔ جو اکبر الٰہ آبادی نے بیان کیا ہے کہ سے

کہاں کا حلال اور کہاں کا حرام!
جو صاحب کھلائے وہ چٹ کیجئے

"جو صاحب کھلائے" یعنے جو انگریز کھلائے ـــ تو انگریز کیا نہیں کھاتا جو انہیں نہ کھلائے گا۔

سُور کا گوشت

مسلمانو! اس قسم کی آزادیٔ طبع یعنے مادر پدر آزادی سے پناہ مانگو۔ اِن لوگوں نے اتباعِ رسالت کی رسّی توڑی۔ تو یہ مت سمجھئے۔ کہ یہ اپنی اس آزادی پسند طبع کو قرآن کا پابند کر سکیں گے۔ نہیں بلکہ جو حدیث سے پھرا وہ قرآن سے بھی گیا۔ ؎

پر بھی خدا کی بڑھائی میں خود شرفِ انسانیت کی بڑھائی مضمر ہوتی ہے"۔
صفحہ ١٩٥

"الحمد للہ رب العلمین۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہی معاشرہ مستحقِ تعریف و ستایش ہوگا جو تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کے محکم اصولوں پہ قایم کیا جائیگا" سلیم کے نام۔ صفحہ ١٩٤۔

"اللہ اس آیڈیل کا نام ہے جس میں یہ تمام صفات اپنے انتہائی نقطہ تک تکمیل یافتہ ہیں" سلیم کے نام۔ صفحہ ٢٢٣

پہلی عبارت میں کچھ تھوڑا سا الجھاؤ ہے اور معلوم نہیں ہوتا کہ اصل مقصود خدا کی بڑھائی ہے یا خدا کا انکار اور انسان کی بڑھائی اس الجھاؤ کو پیچھے کی عبارات نے بالکل صاف کر دیا ہے۔ اور ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ اوپر کی عبارت میں لفظی اور معنوی اگاڑ پچھاڑ سے جو مقصود کو چھپایا گیا ہے۔ وہ ہے خدا کا انکار کرنا اور اس کے تصور سے گلو خلاصی کرانے کے ساتھ مومنِ قرآن ہونا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جس انسانی دنیا سے ہم آشنا ہیں اس میں دیکھا جاتا ہے کہ جب ایک انسان کسی خاص مقام پہ ہوتا ہے تو وہاں اس کے کچھ خاص حقوق ہوتے ہیں جو اس کے ہٹ جانے اور اس کی جگہ کسی اور انسان کے آنے جانے کے بعد باقی نہیں رہتے۔ اگر کسی موٹر ڈرائیور کی جگہ پہ ایک بیل گاڑی کے کوچوان کو لا بٹھایا جائے تو اس کے آگے موٹر چلنے سے انکار کر دے گی اور اگر ایک افسر کی جگہ کوئی غیر آدمی آجائے تو افسر کے ملازم اس نئے آدمی کے غصہ سے ڈر کر ڈیوٹی کو سنبھالنے پر کبھی تیار نہیں ہوں گے لیکن اگر آپ ایک انسان کی جگہ دوسرا انسان لانے کی بجائے کوئی پتھر نصب کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جہاں پہلے ایک

کافر ان سے کیا پھرا، اللہ ہی سے پھر گیا

یہ لوگ قرآن کی صحیح تفسیر و تشریح حدیثِ رسول سے کنارہ کش ہو کر پھر خود اپنی من مانی کارروائیوں سے قرآن کا مطلب بیان کرنے لگتے ہیں۔ اور اپنی اس آزادی پسند طبیعت کو قرآن کے تابع نہیں۔ بلکہ قرآن کو اپنی طبیعت اور اس کی رغبت کے ماتحت رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ رسول کی حرام کردہ گندی چیزوں کو برغبت نوش کرنے والے قرآن کی حرام کردہ اشیار کی پابندی بھی کب برداشت کر سکتے ہیں؟ مجھے اس وقت اخبار کا نام اور اس کی تاریخ یاد نہیں۔ مگر اتنا اچھی طرح یاد ہے۔ کہ کسی اخبار میں ایک منکرِ حدیث نے حکومت کو مشورہ دیا تھا۔ کہ قرآن میں جہاں چار چیزوں کے حرام کرنے کا ذکر آیا ہے۔ وہاں مردار۔ خون۔ اور سور کا گوشت حرام قرار دیا گیا ہے نہ کہ اس کی ہڈی۔ پسلی۔ اور کھال۔ اور بال بھی۔ لہذا ہمیں چاہیئے کہ پاکستان میں جو کثرت کے ساتھ سور پائے جاتے ہیں۔ ان کی ہڈیوں اور کھالوں اور بالوں سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ (استغفر اللہ)

ملاحظہ کیجئے اتباعِ رسول سے بھاگی ہوئی طبیعت کو قرآن بھی قبول نہیں فرماتا بلکہ ایسوں کے لئے یوں ارشاد فرماتا ہے۔ وَیُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا۔ یعنی خدا اسی قرآن سے بہتیروں کو گمراہ بھی کر دیتا ہے۔

لطیفہ بہت ممکن ہے کہ کل کو کوئی منکرِ حدیث ماں باپ کو جوتے بھی مارنے لگے۔ اگر کوئی منع کرے۔ تو یوں کہہ دے کہ قرآن میں تو بس اتنا آیا ہے۔ وَلَا تَقُلۡ لَّهُمَاۤ اُفٍّ۔ یعنی ماں باپ کو اُف نہ کہو" مگر یہ کب آیا ہے۔ کہ جوتے بھی مت مارو۔ سہ

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے!
خصوصًا منکرینِ مصطفٰے سے

حدیث کا ارشاد میرے عزیزو! میں بیان کر رہا تھا۔ کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہمارے لئے شریعت ہے۔ اور اس اپنے دعویٰ پر میں قرآن کی آیت پیش کر چکا ہوں۔ اب آیئے حدیث کا ارشاد

انسان تھا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں۔ بالکل یہی حال خدا کا مقام معاشرہ کو دینے کا بھی ہے۔ معاشرہ خواہ کتنا ہی ربوبیت کے محکم اصولوں پر قائم ہو۔ مگر اسے یہ مقام کبھی نہیں دلایا گیا کہ آدمی اس کے ساتھ دنیا و آخرت کے فائدہ کی امیدیں باندھے یا اس کے دائمی عذاب سے ڈرے اور اس طرح امید اور خوف کی وجہ سے زندگی کے مشکل ترین کاموں کے اندر جان کھپائے یہی حال تصور اور آئیڈیل کا ہے۔ تصور جو انسان خود قائم کرے یا کہیں سے حاصل کرے۔ اس کا بھی یہ مقام کبھی نہیں ہوتا کہ آدمی اس کی رضا کا چاہنے والا ہو یا اس کی ناراضگی سے ڈرے اور اسے اپنی زندگی اور موت کا مالک سمجھے اس بنا پر معاشرہ یا آئیڈیل کو خدا کا مقام دینا خدا کے انکار کے برابر ہے۔ یہی حال اللہ کو چھوڑ کر اللہ کے "قانون" کو ماننے کا ہے[1]۔

خدا کے اس انکار کے ساتھ آپ کی ایک عجیب خواہش یہ بھی ہے کہ آپ مومن قرآن بھی رہیں۔ اور نہ صرف مومن بلکہ اس کے داعی اور دوسروں کو مومن بنانے والے بھی اب ذرا آپ کے مومن قرآن ہونے کے پہلو کو ملاحظہ فرمایا جائے۔ آپ کہتے ہیں کہ آیت میں جو خدا کی بڑھائی بیان کرنے کو کہا گیا تو یہ کوئی بذات خود مقصود نہ تھا۔ یہ صرف لفظی رعایت کے طور پر کہہ دیا گیا ہے یہ لفظی رعایت کیا چیز ہے۔ یہ ہوتا ہے کلام کا ایک نکما جزو جو محض ضرورۃ بیت کے طور پر بڑھا دیا جائے جیسے کہا جائے کہ کھاؤ پیو اور جیو۔ تو اس میں آخری جزو کے اندر کوئی مقصدیت نہیں کیونکہ جینا کسی عمل کا در علاحدہ کوئی نام نہیں بلکہ کھانے پینے سے وہ خود بخود حاصل رہتا ہے اور

---

[1] اللہ کی جگہ اللہ کا قانون کہہ دیا کرو تو بات بالکل واضح ہو جائیگی سلیم کے نام صفحہ ١٥٦

بھی سنئے اور دیکھئے۔ کہ ہمارے حضور کی زبانِ حق ترجمان سے جو کچھ بھی نکلے امت کیلئے وہ شریعت ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَاَیُّہَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَیْکُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوْا فَقَالَ رَجُلٌ اَکُلَّ عَامٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَسَکَتَ حَتّٰی قَالَہَا ثَلٰثًا فَقَالَ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ

(مشکوٰۃ شریف ص۱۳۱) ایک دن حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے وعظ فرمایا تو فرمایا۔ اے لوگو! تم پر حج کرنا فرض کیا گیا ہے۔ لہٰذا حج کیا کرو۔ ایک شخص نے پوچھا۔ یا رسول اللہ! کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے؟ حضور خاموش رہے۔ اس شخص نے تین بار یہی سوال کیا۔ تو حضور نے فرمایا۔ اگر میں ہاں کہہ دیتا۔ تو ہر سال ہی حج فرض ہو جاتا اور تم اس کی استطاعت نہ رکھتے"

سبحان اللہ! کیا ہی ایمان افروز حدیث ہے۔ گویا حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان شریعت ہے۔ اگر اس زبان سے ہاں نکل جاتی۔ تو پھر امت پر ہر سال ہی حج فرض ہو جاتا۔ مگر چونکہ اس زبان فیض رساں سے ہاں نہیں نکلی۔ لہٰذا حج بھی ہر سال فرض نہیں ہوا۔

مسلمانو! قرآن و حدیث سے روز روشن کی طرح ظاہر ہو گیا۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم شارع ہیں۔ مالک ہیں۔ مختار ہیں۔ اور آپ جو کچھ فرماویں وہی شریعت ہے۔ مگر ابھی ابھی آپ سن چکے کہ نام کے "اہلقرآن" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور ان کی حرام کردہ اشیاء کو حرام تسلیم نہیں کرتے۔ بھائیو! اسی طرح بعض نام کے "اہلحدیث" بھی ہیں اور ساتھ ہی ان کے بھائی "بند" بھی ہیں۔ جو قرآن اور حدیث کے ارشادات کے باوجود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا شارع ہونا تسلیم نہیں کرتے۔

تقویۃ الایمانی ایمان

چنانچہ ان سب کی معتمد علیہ اور مستند کتاب "تقویۃ الایمان" ہے۔ جسے یہ لوگ ہزاروں کا خرچ کرکے کثرت کے ساتھ مفت تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ دیکھئے اس کتاب میں لکھا ہے:۔

کھانے پینے کے ساتھ اس کا الگ حکم دینا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ صرف پیؤ کے ساتھ ایک ہم وزن کلمہ لانے کو اسے لاد یا گیا نہ کہ کسی اور غرض کے لئے۔ ادھر یہاں جس آیت کا معاملہ ہے وہ یہ ہے

یا ایها المدثر. قم فانذر. وربك فکبر. اے چادر اوڑھنے والے اُٹھ اور ڈرا۔ اور اپنے رب کی بزرگی بیان کر۔

پرویز صاحب کا انکشاف یہ ہے کہ اس کلام کا پہلا اور دوسرا جملہ تو بامطلب ہیں مگر تیسرا جملہ فقط پہلے دونوں جملوں کی تک بندی اور قافیہ آرائی کے لئے ہے ورنہ اصل مقصد خدا کی بڑھائی بیان کرنا نہیں بلکہ شرف انسانیت کی بڑائی چاہنا ہے اور شرف انسانیت کے اصول کے لئے رب کی بڑائی بیان کرنا بالکل بے ضرورت تو تھا ہی مگر یہ دو طرح سے مفید ہے ایک تو اس سے لفظی رعایت کا کام لیا گیا یعنی سب جملوں کے آخر میں ”ر“ کا صرف آیا۔ اور دوسرا یہ کہ خدا کی بڑائی سے بھی اصل مقصود انسانی شرف کی بڑائی ہی ہے چنانچہ آپ نے آیت کے معنوں میں خودکشیدہ الفاظ کا جو اضافہ کیا وہ قرآن میں کہیں بھی نہیں اس بھرتی کو اسی غرض کے لئے لایا گیا تاکہ قرآن کی کسر کو پورا کیا جائے اس سے جہاں آپ کا عشق قرآن واضح ہوتا ہے وہاں یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایمان باللہ کی طرف سے آپ قرآن کے ہمالیہ پن میں کس قدر صادق ہیں۔ ہمالیہ کا حال یہ ہے کہ ”لے پوری دنیا مل کر بھی اپنی جگہ سے سرکا نہیں سکتی۔ مگر قرآن کے جس کلمہ کو آپ چاہتے ہیں اس کے بے ضرورت ہونے کا فیصلہ دے دیتے ہیں اور پھر بھی اسکا ایک ایک

لے ان کے پاس چودہ سو سال سے ایک ایسا یقینی صحیفہ ہے جس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر ہمالیہ سے بھی زیادہ پائیدار اور محکم ہے۔ قرآنی فیصلے ۔ ص ۱۵۶

"یا خود پیغمبر ہی کو یوں سمجھے کہ شرع انہیں کا حکم ہے۔ ان کا جو جی چاہتا تھا۔ اپنی طرف سے کہہ دیتے تھے۔ اور وہی بات انکی امت پر لازم ہو جاتی تھی۔ سو ایسی باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے۔ (تقویۃ الایمان ص۲۷)

سنا آپ نے؟ وہی چکڑالویوں والی بات۔ جو کچھ انہوں نے کہا تھا۔ وہی کچھ یہ کہہ رہے ہیں۔ وہ بھی رسول کا حلال و حرام فرمانا تسلیم نہیں کرتے اور یہ بھی رسول کی بات کو امت پر لازم نہیں جانتے اور بحکم رسول کو شرع نہیں سمجھتے۔ ؎

وہ تھے چکڑالوی اور یہ وہابی نظر آتے ہمیں یہ دونوں ھمراز!
تعجب کی نہیں یہ بات حق حق "کند ہم جنس باہم جنس پرواز!
کبوتر با کبوتر، باز با باز"

مقامِ غور ہے کہ قرآن بھی فرما رہا ہے۔ کہ رسول خود حلال فرماتا ہے۔ اور وہ خود ہی حرام فرماتا ہے۔ اور حدیث میں بھی تصریح ہے۔ کہ اگر حضور کا جی چاہتا۔ اور "ہاں" فرما دیتے۔ تو امت پر ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ مگر نہ تو چکڑالوی اس کو مانتا ہے اور نہ وہابی۔ مگر اپنا تو یہ ایمان ہے۔ جو مولانا حسن میاں علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے۔ کہ یا رسول اللہ! ؎

جو کچھ تری رضا ہے خدا کی وہی خوشی
جو کچھ تری خوشی ہے خدا کو وہی عزیز
کیوں جائیں ہم کہیں کہ غنی تم نے کر دیا
اب تو یہ در پسند یہ در یہ گلی عزیز
کونین دے دیئے ہیں ترے اختیار میں!
اللہ کو بھی کتنی ہے خاطر تری عزیز!

بکرے کے کپورے

حضرات! آپ نے ابھی ابھی سنا کہ چکڑالویوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے "شارع" ہونے کا انکار کیا تو اس دنیا میں بھی سزا ان کو یہ ملی کہ طرح طرح کی غلاظت و گندگی قسمت میں لکھ دی گئی۔ اور انہیں خود لکھنا پڑا۔ کہ طبیعت کی رغبت ہو۔ تو کھالے

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... آپ کو اپنی کتاب مقام حدیث کا [illegible] ... کس طرح اصول سے حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں مختلف قراءتوں کا ذکر کر کے قرآن کو بے اعتبار بنایا اور خود اپنا حال یہ ہے کہ آیت کو دونوں طرح پڑھنے کا حکم یکساں ٹھہرایا ہے

پھر اس گول مول انداز فکر کو دیکھئے۔ آپ اپنا نکتہ نظر کھول کر بیان کرنے کی بجائے اسے لفظی اور معنوی ہیر پھیر میں الجھاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ اصل مقصود تو [illegible] کو بڑا سمجھنا اور اسے بڑا کہنا۔ کہ کر خدا کی بڑائی کے گیت گانا مگر [illegible] خدا کی بڑائی بیان کرنے سے بھی یہی مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اس [illegible] اس میں بھی حرج نہیں کہ خدا کی بڑائی بیان کر دی جائے۔ چنانچہ اسی نقطۂ نظر کا اثر ہے کہ آپ نے جو کچھ چاہا آیت کے ترجمہ میں اپنی طرف سے بڑھا دیا اور اس بڑھانے کو اپنا فطری حق سمجھ لیا۔

ہم پوچھتے ہیں کہ آخر قرآن میں یہ کہاں بیان ہوا ہے کہ خدا کے ایک حکم کی تعمیل میں انسان خود اپنی طرف اس کا جو مقصد چاہے تجویز کرے اور پھر

اور دیوبندی وہابیوں کے بڑے قطب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کا بھی حسب ذیل فتویٰ ملاحظہ کیجئے۔ سائل سوال کرتا ہے۔

"کاگ کی اوجھری اور بکرے کے کپورے کھانا درست ہیں یا نہیں؟"

جواب ملتا ہے:۔

الجواب:۔ "درست ہیں" (فتاویٰ رشیدیہ حصہ سوم مطبوعہ افضل المطابع مراد آباد صفحہ ۱۵۰)

کیوں صاحب! دیکھا آپ نے یہ عبرتناک نظارہ؟ جس منہ سے گیارہویں شریف کے طیب و طاہر کھانے کے متعلق ناجائز و حرام ہونے کے فتوے صادر ہوتے تھے۔ اس منہ میں دیکھئے کیا نظر آ رہا ہے۔ خوب لکھا ہے نیر بڑودوی نے۔ ؎

گیارھویں کے ہو تبرک سے ترا دل مردہ
شوق سے نگلے تو بکروں کے کپورے کھرے

کالا کوا

انہیں مولوی رشید احمد صاحب سے کسی نے کوا کھانے کے متعلق پوچھا۔ کہ کوا کھانے والے کو عذاب ہوگا یا ثواب؟ تو جواب ملتا ہے۔

الجواب:۔ ثواب ہوگا۔ (فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم مطبوعہ قاسمی پریس دیوبند صفحہ ۱۹۲) علوطیہ

اور سنئے! انہیں مولوی صاحب سے سوال ہوتا ہے۔

ہولی اور دیوالی کی پوری کچوری

"ہندو تہوار ہولی یا دیوالی میں اپنے استاد یا حاکم یا نوکر کو کھیلیں یا پوری یا کچھ اور کھانا بطور تحفہ بھیجتے ہیں۔ ان چیزوں کا لینا اور کھانا استاد و حاکم و نوکر مسلمان کو درست ہے یا نہیں؟"

جواب ملتا ہے:۔

الجواب:۔ درست ہے" (فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم صفحہ ۱۱۹)

اس موقعہ پر نیر بڑودوی لکھتے ہیں۔ ؎

شربت و آب محرم کو تو کہتا ہے حرام!
پوریاں ہولی و دیوالی کی تو کھائے کھرے

اسی مقصد کے تحت اس حکم پر تعمیل کرنے اور نہ کرنے کا فیصلہ کرے۔ مثلاً نماز
اور روزہ کے حکم کے ساتھ یہ اضافہ کر لے کہ نماز ادا کرو تاکہ تم دلیر بنو
اور روزہ رکھو تاکہ تمہاری قوت ہاضمہ ٹھیک رہے اس کے بعد پھر اس
اضافہ کے پیش نظر جب وہ اپنے آپ کو دلیر فرض کرے اور اس
کا ہاضمہ بھی درست ہو تو نہ نماز ادا کرے اور نہ روزہ رکھے۔ اسی طرح
چوری کی ممانعت کے ساتھ خود ہی یہ اضافہ کرے کہ چوری نہ کرو تاکہ تم
بیمار نہ ہو اور پھر جب چوری کی وجہ سے بیمار نہ ہو تو اس کے ہاں چوری کے
ممانعت کے کوئی معنی نہ ہوں۔

اس نکتے اضافہ کا نتیجہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو آدمی اپنے آپ کو عظمت و
کبریائی کا مالک سمجھ لے وہ اور جو خدا کی بڑائی بیان کرتے ہوئے بھی
اپنی بڑائی میں کمی محسوس کرے وہ خدا کی بڑائی اور تعریف کو نکما کام سمجھ
کر چھوڑ دے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ خدا کی تعریف کو اس غرض سے وردِ زبان
بنانا تاکہ انسان خود بڑا بن جائے ایک بے حد لا حاصل مشغلہ ہے اگر انسان بڑائی
کا عمل کوئی نہ کرے اور خدا کی بڑائی کا ورد کرتا رہے تو وہ کبھی بڑائی حاصل
نہیں کر سکتا۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کی ہدایت اور اس کے احکام
پر چل کر بہت بڑا ہو سکتا ہے۔ اور توقع ہو سکتی ہے کہ وہ بڑا بن جائے۔ مگر
خدا کے حکم پر عمل کرنے سے حاصل ہونے والے فوائد کو مقاصد کا مقام
کبھی نہیں دیا جاتا نہر اور کنواں جہاں کھودا جائے تو اس کے پانی سے کیڑے
مکوڑے اور چیونٹیاں بھی فائدہ اٹھاتی ہیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نہر کھودنے
پر اس چیز کو مقصدی اہمیت ہو کہ اس سے چیونٹیاں پانی پئیں گی۔ یا باغ

مسلمانو! دیکھ لو اور خود ہی فیصلہ کر لو کہ سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی شانِ تشریع کا انکار کیا رنگ لایا۔ اور اس نے ان منکرین کے منہ میں کیا کیا دے دیا۔ درود شریف پڑھئے اور سنئے!

صلے اللہ علیک وسلم یا رسول اللہ

صلے اللہ علیک وسلم یا حبیب اللہ

خلیل وحبیب میں فرق

آپ کو یاد ہوگا۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلَا وَ اَنَا حَبِیْبُ اللہِ کے متعلق عرض کر رہا تھا۔ اور بتا رہا تھا۔ کہ موسٰی علیہ السلام اللہ کے کلیم ہیں۔ اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حبیب ہیں۔ اور آپ کو بتا چکا کہ کلیم وحبیب میں کیا فرق ہے۔ اب آیئے آپ کو بتاؤں کہ خلیل وحبیب میں کیا فرق ہے۔

یاد رکھئے! خلیل وہ ہے جو اللہ کی رضا چاہے اور حبیب وہ ہے جس کی رضا خدا چاہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رضاءِ الٰہی کی دھن میں جان ومال ملک و وطن کو قربان کرتے ہوئے آخر میں اپنے محبوب بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری چلا دی۔ چھری اگرچہ نہ چلی۔ لیکن خلیل نے تو شانِ خلّت کا مظاہرہ کر کے دکھا دیا۔ یہ تو شانِ خلیل ہے۔ اب آیئے حبیب کی شان ملاحظہ فرمایئے۔ خدا فرماتا ہے:۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا۔ یعنی اے محبوب! تمہاری رضا کے مطابق ہم اپنا قبلہ بھی پھیر دیں گے۔" اور فرمایا:۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ یعنی تمہارا رب تمہیں اتنا دیگا۔ کہ تم اے محبوب راضی ہو جاؤ گے۔"

گویا وہ خدا جس کی رضا سارا عالم چاہتا ہے۔ وہ خود اپنے حبیب کی رضا چاہتا ہے۔ اسی لئے اعلیٰ حضرت نے لکھا ہے ؎

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خدا چاہتا ہے رضائے محمد

لگانے میں یہ مقصد ٹھیرایا جائے کہ اس سے پرندے فائدہ اٹھائیں گے۔

مسلمان کو جب خدا کی بڑائی بیان کرنے کا حکم دیا گیا تو اس کی تمام تر قدر و قیمت اس کے ہاں اسی وجہ سے ہوگی کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ اور اسے اور خدا کے ہر دوسرے حکم کو محض خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے وہ انجام دیگا چاہے اس کے نتیجہ میں وہ بلند ہو یا پہلے سے بھی زیادہ گرے۔

اس مقام پر ذرا اس ارتقا کا بھی اندازہ کیجئے۔ معراج انسانیت میں تو پرویز صاحب کے ہاں خدا کا بہر حال یہ مقام تھا کہ اس کی بڑائی کو بیان کیا جائے خواہ اسے بڑا سمجھ کر یا اپنے آپ کو بڑا بنانے کے لئے مگر بعد کی کتابوں میں آپ کے ہاں خدا کا اور خدا کی بڑائی اور تعریف کا مقام معاشرہ کو مل گیا۔ اور ذات باری کا وجود ایک تصور اور خیال ہو کر رہ گیا کچھ ایسا ہی ارتقا انکار حدیث کے سلسلہ میں بھی آپ نے کیا۔ معراج انسانیت میں تو اس کی واحد غرض یہ تھی کہ حدیث کو جھٹلا کر غیر مسلموں کے اعتراضات سے اسلام کو بچایا جائے۔ اور جس بات پر انہیں اعتراض ہو اسے اسلام سے خارج کر ڈالا جائے۔ مگر بعد میں جب آپ کے مجوزہ نظام ربوبیت کے ڈانڈے مارکسزم سے ملنے لگے۔ تو انکار حدیث کی بنیاد یہ امر ٹھیرا کہ حدیث میں چونکہ نظام سرمایہ داری اور ذاتی ملکیت کی تعلیم ہے اس لئے اسے نہ مانا

۱؎ روایات تمام اس دور کی پیداکردہ ہے جس میں ملوکیت اور سرمایہ داری کا نظام پنے پورے استبداد کے ساتھ مسلط تھا حقیقت یہ ہے کہ روایات سازی کی ضرورت ہی اس لیے پیش آئی تھی کہ قرآن سے اس مفاد پرستانہ ذہنیت کا جواز نہیں * (نظام ربوبیت ص ۱۴۳)

میرے بزرگو! حبیب وہ ہے۔ جس کی رضا خدا بھی چاہے۔ فرمائیے اس سے بڑا مرتبہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور یہ مرتبہ صرف ہمارے آقا و مولےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کا ہے۔ اس مرتبہ کا نہ کوئی ہوا۔ نہ ہے۔ نہ ہو سکتا ہے ؎

یہی بولے سدرہ والے چمن جہاں کے تھالے
سبھی ہیں نے چھان ڈالے ترے پایہ کا نہ پایا
تجھے اک نے اک بنایا

یہ شعر جو میں نے پڑھا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ہے۔ اور ایک حدیث کا ترجمہ ہے۔ جو طبرانی شریف اور بیہقی کی ہے۔ جسے اعلیحضرت نے تجلّی الیقین میں درج فرمایا ہے۔

بینظیر آقا صلے اللہ علیہ وسلّم

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل نے مجھ سے آکر عرض کیا:۔

قَلَّبْتُ الْاَرْضَ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا فَلَمْ اَجِدْ رَجُلًا اَفْضَلَ مِنْ مُحَمَّدٍ۔ یعنی میں نے پورب، پچھم، ساری زمین الٹ پلٹ کر دیکھی۔ کوئی شخص محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے افضل نہ پایا۔"

اعلیٰ حضرت نے اپنے اس شعر میں اسی حدیث کا ترجمہ کیا ہے۔ اور اسی حدیث کا ترجمہ یہ اشعار بھی ہیں۔ ؎

جبریل سے کہنے لگے اک روز یوں شاہِ اُمم
تم نے تو دیکھا ہے جہاں بتلاؤ تو کیسے ہیں ہم
یوں کہا جبریل نے اے مہ جبیں تیری قسم
"آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری"

میرے بھائیو! دیکھ لو جبریل امین کا بھی یہی ایمان ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم جیسا روئے زمین پر کوئی نہیں۔ اور ایک آجکل کے

مسئلہ حجۃ اللہ علی العالمین کا صفحہ ۱۱ دیکھئے

چاہئے۔ چنانچہ اس راہ میں جب آپ نے جہاد کرنا شروع کیا تو اس میں حدیث کے قلعہ پر جو گولہ بارود استعمال کیا اس میں یہ بم بھی تھا کہ حدیث سے سرمایہ پرست اور ملوکیت پیشہ لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے اس لئے یہ جھوٹوں کا ریکارڈ ہے۔ اور سرمایہ پرستی ہی کے لئے اسے وجود میں لایا گیا ہے یہی مقام کمیونسٹوں کے ہاں دین اور مذہب کا ہے

صفحات کی خارزار

"خدا کے سوا کوئی اور ہستی ایسی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے اس جھکنے کا مطلب یہ نہیں کہ جس طرح ایک مستبد حاکم کی اطاعت ہے [۳]

لہ کیسے غلط انداز فکر سے حقائق کا خون کیا جاتا ہے ایک عام عقل کی بات ہے کہ جہاں ایک واقعہ کو جھوٹ کی ملاوٹ کے ساتھ بیان کیا جائے وہاں یہ تو ہوتا ہے کہ اصل حقیقت کو کسی قدر مبالغہ کے ساتھ پیش کردیا جائے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک حقیقت کو مٹایا جاسکے یا بالکل بدل کر اس کی بجائے کچھ اور ظاہر کیا جائے حاتم کے کردار کو اگر کوئی آدمی غلط رنگ میں پیش کرے تو اس کا جھوٹ اسی وقت چل سکتا ہے کہ وہ حاتم کو اس سے زیادہ فیاض اور سخی ظاہر کرے جتنا کہ وہ واقعۃً تھا۔ بخلاف اس کے اگر وہ کہے کہ حاتم بڑا کنجوس اور انتہا درجہ کا بخیل تھا تو اس کی بات کو کوئی بھی سننے اور ماننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ ادھر پرویز صاحب

برائے نام مسلمان بھی ہیں۔ جو حضور کو اپنے جیسا کہتے اور کہلاتے ہیں۔ ان بیوقوفوں سے کوئی پوچھے۔ کہ اگر حضور ہمارے ہی جیسے بشر تھے۔ تو پھر کیا ہم دنیا میں تھوڑے تھے۔ کہ اللہ نے حضور کو بھی بھیج دیا؟ یاد رکھو! حضور، حضور ہی ہیں۔ کہاں وہ ذاتِ پاک اور کہاں ہم گنہگار ؎

انہیں مثل اپنی مت کہہ تو اے بیباک!
چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

بیوقوف

حضرات! میں نے جو ان گستاخوں کو بے وقوف کہا ہے۔ تو یہ کوئی غلط نہیں کہا۔ بلکہ جو گستاخِ رسول ہے۔ وہ یقیناً بے وقوف ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ یہ سب چیزیں ضروری ہیں اور لازم ہیں۔ مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ادب و پیار کے سوا یہ سب کی سب بیکار اور فضول ہیں۔ ؎

نماز اچھی، حج اچھا، روزہ اچھا، اور زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود ان کے مسلمان ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ بطحا کی عزت پر!
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا!

داڑھی رکھنا ضروری ہے اور یہ سنتِ رسول ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) مگر یاد رکھئے۔ جو شخص گستاخ رسول ہے۔ اس کی لمبی داڑھی اور تارا سنگھ کی داڑھی میں کوئی فرق نہیں۔ گستاخانِ رسول کی یہ لمبی لمبی داڑھیاں سب جہنم کا مال ہیں۔ اور ایسے گستاخ نہ صرف ایمان سے خالی بلکہ عقل سے بھی خالی ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ایک گستاخ رسول کا لطیفہ ہے کہ ناف سے بھی نیچی اس کی لمبی داڑھی تھی۔ اور سر بہت چھوٹا اور استرے سے منڈا ہوا تھا۔ آپ نے گستاخانِ رسول کا اکثر یہی حلیہ دیکھا ہوگا۔ میں نے اپنے ایک شعر میں لکھا ہے۔ ؎

سیہ رُو، تند خو، اور سر منڈا اور سر بسر فتنہ
یہ گستاخِ نبی کا مختصر سا ایک خاکہ ہے

اختیار کیجاتی ہے۔ اسی طرح خدا کی اطاعت[۱] اختیار کیجائے۔ خدا کی ذات ان صفات عالیہ کا سرچشمہ مطلق ہے جسکا اخذ و ارتسام انسان کی تکمیل ذات کا موجب ہے۔ یہ جسقدر ان صفات کو اپنے اندر منعکس کرتا جاتا ہے اسی قدر اس سرچشمہ حق و خیر سے ہم آہنگ ہوتا جاتا ہے۔ اس ہم آہنگی اور رفاقت کو قرب الٰہی کہتے ہیں۔ صفات خداوندی کو اپنے اندر منعکس کرنے کا نام اطاعت الٰہیہ ہے۔" ص ۲۵۱

۱۔ جھکنے کے لیے عربی زبان میں سجدہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ انسان کا سجدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا چہرہ زمین پر رکھے یا جھک جائے۔ اسی کے اندر اطاعت امر کا مفہوم بھی شامل ہے۔ جبکہ سجدہ خدا کے تعمیل حکم کا نتیجہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ خدا کھڑا ہونے کا حکم دے۔ اور آدمی جھک جائے۔ پہلی قسم کا سجدہ انسان کے لیے خاص ہے۔ اور دوسرا سجدہ جو اطاعت کے معنی میں ہے وہ انسان کے علاوہ تمام کائنات کے لیے عام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پتھروں، پہاڑوں اور دریاؤں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی حالت کو بدلیں اور اپنے آپ کو جھکائیں۔ مگر انسان کے لیے یہ سب کچھ ممکن ہے۔ اور وہ زمین پر سر بھی رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ خدا کو سجدہ کرو جو ان کا خالق ہے۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ

---

* کہتے ہیں کہ رسول جو نظام ملکیت و سرمایہ داری کا قاتل تھا اسے جب حدیثیں بنانے والوں نے سب سے بڑے سرمایہ دار اور سرمایہ داری کے سب سے بڑے معاون کی حیثیت سے پیش کیا۔ تو ساری دنیا کے لوگ اندھوں کی طرح ان کی بات کو مان گئے۔ اور کسی نے بھی ان کے رد میں کچھ نہ کہا۔ یہ ہے وہم پرستی کی انتہا۔ جب ایک انسان اپنے وہم کے پیچھے پڑ جائے تو اسی طرح اسے حقائق کا خون کرنے میں دریغ نہیں ہوتا۔

لطیفہ

یہ گستاخ رسول اپنے چھوٹے اور منڈے ہوئے سر، اور لمبی داڑھی سمیت رات کو چراغ کی روشنی میں ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ اس کتاب میں لکھا ہوا دیکھا۔ کہ جس کا سر چھوٹا، اور داڑھی بہت لمبی ہو۔ وہ بیوقوف ہوتا ہے۔ یہ پڑھتے ہی اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اور اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر داڑھی کو دیکھا۔ تو سوچنے لگا۔ کہ اس حساب سے تو میں بھی بیوقوف ہوا۔ سوچنے لگا۔ کہ اب کیا کیا جائے؟ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ سر تو بڑا کرنا مشکل ہے۔ ہاں داڑھی چھوٹی کی جا سکتی ہے۔ اگر داڑھی چھوٹی کر لوں۔ تو اس کلیہ سے نکل سکتا ہوں۔ چنانچہ داڑھی کو مٹھی میں پکڑ کر اگلا حصہ کاٹنے کے لئے قینچی کی تلاش کرنے لگا۔ اتفاقاً قینچی نہ ملی۔ تو سوچا! یہ اگلے بال الگ ہی تو کرنے ہیں کاٹ کر نہ سہی۔ تو جلا کر ہی سہی۔ یہ سوچ کر داڑھی کا اگلا حصہ چراغ کی لو میں رکھ دیا۔ آگ جو بالوں کو لگی اور سارے بال جلنے لگے۔ تو مٹھی کو سینک جو پہنچا۔ تو مٹھی بھی کھول ڈالی۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ساری ہی داڑھی جل گئی۔ یہ عالم دیکھ کر کتاب کی طرف دیکھا۔ اور بولا۔ اے کتاب کے مصنف جو کچھ تم نے لکھا ہے۔ ٹھیک ہے واقعی میں بے وقوف ہی نکلا۔

تو میرے بھائیو! یہ گستاخ واقعی بے وقوف بھی ہوتے ہیں۔

"خدا جب دین لیتا ہے حماقت آ جاتی ہے۔"

خدا تعالیٰ نے گستاخی رسول کا نتیجہ قرآن میں یہ بیان فرمایا ہے کہ:۔

اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔ (پ۲۶ ع ۱)

تمہارے عمل برباد ہو جائیں۔ اور تمہیں شعور بھی نہ ہو"

گستاخی رسول کی سزا

یعنی گستاخ رسول کے اس گستاخی کے سبب عمل بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا شعور بھی سلب کر لیا جاتا ہے۔ اور اس بات کی ایک وجہ یہ ہے۔ کہ جو گستاخ رسول ہے۔ وہ سب سے بڑا۔ اور بدترین مجرم ہے۔ اور ایسا مجرم اس لائق ہے کہ وہ جہنم میں ضرور جائے۔ تو اگر اس کا شعور قائم ہو۔ تو ممکن ہے۔ اُسے

سورج اور چاند کے آگے نہ جھکو۔ ورنہ ان کی صفات کے اختیار کرنے میں تو کبھی بھی ممانعت نہیں۔ اور نہ ان میں کوئی برائی ہے۔ پھر قرآن میں یہ بھی ہے کہ اللہ کا سجدہ زمین و آسمان کی تمام کائنات کرتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت اور چار پائے وغیرہ۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ درخت اور چار پائے خدا کی صفات کا اخذ و ارتسام کرتے ہیں۔ بلکہ مفہوم یہ ہے کہ وہ سب کے سب خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں اس کے ساتھ سجدہ کی کیفیت کے متعلق قرآن میں ہے کہ جب اہل علم لوگوں کے سامنے خدا کی آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ منہ کے بل گرتے ہوئے سجدہ کرتے ہیں! اور یہ کہ ان کی پیشانیوں پر سجدہ کے نشانات ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سجدہ کے معنی ہیں خدا کی اطاعت کرنا۔ اور اس کے آگے جھک جانا۔ نامعلوم یہ کہاں وارد ہے۔ کہ جھکنے کا مطلب ہے خدا کی صفات کا اخذ و ارتسام۔ اور کہاں خدا نے سورج اور چاند کی صفات کے اخذ و ارتسام سے منع فرمایا ہے اور یہ کہاں ہے کہ پتھر اور پہاڑ وغیرہ جو خدا کا سجدہ کرتے ہیں تو وہ اسکی صفات کا اخذ و ارتسام کرتے ہیں۔

۲۔ اگر کوئی پوچھے کہ جھکنے کا یہ عجیب و غریب مفہوم قرآن کی کس آیت میں بیان ہوا ہے تو اس قماش کے لوگ جواب میں کہیں گے کہ دیکھئے صاحب لفظی بحث میں مت الجھیئے۔ یہ بالکل بھول جایئے کہ قرآن کے الفاظ کیا ہیں۔ بلکہ جو مفہوم ہم بیان کر رہے ہیں اس کے معقولات پہ غور کیجئے۔ قرآن میں اگر جھکنے کا حکم ہے بھی تو اس حکم کے الفاظ پر جم جانا ضروری نہیں۔ یہ کہتے ہوئے قرآن کو بالکل بے مصرف بنا دیا جاتا ہے۔ اور پھر جس کے جو جی میں آئے قرآن کی طرف سے کہہ گذرتا ہے۔ اور سوچا نہیں کہ اگر اس کا بیان کیا ہوا مفہوم کچھ قدر و قیمت رکھتا۔ تو خدا نے جہاں جھکنے کا حکم فرمایا تھا۔ وہیں اس کا وہ مفہوم بھی بیان فرما دیتا۔ اور اسے واضح کر دیتا اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ پہلے یہ مرض پرویز صاحب کو معمولی تھا جو رفتہ رفتہ خاصا

اس بات کا احساس ہو جاتے۔ کہ میں نے جو کیا، لکھا، یا کہا ہے۔ یہ اچھا نہیں ہے۔ بلکہ کفر ہے۔ اور وہ توبہ کرلے۔ توبہ کرلے تو جہنم سے بچ جائے حالانکہ ایسے گستاخ کو جہنم سے بچنا ہے ہی نہیں ہے۔ تو اس کا شعور ہی چھین لیا جاتا ہے۔ تاکہ نہ اسے احساس ہو۔ نہ توبہ کرے اور نہ جہنم سے بچے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آج کل بھی جتنے گستاخ رسول ہیں۔ انہوں نے جو جو بھی کلماتِ کفر اپنی کتابوں میں لکھے ہیں۔ ان کا انہیں کچھ احساس ہی نہیں۔ علماء اہل سنت نے ان کے اُن کلماتِ کفر پر گرفت کی۔ لیکن وہ لوگ اپنے انہیں کلماتِ کفر پر قائم رہے۔ اور مرتے مر گئے۔ مگر نہ سمجھے کہ ہم نے جو لکھا ہے۔ غلط اور کفر لکھا ہے۔ مسلمان جب ان کی وہ عبارات پڑھتا، سنتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے۔ مگر وہ اور ان کے معتقدین ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنے انہیں کلماتِ کفر کی تائید میں مناظرہ کرنے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ کی گرفت میں آ چکے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

میرے بزرگو! گستاخیٔ رسول سے پناہ مانگو! یہ ایک ایسا جرم ہے کہ نہ ایمان چھوڑتا ہے۔ نہ عقل و شعور، دین و دنیا برباد کرکے رکھ دیتا ہے۔ اور خسر الدنیا والآخرہ کا طوقِ لعنت پہنا دیتا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم، اللہ کے حبیب ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل، اور خلیل وہ ہے۔ جو رضائے حق کا طالب ہو۔ اور حبیب وہ ہے۔ جس کی رضا کا حق طالب ہو۔ اس کے علاوہ اور بھی سنئے۔ کہ حبیب و خلیل میں کیا فرق ہے؟

خلیل وحبیب میں فرق کی مزید تشریح

دیکھئے! حضرت خلیل علیہ السلام کے متعلق خدا فرماتا ہے وَاتَّخَذَ اِبْرَاهِیْمَ خَلِیْلًا۔ خدا نے ابراہیم کو خلیل بنایا۔ اور ادھر اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔ کہ جو حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوگا۔ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ــ اللہ اس سے محبت کرے گا۔

متعدی ہو کر رہا۔ چنانچہ بعد کی کتابوں میں آپ نے قرآن کے سادہ الفاظ کا اپنی طرف سے مفہوم بنانا اور حقیقت کا مجاز بنا ڈالنا اپنا ایک خصوصی فن بنا لیا۔ یہاں تک کہ قرآن میں مجاز کے بغیر کچھ بھی نہ رہا۔ اور تو اور آپ نے خدا تعالیٰ کے اسم ذاتی لفظ اللہ کو بھی مجاز[1] بنا کر دم لیا۔ اس سے بھی بڑھ کر اب ثقافت اسلامیہ والوں کا حال یہ ہے کہ قرآن کی ایک آیت کو لے لیا اور اس کے تحت اپنے خیالات کا جو کوڑا کرکٹ چاہا بھر دیا۔ نہ الفاظ کی رعایت اور نہ کسی قاعدہ و اصول کی پروا۔ معلوم نہیں آزادی اور روشن خیالی کا یہ کونسا مصرف ہے کہ اسکی تجربہ گاہ قرآن اور اسلام ہی ہو۔ اپنے روشن خیالات کو انسان قرآن کو نشانہ بنائے بغیر بھی تو پھیلا سکتا ہے۔ اور اس طرح بھی ان کے روشن ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اگر آپ کے ہاں ایک انسان کی شکل و صورت اچھی نہیں تو کیا یہ اس لئے کہ آپ چاقو اور قینچی لے کر اس کے جسم کے جوڑوں کی اور کان آنکھوں اور ناک کی اصلاح کرنے لگ جائیں معقول طریقہ یہ ہے کہ آپ کوئی مصنوعی قسم کا ایک مستقل انسان بنا لیں کوئی اور خوبصورت انسان کی تصویر بنا لیں اور اسی سے اپنا دل بہلائیں۔ اور لوگوں کو بھی اس کی طرف رغبت دلائیں۔ ورنہ یہ کیا ضروری ہے کہ آپ کا ذوق حسن ایک زندہ انسان کی جان پر آفت ڈھائے۔

اِدھر جہاں تک قرآن کے الفاظ کا تعلق ہے یہ اس کے الفاظ ہی تو ہیں جنکی وجہ سے ہم آدم و ابلیس۔ ابراہیم و نمرود۔ موسیٰ و فرعون اور محمدؐ و ابولہب کے مراتب میں فرق کرتے ہیں۔ پھر انہیں الفاظ کے تحت ایک طرح کی عورتوں میں ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی تمیز قائم کرتے ہیں۔ اور انہیں الفاظ کے ذریعہ شراب کو حرام اور پانی کو حلال سمجھتے ہیں۔ اگر ان الفاظ کی اہمیت کچھ بھی نہ ہو تو اور کس چیز کی اہمیت

---

[1] اللہ کی جگہ اللہ کا قانون کہدیا کرو۔ تو بات بالکل واضح ہو جائیگی۔ سلیم کے نام ص ۱۵۶

تو معلوم ہوا کہ وہاں تو صرف ابراہیم علیہ السلام کو خلیل فرمایا تھا۔ اور یہاں غلامانِ مصطفےٰ سے بھی محبت کا وعدہ فرمایا جا رہا ہے۔ ؎

اللہ کا محبوب بنے جو تمہیں چاہے!
اس کا تو بیاں ہی نہیں کچھ تم جسے چاہو!

خلیل کے لئے ارشاد ہے :۔

نُرِیْ اِبْرَاهِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی نشانیاں اور عجائب دکھاتے "

اور حبیب کے لئے ارشاد ہے :۔

لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیَاتِنَا۔ ہم اپنے بندے کو معراج کی شب لے گئے تاکہ اُسے اپنی نشانیاں دکھائیں "

وہاں زمین و آسمان کی نشانیوں کا دکھانا تھا۔ اور یہاں نشانیوں کو اپنی طرف مضاف فرما کر فرمایا کہ اپنی نشانیاں دکھانے کو لے گئے۔

خلیل نے جب مظالمِ نمرود دیکھے تو کہا۔ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں۔ عنقریب وہ مجھے راہِ راست پہنچائے گا "

اور حبیب کے لئے ارشاد ہوتا ہے :۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ ۔ پاک ہے وہ جو اپنے بندے کو لے گیا "

غور فرما لیجئے۔ وہاں خود جانا ہے۔ اور یہاں لے جانا! ؏

اپنا جانا اور ہے ، ان کا بلانا اور ہے

نمرود کے آتش کدہ میں پہنچکر خلیل نے جبریل سے یوں فرمایا تھا۔ حَسْبِیَ اللّٰہُ ۔"میرا اللہ مجھے کافی ہے" اور حبیب کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ ۔"اے نبی! اللہ تمہیں کافی ہے"

خلیل علیہ السلام خدا سے تمنا کرتے ہیں اور کہتے ہیں :۔

لَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ۔" مجھے قیامت میں رسوا نہ کرنا "

اور حبیب علیہ السلام سے خود فرماتا ہے :۔

باقی رہ سکتی ہے۔ اور قرآن کیطرف دعوت دینے والوں کا یہ فرض کب ہے کہ وُہ اس کے الفاظ کی اہمیت کو مٹانے لگ جائیں۔

۳۔ اطاعت امر کو کس شان بے پروائی کے ساتھ بے معنی بنانا چاہا۔ جیسے کسی درخت کو جڑ سے کھودنے کی بجائے اس حصہ زمین کو کھود کر وہاں پر کسی خزانہ کے حصول کیطرف لوگوں کو مائل کر کے اس کا اہتمام کر لیا جاتا ہے کہ کسی کے دل میں اس کے نقصان کا احساس تک بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ یعنی جب سرے سے اطاعت کے لفظ اور اس کے وجود کو بے حقیقت بنا دیا گیا تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ کہ کس کی اطاعت کیجائے۔ اور کیوں کیجائے۔ اور پھر نظام اطاعت کو متروک ٹھیرانے کیلئے اس کی مکروہ شکل کو سامنے لاتے ہیں جیسے کھانے کے حلال و حرام ہونے کے شعور کو یہ کہکر باطل کیا جائے کہ کھانا کھانے کا مفہوم یہ نہیں کہ آدمی ایک پاگل انسان کی طرح کھائے اور چبائے۔ اور ہر لقمہ کا ایک بڑا حصہ اور منہ کی رال کا مواد اپنے منہ کی چاروں طرف نکالتے ہوئے قے کا نمونہ پیش کرے۔ بلکہ حقیقت یہ کھانا ہے کہ آدمی کچھ کھائے بغیر روٹی کے ذوق سے اس کا خیال ذہن میں باندھ کر بالکل روٹی کی صفات میں رنگ کر ہمہ تن روٹی بن جائے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ آخر ایک مستبد حاکم کیطرح کیوں نہ خدا کے آگے جھک کر اس کی اطاعت کیجائے۔ کیا اس لئے کہ ایسا کرنے سے مستبد حاکم کی خدا وندی میں زوال آتا ہے۔ یا اس لئے کہ مستبد حاکم کو جہاں اپنے جیسے انسانوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنے کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ وہاں خدا کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے بندوں کو اپنا تابع امر بنا کر استبداد کی راج شاہی کو ختم کرے۔ یا مستبد

لے دین کے اس نظام کی خصوصیت یہ تھی کہ.... اطاعت صرف قانون کی تھی۔ اسباب زوال امت۔ ۲۹ء

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ۔ " قیامت کے دن اللہ اپنے نبی اور مسلمانوں کو رسوا نہ کرے گا۔"

خلیل فرماتے ہیں :۔

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

"جو میری تابعداری کرے وہ میرا ہے۔ اور جو نافرمان ہے۔ پس تو غفور رحیم ہے۔"

اور حبیب فرماتے ہیں :۔

شَفَاعَتِيْ لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ۔ میری شفاعت امت کے گنہگاروں کے لئے ہی ہے۔"

وہاں گنہگاروں سے علیحدگی ہے۔ اور یہاں گنہگاروں کیلئے تسلی ہے۔

خلیل نے جب بچہ کو ذبح کرنا چاہا۔ تو فدیہ ایک دنبہ ملا۔ لیکن امتِ حبیب کو قیامت کے دن ارشاد ہوگا۔ کہ ہر ایک مسلمان اپنا فدیہ ایک نصرانی یا یہودی کو دوزخ میں ڈال دے۔ اور جنت میں چلا جائے۔ چنانچہ اسی فرق کے متعلق کسی شاعر نے لکھا ہے۔ ؎

نارِ نمرود ے بر ابراہیم گرشد گلستاں
آتشِ دوزخ بریں امت گلستاں ساختہ
بہر فرزندِ خلیل ار گوسفند آمد فدا
بہرِ ایں امت فدا از نوع انساں ساختہ

خلیل پر آگ ٹھنڈی ہوئی۔ اور صرف ذاتاً خلیل پر اور حبیب نے حضرت انس کے گھر جاکر جس دسترخوان سے ہاتھ صاف فرمائے۔ اس دسترخوان پر بھی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ سچ تو یہ ہے۔ ؏

کوئی تجھ سا ہوا نہ ہوگا شہا تیرے خالقِ حُسن و ادا کی قسم

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی ہوا، نہ ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ اور بالکل سچ فرمایا اعلیحضرت نے ؎

سب سے اعلیٰ و اولیٰ ہمارا نبی ؛ سب سے بالا و والا ہمارا نبی

کی بڑائی کو لوگوں کے دلوں میں قائم رکھنا ضروری ہے نہ کہ خدا کی بڑائی کو۔ یا اس لیے کہ جس طرح مستبد حاکم کا حکم ماننے میں لوگوں کو عار لاحق ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ خدا کی اطاعت کو بھی عار کے قابل سمجھتے ہیں۔ یا اس لیے کہ مستبد حاکم کے حکم میں جو حکمت و صداقت ہوتی ہے اس حکمت و صداقت سے خدا کا حکم خالی ہوتا ہے۔ کچھ پتہ تو چلے اور قرآن سے چلنا چاہیئے مگر آخر مستبد حاکم کی طرح بھی نہیں بلکہ اس کے حکم کو چھوڑ کر خدا کا حکم کیوں نہ اس کے حکم سے بڑھ کر مانا جائے۔

۴۔ اس مقام کا مرکزی نقطہ یہ خیال ہے کہ اگر خدا کو ماننا یا منوانا ہو تو اسے اس شکل میں مانا اور منوایا جائے کہ بالکل اس کے نہ ماننے والے کی طرح ....

اس کے ماننے والے کی آزادی میں فرق نہ آئے۔ اور اس کے ماننے کے کچھ فرائض اور کچھ تقاضے اس کے ارادہ و عمل کا راستہ روکنے کو موجود نہ ہوں۔ اور یہی راز ہے خدا کی اطاعت کو نہ ماننے[1] اور صفات کو ماننے کا۔ اور اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب پرویز صاحب اطاعت رسول کا انکار کر کے اطاعت خدا کا درس دیتے ہیں۔ تو آپ کے اس درس میں خلوص اور صداقت کا کتنا کچھ حصہ ہوتا ہے۔ اور اس سے آپ کی کیا غرض ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ جب انسان صرف قرآن کی طرف سنت رسول کو چھوڑ کر آئے تو اس کا دل صفات کے خوش کن تصور سے بہلایا جائے۔ کہ نہ خدا کا مانے اور نہ رسول کا۔

خدا کو مانتے ہوئے انسان کی یہ آزادی اسی صورت میں بحال رہ سکتی ہے۔ کہ خدا کو سرکاری ڈاکٹر سے بڑھ کر بھی نہیں ایک عطائی طبیب کی حیثیت میں مانا جائے۔ جس

---

[1] مغرب نے خدا کا انکار اس لیے کیا ہے۔ کہ خدا پر ایمان لانے سے اُسے اس کے احکام کی اطاعت کرنی پڑتی تھی جس سے انسانی اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا ہے۔ سلیم کے نام ص ۳۵۷

قرآن پاک

حضرات! ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و برتری کا نظارہ ایک دوسرے رنگ میں بھی ملاحظہ فرمایئے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کیجئے۔ حضور صلے اللہ علیہ و سلم سے قبل جتنے پیغمبر بھی گزرے۔ ان میں ہمارے حضور صلے اللہ علیہ و سلم ہر طرح ممتاز ہی نظر آتے ہیں۔ دیکھئے خداوند کریم نے جب بھی کسی پیغمبر کو ندا فرمائی۔ تو اس پیغمبر کا ذاتی نام لے کر پکارا۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کو پکارا۔ تو فرمایا۔ یَا اٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّۃَ۔ اے آدم! کہہ کر ندا فرمائی۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو پکارا۔ تو فرمایا۔ یَا زَکَرِیَّا اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ ۣ اسْمُہٗ یَحْیٰی۔ اے ذکریا فرمایا۔ حضرت یحیٰی علیہ السلام کو پکارا۔ تو فرمایا۔ یَا یَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ۔ اے یحیٰی فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پکارا۔ تو فرمایا۔ یَا اِبْرٰہِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا۔ اے ابراہیم فرمایا۔ حضرت موسٰی علیہ السلام کو پکارا تو فرمایا۔ یَا مُوْسٰی اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ۔ اے موسٰی کہہ کر ندا فرمائی۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام کو پکارا۔ تو فرمایا۔ یَا عِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ۔ اے عیسٰے فرمایا۔ الغرض ہر نبی و رسول کو جب بھی خدا نے پکارا۔ تو اس کا ذاتی نام لے کر پکارا۔ مگر قربان جائیے شانِ مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کے۔ کہ خدا تعالٰی نے جب بھی اپنے محبوب کو پکارا۔ تو کبھی حضور کا ذاتی نام لے کر "یا محمد" یا "یا احمد" کہہ کر نہیں پکارا۔ بلکہ محبوب کی اداؤں کو ملحوظ فرما کر کہیں تو فرمایا۔ یَاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ۔ اے جھرمٹ مارنے والے محبوب! کہیں فرمایا۔ یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ۔ اے کملی اوڑھنے والے پیارے! کہیں فرمایا! یَاَیُّھَا النَّبِیُّ۔ اے غیب کی خبریں دینے والے محبوب! کہیں فرمایا۔ یٰسٓ۔ اے سردار! اور کہیں فرمایا طٰہٰ۔ اے چودھویں کے چاند۔

دیکھا آپ نے! سردارِ انبیاء صلے اللہ علیہ و سلم کی برتری و فضیلت کو۔ کہ خود خداوندِ کریم بھی اپنے محبوب کو بلاتا ہے۔ تو پیاری اداؤں کو ملحوظ فرما کر نام لے کر نہیں بلاتا۔ ؎

یا آدم است با پدرِ انبیاء خطاب ٭ یا ایُّہا النبیّ خطابِ محمد است

سے دوائی پینا اور علاج کرانا اس کی ہدایت پر نہیں بلکہ بیمار کی اپنی مرضی پر موقوف ہو۔ اور جب بھی
اس کی طبیعت اس کے علاج کی طرف مائل نہ ہو تو اسے جانا کرے۔ اس خیال کو بڑے
خوشنما عنوانات کے ساتھ صفات کے دلکش تصور کے نقشہ میں پیش کیا جاتا ہے۔
تاکہ اس کی رنگینی اور دلکشی سے مسحور ہو کر انسان خدا کا گرویدہ ہو جائے۔ اور اس کے ماننے
پر اتر آئے۔ اور یہ نہ سوچنے پائے کہ اس شان بے نیازی سے خدا کو ماننا بہت بڑی
بے وقوفی ہے۔ اس صورت میں ایسا خدا کو ماننے والا جیسا کچھ اسکی بلندی صفات کا تصور
قائم کرے کے ان کے اخذ و ارتسام کا پابند ہو سکتا ہے۔ وہ بالکل روشن ہے
خدا کے اس تصور سے انسانی آزادی کا سمندر تو ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے مگر خدا
کا مقام ایک ایسے بت کے برابر ہو جاتا ہے جسے انسان نے خود گھڑا ہو۔ جو نہ پیغمبر بھیجتا
ہو اور نہ کتابیں نازل کرتا ہو۔ اور اس کے پوجنے والے خود ہی اپنے فرائض کا اور اس کے
حقوق کا تعین کریں یا ایسی خصوصیات کا خدا جب انسانوں کے دلوں پر اپنی خدائی کا سکہ
بٹھاتا ہے تو اس کے ماننے والا رضا و عدم رضا اور جزا و سزا[1] کے جھگڑے میں کبھی نہیں پڑتا
بلکہ یہ منصب قانون مکافات[2] کو دیتا ہے۔ اس کے انعام و عذاب کی بجائے اپنے بنا دیتی

---

[1] آپ کو کسی نے گالی دی آپ نے غصہ میں آ کر اسے تھپڑ رسید کر دیا..... اس قسم کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں مل سکتی۔ وہ ذات صمدیت غصہ کے انتقامی جذبات سے بلند و بالا ہے۔ سزا کی دوسری قسم تادیبی ہو سکتی ہے۔ ایک شخص نے چوری کی حکومت نے اسے جیل خانے بھیج دیا۔ تاکہ قید و بند کے مصائب سے اسے سبق مل جائے۔ حیات اخروی میں اس قسم کی سزا بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہاں جرم سے اجتناب کے کچھ معنی ہی نہیں... سزا کی تیسری صورت اعمال کا فطری نتیجہ ہے۔ فردوس گم گشتہ۔ ص ۳۱۸

[2] قانون مکافات کا عمل دل کے ارادوں اور نگاہ کی جنبشوں تک کو محیط ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف کا نام ایمان ہے۔ فردوس گم گشتہ۔ ص ۳۸۴

او سنیئے

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے فرماتا ہے:۔
مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (پ ۲۳ ع ۱)

"جب اُن کے پاس کوئی رسول آتا ہے تو اس سے ٹھٹھا ہی کرتے ہیں"

یعنے ان کافروں کا یہ حال ہے۔ کہ جب بھی کوئی اللہ کا رسول ان میں تشریف لایا یہ بجائے ایمان لانے کے اس پر ٹھٹھا کرتے رہے۔ اس آیت سے کوئی یہ نہ سمجھ لے۔ کہ پھر تو مرزا قادیانی بھی رسول ہوا۔ اس لئے

مرزا قادیانی

کہ لوگ اس پر بھی ٹھٹھا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ آیت میں اس بات کا ذکر ہے۔ کہ اللہ کے رسول پر کافر ٹھٹھا کرتے رہے۔ یہ بات نہیں کہ لوگ جس پر بھی ٹھٹھا کریں۔ وہ اللہ کا رسول ہے، اس طرح تو پھر ہر پاگل و دیوانہ کو بھی رسول ماننا پڑے گا۔ کہ ان پر بھی لوگ ٹھٹھا کرتے ہیں۔ دیکھئے! ہر انسان زمین پر چلنے والا ہے۔ مگر یہ بات نہیں۔ کہ ہر زمین پر چلنے والا انسان ہو۔ اس لئے کہ زمین پر چلنے والا تو گدھا۔ گھوڑا۔ اور کتا بلا بھی ہے۔ تو اسی طرح ہر رسول پر کافر ٹھٹھا کرتے رہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر یہ بات نہیں۔ کہ جس شخص پر بھی لوگ ٹھٹھا کریں۔ وہ رسول ہے۔ جو پاگل ہو اور پاگلانہ حرکتیں کرے۔ لوگ اس پر بھی ٹھٹھا کرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو نبوت کا دعوٰے کرے گا۔ وہ یقیناً پاگل ہے۔

دو پاگلوں کا قصّہ

چنانچہ ایک مولوی صاحب نے لاہور کے پاگل خانہ کا قصہ سنایا۔ کہ میں ایک مرتبہ لاہور کا پاگل خانہ دیکھنے کے لئے گیا۔ تو دو کمروں میں جو بالکل متصل تھے۔ دو پاگل بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان میں سے ایک پاگل بولا۔ دیکھئے مولوی صاحب! مجھے خواہ مخواہ، ان لوگوں نے پاگل سمجھ لیا۔ حالانکہ میں بالکل پاگل نہیں ہوں صرف اتنی بات کہتا ہوں کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔ بس اسی بات پر یہ مجھے پاگل خانہ میں لے آئے ہیں۔ اتنے میں ساتھ والا دوسرا پاگل بولا، دیکھئے مولوی صاحب! کہیں اس کی باتوں میں نہ آجانا۔ یہ جھوٹ بولتا

جنت و دوزخ[1] سے واسطہ رکھتا ہے۔ اسے رب[2] ملنے کی بجائے نظام ربوبیت ہی مل جاتا دیتا ہے اور آخر کار اسی نظام کو خدا ٹھہرالیتا ہے۔ اور اسی پر توکل[3] کرتا ہے۔ ایسے آزاد لوگوں کا خدا اپنے ماننے والوں کے ہاتھوں موم کی ناک بن کر رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

۵۔ خدا کی صفات عالیہ کا ماخذ پرویز صاحب کے نزدیک تمام تر انسان کا ذاتی ذوق و وجدان ہے۔ اور ہر انسان کا ذوق دوسروں سے مختلف ہوتا ہے اس لیے خدا کی صفات عالیہ کا ایک ایسا مرتب شدہ مستند اور متفقہ گوشوارہ تیار کر لینا جو ہر انسان کے ہاں یکساں قابل قبول ہو۔ ایک محال امر ہے ہو سکتا ہے کہ ایک انسان قتل و غارت اور خون خرابہ کو خدا کی صفت ٹھہرا کر اسے اختیار کر لے۔ کیونکہ خدا کی یہ بھی صفت ہے کہ وہ کبھی کبھی بعض نامعلوم سلسلہ اسباب کے تحت زلزلے بھیلا

---

[1] سلسلہ ارتقا میں آگے بڑھ جانا جنت کی زندگی ہے۔ اور نشو و نما کی صلاحیت سلب ہو چکنے کے بعد سلسلہ ارتقا میں رک جانے کا نام جہنم کا عذاب ہے۔ فردوس گمگشتہ۔ ص ۳۲۹

[2] رب۔ خدا قانون ربوبیت جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ نظام ربوبیت۔ ص ۸۶

[3] یہی وہ خدا تھا جس کے متعلق مارکس نے کہدیا تھا کہ اس کا تصور سرمایہ دارانہ مصلحت کوشیوں کا پیدا کردہ ہے لیکن خدا کے تصور کا ایک مفہوم۔۔۔ قرآن کے حروف میں جگمگ جگمگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تصور کے رو سے ان مقامات پر خدا سے مفہوم ہے وہ نظام جو اس کے متعین فرمودہ ابدی قوانین کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے یہ ہے وہ نظام جس پر پورا پورا توکل کیا جا سکتا ہے۔ سلیم کے نام۔ ص ۲۲۶

[4] الله پر ایمان کے معنی ہوئے سلیم! صفات خداوندی کے حسین مجموعے اسماء الحسنیٰ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانا یعنی وہ صفات الٰہیہ جو خود انسان کے اندر مضمر ہیں۔ انہیں مشہود کرتے چلے جانا۔ سلیم کے نام۔ ص ۲۵۷

ہے۔ کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔ میں نے تو اسے بھیجا ہی نہیں!!

گویا یہ دوسرا پاگل خدا بن بیٹھا۔ استغفر اللہ! مولوی صاحب کہتے ہیں میں نے اُن دونوں سے کہا۔ بھئی! تم دونوں اسی جگہ کے قابل ہو۔ تو میرے بھائیو! حضور کے بعد جو نبوت کا دعوٰے کرے گا۔ وہ یقیناً پاگل ہے۔ اور یا پھر بھوکا ہے۔ بعض اوقات بھوک بھی آدمی کو گمراہ کر دیتی ہے۔

لطیفہ چنانچہ ایک بھوکے شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ تو وقت کے بادشاہ نے سپاہیوں سے کہا۔ کہ یہ شخص غالباً بھوکا ہے اسی لئے ایک نیا ڈھونگ رچا کر پیٹ پوجا کا سامان مہیا کرنا چاہتا ہے۔ تم جاؤ اور اس شخص کو شاہی باورچی خانہ میں لے آؤ۔ اور پانچ چھ روز تک اسے خوب کھلاؤ پلاؤ۔ جب اسے کھانے پینے کو ہر چیز ملے گی۔ تو غالباً دعویٰ نبوت بھول جائے گا۔ چنانچہ سپاہی اسے پکڑ کر شاہی باورچی خانہ میں لے آئے۔ اور کچھ روز اسے خوب کھلایا پلایا۔ ایک دن بادشاہ خود اس کے پاس آیا۔ اور پوچھا۔ کیوں صاحب! کیا اب بھی کوئی الہام وغیرہ ہوتا ہے؟ وہ شخص بولا۔ ہاں صاحب! ابھی ابھی فرشتہ آیا تھا اور یہ کہہ گیا ہے۔

یَاأَیُّهَا النَّبِیُّ! —— باورچی خانے میں رہیو۔

تو میرے بھائیو! خوب یاد رکھو۔ حضور کے بعد یہ نبوت کے دعوے سب پیٹ بھرنے کے ڈھنگ اور باورچی خانے کی رونق کے سامان ہیں چنانچہ متنبی پنجاب کی طرف سے کسی شاعر نے لکھا ہے ؎

اے پیٹ تیرے واسطے ہم کیا سے کیا بنے
مہدی بنے مسیح بنے مقتدا بنے
لیکن شرم تو بھرا نہیں گو ہم خیال ہیں
تا آنکہ بنے کرشن بنے اور خدا بنے

میرے دوستو! ؎

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے ۔ خصوصاً آج کل کے انبیاء سے

اور طاعون و وبا کے ذریعہ پوری کی پوری آبادیوں کے نظام حیات کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتا ہے اور کوئی دوسرا انسان ان کے برعکس صفات کا دلدادہ ہو۔ اس بناپر صفات کا یہ نظام فکر کسی جاندار اور پاکیزہ تمدن کی بنیاد کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح صفات کا یہ منطق جس قدر خوشنما اور آزادی کا مظہر ہے اسی قدر بے مصرف اور لاحاصل ہے۔ آپ کبھی تعین سے نہیں بتا سکتے کہ خدا کی صفات عالیہ کے رو سے انسان کو ایسا اور ایسا بننا چاہیئے۔ اور یہ اور یہ کام کرنا چاہیئے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی حاذق حکیم کی صفات کے ذریعہ آپ کسی مریض کا علاج نہیں کر سکتے۔ اور نہ اسے خودکشی سے باز رکھ سکتے ہیں۔

۱۔ پرویز صاحب کی مخصوص اصطلاح اخذ ارتسام کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی اطاعت کے خیال میں اس کی صفات کو اپنے اندر پیدا کیا جائے۔ اس کے ساتھ آپ کہتے ہیں کہ قرآن میں اطاعت رسول کی بجائے حاکم وقت کی اطاعت کا حکم ہے جس کا مطلب ہوا کہ رسول کی بجائے حاکم وقت کی صفات کو اپنایا جائے۔ اور وہ رسول سے زیادہ بہتر صفات کا مالک ہوتا ہے۔ اور جن کفار و مشرکین و شیاطین کی اطاعت کا خدا نے منع فرمایا ہے ان کا حکم ضروری مانا جائے۔ مگر ان کی صفات سے بچا جائے۔ اس سے بیک وقت خدا بھی خوش رہے۔ اور شیطان بھی راضی۔ اور آزادی میں بھی فرق نہ آئے۔

خدا کی اطاعت کو اس طرح ٹھکانے لگانے کے بعد پھر قرآن کا کوئی مصرف باقی نہیں رہ جاتا۔ کیونکہ اگر سارے قرآن میں صرف یہی کچھ ہوتا کہ خدا کی اطاعت کرو اور اس کے آگے جھکو۔ تو یہ کہنا آسان تھا کہ خدا کی اطاعت سے مراد ہے اس کی صفات کو اپنانا اور اس کے لئے اتنے بڑے قرآن کی بھی ضرورت نہ تھی۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ خدا کی اطاعت کی بے حد تفصیلات کو قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اور پھر ہر حکم کے مقابل ممانعت کا جوڑ کچھ اس طرح لگا ہوا موجود ہے کہ وہ انسان کو قدم قدم پر پابند

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ کافروں میں جب بھی کوئی اللہ کا رسول آیا، تو وہ ان اللہ کے پیغمبروں (علیہم السلام) پر ٹھٹھا ہی کرتے رہے۔ چنانچہ ان کافروں کی گستاخیوں اور استہزار کا دوسری آیات میں ذکر موجود ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے۔ کہ جب بھی کسی رسول کی بارگاہ میں گستاخی کی گئی تو اس گستاخی کا جواب خود پیغمبر ہی دیتے رہے۔ یعنی یہ نہیں ہوا۔ کہ کسی رسول کی بارگاہ میں گستاخی کی گئی ہو۔ اور اس کافر کے جواب میں خدا بولا ہو۔ نہیں بلکہ وہ پیغمبر خود ہی ان گستاخوں کی گستاخیوں کا جواب

نوح علیہ السلام

دیتے رہے۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ آپ کی بارگاہ میں کافروں نے یوں گستاخی کی۔

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ــــ (پ ۸ ع ۱۵)

ہم تمہیں کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں "

کافروں نے معاذ اللہ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف " ضلالت " کی نسبت کی۔ اس گستاخی کا جواب حضرت نوح علیہ السلام نے خود دیا اور فرمایا

یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (پ ۸ ع ۱۵)

" اے میری قوم! مجھ میں گمراہی کچھ نہیں۔ میں تو رب العالمین کا رسول ہوں "

ہود علیہ السلام

حضرت ہود علیہ السلام بھی اللہ کے ایک برگزیدہ رسول ہیں قوم نے ان لفظوں سے آپ کی بارگاہ میں گستاخی کی۔

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ (پ ۸ ع ۱۶)

ہم تمہیں بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اور بیشک ہم تمہیں جھوٹوں میں گمان کرتے ہیں "

کافروں نے ہود علیہ السلام کو (معاذ اللہ) بیوقوف اور جھوٹا کہا۔ اس گستاخی کا جواب حضرت ہود علیہ السلام نے خود دیا۔ اور فرمایا:۔

یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (پ ۸ ع ۱۶)

اے میری قوم مجھے بیوقوفی سے کیا علاقہ میں تو پروردگار عالم کا رسول ہوں۔

رہنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ اور زندگی بھر کام کے لئے ایسے ہدایت دیتا ہے جس کے مطابق اسے انجام دیئے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ اس سارے نظام حکم و ممانعت کی ٹاٹ پلیٹ کر انسان اگر صرف خدا کی صفات کا گھروندا تعمیر کرنے لگ جائے جس کے لئے اسے کہیں بھی حکم نہیں دیا گیا۔ تو اس میں کئی طرح کی خرابیاں پیش آتی ہیں۔

اوّل جب ایک حکم کو چھوڑ کر ایسا کام کیا جاتا ہے جس کا حکم نہیں ہوتا۔ تو لازماً حکم ترک ہو جاتا ہے۔ دوسری اس میں یہ خرابی ہے کہ ذات باری کی صفات کا ایک حصہ وہ ہے جو صرف اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ایسی صفات کے حصول یا دعویٰ کا اظہار کرنا انسان کے لئے جائز نہیں اور کچھ دوسری صفات وہ ہیں جن کا اصل مالک خدا ہی ہے۔ اور ان کا کچھ حصہ مخلوق کو بھی دیا گیا ہے۔ جیسے دیکھنا۔ سننا۔ رحم کرنا معاف کر دینا وغیرہ۔ ان دو نوں طرح کی صفات کو اگر بلا امتیاز لیا جائے۔ تو یہ ناجائز ہونے کے ساتھ نظم عالم کے لئے بھی خطرہ کا باعث اور تباہ کن ہے۔ اور ان میں سے صرف دوسری صفات کو بھی اگر ایک اچھا انسان بننے کے لئے اختیار کیا جائے۔ تو نیکی ہے۔ ورنہ انہیں خدا کے مشابہ بننے کے لئے اختیار کرنا کوئی نیکی نہیں۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ جب خدا کی صفات کو بلا امتیاز لینے کی بجائے

ا‎ے قرآن میں صفات و اسمائے حسنیٰ کے متعلق صرف یہی حکم ہے کہ ان کے ساتھ خدا کو پکارا جائے اور اس سے دعا مانگی جائے۔ رہا ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنا تو یہ بعض صوفیا کا خیال تھا جن میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ خدا کی صفات کے ساتھ اس کی اطاعت کو چھوڑ دیا جائے۔ یا اطاعت کا سرے سے وجود نہیں۔ یہ کہنے کا فخر ہمارے ڈیڑھ صاحب کے حصہ میں آیا۔ اس لحاظ سے آپ کا یہ نقطۂ نظر ان بہت کارناموں میں سے ایک قابل فخر کارنامہ ہے جنہیں آپ اپنے نام سے پیش کرتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہوئے خود اپنی طرف سے انکی داد حاصل کرتے ہیں اور کبھی کبھی دوسروں سے انکی داد کی توقع باندھتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السّلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے کتنے بڑے جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ آپ کی شان میں گستاخی کی گئی۔ اور اس گستاخی کا جواب موسےٰ علیہ السلام نے آپ ہی دیا۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرکے فرعون نے کہا :۔

اِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یَا مُوْسٰی مَسْحُوْرًا ۔ (پ۱۵ ع۱۲) اے موسیٰ میرے خیال میں تو تم پر جادو ہوا ہے "

بے ایمان فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مسحور کہہ دیا۔ یعنی تم پر توکسی نے جادو کر دیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس گستاخی کا جواب خود ہی دیا۔ اور فرمایا :۔

وَاِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یَا فِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (پ۱۵ ع۱۲) اور میرے گمان میں تو اے فرعون تو ضرور ہلاک ہونے والا ہے "

یعنی یہ تیری میرے حق میں گستاخیاں تجھے ہلاک کرکے رکھ دینگی۔

بزرگوں کی بے ادبی مہلک ہے

میرے بزرگو! خدا کے مقربین کی شان میں بکواس کرنے سے انسان اس دنیا میں بھی ذلیل ہوتا ہے۔ چنانچہ فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توہین کرکے ذلیل و ہلاک ہوا۔ اور جو کچھ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ وہی کچھ ہو کر رہا۔ فرعون کی مانند آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو خدا کے مقربین کی شان میں بکواس کرتے رہتے، اور ذلیل ہوتے ہیں۔ مولانا رومی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

گر خدا خواہد کہ پردہ کس درد ؛ میلش اندر طعنۂ پاکاں کند

یعنی خدا کسی کو ذلیل و رسوا کرنا چاہے۔ تو اس بے دین کا رجحان پاک لوگوں کی شان میں گستاخی کی طرف کر دیتا ہے۔ اور وہ ان اللہ والوں کا گستاخ بن کر اس جہان اور اُس جہان میں بھی ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔

حضرات! یہ واقعہ ہے کہ خدا نے جب بھی کسی کافر کو ہلاک کیا۔ اس وقت ہی کیا۔ جبکہ اس کافر نے خدا کے کسی مقبول بندے کو ستانا شروع کر دیا۔ اور جب تک۔ اس ملے خدا کے کسی مقبول کو نہیں ستایا۔ اس وقت تک خدا

ان میں انتخاب کا اصول سامنے آیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ ان میں کچھ کا لینا اچھائی نہیں حالانکہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ خدا کی سب صفات اچھی ہیں، اور ان میں سوائے اچھائی کے اور کچھ نہیں۔

چوتھی خرابی یہ ہے کہ اگر ان صفات کے انتخاب کرنے میں معیار ہو خدا کی ہدایت اور خدا کا فیصلہ اور لیے ا نا لازم ہو تو ایک تو اس طرح اس کا حکم مستبد حاکم کی طرح ہوگا اور دوسرا اس بارہ میں خدا کی کوئی ہدایت ہے نہیں۔ اور کسی دوسرے کا فیصلہ مستند نہیں۔

پانچویں خرابی یہ ہے کہ اگر ان صفات میں ہم اپنی مرضی سے انتخاب کریں تو ہر انسان کا انتخاب جداگانہ ہوگا۔ اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ کوئی قاتل ہونا پسند کرے جیسے خدا مارتا ہے۔ اور اگر کوئی لوگوں کے مال لے۔ جیسے خدا سب کا اور سب کے مال کا مالک و متصرف ہے۔ اور اسی طرح نظم عالم تباہ ہوگا۔

چھٹی خرابی یہ ہے کہ خدا کی صفات میں انتخاب کا اصول ماننے کے بعد پھر خدا کیسا تھ ہر چیز کی اچھی صفات کو لینا ہوگا۔ اس لیے کہ دنیا کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی اچھائی موجود ہے۔ اور اچھائی جہاں بھی ہو۔ وہیں سے لینے کے قابل ہوتی ہے۔ اس طرح جو آدمی سب چیزوں کی اچھی صفات قبول کریگا۔ وہ اور سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مگر خدا کا ہم آہنگ اور اس کی صفات کا اخذ و استلام کرنے والا نہیں ہو سکتا۔

ساتویں خرابی یہ ہے کہ محض خدا کی صفات پر دار و مدار رکھنے والا انسان اندھیرے میں رہتا ہے۔ مثلاً کبھی وہ بھوکا اور پیاسا ہوتا ہے۔ کبھی چوروں، ڈاکوؤں اور درندوں سے ڈرتا ہے۔ کبھی اس کی کشتی دریا میں اور مکانات و باغات سیلاب کی زد میں ہوتے ہیں۔ کبھی اسے آگ کا خطرہ ہوتا ہے، اور کبھی کسی کی موت کا غم ویسے تمام حالات میں خدا کی صفات کا نظام اسے کچھ بھی بتا کر نہیں دیتا کہ وہ کیا کرے!

نے اُسے کچھ نہیں کہا۔ اگرچہ وہ کفر میں بہت بڑھ بھی گیا ہو۔ مثلاً یہی فرعون ساری عمر اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کہتا رہا۔ خدا بنتا رہا۔ کفر کرتا رہا۔ مگر مشہور ہے۔ کہ اُسے کبھی سردرد بھی نہیں ہوتی۔ مگر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستانا شروع کیا۔ اور آپ کی شان میں گستاخی کی۔ تو اللہ نے اُسے ہلاک کر دیا۔

نمرود جب تک کفر کرتا رہا۔ خدا نے اس دنیا میں اُسے کچھ نہیں کہا۔ مگر جب اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس نے ستایا تو مارا گیا۔ گویا خداوند کریم کی غیرت کا یہ تقاضا ہے۔ کہ اس کے محبوبوں کو کوئی ستائے۔ تو وہ انہیں ہلاک کر دیتا ہے۔

ایک مجذوب کا قصہ

چنانچہ ایک مجذوب کا قصہ ہے۔ جو اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ مجذوب دانا اور عارف ہوتے ہیں ـــ برخلاف آجکل کے غلط خیال کے کہ ہر وہ شخص جو دیوانہ ہو جائے ننگا رہنے لگے۔ گالیاں دینے لگے۔ وہ لوگوں کی نظروں میں بڑا پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ بھائیو! مجذوب اگرچہ لوگوں کی نظروں میں دیوانہ سا بھی ہو۔ مگر وہ دراصل بڑا فرزانہ و دانا ہوتا ہے۔ استاذی المعظم شیخ المحدثین حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ صاحب الوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ مجذوب کی پیٹھ پیچھے اگر درود شریف پڑھا جائے۔ تو وہ فوراً پیٹھ موڑ لیتا ہے۔ گویا وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور لوگوں سے چھپنے کے لئے وہ اپنے آپ کو دیوانہ سا بنا رکھتا ہے۔ جس طرح بعض سی۔ آئی۔ ڈی کے بڑے بڑے افسر دیوانے بن بن کر پھرتے ہیں۔ مگر دراصل دیوانے نہیں بلکہ بڑے فرزانے اور ہشیار ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ بھی بڑے دانا و ہشیار ہوتے ہیں۔

بہلول دانا

حضرت ہارون رشید کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑ گیا۔ لوگ پریشان نظر آنے لگے۔ بادشاہ خود بھی بڑا پریشان رہنے لگا ایکبار اسی پریشانی کے عالم میں بادشاہ قبرستان سے گزرا۔ اور دیکھا۔ کہ قبرستان میں حضرت بہلول دانا مجذوب بدستور اطمینان و سرور سے بیٹھے

کیونکہ خدا تعالیٰ کو اس قسم کے حالات پیش ہی نہیں آتے تاکہ معلوم ہو کہ وہ ایسے خطرات و مشکلات کے وقت کونسی صفات کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور ان سے کیسے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

آٹھویں خرابی یہ ہے کہ انسان اس آدمی کی صفات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جو اس کے پاس ہی رہتا ہو۔ اس کے سامنے چلتا پھرتا ہو۔ اٹھتا بیٹھتا ہو۔ اور معاملات کے حوادث سے دو چار ہوتا ہو۔ اور انسان مختلف حالات میں اسکی مختلف صفات کا مشاہدہ کرے۔ یا ان سے باخبر ہو۔ اور یہ مقام خدا کا اور خدا کی صفات کا کسی طرح بھی نہیں۔

نویں خرابی یہ ہے کہ بعض اوقات انسان ایسا معطل ہوتا ہے کہ وہ مشکل سے بندگی اور انسانیت کے حدود کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اور عام انسانوں کا علمی اور ذہنی معیار بھی ناقص ہوتا ہے۔ ادھر خدا کی صفات کو جس انداز سے انسان کے معلومات میں لایا جاتا ہے۔ اس سے یہ تو ہو سکتا ہے۔ کہ انسان خدا کو نفع و نقصان اور ثواب و عذاب کا مالک مانے۔ اور اس سے امیدیں باندھے اور اسی سے ڈرے مگر ان صفات کا ادراک کرکے ان سے ایک نظام فکر و عمل مرتب کرنا۔ یہ تو ایک بڑے سیانے پختہ ہشیار و تندرست فلسفی کے دماغ کا کام ہو سکتا ہے۔ نہ کہ ہر انسان کا۔ اور جب فلاح کا دارومدار انہیں صفات کے اخذ و ارتسام پر ہو تو کسی بھی انسان کا فلاح پانا ممکن نہیں۔

۷۔ اس انعکاس کے معقولات کی بجائے اس کے امکانات پر غور کیجئے۔ جہاں دو چیزیں اپنے اصل اور وجود کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ تو انہیں

۱۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے انسانوں پر رسول کا اسوہ لازم ٹھیرایا ہے نہ کہ اپنا۔

ہوتے ہیں۔ حضرت بہلول قبرستان میں ہی رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے کسی نے پوچھا۔ سہ

آپ آبادی میں کیوں آتے نہیں؟ ٭ بولے سب آبادی آتی ہے یہیں

یعنے مجھے شہر میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جبکہ شہر والے ہر روز ایک ایک کر کے یہیں آ رہے ہیں۔ یہی بہلول دانا جب بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوتے بادشاہ نے دیکھے۔ تو پوچھا۔ لوگ قحط سالی سے پریشان ہو رہے ہیں اور آپ بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں گویا آپ کو کوئی فکر ہی نہیں حضرت! یہ کیا بات ہے؟ کیا آپ کو قحط سالی کا علم نہیں؟ حضرت بہلول دانا نے جواب دیا۔ ہاروں رشید! خدا نے ہمارے ذمہ "یاد حق" رکھی ہے۔ اور رزق دینے کا ذمہ اس نے خود لیا ہے۔ تو ہمیں فکر یاد حق کی کرنی چاہیئے روٹی کی فکر ہم کیوں کریں۔ یہ جس نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ وہ خود اس کا انتظام فرمائے گا۔

دیکھا آپ نے یہ لوگ کیسے مطمئن اور لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کی زندہ تفسیر ہیں۔ آج ہم لوگ دن رات بے اطمینانی میں بسر کرتے ہیں اور اس نعمت سے محروم ہیں۔ مگر اللہ والے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کے مطابق اس نعمت سے سرفراز ہیں۔ سچ۔

نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

آج دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ۔ وزیر اور گورنر اگرچہ دنیاوی عیش و آرام کے جملہ سامان رکھتے ہیں۔ مگر اطمینانِ قلب کی نعمت سے محروم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل عموماً ہارٹ فیل ہونے لگے ہیں۔ جس دل میں یاد حق نہ ہو وہ دل فیل نہ ہوگا۔ تو کیا ہوگا؟ اگرچہ ایسا شخص بظاہر زندہ بھی کیوں نہ ہو۔ مگر وہ مردہ ہی ہے۔ کہ اس کا دل مردہ ہے۔ اور زندگی تو زندہ دلی کا نام ہے۔ اور زندہ دلی یاد حق سے ملتی ہے۔ افسوس کہ اس دور میں برائے نام زندگی زیادہ ہے۔ دل عموماً مردہ ہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ!

ہاں تو میں ایک مجذوب کا قصہ بیان کرنے لگا تھا۔ ایک مجذوب

ایک دوسرے کی صفات کا نقل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ انسان کے لئے انسان رہتے ہوئے ممکن نہیں کہ وہ گھوڑے کی صفت کو تو خیر اس کی صفات کو اپنے وجود میں پرورش کرے۔ اور جب نہیں کر سکتا تو پھر ایک اچھے خیال کی حیثیت سے انسان کے اندر گھوڑے کی صفات کا جمع ہونا لاکھ اچھا سہی مگر عملاً تو ایسا ہونا محال ہے۔ یہ حال اس وقت ہے کہ انسان اور گھوڑا مخلوق ہونے میں برابر ہیں۔ پھر جب ایک طرف خدا اور دوسری طرف انسان ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دونوں کی صفات ایک میں جمع ہوں۔

شاہ اسمٰعیل شہید نے فرمایا تھا کہ خدا کے مقابل مخلوق کی مثال ایسی ہے جیسے بادشاہ کے مقابل ایک چمار ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں۔ کیونکہ بادشاہ اور چمار تو دونوں ایک خدا کے بندے ہے۔ ایک زمین کے باشندے اور ایک آدم کی اولاد ہونے میں برابر ہوتے ہیں۔ اور دو ایک جیسے انسانوں کے مراتب میں چاہے بہت بڑا تفاوت بھی موجود ہو وہ بہرحال ایک دوسرے کے مقام پر آسکتے ہیں۔ اور یہ کچھ بھی عقل کے خلاف نہیں۔ مگر خدا اور انسان کے مراتب میں تفاوت کا تو یہ عالم ہے۔ کہ ان میں کوئی پہلو بھی برابر اور مشترک نہیں۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر انسان کا خدا کی صفات کے انعکاس کے طمع میں پڑنا ایک بے جا طمع نہیں تو اور کیا ہے۔

۸۔ اس ہم آہنگی میں بھی عجیب بے جان کشش ہے۔ اگر ایک بادشاہ کا ملازم یا عام شہری اس کی فرمانبرداری اور وفاداری کی بجائے بادشاہ کے طور و اطوار کی نقل اتارنے کے شغل میں پڑے۔ بغیر اس کے کہ اسے ایسا حکم دیا گیا ہو تو اس سے وہ بادشاہ کا ہم آہنگ کبھی نہیں ہوگا۔ بلکہ بعید نہیں کہ اگر وہ ملکی امور میں اسی کی طرح دیں کے مقابل اس جیسا سلطنت کا نظام بنانے لگے۔ تو باغی قرار پائے

فقیر ایک شہر کے بارونق بازار سے گزر رہے تھے۔ اس بازار میں ایک فاحشہ عورت اپنے ایک آشنا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بارش ہو جانے کے باعث سڑک پر کیچڑ بہت تھا۔ اتفاقاً اس فقیر کے ٹوٹے ہوئے جوتے سے کیچڑ کا ایک چھینٹا اس فاحشہ کے منہ پر جا پڑا۔ فاحشہ کے آشنا کو یہ بات ناگوار گزری۔ اور اٹھ کر اس فقیر کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا۔ فقیر نے کچھ نہیں کہا۔ اور چل دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس فقیر سے کسی نے آکر کہا۔ سائیں بابا! سُنا آپ نے بھی؟ وہ فاحشہ کا آشنا جس نے آپ کو تھپڑ مارا تھا۔ خود مارا گیا۔ فقیر نے پوچھا۔ وہ کیسے؟ اس نے بتایا۔ کہ وہ آئینہ لانے کے لئے کوٹھے پر چڑھا تھا۔ تاکہ فاحشہ آئینہ میں اپنا منہ صاف کرے۔ اتفاقاً اس کا پاؤں اوپر کی سیڑھی سے پھسلا اور دھڑام سے نیچے آگرا۔ سر پھٹ گیا۔ اور اسی وقت مر گیا۔ فقیر سن کر مسکرایا اور کہا بھئی! یہ تو یاروں کی آپس میں لڑائی ہے۔ فاحشہ کے یار کو غصہ آیا اس نے مجھے مارا۔ میرے یار کو غصہ آیا۔ تو اس نے اسے مار دیا۔

تو دوستو! خدا کی مار ہے ان لوگوں کے لئے جو اس کے محبوبوں کو ستاتے ہیں۔ اسی طرح فرعون نے بھی موسیٰ علیہ السلام کو ستا کر اپنی ہلاکت کا سامان تیار کر لیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا۔ یعنی اے فرعون میں دیکھتا ہوں۔ اب تو نہیں بچیگا۔ اور ہلاک ہو جائیگا۔ چنانچہ فرعون جیسا منکر و مغرور شخص، جو اپنی وسیع سلطنت اور بڑے بڑے ساز و سامان کے پیشِ نظر اپنے آپ کو خدا کہلاتا تھا۔ پانی میں غرق ہو کر ہلاک ہو گیا۔

فرعونی ایمان قرآن پاک میں فرعون کے غرق ہونے کا قصہ موجود ہے۔ اور قرآن فرماتا ہے۔ کہ جب فرعون غرق ہونے لگا۔ تو اس وقت پکار اٹھا۔ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۔ (پ۱۱ ع ۱۴) یعنی میں خدا پر ایمان لایا۔ اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

لیکن میرے بھائیو! کیا اس کا یہ ایمان اور اپنے آپ کو مسلمان کہنا مفید

اور کسی انعام واکرام کی بجائے سزا کا مستحق ہو۔ پھر خدا کی صفات کے حصول میں انسان خدا کا ہم آہنگ کیسے ہو سکتا ہے۔ بادشاہ کی صفات کے رنگ میں ہم رنگ ہونے والا تو بہر حال ان فوائد سے محروم رہتا ہے۔ جو بادشاہ کو منصب حکومت سے یا لوگوں کو بادشاہ سے حاصل ہونے چاہئیں۔ خواہ وہ باغی نہ ہی قرار پائے۔ تو اس ہم آہنگی رفاقت اور قرب کے ہم معنی الفاظ کی لفاظی اور نمائش کے نقش آب سے اثر کر ذرا اس کی حقیقت پر اور پھر اس کے اغراض و مقاصد پر غور کیجئے تو یہ نقش آب بھی نہیں بلکہ سراب سے بھی زیادہ بے حقیقت ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ میں بڑا بن جاؤں گا یعنی وہی تکمیل ذات اور شرف انسانیت کی بڑائی۔ اور جب اس مقصد کے لئے ایک انسان خدا کی صفات کو حاصل کر لیگا۔ تو وہ خدا کی رفاقت میں کیسے پہنچ جائیگا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ترکستان کا سفر کرنیوالا کعبہ میں پہنچ جائے۔ اس کے معقولات کا حال یہ ہے۔ کہ اگر ایک آدمی کسی دوسرے کا قیمتی لباس یا اچھا مکان دیکھ کر اسی جیسا لباس یا مکان تیار کرے تو وہ دوسرا اس کے ایسا کرنے سے اس پر کبھی خوش نہیں ہو گا۔ اور نہ وہ اس کا رفیق بن جائیگا۔ بخلاف اس کے اسکا ایک معمولی ملازم اور خادم جو اس کا کہا مانتا ہو۔ وہ اپنی ذلت و خستہ حالی کی زندگی میں رہ کر اور معمولی لباس پہن کر بھی اس کا سب سے بڑا قریبی اور رفیق بن سکیگا۔

۱۰۔ اس مقام پر اصل قابل غور سوال یہ ہے جو خدا کی صفات پر عمل کرنے والے اور ہر دوسرے انسان کو قدم قدم پر پیش آتا ہے۔ کہ انسان حکم کس کا مانے اور کیوں مانے اور کس کا کہا نہ مانے اور کیوں نہ مانے۔ اس لئے کہ کسی حکم کا صحیح ہونا اسے قابل قبول بناتا ہے۔ نہ کہ اس کا کسی خاص ہستی کی طرف سے ہونا۔ پرویز صاحب اس کا حل یہ بتاتے ہیں کہ حکم کسی کا بھی نہ مانا جائے۔ اور

و معتبر ہوا؟ ہرگز نہیں۔ وہ کا فر بے ایمان ہی رہا۔ آخر کیوں؟ جب کہ وہ ایمان لے آیا۔ اور اپنے آپ کو اس نے مسلمان بھی کہا۔ پھر اس کا ایمان و اسلام کیوں معتبر نہ ہوا؟ سنئے! اس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ:-

قِيْلَ اِنَّمَا لَمْ يَنْفَعْهُ ذٰلِكَ لِاَنَّ الْاِيْمَانَ عِنْدَ رُؤْيَةِ الْعَذَابِ لَا يُفِيْدُ وَقِيْلَ لِاَنَّهٗ لَمْ يُقِرَّ بِنُبُوَّةِ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ

(نزہۃ المجالس صہ ۱۷۵/۲) — یعنی اس کا یہ ایمان اس لئے معتبر نہ ہوا کہ عذاب دیکھ لینے پر جو ایمان لایا جائے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ چونکہ وہ صرف اللہ پر ہی ایمان لایا۔ اور رسول وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لایا۔ اور ان کی نبوت کا اقرار نہ کیا۔ اس لئے اس کا صرف خدا پر ایمان لانا مفید نہ ہوا"

میرے بزرگو! دیکھ لو۔ فرعون کا صرف خدا کو مان لینا اس کے کسی کام نہ آسکا۔ اگر وہ توحید کے ساتھ ساتھ رسالت کا بھی اقرار کر لیتا۔ تو یقیناً مومن بن جاتا اور مسلمان ہو جاتا۔ مگر صرف توحید توحید ہی پکارتا مرا۔ تو کافر کا کافر ہی رہا۔ اسی طرح آج کل بھی بعض لوگ ایسے ہی فرعونی ایمان کے مدعی ہیں توحید توحید تو پکارتے ہیں۔ مگر رسالت کا نام لینا شرک قرار دیتے ہیں۔ تو ایسے لوگ لاکھ اپنے آپ کو "مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" کہیں۔ وہ ہرگز مسلمان نہیں مسلمان وہی ہے۔ جو درِ رسالت پر بھی جھک جائے۔ ؎

خدا کے سب ہیں بندے پر خدا ملتا نہیں ان کو
خدا ملتا ہے ان کو جو ہے بندے محمد کے

حضرات! میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے جب بھی کسی پیغمبر کی شان میں گستاخی کی گئی۔ تو وہ پیغمبر اس گستاخی کا جواب خود ہی دیتے رہے۔ چنانچہ حضرت نوح، حضرت ہود، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثالیں میں نے قرآنِ پاک سے بیان کی ہیں۔ جو آپ سن چکے۔

صرف قانون[1] کی اطاعت کی جائے. گویا اگر کسی اندھیر نگری کا چوپٹ راجہ قانون کی لاٹھی گھما کر اس کی ریاست سے بے تعلق ہو جائے یا مر جائے تو اس کا بالکل بیکار قانون صحیح ہو جائیگا. اور اس کے اندر کوئی سقم نہیں رہیگا. ادھر قرآنی قانون کو اگر خدا کا قانون اور خدا کا حکم کہکر مسلط کیا گیا. تو اس میں چونکہ قانون کی بجائے خدا کی اطاعت کا تصور سامنے آئیگا. اس لئے وہ قرآنی قانون ہوتے ہوئے بھی صحیح نہیں رہیگا. اور جہاں قانون کا نافذ کرنے والا موجود نہ ہو وہاں کسی کی پیروی بھی لازم نہیں ہوگی. نہ کسی انسان کی اور نہ قانون کی.

قرآن کہتا ہے کہ حکم صرف خدا کا مانا جائے اور اس لئے مانا جائے کہ وہ حکم دینے کا حق رکھتا ہے اور اسی کے پاس وہ علم اور ہدایت ہے. جو حکم دینے والے کے پاس ہونی چاہیئے. اور اسی کا حکم بے لاگ اور خود غرضی سے پاک ہو سکتا ہے. اور خدا کے سوا کسی دوسرے کا حکم نہ مانا جائے. کیونکہ کوئی دوسرا نہ اس کا مستحق ہے اور نہ اس میں حکم دینے کی قابلیت پائی جا سکتی ہے. اور نہ ہی اس کا حکم بے لاگ اور خود غرضی سے پاک ہو سکتا ہے. خدا کا حکم جہاں تعلیم اور ہدایت ہے وہیں قانون اور ضابطہ بھی ہے. اور دونوں صورتوں میں اپنی حقانیت کی بنا پر وہ پیروی کے قابل ہے. خواہ اس کا پیش کرنے والا حکومت کے تخت پر متمکن ہو یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے. دونوں طرح اس کے حق ہونے میں کچھ بھی فرق نہیں آتا.

---

[1] قرآنی احکام کا نفاذ مرکز ملت کی طرف سے ہوتا ہے. ایسے نظام میں اطاعت قانون کی ہوتی ہے. اشخاص کی نہیں. مقام حدیث صـ ۷۶ ...

سردارِ انبیاء صلے اللہ علیہ وسلم

اب آیئے۔ آپ اپنے پیغمبر حضور سرورِ انبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کی امتیازی شان دیکھئے کافروں نے ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی گستاخیاں کیں۔ مگر حضور کی شان نرالی ہے۔ پہلے انبیاء کرام کی شان میں گستاخیاں کی گئیں۔ تو ان گستاخیوں کے جواب میں خدا نہیں بولا۔ بلکہ وہ پیغمبر خود ہی جواب دیتے رہے۔ مگر جب اپنے حبیب کی باری آئی۔ اور کافروں نے گستاخیاں کیں۔ تو خداوند کریم خود بولا۔ اور فرمایا:۔

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ۔ (پ۲۹ ع ۱۳) اور مجھ پر چھوڑدو۔ ان جھٹلانے والوں کو "

یعنی اے محبوب! اب تم خاموش رہو۔ ان بے دینوں کی گستاخیوں کا میں خود جواب دوں گا۔ سبحان اللہ! کیا شان ہے اور کیا مرتبہ ہے۔ کہ محبوب کی باری آئی تو ان کافروں کا جواب دینے کو خدا خود تیار ہو گیا۔ چنانچہ دیکھئے۔ کافروں نے گستاخی کی اور یوں کہا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ۔ (پ۱۴ ع ۱)

"اے وہ جن پر قرآن اترا۔ بیشک تم مجنوں ہو"

کافروں نے تمسخر کے ساتھ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے یوں کہا۔ کہ تم تو مجنون ہو۔ اب اس کے جواب میں دیکھئے۔ کیا حضور خود بولے یا خدا بولا؟ قرآن پاک شاہد ہے کہ ذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ کے مطابق اس کا جواب خدا نے خود دیا۔ اور فرمایا:۔

نٓ ۔ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ۔ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ۔ (پ۲۹ ع ۳)

"قلم اور ان کے لکھے کی قسم۔ تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں"

دیکھئے! اللہ تعالیٰ قسم فرما کر فرما رہا ہے۔ کہ پیارے تم مجنون نہیں۔ یہ بے ایمان جھوٹ بولتے ہیں۔ اور پھر آگے فرمایا:۔

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ۔ (پ۲۹ ع ۳) عنقریب تم بھی دیکھ لوگے۔ اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں کون مجنون تھا"

فطری تقاضا اور وحی

"خدا حق[1] ہے۔ کائنات[2] کی بنیاد حق پر ہے۔ انسانی فطرت کی اساس
فطرۃ اللہ یعنی حق پر[3] ہے۔ ہم ان تینوں میں کوئی[4] ربط و تعلق نہیں دیکھتے
ہمارے[5] ناقص تصور میں خدا عرش کی بلندیوں پر کہیں[6] الگ تھلگ
بیٹھا ہے۔ کائنات اس فضا کی پہنائیوں میں الگ معلق کھڑی ہے۔
اور انسان اس صفحہ ارض پر الگ مارا مارا پھر رہا ہے۔ کہ فکر معاش
میں سر کھپاتے کھپاتے مر جائے۔ لیکن رسول جو حق کو بے نقاب[7] دیکھ
لیتا ہے۔ وہ اس ربط و تعلق کو ایک زندہ حقیقت کی شکل میں اپنے
سامنے موجود[8] پاتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ وہی حق جو خون رگ کائنات
میں حرارت بن کر جاری و ساری[9] ہے۔ خود فطرۃ انسانی کے اعماق قلب
میں برق تپاں کی طرح تپش انگیز اور[11] لہٰذا اس کی رگ حیات سے بھی
زیادہ قریب ہے۔

.... اس لئے وہ عبد کامل اور مسلم اوّل[12] ہوتا ہے۔ یہ احکام چونکہ خود
فطرت انسانی کے تقاضے ہیں اس لئے ان کی اطاعت میں کوئی تنگی اور
گرانی[13] نہیں ہوتی۔" صفحہ ۲۹۹

۱۔ اس سارے بیان کی جگمگاہٹ اور ملمع کاری کی حقیقت کو سمجھ پانا دو
سوالات کے حل پر موقوف ہے۔ پہلا یہ ہے کہ رسول کس وجہ سے قرآن کے

لہ حقیقت یہ ہے کہ تحفظ ذات یا تولید نسل کی حیوانی جبلت سے آگے انسان
کی کوئی فطرت نہیں۔ نظام ربوبیت صفحہ ۱۶۷۔ دروغ گو را حافظہ نباشد۔

گویا یہ بے ایمان خود ہی مجنون ہیں۔ جو آپ کو مجنون کہہ رہے ہیں میرے عزیزو! حضور صلے اللہ علیہ وسلم تو ایک حق نما آئینہ ہیں۔ اس میں ہر شخص کو اپنی ہی سیرت و صورت نظر آتی ہے۔ مجنونوں نے حضور کو مجنون کہہ دیا۔ اور جو خود بدبخت جاہل ہیں۔ وہ حضور کے علم کا انکار کر دیتے ہیں۔ یہ جو گستاخوں نے براہین قاطعہ میں لکھ دیا ہے۔ کہ حضور کو دیوار کے پیچھے کا علم نہ تھا۔ یہ دراصل ان جاہلوں کی اپنی تصویر ہے۔ ورنہ حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے تو خدا نے ذرہ ذرہ عیاں فرما دیا ہے۔ ؎

دل فرش پر ہے تری نظر — سر عرش پر ہے تری گزر!
نہیں وہ جو تجھ پہ عیاں نہیں — ملکوت و ملک میں کوئی شے

حضرات! اسی طرح کافروں نے جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں یوں گستاخی کی۔ اور یہ کہا کہ :-

لَسْتَ مُرْسَلًا۔ (پ۱۳ ع ۱۲) ۔" تم رسول نہیں "

تو اس کے جواب میں بھی حضور نہیں بولے۔ بلکہ خدا نے خود جواب دیا ہے :-

یٰسٓ۔ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۔ (پ۲۲ ع ۱۸)

اے سردار! حکمت والے قرآن کی قسم۔ بیشک تم رسولوں میں سے ہو"

اور سنئے! کافروں نے ایک مرتبہ یہ بات اڑا دی کہ :-

اِنَّ مُحَمَّدًا وَدَّعَهٗ رَبُّهٗ وَقَلٰهُ۔ (روح البیان ص۱۶ ج ۴)

تحقیق محمد کو اس کے رب نے چھوڑ دیا۔ اور دشمن بنا لیا"

اس بکواس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی (پ۳۰ ع ۱۸)

چاشت کی قسم، اور رات کی قسم جب وہ پردہ ڈالے۔ کہ تم کو تمہارے رب نے نہ چھوڑا۔ اور نہ دشمن بنایا"

دیکھ لیجئے۔ ہر مقام پر محبوب کی طرف سے خود خدا ہی بول رہا ہے اور محبوب کی عزت و شان بڑھانے کو جب بھی کچھ ارشاد فرمایا۔ قسم فرما کر۔ میرے بزرگو! یہ جو والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ " میں قسم فرمائی۔ ایک تو اس

احکام کو انجام دیا۔ اور ان میں اس نے کسی طرح بھی جی نہ چرایا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اور لوگوں کو قرآن کے احکام کیوں کسی تنگی ترشی دکھائے بغیر مان لینے چاہئیں۔ پہلے سوال کا حل پرویز صاحب یہ بتاتے ہیں کہ دراصل رسول خدا اس راز کو پا گئے۔ کہ خدا حق ہے اور کائنات کی تخلیق اور انسانی فطرت کی بنیاد بھی حق پر ہے۔ اس اعتبار سے وہ خود بھی حق ہے۔ کیونکہ بہرحال ایک اچھا خاصا انسان تو وہ بھی ہے ہی۔ ادھر قرآن بھی حق ہے۔ اور جب ہے تو اس نے سمجھ لیا کہ خدا کہیں کسی دور دراز مقام سے اس کی طرف کسی ڈاک وغیرہ کے ذریعہ اپنے احکام نہیں بھیج رہا بلکہ اس نے سمجھا کہ خدا کے احکام خود اس کے اپنے دل کی گہرائیوں سے ولولوں کی طرح ابھر رہے ہیں۔ اور انہیں اپنے دل کی خواہش سمجھ کر بجا لانا چاہیئے۔ جس میں کسی طرح پس و پیش کی گنجائش نہیں ہوتی۔

دوسرے سوال کو پرویز صاحب یوں نپٹاتے ہیں کہ قرآنی احکام خود انسانی فطرت کے اپنے تقاضے ہیں جیسے بھوک پیاس وغیرہ اس کے تقاضے ہیں۔ اور جب ہیں تو انہیں ماننے میں نہ کوئی تنگی ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہونی چاہیئے۔ اس طرح جہاں قرآن انسانی آزادی کا محافظ ٹھیرتا ہے وہاں رسول کی پیروی قرآن بھی کچھ قابل رشک نہیں رہ جاتی۔ اگرچہ اس کے بعد قرآن کی ضرورت کا سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔

پہلا حل اس واقعاتی حقیقت سے باطل ٹھیرتا ہے کہ رسول قرآنی احکام کو اپنے ہمراہ لے کر نہیں پیدا ہوا تھا۔ اور نہ ہی اس وقت انہیں پیش کرنا اس نے شروع کر دیا تھا۔ بلکہ خود قرآن کے بیان کے مطابق اس نے کافی عمر گئے اس کام کا آغاز فرمایا تھا۔ پھر جب کافی عمر کے بعد اسے قرآن ملنا شروع ہوا تو اس کے کافی احکام آنے کے بعد یہ لمبا چوڑا سلسلہ

کا یہ معنے ہے جو آپ سن چکے کہ چاشت کی، اور رات کی قسم، اور مفسرین نے اس کا ایک اور معنے بھی لکھا ہے۔ چنانچہ صاحبِ روح البیان نے

رُخِ انور اور زُلفِ معنبر

اس کی تفسیر میں ایک قول یہ نقل کیا ہے:۔
"اشارت است بروشنی روئے حضرت مصطفٰے علیہ السلام و کنائیتست از سیاہی موئے وے۔" (روح البیان ج۴ ص۶۶۳)

مطلب یہ کہ "والضحٰی" سے مراد حضور صلے اللہ علیہ و سلم کا چہرۂ انور ہے اور "واللیل" سے مراد حضور کی زلفِ معنبر ہے۔ گویا خدا نے یوں فرمایا ہے:۔

(کہ اے محبوب) تیرے اس رُخِ روشن کی قسم اور ان سیاہ زلفوں کی قسم جب کہ وہ بکھر کر چہرۂ انور کو ڈھانپ لیں۔ تمہارے رب نے نہ تجھے چھوڑا۔ اور نہ دشمن بنایا"

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز نے اسی لئے فرمایا ہے ؎

ہے کلامِ الٰہی میں شمس و ضحٰے ترے چہرۂ نور فزا کی قسم
قسم شبِ تار میں راز یہ تھا کہ حبیب زلفِ دوتا کی قسم

ایک اور شاعر لکھتا ہے ؎

یوں زلف جلوہ گر ہے رخِ پرضیا کے پاس
واللیل جس طرح ہو لکھی والضحٰی کے پاس

جامع الصفات

میرے بزرگو! اس تقریر سے ثابت ہو گیا۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم جملہ انبیاء کرام علیہم السلام سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضور کو جملہ انبیاء کرام[1] کا سردار و سلطان بنایا ہے۔ خوب یاد رکھئے۔ ہر نبی کو جو جو کمالات و فضائل انفرادی طور پر عطا ہوئے۔ وہ سب کے سب فضائل و کمالات ہمارے حضور میں جمع فرما دیئے گئے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ؎

وَلِکُلِّ نَبِیٍّ فِی الْاَنَامِ فَضِیْلَۃٌ ۔ وَجُمْلَتُھَا مَجْمُوْعَۃٌ لِمُحَمَّدٍ

یعنی ہر نبی کے لئے جو جو فضائل و کمالات حاصل ہیں۔ وہ سب کے سب ذات جامع الصفات حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم میں جمع ہیں۔

[1] علیہم السلام

حقائق بڑے بڑے کافی تعلیمی وقفوں کے بعد اسے بتایا گیا کہ خدا حق ہے۔ کائنات حق ہے۔ انسان حق ہے اور قرآن حق ہے۔ یہ جب واقعہ ہے تو یہ کچھ بتائے جانے سے پہلے کیسے یہ آگاہی ہو گئی جس کے تحت اس نے ان بہت سے حقائق کو اور ان سے پہلے آنے والے بہت سے احکام کو اپنے دل سے ابھرنے والے ولولوں کے برابر سمجھا۔ ادھر اس سے بھی انکار نہیں کہ قرآن کو جو کچھ اس نے لعل قدم پر اہمیت دی۔ اور اس کا مقام وہی سمجھا جو حق تھا جس پر وہ آخر دم تک قائم رہا۔ اور کسی بات کے حق ہونے اور قابل قبول ہونے کا معیار یہ کب ہے کہ وہ انسان کی خواہشات کے مطابق ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی خواہش کو کسی اجنبی کی اچھی بات سن کر چھوڑ دیتا ہے۔ اور اسکی بات پر چل پڑتا ہے۔

دوسرا اصل اس طرح باطل ٹھیرتا ہے کہ اگر انسان کا فطری تقاضا معیار ہو سکتا تھا تو پھر رسول کو اس اتنے لمبے حقائق کے کورس میں کیوں رکھا گیا۔ اور خود ضرورت وحی کا فلسفہ کیا رہ جاتا ہے۔ کیوں نہ آدمی فطری تقاضا کو اپنا رہنما مان لے۔

خدا حق ہے اور قرآن بھی ضرور حق ہے۔ مگر کائنات کو تو قرآن میں کہیں بھی حق نہیں کہا گیا۔ قرآن میں صرف یہ ہے کہ کائنات کو خدا نے حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ حق اور شے ہے اور حق کے ساتھ پیدا ہونا اور چیز ہے۔ رہا انسان کی فطرت کا حق ہونا۔ تو یہ قرآن میں کہیں بھی موجود نہیں قرآن میں صرف یہ ہے کہ اللہ کا طریق پیدائش وہی ہے۔ جس پر اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا۔ خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی دین قیم ہے۔ اگرچہ پرویز صاحب اس کے بھی قائل نہیں کہ انسان کی فطرت دین ہے[1]

[1] انسانی فطرت کا تصور ہی غلط ہے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں نہ نیک نہ بد

ایک مثال

ایک مثال عرض کروں۔ دیکھیئے آپ نے چند رقمیں جمع کرنی ہوں۔ مثلاً ۲۰-۱۸-۱۵-۱۰- یہ رقمیں آپ جمع کرنا چاہتے ہوں۔ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ان رقموں کو حسب ذیل صورت میں اوپر سے نیچے لکھیں گے۔

۲۰
۱۸
۱۵
۱۰

پھر ان کو جمع کر کے جو ٹوٹل بنے گا۔ اس رقم کو آپ ان سب رقموں کے نیچے لکھیں گے۔ یعنی ان سب رقموں کا ٹوٹل "۶۳" ہے۔ اور یہ رقم آپ سب رقموں کے نیچے بایں صورت لکھیں گے۔

۲۰
۱۸
۱۵
۱۰
۶۳

اب غور فرمایئے۔ کہ ٹوٹل کی رقم "۶۳" بھی ایک رقم ہی ہے اور سب سے آخر لکھی گئی ہے۔ مگر حقیقت میں اوپر کی تمام رقمیں اسی ایک رقم میں موجود ہیں۔ اسی طرح انبیاء سابقہ علیہم السلام اپنے اپنے وقتوں میں تشریف لائے۔ اور علی الانفراد سب نے اللہ سے مختلف اوصاف و کمالات پائے۔ اور پھر خدا نے ان جملہ اوصاف و کمالات کو جس وجود باجود اور ہستئ مسعود میں جمع فرمایا۔ اس کا نام "مُحَمَّد" رکھا۔ اور بکمال آب و تاب اس وجود گرامی سے اہل زمین کو مشرف فرمایا۔ یہ ذاتِ گرامی جملہ اوصاف و کمالات کی جامع بن کر تشریف لائی۔ اور چونکہ جیسے کہ آپ سن چکے۔ ٹوٹل کی رقم سب رقموں کے بعد لکھی جاتی ہے۔ اسی واسطے اس جامع کمالات ذات بابرکات کو سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد بھیجا گیا۔ اور دیکھنے میں تو حضور بھی دوسرے انبیاء کی طرح ایک نبی و رسول ہیں۔ مگر حقیقت میں پہلے تمام انبیاء ورسل کے تمام اوصاف و کمالات اسی ایک وجود باجود میں موجود ہیں۔ صفوتِ آدم۔ شوکتِ نوح۔ خلتِ ابراہیم۔ صبرِ ایوب۔ خوفِ یحییٰ۔ شکوہ

صحیح کے موافق ہے۔ اور اس فطرت کا لازمہ ہے کہ انسان خدا کے دین کی پیروی کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے کائنات خدا کے قانون فطرت کی پیروی کر رہی ہے۔ اور انسان کو اپنے ارادہ کے ساتھ یہ پیروی کرنی چاہیئے۔

قرآن کو جو حق ٹھیرایا گیا تو اس لیئے کہ یہ خدا کی صفت کلام کا مظہر ہے۔ اور جس طرح خدا کی ذات حق ہے بعینہٖ اسی طرح اسکی صفت کا حق ہونا بھی ضروری ہے۔ اور یہ ایک بہت بڑا ثبوت ہے اس بات کا کہ ذات باری کی صفات کے بارہ میں متذبذب ہونے کی وجہ سے معتزلہ معطلہ اور نافیہ کا خیال باطل ہے۔ اس لئے کہ خدا نے اپنی ذات کی طرح اپنی صفت کو بھی جب حق فرمایا تو پھر مجرد عقلی بنیادوں پر اس میں مستقل اور غیر مستقل کا الجھاؤ پیدا کر کے نہ صفات کو حق ماننا اور نہ کچھ ماننا اور بلا صفت خدا کو حق مان لینا کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کی فطرۃ اور تخلیق کے باعث انسان اور زمین و آسمان کیسے حق ہو گئے

۲۔ اللہ نے جو زمین و آسمان کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا۔ تو جو کچھ موجود نہ تھا اسے وجود میں لایا۔ اس طرح خدا خالق ہوا۔ اور کائنات مخلوق ٹھیری۔ اس وجہ سے جہاں یہ کہنا غلط ہے کہ زمین و آسمان وغیرہ کچھ ہے ہی نہیں۔ اور جو کچھ ہے خدا ہے۔ وہاں یہ کہنا بھی غلط ہے کہ زمین و آسمان اور کائنات بھی خدا کی طرح حق ہے۔ کیونکہ کسی چیز کا حق کے ساتھ ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ چیز خود بھی حق ہے۔ بنابریں خدا حق ہے۔ اور کائنات حق کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ اور کائنات کے ساتھ خدا جو معاملہ بھی کرتا ہے۔ وہ اپنی مخلوق کے ساتھ کرتا ہے۔ نہ کہ اپنے ساتھ

سلیم کے نام۔ ص ۳۲۶

ملاحظہ ہو تضاد۔ کہاں انسان کی فطرت کا خدا کی طرح حق ہونا اور کہاں اسکا نیکی سے بھی خالی ہونا

سلیمان - حسنِ یوسف - جلالِ موسٰی - اور تواضع عیسٰے علیہم السلام کی جامع یہی ذات منبع البرکات ہے - میں نے اپنی ایک تضمین میں لکھا ہے:۔

حسنِ یوسف کا ہوا ایک جہاں میں چرچا
اک نظر جس پہ پڑی اس پہ ہوا غش طاری
حضرت روح نے مردوں کو کیا ہے زندہ!
تم کہا جس کو حیات اس میں ہوئی ہے ساری
اور موسٰے نے خدا سے یدِ بیضا پایا!
نور کے چشمے ہوتے ہاتھ سے ان کے جاری!
سامنے آئی جو تصویرِ محمد میرے!
خوبیاں اس میں نظر آئیں یہ مجھ کو ساری
ہوش کھو بیٹھا بشیر اس کا نظارہ کر کے
بے خودی میں یہ ہوا شعر زباں پر جاری

حُسنِ یوسف دمِ عیسٰے یدِ بیضا داری!
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

تواضع

حضرات! آپ نے سن لیا کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی کس قدر بلند شان ہے - اتنی بلند کہ۔ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اس قدر بلند شان ہونے کے باوجود سرکار کی تواضع ملاحظہ فرمایئے۔ کہ کسی قسم کے فخر و غرور کا نام تک نہیں۔ بلکہ جب بھی کبھی اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کے مطابق اپنے فضائل بیان فرماتے۔ تو ساتھ ہی وَلَا فَخْرَ فرما دیا۔ اور حضور کی یہ تواضع مبارک بھی ہمارے لیئے ایک مشعلِ ہدایت ہے۔ آج کسی کو ذرا سا بھی کوئی عہدہ مل جائے۔ تو اس کا دماغ آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے اور وہ غرور

اور جس طرح اس کی ذات حق ہے اسی طرح اس کی صفات اور اس کے کام بھی حق ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ زمین اور آسمان کے عناصر حق نہیں۔ بلکہ انہیں وجود میں لانا جو خدا کا کام ہے وہ حق ہے۔

۳۔ یہی حال انسانی فطرت کا ہے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا فرمایا ہے۔ اور اللہ نے جس طرز پر انسان کو پیدا فرمایا ہے۔ وہ بالکل حق ہے۔ اور جس طرز پر خدا نے دوسری موجودات حیوانات وغیرہ کو پیدا فرمایا۔ وہ بھی حق ہے۔ اور دونوں کی تخلیق اور فطرت کا حق کے ساتھ ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ ان کے اندر کچھ خدائی خصوصیات کو اس بنا پر مانا جائے کہ وہ حق کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بحث البتہ اس میں پیدا ہو سکتی ہے کہ جب اللہ نے انسان کو دین حق اور دین قیم پر پیدا فرمایا تو وہ برا کیوں بن جاتا ہے اسے تو لازماً نیک ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ کبھی برا نہ ہو سکے۔ پرویز صاحب اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ انسان کے اور تمام کائنات کے اندر خدا نے برائی اور شر کو کہیں پیدا نہیں فرمایا۔ انسان اپنی غلطی سے برا بن جاتا ہے۔[1] یہ جواب بالکل ایسا ہی ہے جیسے موٹر ڈرائیور کی صفائی دیتے ہوئے کوئی کہے کہ موٹر اپنی غلطی کی وجہ سے کھڈ میں جا گرتی ہے۔ یا سائیکل اپنی غلطی سے گر جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب غلطی کا کہیں وجود آپ تسلیم نہیں کرتے تو انسان اپنے عمل کے ذریعہ غلطی کہاں سے لاتا ہے

---

[1] اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ انسانی فطرت جذبات شر کو اپنے ساتھ لئے ہوئی ہے تو اس سے خالق فطرت کے متعلق جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ سلیم کے نام ص ۱۴۷

کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔

اگر کوئی شخص ڈی۔سی سے بھی مل آئے۔ تو اس کے قدم زمین پر نہیں جمتے۔ اور وہ گویا زمین کا باشندہ ہی نہیں رہتا۔ پھر کسی غریب سے گفتگو کیسے کرے؟ مگر قربان جائیں تواضع مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کے کہ شب کو خدا سے بھی مل آئے۔ مگر دن کو اپنے غلاموں سے اُسی شفقت کے ساتھ گفتگو فرمائی جا رہی ہے۔ میرے دوستو! آؤ۔ اور اپنے آقا و مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ سے سبق حاصل کرو۔ اور اپنے اخلاق کو سنوار لو۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کا نقشہ مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے مثنوی شریف میں بیان فرمایا ہے۔ اسے سنو۔ اور اپنے دین و دنیا کو اچھا بنا لو۔ مولانا فرماتے ہیں۔

در ہمہ احوال و افعال اے فتا!
قبلۂ خود ساز خلقِ مصطفٰے

کہ تواضع پیشہ بودے ہر زماں ‌‌ ‌ نان خوردے بر زمیں چوں بندگاں
از تواضع آں رسولِ حق پرست ‌ ‌ جملہ کارِ خانہ خود کردے بدست

خانہ رفتے گاؤ را دادے علف!
ہر زماں از کبر بودے بر طرف

یعنی اے جوان! ہر وقت اخلاقِ مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کو پیشِ نظر رکھ! حضور نے ہر وقت تواضع اختیار فرمائی۔ آپ زمین پر تشریف فرما ہو کر تواضع کے ساتھ کھانا تناول فرماتے تھے۔ اور گھر کا سارا کام خود اپنے ہاتھ مبارک سے کر لیتے تھے۔ گھر تشریف لاتے تو گائے کو چارہ بھی خود ہی ڈالتے اور کبر و غرور سے ہر وقت آپ کنارہ کش رہتے تھے۔ آگے فرمایا:۔ ؎

ہر کرا ہمسایۂ بودے چناں!
کہ ازو پرہیز کردے جہاں!
مُصطفٰے با او بہم خوردے طعام
بود زیں شاں حال آں خیر الانام

اور وہ اپنی قوتوں کو غلط کیوں استعمال کرتا ہے۔ یا تو آپ سیدھی طرح تسلیم کریں کہ سڑک کے اردگرد میدان ہے۔ اس میدان میں ٹیلے بھی ہیں گڑھے بھی ہیں۔ جب آپ فرض یہ کرتے ہیں کہ سڑک جس پر انسان چل رہا ہے اس کے دونوں جانب آہنی دیواریں ہیں جنہیں پھاند کر کسی غلط سمت جانے کا کوئی امکان نہیں اور نہ اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ کہ خدا نے[1] سڑک کے ساتھ ساتھ گڑھے بھی بنا رکھے ہیں۔ تو پھر یہ کہنا کیسے معقول ہو سکتا کہ انسان غلطی سے گڑھوں میں جا پڑتا ہے۔

قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ خدا نے انسان کو نیکی پر ہی پیدا فرمایا ہے اور وہ فطرۃً نیکی کو قبول کرتا ہے مگر اس کے ساتھ وہ ارادہ و اختیار کا مالک بھی ہے اور جب برا ہوتا ہے تو اپنے قصد اور ارادے سے برا ہوتا ہے جیسے وہ قصداً خود کشی کر گذرتا ہے۔ اس پر اگر کوئی کہے کہ خدا نے برائی کو دنیا میں وجود کیوں دیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ برائی نام ہے غلط کاری کا۔ خدا نے تو لوہا انسان کی بھلائی کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ نہ اس لئے کہ انسان اس سے خودکشی کے لئے ہتھیار بنائے مگر پھر بھی اس موضوع سے جو قضا و قدر اور خیر و شر کے مسائل پیدا ہوتے ہیں ان سے دو اور دو چار کی طرح عہدہ برا ہونا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ ان کا آخری حل یہی ہے کہ جیسا کچھ انہیں قرآن نے پیش کر دیا ہے۔ اسی شکل میں ان پر ایمان لایا جائے اور ان کی بحث میں نہ پڑا جائے۔ ورنہ جب آپ کہتے ہیں کہ انسان کو برا نہ ہونا چاہیئے تو اس سے یہ دعویٰ بری طرح باطل ہوتا ہے

---

[1] کائنات میں تو ذاتہ شر کا وجود ہی نہیں۔ شر تو اس صورت حالات سے پیدا ہوتا ہے جس میں انسان اپنی قوتوں کے غلط استعمال سے اپنے نظام کا توازن بگاڑ دیتا ہے۔ تسلیم کے نام ص ۱۲۶

یعنی کسی شخص کو اگر ایسی بیماری لگ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے سب لوگ اس سے الگ ہو جاتے تھے۔ تو حضور اس آڑے وقت میں اس بے کس و بے یار بیمار کے ساتھ تشریف فرما ہو کر کھانا تناول فرماتے تھے۔

حضرات! دیکھا آپ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تواضع شریف کو کہ مرتبہ اس قدر بڑا کہ بڑے بڑے رسولوں کے بھی سردار ہیں اور تواضع اس قدر کہ غریب سے غریب تر شخص سے بھی محبت و شفقت فرمائی جاتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی اپنے آقا و مولے صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کو پیشِ نظر رکھیں۔ اور مسلمان بن کر جئیں اور مسلمان ہی رہ کر مریں۔

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

کہ دنیا میں برائی اور شر کا وجود کہیں ہے نہیں۔ برائی سے رد کنا تو اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے وجود کو مانا جائے۔ بغیر اس بحث کے کہ خدا نے برائی کو کس لئے پیدا فرمایا۔ اور جب پیدا فرمایا تو یہ کونسا اچھا کام کیا۔ کیونکہ خدا کے ایک کام کا اچھا ہونا اس پر موقوف نہیں کہ ہماری عقل اس کے اچھا ہونیکا فیصلہ دے۔ اس پر پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس نے ہمیں ناقص عقل کیوں بنایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اچھا ہوا کہ اس نے ہمیں ناقص عقل انسان بنایا۔ وہ ہمیں کچھ اور بھی بنا سکتا تھا۔

۲۔ زمین و آسمان کی کائنات کو ایک مکان کا سامان فرض کر لیجئے! ایک مکان میں نقدی زیورات اور برتن بھی ہوتے ہیں۔ چارپائیاں اور بستر بھی ہوتا ہے۔ اس کا فرش اور چھت بھی ہوتا ہے۔ اور کہیں کچھ مٹی گھٹا اور کوڑا کرکٹ بھی پڑا ہوتا ہے۔ اور دنیا کا کوئی انسان جو پاگل نہ ہو وہ اس کے کوڑے کرکٹ کو اس کے فرش کے برابر کبھی نہیں کہیگا۔ نقدی اور زیورات کے برابر ہونا تو کہیں دور کی بات ہے۔ اور یہ امید تو ایک پاگل سے بھی نہیں ہو سکتی کہ وہ مکان کے کوڑے کرکٹ میں مالک مکان کا جلوہ پالے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ مکان کی چیزوں کے برابر ہونے اور نہ ہونے کی بحث میں پڑے بغیر یہ سمجھا جائے۔ کہ اس کے ہر حصہ میں مالک مکان رزح بس گیا ہے، اور یہ ہے مکان اور مالک مکان کے متعلق قرآن کا وہ تصور جو اس سے رسول کو ارزانی ہوا۔ آپ کے نزدیک رسول کے اس قرآنی تصور توحید کا تقاضا یہ ہے کہ کائنات کے ہر ذرے اور ذرے کے ہر حصہ میں بس خدا کو ہی جلوہ فرما دیکھا جائے۔ بخلاف اس کے اگر ان عناصر کے اچھے اور برے کی تمیز میں پڑ کر ہم ان کی گندگی اور غلاظت کو خدا کے عرش کے ہم پایہ ماننے میں تامل کرنے لگے۔ تو یہ خدا کے متعلق ناقص تصور ہوگا

چوتھا وعظ

رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ط

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ط (پ ۱۷ ع ۷)

"اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لئے۔"

حضرات! — آج میں آپ کے سامنے حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت کے متعلق کچھ بیان کرنے کو حاضر ہوا ہوں۔ اسی واسطے میں نے قرآن کریم کی ایک ایسی آیت پڑھی ہے۔ جس میں اللہ نے اپنے محبوب پاک کی رحمتِ عامہ کا ذکر فرمایا ہے۔ خدا اپنے محبوب سے خطاب فرما کر فرما رہا ہے کہ پیارے! ہم نے آپ کو "رحمۃ للعالمین" بنا کر بھیجا ہے۔ میرے بھائیو! اس آیت میں اس لفظ "عالمین" کو سامنے رکھئے۔ اور پھر سورۂ فاتحہ کو پڑھئے۔ اس کی پہلی آیت یہ ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ سب تعریفیں اس اللہ

۵۔ قرآن مجید کو بیکار بتلانے کا یہ بھی ایک ترقی یافتہ فن ہے کہ اس کے جس حکم اور جس ہدایت کو غلط اور فضول کہنا چاہا! اسے اپنے ناقص خیال اور تصور کا نام دے کر اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اسطرح انسان منکر قرآن کے الزام سے بچتے ہوئے وہ سب کچھ قرآن کے خلاف کہہ گذرتا ہے جو ایک منکر قرآن کے ساتھ مخصوص ہونا چاہیے۔ اس کا منظر آپکو یہاں اس خوبی کے ساتھ نظر آئیگا۔ خدا کے عرش پر الگ تھلگ ہو کر بیٹھنے کو پرویز صاحب نے اپنی بکثرت کتابوں میں اس انداز کے ساتھ بیان کیا ہے جیسے یہ کسی دیوانے مجذوب کی بات ہو جو اس نے اپنے کسی الھڑ والے پیر و مرشد کی شان میں وارفتہ ہو کر کہہ دی ہے۔ جسکا تمسخر اڑانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس سے کسی کی ہتک ہو رہی ہے۔ ادھر قرآن کے کئی ایک مقامات پر بھی خدا کا عرش پر متمکن ہونا موجود ہے۔ اس پر سوچا جا سکتا ہے کہ قرآن کی اس سے بڑھ کر اور کیا بے حرمتی ہو سکتی ہے کہ جو حقیقت اس کے کئی مقامات پر موجود ہو اس کا انسان بار بار مذاق اڑائے۔ اور اسے ہنسی اور دل لگی کا سامان بنائے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ قرآن کے خلاف روا رکھتے ہوئے پرویز صاحب قرآن کے دعوی عشق میں کتنے صادق ہیں۔ اور یہ عمل آپ کے خلوص کا کتنا بڑا ثبوت ہے کہ قرآن ماننے والوں کے دل میں بار بار شک کے کانٹے چبھوئے جائیں۔ اور ان کے شک کو دور کرنے کا کوئی اہتمام نہ کیا جائے۔ اور جو ملازم اپنے افسر یا مالک کی باتوں کا مذاق اڑائے وہ اس کا کتنا بڑا مخلص اور وفادار ملازم ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر یہ سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں کہ آپ رسول کی ہتک کرنے میں کیوں اتنے دلیر واقع ہوئے ہیں۔

۶۔ ذات باری کے عرش پر متمکن ہونے کا مسئلہ دو پہلو رکھتا ہے۔ ایک

کے لئے ہیں۔ جو سارے جہانوں کا رب ہے"۔
دیکھ لیجئے! یہاں بھی وہی " عالمین" کا لفظ ہے۔ جو وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ میں ہے۔ گویا خدا فرماتا ہے۔ کہ میں " رب العالمین" ہوں۔ اور میرا محبوب " رحمة للعالمین" ہے۔

عَالَمِیْن

اب دیکھنا یہ ہے کہ " عالمین" کا معنےٰ کیا ہے؟ تو میرے دوستو۔ عٰلمین جمع عالَم کی ہے۔ اور عالَم کا معنےٰ ہے " مَا یُعْلَمُ بِهِ الشَّیُّ"۔ ایسی چیز جس سے دوسری چیز کا علم حاصل ہو جائے۔ چونکہ دنیا کی ہر چیز اپنے خالق کا پتہ دے رہی ہے اور بقول شاعر ؎

ہر گیا ہے کہ از زمیں روئد!
وحدہٗ لا شریک مے گوید!

ہر گھانس بھی جو زمین سے اگتی ہے۔ وہ زبانِ حال سے اس امر کا اعلان کرتی ہے۔ کہ میرا خالق وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس لئے دنیا کو عالم کہتے ہیں۔ اور عالم کا اطلاق خدا کی ذات وصفات کے سوا ہر موجود و مخلوق پر ہوتا ہے۔ اور خدا کی بیشمار مخلوق کے اعتبار سے عالَم کی کئی قسمیں ہیں۔ عالَمِ مجردات۔ یعنی وہ چیزیں جو جسم عنصری، اور جسم سماوی سے بری ہیں۔ اور ہمیں بسبب لطافت کے نظر نہیں آتیں۔ جیسے کہ روح اور فرشتے۔ اور عالم جسمانیات یعنی ایسی چیزیں جو جسم رکھتی ہیں۔ پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ عالم علویات۔ یعنی وہ جن کا تعلق بلندی سے ہے۔ مثلاً آسمان۔ آفتاب۔ چاند۔ ستارے وغیرہ، اور عالم سفلیات یعنی وہ چیزیں جن کا تعلق پستی سے ہے۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں۔ عالم لطیفات یعنی وہ چیزیں کہ جو بسبب لطافت دکھائی نہیں دیتیں جیسے ہوا وغیرہ۔ عالم کثیفات۔ پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ عالم مفردات۔ جیسا کہ پانی اور خاک۔ عالم مرکبات۔ پھر اس کی چار قسمیں ہیں۔ عالم کائنات جو۔ یعنی وہ چیزیں جو زمین سے اوپر ادھر ہیں۔ جیسا کہ ابر۔ اولے۔ قوس و قزح وغیرہ۔ دوم عالم جمادات یعنی پہاڑ اور دیگر معدنیات

خدا کی صفات کا اور ایک متشابہات کا۔ صفات کے متعلق قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ خدا کو اچھی صفات اور اچھے ناموں کے ساتھ پکارا جائے۔ اور خدا کو ہفت افلاک سے اوپر عرش عظیم پر متمکن ماننا اسی حکم ہی کی تعمیل ہے۔ اور یہ ایسے اچھی صفات کے ساتھ یاد کرنا ہے کہ اس کے منافی اس کی وجہ یہ ہے کہ نیچے کی سمت پر جب ہم غور کرتے ہیں۔ تو اسے قابل نہیں پاتے کہ اسے خدا کا مسکن کہنے کو تیار ہوں۔ اس لئے اوپر کی سمت ہی اس قابل رہتی ہے کہ اسے خدا کی طرف کا نام دیا جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بڑے انسان کے کاشانہ کو زمین پر ہونے کے باوجود درگاہ معلیٰ کا لقب دیا جاتا ہے۔ نہ اس لئے کہ اس کا گھر کہیں زمین سے اوپر ہوا میں ہوتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ نیچے کی سمت کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ اس میں کسی باعزت ہستی کو سمویا اور رلایا جائے۔ پر اس دقت ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا آدمی اور بادشاہ بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ دونوں پاؤں زمین سے اٹھا سکے۔ بخلاف اس کے خدا کا اوپر کو ہونا یا عرش پہ رہنا اور اس کے باوجود ہر مقام پر رہنا خدا کے لئے کچھ بھی مشکل کام نہیں۔ یہ نہ ادب کے خلاف ہے۔ اور نہ عقل کے۔ بلکہ عقل کا اور اس کے ساتھ قرآن کا فیصلہ تو یہ ہے۔ کہ خدا کو سب کچھ کرنے پر قادر مانا جائے۔

امام ابوحنیفہ سے ایک متکلم مناظر نے کہا تھا کہ میں ایسے خدا کو ماننے کے لیے تیار نہیں جو ایک آسمان سے اتر کر دوسرے پر آتا ہو۔ یعنی یہ اتار چڑھاؤ کا قصہ تو مخلوق کی صفات میں سے ہے۔ امام صاحب نے جواب میں فرمایا کہ میں تو ایسے خدا کو مانتا ہوں۔ جو سب کچھ کر لینے پر قادر ہے۔

اس مناظرہ میں متکلم کا روئے سخن ایک مشہور حدیث کی طرف تھا جس میں وارد ہے کہ خدا تعالیٰ ہر نصف شب کو نچلے آسمان پر نزول فرماتا ہے۔ اور

چاندی۔ سونا۔ ہیرا۔ بلور وغیرہ۔ سوم عالم نباتات یعنی درخت اور گھاس وجڑی بوٹیاں وغیرہ۔ چہارم عالم حیوانات۔ یعنی انسان۔ گدھا۔ گھوڑا۔ درند۔ چرند۔ جاندار چیزیں۔ دریا کی ہوں یا خشکی کی۔ اس عالم حیوانات میں سب سے افضل و اشرف انسان ہے ـــ الغرض اللہ کی مخلوق کے بہت سے عالم ہیں۔ جن کا حقیقی علم مَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ کے مطابق اللہ ہی کو ہے۔ تو لفظ "عالمین" جمع ہے عالم کی۔ جس کا معنےٰ ہے سارے عالم۔ تو الحمد للہ رب العالمین کا معنے یہ ہوا کہ سب تعریف ہے اس اللہ کے لئے جو سارے عالموں کا پالنے والا ہے۔ کوئی بھی تو اسکی مربوبیت سے محروم نہیں۔ بلکہ ہر ذرہ ہر قطرہ اور ہر پتہ اس کی ربوبیت سے مستفید ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایک شاعر نے کیا اچھا لکھا ہے وہ کہتا ہے ؎

چکی کی آواز

آسیہ کہتی ہے ہر روز باٰواز بلند !!
رزق سے بھرتا ہے رزاق دہن پتھر کا

آسیہ چکی کو کہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے۔ جب چکی چلتی ہے۔ تو اس کی آواز ایک حقیقت کا اعلان کرتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اے سننے والو! خدا کی شانِ ربوبیت و رزاقی کا نظارہ دیکھو۔ کہ میں ایک پتھر ہوں۔ مگر اس کی رزاقی و ربوبیت کا یہ عالم ہے۔ کہ ہر روز وہ مجھ جیسے پتھر کا منہ بھی گندم سے بھرتا ہے۔ سبحان اللہ! کیا اچھی بات کہی۔ واقعی وہ رب العالمین ہے۔ اور عالم کا ذرہ ذرہ اس کا مربوب ہے۔

میرے بزرگو! جب آپ کو اس لفظ "علمین" کی وسعت کا پتہ چل گیا۔ کہ یہ لفظ اس قدر وسیع اور عام ہے۔ کہ مخلوق کا ہر ذرہ اس کے اندر موجود ہے تو اب اس آیت کو جو میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت بیان کرنے کیلئے پڑھی ہے سامنے رکھئے۔ اور دیکھئے کہ خدا تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ط۔ یعنی اے محبوب! ہم نے آپ کو سارے عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اعلان فرماتا ہے کہ کون ہے جو مجھ سے دُعا مانگے۔ اور میں قبول کر دوں۔ اور جو
مانگے وہ دُوں۔ متکلم نے اس وجہ سے اس حدیث کو نشانہ بنایا کہ خدا کو اگر سیڑھیوں
کے ذریعہ یا پرندوں کی طرح پروں کے ذریعہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کو جانے
آنے والا مانا جائے۔ تو یہ چیز صفات مخلوق کے مشابہ ہے۔ جس سے خدا کو پاک
ہونا چاہیئے۔ مگر وہ یہ بھول گیا کہ مخلوق کی خصوصی اور ناقص صفات سے خدا کا
پاک ہونا ضروری ہے نہ کہ اچھی صفات سے۔ چنانچہ دیکھنا اور سُننا خدا کی صفت
بھی ہے۔ اور مخلوق کی بھی اور دونوں میں بے انتہا فرق ہے۔ امام صاحب نے قرآن
سے اس کے غلط استدلال کو باطل کر کے حدیث کی تصدیق فرمائی جو عقل کے
بھی موافق ہے۔ آخر خدا کے صفات مخلوق سے پاک ہونے کا تقاضا یہ کب ہے
کہ اس کی کوئی اچھی صفت بھی نہ ہو۔ اور اوپر نیچے آنے جانے کا اس کے پاس
سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہ ہو جس کا رواج مخلوق کے ہاں موجود ہے۔ اور نہ وہ
بھی سیڑھیوں اور پروں کا محتاج ہو۔ اس سے ان لوگوں کا خیال بھی باطل
ٹھیرتا ہے جو امام ابوحنیفہ کو معتزلہ کہتے ہیں۔ اور پرویز صاحب کا بھی جو امام
موصوف کو اپنا ہم رکاب کہتے ہیں۔ ورنہ اس مقام پر امام ابوحنیفہ کے لیے
ایسی حدیث کا انکار کر دینا آسان تھا۔ پھر اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان
جب اپنے مفروضات کی پیروی میں چل نکلتا ہے۔ تو نہ حدیث کی پرواہ کرتا ہے
اور نہ قرآن کی۔ چنانچہ معتزلہ اور نافیہ نے جب صفات خداوندی کا انکار کیا
تو قرآنی آیات کی عجیب تاویلیں کیں۔ اور ان کی مختلف تاویلیں شاہد ہیں کہ وہ خود بھی ان پر مطمئن نہ تھے
۔ اس دعوی پر غور کیجیے کہ ہمارے ناقص[1] تصور میں خدا کہیں الگ تھلگ عرش

---

[1] نقل کفر۔ کفر نباشد۔

گویا : اے پیارے! میں اگر سارے عالموں کا رب ہوں۔ تو تو سارے عالموں کے لئے رحمت ہے ؂

حق تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے تو!
سارے عالم کیلئے رحمت ہے تو

حضرات! "الحمد لِلّٰہِ ربِّ الْعٰلمین" اور "وما ارسلنٰکَ اِلّا رحمۃً لِّلعٰلمین"۔ ان دونوں آیتوں کے پیشِ نظر ثابت ہوا۔ کہ جس قطرے۔ جس ذرے۔ اور جس پتے کے لئے اللہ رب ہے۔ اس قطرے۔ اس ذرے اور اس پتے کے لئے حضور رحمت ہیں۔ گویا جس شے کو خدا کی ربوبیت درکار ہے۔ اسے مصطفےٰ کی رحمت کی بھی احتیاج ہے۔ اور جو شخص یوں کہے۔ کہ میں رحمتِ مصطفےٰ کا محتاج نہیں ہوں۔ اس کو چاہیئے۔ کہ وہ یوں بھی کہہ دے۔ کہ میں ربوبیتِ خدا کا بھی محتاج نہیں۔

تمہیدی کلمات

حضرات! حضور صلے اللہ علیہ و سلم کی رحمت عامہ کے متعلق کچھ بیان کرنے سے قبل چند تمہیدی کلمات سن لیجئے۔ ماں باپ بچے کی پرورش کرنے والے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کو بچے کا رب فرمایا ہے۔ کَمَا رَبَّیَانِیْ صَغِیْرًا۔ یہ آیت اس امر پر شاھد ہے۔ رب کہتے ہیں۔ پالنے والے کو۔ تو چونکہ ماں باپ بچے کو پالتے ہیں۔ اس لئے انہیں رب فرمایا گیا ہے۔ اب آپ سوچئے کہ ماں جو بچے کو پالتی ہے۔ تو کس قدر محنت و شفقت کے ساتھ۔ اور اپنی تکلیف کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے بچے کی پرورش کا خیال رکھتی ہے۔ اپنا چین۔ سکھ آرام۔ نیند۔ بھوک۔ پیاس سب کچھ بچے پر قربان کر دیتی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ ماں میں یہ جذبہ کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ بات یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کے دل میں بچے کے لئے رحمت پیدا فرما دی ہے۔ یہ اُس رحمتِ مادر کا کرشمہ ہے۔ کہ ماں ہر تکلیف کو برداشت کرتی ہے۔ مگر بچے کی پرورش میں کوتاہی نہیں کرتی۔ گویا ماں کی "ربوبیت" کا اظہار اسی" رحمت" سے ہوتا ہے۔ اگر ماں کے دل میں اس بچے کے لئے رحمت نہ ہوتی۔ تو ماں

پر لیٹا ہوا تھا۔ اور کائنات میں انسان کا مارا مارا پھرنا بھی ہمیں الگ دکھائی دیا۔ رسول کو جو حق کے بے نقاب دیکھنے کا شرف ارزانی ہوا تو اس نے خدا اور کائنات اور کائنات و انسان کے حق ہونے کا ربط معلوم کرتے ہوئے اُس حقیقت کا سراغ لگایا کہ ہو بہو یہ سب عناصر برے بھلے کی تمیز کے بغیر شاید ایک ہی حقیقت کے مختلف نام اور ایک ہی چیز کے مختلف اجزا ہیں۔ اور ان میں بیگانگی اور من و تو کی تفریق کہیں بھی موجود نہیں۔ اس طرح اسے خدا یکسر سب کچھ حق دکھائی دینے لگ گیا۔ اگر کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کا عرش پر متمکن ہونا تو قرآن سے ثابت ہے تو آپ کہیں گے کہ قرآن میں جہاں یہ ہے وہاں اس سے مراد ہے حاکم وقت اور اس کا تخت یا اس کی کرسی۔ بالکل اسی طرح جیسے اطاعت خدا و رسول سے مراد ہے اطاعت حکومت۔ لے دے کے ہیں مجرد دعویٰ اور دعویٰ بلا دلیل

۸۔ یہاں تشبیہات و استعارہ کا اتنا بڑا میدان آپ کو کیسے ہاتھ لگ گیا۔ کائنات کو ایک جسم فرض کر کے اس کی رگوں میں چلنے والے خون کی گرمی کے مشابہ ذات رب العالمین کو ٹھیرایا جا رہا ہے۔ جو ایک طرف خدا کے تصور کی انتہائی بلندی ہے تو دوسری طرف اس کے مطلق انکار کے لئے بھی ایک زینہ ہے۔ اور ایک انسان کہہ سکتا ہے کہ جو خدا فرضی جسم کی فرضی رگوں کے فرضی خون کی فرضی گرمی کے مشابہ فرض کیا گیا ہے۔ اس کے آگے اس کی رضا کے لئے مراسم بندگی بجا لانے میں کیا دھرا ہے۔ اور اس کا یہ مقام کب ہو سکتا ہے۔ کہ وہ زندگی کا دستور عمل بنائے۔ اور اپنے مرتب کردہ دستور کا اپنے بندوں کو پابند رہنے پر مجبور کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اوّل روز سے علمائے اسلام نے ذات باری کے موضوع میں تشبیہ و استعارہ کو ہمیشہ ناپسند کیا ہے۔ کیونکہ

کبھی بچے کی پرورش نہ کرتی۔ ماں چونکہ اپنے دل میں اپنے بچے کے لئے بے پناہ پیار و رحمت پاتی ہے۔ اس لئے اس کی پرورش کرتی ہے۔ ماں کا دل بچے کے لئے مخزنِ رحمت ہے۔ اور ماں کا دل بچے کی تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا۔

ماں کا دل

چنانچہ "رحمتِ قلب مادر" کی تشریح کے لئے ایک قصہ ہے۔ کہ ایک "اپ ٹوڈیٹ" لڑکی کا ایک "اپ ٹوڈیٹ" لڑکے کے ساتھ بیاہ ہو گیا۔ لڑکے کی صرف ایک بوڑھی ماں موجود تھی۔ اور کوئی اس کا عزیز و رشتہ دار نہ تھا۔ اور آجکل رشتے میں دیکھا بھی اسی بات کو جاتا ہے۔ کہ لڑکی وہاں دی جائے۔ جہاں لڑکے کا کوئی رشتہ دار موجود نہ ہو۔ نہ اس کی ماں ہو۔ نہ کوئی بہن، نہ بھائی۔ نہ کوئی اور عزیز۔ گویا لڑکا سب کو کھا پی چکا ہو۔ اور اکیلا گھر ہو۔ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے۔ کہ جب تم رشتہ کرنے لگو۔ تو کوئی حسن و جمال دیکھتا ہے۔ اور کوئی جاہ و جلال۔ مگر فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّیْنِ۔ تم سب سے پہلے دین کو دیکھو کہ لڑکی اور لڑکے میں دین بھی ہے یا نہیں؟ یہ تو ہے ارشاد ہمارے آقا و مولےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کا۔ مگر رواج یہ کہتا ہے۔ کہ پہلے یہ دیکھو کہ لڑکا جنٹلمین ہے یا نہیں؟ داڑھی مونچھ کا دشمن ہے یا نہیں؟ کھڑے ہو کر موتتا ہے یا نہیں۔ لڑکی سرخی و پوڈر کی دلدادہ ہے یا نہیں؟ ٹیڑھی مانگ کی شوقین ہے یا نہیں؟ ڈانس اور گانے میں طاق ہے یا نہیں۔ بزرگو! اب وہ زمانہ کہاں؟ جبکہ لڑکی کا باحیا ہونا اور قرآن خوان و نمازی ہونا دیکھا جاتا تھا۔ اب تو امیر گھرانوں میں لڑکیوں کو باقاعدہ ناچنے اور گانے کی تعلیم دی جاتی ہے اور جو لڑکی ناچنے گانے میں ماہر ہو۔ اسے معیاری قرار دیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ ان گمراہیوں سے محفوظ رکھے۔ ذرا سوچئے تو۔ جو لڑکی ناچنی آئیگی وہ سسرال والوں کو آکر کیوں نہ نچائے گی۔ آہ! اس زمانہ نے ترقی کے نام سے کیا کیا گمراہیاں پیدا کر دیں۔ خوب یاد رکھئے۔ ؎

جس چیز میں استعارہ اور تشبیہ راہ پائے۔ اس کی حقیقت متزلزل ہو کر رہتی ہے۔ مثلاً اگر زید کو شیر یا شیر کا پنجہ کہا جانے لگے تو اس کا ہر حال میں انسان سمجھا جانا ضروری نہیں رہ جاتا۔ اور اس کے ساتھ ہی اگر زید کے شیر ہونے کو بے حقیقت کہہ دیا جائے تو بھی جائز ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ذات باری جو زید اور شیر کی طرح محسوسات کے دائرہ میں نہیں بلکہ اس دائرہ سے کہیں وراء الورا ہے۔ اس کے لئے تشبیہ کو عام کر دینا کتنا خطرناک اور نتائج کے لحاظ سے کسقدر مضر ہے۔ اگر ایک آدمی ذات باری کے متعلق ایک تشبیہ دے اور دوسرا اس کے صحیح ہونے سے انکار کر دے تو وہ خدا کا انکار ہو گا۔ نہ کہ اسکی تشبیہ کا۔

اس کے بعد ذرا رسُول کی وسعت نظر کا نقاب اُلٹیے۔ رسُول جو حق کو اپنی آنکھوں سے بے نقاب دیکھ لیتا ہے تو ضروری ہے کہ اسکا بے نقاب حق کا مشاہدہ ہمارے روزمرہ مشاہدہ کے خلاف اور اس کے منافی نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ جو کچھ ہم اپنی آنکھوں سے آئے دن دیکھ رہے ہیں اُسے وہ بے حقیقت کہتے ہوئے اس کا انکار کرنے لگ جائے۔ خوردبینی آلات کے ذریعہ دیکھنے والا انسان عام آدمی کے مشاہدہ کا انکار کبھی نہیں کرتا۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ ایک عام آدمی جن پہاڑوں دریاؤں اور درختوں کو دیکھ رہا ہو۔ خوردبین سے دیکھنے والا ان سے کئی زیادہ چیزوں کا وجود ثابت کر دے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خوردبین سے معائنہ کرنے کے بعد پہاڑوں اور دریاؤں اور درختوں کا انکار کر دے۔

ادھر ہمارا تصوّر اور مشاہدہ یہ ہے کہ ہم ہر چیز کو دوسری چیزوں سے جدا سمجھتے ہیں۔ اور جب سمجھتے ہیں تو ضروری اور بہت زیادہ ضروری ہے۔ کہ

چار چیزیں چاہئیں از بہر زن!
چکی، چولھا اور چادر، پیرہن

مگر اب یہ باتیں کہاں؟ اب تو "ناچنا۔ گانا و عریانیٔ تن" کا تماشا نظر آتا ہے۔ ہاں تو ایک ایسے ہی اَپ ٹو ڈیٹ لڑکے سے ایک اَپ ٹو ڈیٹ لڑکی کا بیاہ ہو گیا۔ لڑکے کی صرف ایک ماں ہی تھی۔ اور کوئی عزیز نہ تھا۔ تازہ شادی تھی۔ اور دونو میاں بیوی فیشن ایبل تھے۔ اور دین سے بے بہرہ۔ لڑکی نے جو سسرال میں قدم رکھا۔ تو بوڑھی ساس کو گھر میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر پریشان ہوئی۔ کہ میں نے تو سنا تھا۔ کہ گھر اکیلا ہے۔ میاں تنہا ہیں۔ مگر یہ بڑھیا کہاں سے آ ٹپکی؟ چنانچہ شب کو پہلی ملاقات میں اپنے شوہر سے کہنے لگی: "دیکھئے اگر واقعی آپ کو مجھ سے محبت ہے۔ جیسے کہ آپ ظاہر کر رہے ہیں تو سنئے۔ میں نے آپ کی خاطر اپنی ایک ماں۔ ایک باپ۔ تین چچا۔ تین پھوپھا۔ دو خالو۔ پانچ بھائی اور چار بہنیں چھوڑیں۔ ان سب عزیزوں کو صرف آپ کی خاطر چھوڑا۔ اور آپ کے پاس آ گئی۔ اب آپ کو بھی اگر مجھ سے پیار ہے۔ تو میری خاطر آپ صرف ایک عدد اپنی اس بڑھیا ماں کو چھوڑ دیجئے۔ اور اسے گھر سے نکال دیجئے۔ میاں نے یہ سنا تو اس کی محبت میں اندھا ہو کر کہنے لگا۔ واہ! یہ بھی کوئی بڑی بات ہے صبح ہی لو۔ میں بڑھیا کو گھر سے نکال دونگا۔ چنانچہ صبح اس نے واقعی اپنی بوڑھی ماں سے کہا کہ اماں اس دوسرے محلہ میں ہمارا جو مکان ہے۔ آج سے تم وہاں رہا کرو۔ تمہیں وہیں روٹی بھجوا دیا کروں گا۔ بوڑھی ماں سمجھ گئی۔ کہ میرا بیٹا اپنی بی بی کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ بولی اچھا بیٹا! جہاں کہو رہنے کو تیار ہوں۔ اور بہر حال تمہارے لئے میری تو یہی دعا رہے گی۔ کہ خدا تجھے کوئی تکلیف نہ دکھائے۔

اسی دن ماں کو دوسرے مکان میں بھیج دیا گیا۔ آٹھ دن گزرے۔ تو ایک شب پھر وہ خونخوار عورت اپنے شوہر سے کہنے لگی۔ میں نے سنا ہے۔ آپ اپنی بڑھیا ماں سے ملنے جاتے اور اسے بہت کچھ کھلاتے پلاتے

اسے خدا سے بھی جدا سمجھیں۔ کیونکہ جب لوہا سونے سے جدا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے سونے کے برابر منوانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ لوہے کو سونے سے بھی بلند مقام دے کر اسے خدا سمجھا جائے۔ پھر جب دنیا کے لوگوں کا عام تصوّر ہے تو اسے ناقص کیسے اور کس قاعدہ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ اور کس ذریعہ سے اس کے ناقص ہونے کو قابل قبول بنایا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف انسانوں کے باپ کو حیوان اور بندر فرض کر لینے کی بنیاد بھی آپ کے ہاں یہی خیال ہے کہ اس مفروضہ کو دنیا میں حقیقت سمجھ لیا گیا ہے۔ اور جب سمجھ لیا گیا ہے[1] تو یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہو۔ اس بارہ میں آپ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ پہلے زمانہ میں جب اس بات کو حقیقت سمجھا جاتا تھا کہ انسان کا باپ بندر نہیں بلکہ انسان ہی ہے تو وہ بھی حقیقت تھی اور اب اس کا بندر ہونا بھی حقیقت ثابتہ بن گیا۔ تو ان دونوں میں سے کس حقیقت کو حقیقت ہونے کے باوجود قرآن کے خلاف[2] نہیں کہیں گے۔ اس تردد میں پڑے بغیر آپ نے تسلیم کر لیا۔ کہ جو کچھ دنیا کی رائے عامہ نے سمجھ لیا ہے۔ اس کے مطابق واقعی انسان کا مورث اعلیٰ حیوان تھا۔ لیکن کائنات اور انسان کو تو پہلی اور موجودہ دنیا میں کبھی کسی وقت بھی خدا کے برابر

---

[1] کوئی نظریہ جب حقیقت کی صورت اختیار کرے۔ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہو۔ "ابلیس و آدم" صفحہ ۱۸

[2] پرویز صاحب کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں آپ موجودہ زمانہ کی مانی ہوئی حقیقت کو حقیقت کا نام دیکر اسی کو قرآن کے مطابق کہیں گے۔ اور پہلے زمانہ کی حقیقت کو تاریخی بات کہکر رد کر دیں گے۔ کیونکہ تاریخ حجت نہیں ہے۔

ہیں۔ دیکھئے اگر واقعی آپ میرے عشق میں سچے ہیں۔ تو اندھیری رات ہے کسی کو کیا علم۔ یہ لیجئے خنجر! اور میری خاطر اپنی ماں کو قتل کر آیئے۔ میاں اس قدر بے دین نکلا۔ کہ بولا۔ جان من! تیری خاطر مجھے یہ بھی منظور ہے۔ دیکھو سونا مت۔ میں ابھی ماں کو قتل کرکے آیا۔ بیوی نے کہا۔ مگر میرے اطمینان کے لیئے کہ واقعی آپ ماں کو قتل کر آئے ہیں۔ قتل کرنے کے بعد اس کا دل میرے پاس لے آنا۔ میاں نے کہا۔ بہت اچھا۔ یہ کہا اور خنجر لے کر ماں کے مکان میں گیا۔ بڑھیا بیچاری بے خبر سو رہی تھی۔ نالائق بیٹے نے اپنی ماں کو سوتے میں خنجر گھونپ دیا۔ بڑھیا سوتی کی سوتی رہ گئی۔ اس بے دین نے پھر ماں کا دل نکالا۔ تاکہ اسے اپنی بیوی کے پاس دکھانے کو لے جائے۔ اور اُسے خوش کر سکے۔ رات اندھیری تھی۔ راستے میں ایک جگہ ٹھوکر لگی۔ تو وہ نالائق بیٹا منہ کے بل گر پڑا۔ ماں کے دل سے آواز آئی۔

"بیٹا چوٹ زیادہ تو نہیں آئی؟"

اس آواز کو سن کر اب اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور اسکی آنکھیں کھلیں۔ کہ میں نے یہ کیا ظلم کیا کہ اس قدر رحمدل اور مہربان ماں کو قتل کر دیا۔ جس کے دل سے قتل ہو جانے کے بعد بھی میری محبت نہیں نکلی۔ میرے بھائیو! دیکھا آپ نے ماں کی محبت کو — !

ماں سے بھی زیادہ شفیق اور یاد رکھیئے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے ساتھ ماں سے بھی زیادہ شفقت و محبت ہے۔ چنانچہ قبر میں جب ماں باپ بھی تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔ وہاں حضور صلے اللہ علیہ و سلم تشریف لاتے ہیں۔ اور اپنے غلاموں کو اپنی آغوشِ رحمت میں لے لیتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں۔ ؎

ماں جب اکلوتے کو چھوڑے ٭ آ آ کہہ کے بلاتے یہ ہیں!!
باپ جہاں بیٹے سے بھاگے ٭ لطف وہاں فرماتے یہ ہیں
مرقد میں بندوں کو تھپک کر ٭ میٹھی نیند سلاتے یہ ہیں

.... یا اس کا جزو نہیں مانا گیا۔ بلکہ خدا کو آج کی طرح ہمیشہ ہر چیز سے بالاتر سمجھا گیا ہے۔ پھر اسے خدا کا ناقص تصور آپ کیوں کہتے ہیں۔ کیا یہ تصور رکھنے والے انسان کو بندر کی اولاد ماننے والوں سے تھوڑے ہیں۔ اگر تھوڑے ہیں اور لکھو کھہا حصہ ان سے زیادہ ہیں تو پھر یہ فرض کر لینا کہاں صحیح ہو سکتا ہے کہ خدا اور کائنات کے متعلق انسان کا تصور ہمیشہ سے ناقص رہا ہے۔ اور پھر یہ خصوصیت "تنہا خدا" کے حصہ میں کیوں آئی۔ سورج چاند اور زمین وغیرہ کے متعلق دنیا کے خیالات کو تو آپ نے ناقص تصور کا نام دیا اور ذات باری کے متعلق لوگوں کا تصور آپ کو قابل اصلاح نظر آ گیا۔ لوگوں کے مجموعی تصورات نے اور کیوں کہیں بھی غلطی نہیں کی۔

۹۔ اگر خداوند عالم کائنات کے عناصر میں جاری و ساری ہو تو اس سے لازم آتا ہے کہ یہ سب عناصر اس کی ذات کا جزو ہوں۔ اور یہ حد درجہ غلط اور باطل ہے۔ ورنہ قرآن میں حرام اور گندی چیزوں سے پرہیز کا حکم کبھی نہ دیا جاتا۔

٭ چنانچہ بعد کے زمانہ میں جب کچھ لوگ انسان کو صنعت سمجھ بیٹھے کہ انسان کا باپ بندر کی بجائے گھوڑا تھا تو اس وقت قرآن کی حقانیت منوانے کے لئے ضروری اور لازم ہوگا۔ کہ موجودہ زمانہ کی اس موجودہ حقیقت کا انکار کیا جائے جسے اس قدر زور سے پیش کیا جا رہا ہے۔ کہ انسان بندر کی اولاد ہے۔ اب جو اسے بندر کی اولاد ثابت کیا جا رہا ہے۔ تو اسے بعد کے زمانہ میں تاریخی بات کہہ کر رد کرنا ضروری ہوگا۔ اس سے لازم آتا ہے کہ اگر آج ایک مسلم ماہر طبعیات نہ ہر گو انسانی مزاج کے موافق فرض کر لے تو اسے پہلے زمانہ کی تاریخ کی بجائے اپنے ذاتی تجربہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

لاکھوں بلائیں کروڑوں دشمن
کون بچائے بچاتے یہ ہیں

کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

ایک پنجابی شاعر نے بھی اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ ؎

تینوں کلیاں گھر تھیں کڈن گے اتے وچہ زمین دے گڈن گے وچہ جنگل جا کے چھڈن گے
کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہیں محمد پیارے رسول اللّٰہ

ایتھے ڈاہڈی جان اچ بھائی آ ایتھے کوئی نہ سنگی ساتھی آ ایتھے کسے نہ پانی چھاتی آ
کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہیں محمد پیارے رسول اللّٰہ

پر اوہ کملی والا آوے گا وچہ کملی آن چھپاوے گا ہر دکھ تھیں آن بچاویگا
کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہیں محمد پیارے رسول اللّٰہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت قبر میں بھی ہمارے کام آئے گی اور کل قیامت کے دن بھی جبکہ ماں باپ اپنے بیٹے کو بھول جائینگے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی رحمت ہماری بگڑی کو بنائے گی۔ سب نفسی نفسی کہہ رہے ہونگے۔ مگر حضور اُمتی اُمتی فرماتے ہوں گے۔ خدا کی قسم اگر حضور کی رحمت نہ ہو۔ تو ہم میں سے کوئی بھی عذاب الٰہی سے نہ بچے۔ یہ حضور ہی کی رحمت کا صدقہ ہے۔ کہ ہم مامون و محفوظ ہیں ؎

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا!
پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا!
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تجویز
لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا

رحمت عالم

حضرات! تقریر سابق سے معلوم ہُوا کہ ماں کی "ربوبیت" کے اظہار کے لئے پہلے "رحمت" کا ہونا ضروری ہے۔ اگر رحمت نہ ہو تو ربوبیت بھی نہ ہو۔ بلاتشبیہہ خداوند کریم جو رب العالمین ہے۔ سارے جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے۔ اس نے اپنی "ربوبیت" کے اظہار کے لئے سب سے پہلے "رحمۃ للعالمین" کو پیدا فرمایا۔ اگر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

اور نہ برے لوگوں سے جنگ اور قطع تعلق کا حکم دیا جاتا، دوسری طرف اس سے یہ لازم آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کائنات کا جزو ہو۔ اور یہ پہلے سے بھی زیادہ باطل ہے۔ ورنہ مجموعی کائنات کو اور اس کی کسی چیز کو کبھی فنا اور تغیر و تبدل کا شکار نہ ہونا پڑتا۔ اسی کے ساتھ ہی قرآن کا بالکل سادہ اور دو ٹوک فیصلہ ہے۔ کہ نہ خدا نے کسی کو جنا اور نہ وہ خود کسی سے جنا۔ اور جب ایسا ہے تو وہ ان جنے والی چیزوں میں جاری و ساری کیسے فرض کر لیا گیا ہے۔

۱۰۔ اعماق قلب کے معنی ہیں دل کی گہرائیاں۔ ان گہرائیوں کے اندر اگر خداوند عالم کو محدود فرض کر لیا جائے۔ تو لازم آتا ہے کہ جب ایک مرنے والے انسان کا دل باقی نہیں رہتا۔ تو اس میں خدا بھی موجود نہ رہے۔ اور یہ کہ جن کفار و مشرکین کے دلوں کو قرآن میں زنگ آلود کہا گیا ہے۔ ان میں بھی خدا ہو اور ان کے زنگ میں وہ بھی برابر کا حصہ دار ہو۔ اور یہ بالکل باطل ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خدا کسی کے دل میں بھی برقی تنیاں کی طرح جاری و ساری نہیں۔ اور وہ اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ کہ اسے اس کی کسی مخلوق کے مشابہ کہا جائے۔ چاہے وہ برقی تنیاں ہو یا کچھ اور۔

۱۱۔ جب رسول عبد کامل اور مسلم اول ہوتا ہے تو اسے جملہ غلطیوں اور خطاؤں سے پاک[1] اور معصوم مطلق ہونا چاہیئے۔ اور لازم ہے کہ اسے ایسا ہی مانا جائے۔

---

[1] حضرت مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ عموماً ہر نبی و رسول سے خدا تعالیٰ نے ایک دو غلطیاں اس غرض سے ہونے دی ہیں تاکہ انہیں لوگ خدا نہ مان لیں۔ اور ان غلطیوں کو نظر میں رکھیں۔

پیدا نہ فرمائے جاتے تو خدا کی "ربوبیت" کا کبھی اظہار نہ ہوتا۔ اور اگر خدا کی "ربوبیت" کا اظہار نہ ہوتا۔ تو پھر کچھ بھی نہ ہوتا۔ زمین و آسمان۔ عرش و فرش جملہ کائنات خدا کی مخلوق و مربوب ہے۔ اگر خدا اپنی ربوبیت ظاہر نہ فرماتا۔ تو ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہوتی۔ اور یہ ربوبیت کبھی ظاہر نہ ہوتی۔ اگر پہلے رحمۃ للعالمین نہ ہوتے۔ تو گویا اگر حضور رحمت للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے۔ تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اسی لئے اعلیٰ حضرت نے لکھا ہے کہ ؎

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا، وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو
جان ہیں وہ جہان کی، جان ہے تو جہان ہے

نورِ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم

اور یہ بات کہ ساری مخلوق سے پہلے اللہ نے حضور کو پیدا فرمایا۔ حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے حضور سے سوال کیا۔ حضور سب سے پہلے اللہ نے کس چیز کو بنایا؟ تو حضور نے ارشاد فرمایا:۔

يَا جَابِرُ اِنَّ اللهَ تَعَالٰى خَلَقَ قَبْلَ الْاَشْيَاءِ نُوْرَ نَبِيِّكَ مِنْ نُوْرِهٖ وَلَمْ يَكُنْ فِىْ ذٰلِكَ الْوَقْتِ لَوْحٌ وَلَا قَلَمٌ وَلَا جَنَّةٌ وَلَا نَارٌ وَلَا مَلَكٌ وَلَا سَمَاءٌ وَلَا اَرْضٌ وَلَا شَمْسٌ وَلَا قَمَرٌ وَلَا جِنٌّ وَلَا اِنْسٌ — رحمۃ اللہ علے العالمین ص۲۸

اے جابر! تحقیق اللہ تعالیٰ نے ہر شے سے پہلے تمہارے نبی (حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کے نور کو اپنے نور سے پیدا فرمایا اور اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم، نہ جنت تھی نہ دوزخ۔ نہ کوئی فرشتہ تھا، نہ آسمان اور نہ زمین۔ نہ سورج تھا نہ چاند، اور نہ کوئی جن تھا نہ انسان"

معلوم ہوا کہ ہر شے سے پہلے حضور ہی کو پیدا فرمایا گیا۔ اور اگر اللہ حضور کو پیدا نہ فرماتا تو رحمت نہ ہوتی۔ اور پھر خدا کی ربوبیت کا اظہار بھی نہ

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ ایسا نہیں بلکہ رسول سے اجتہادی[1] غلطیاں ہو کے رہتی تھیں

---

* اگرچہ مولانا کی تحقیق پر میرا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ مگر میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ انبیاء کو خدائی کے حقوق سے محروم کرنے کا خدا نے یہ کونسا اچھا طریقہ تجویز فرمایا کہ ان سے لازماً کچھ غلطیاں کروا ڈالی جائیں۔ پھر جب آپکو اور دوسرے لوگوں کو یہ پتہ چلگیا وہ غلطیاں انہوں نے کی نہیں بلکہ ان سے کروائی گئی ہیں۔ تو یہ مقصد کہاں تک پورا ہوا۔ انہیں خدائی میں شریک کرنے والا انسان تو اب کہہ سکتا ہے۔ کہ وہ جملہ غلطیوں سے پاک تھے۔ اور خدا نے ان سے خواہ مخواہ غلطیاں کروائیں۔ اس طرح نتیجہ میں جو غلطیاں ہوئیں ان میں وہ اور خدا برابر کے شریک رہے ہیں۔ اور میں یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ انسان کو غلطی سے پاک ماننے کا مطلب یہ کب ہے کہ وہ خدا ہی ہو اور جو خدا کا تابع امر ہو وہ مخلوق ہونے سے بھی نکل جائے۔ ادھر خود مولانا ہی نے لکھا ہے کہ متقی انسان وہ ہوتا ہے جو اپنا فرض پورا پورا ادا کر دے اور اس سے بڑھ کر محسن وہ ہوتا ہے جو اپنے فرض سے بڑھ کر خدا کی رضا کے لیے اس کی بندگی کے کاموں میں جان لڑائے۔ اس سے تو لازم آتا ہے کہ ہم ایک متقی انسان کو بھی غلط کار نہ کہیں۔ کجا یہ کہ ایسا الزام محسن کے *

[1] اجتہادی غلطیوں کا اس سے امکان ہوتا ہے مگر چونکہ وہ ان سے باخبر ہونیکے بعد فوراً رجوع الی اللہ کر لیتا ہے۔ اس لیے ان کے مضر اثرات اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتے۔ ص ۷۹۹

ہوتا۔ اور خدا کی ربوبیت اگر نہ ہوتی۔ تو پھر دنیا و مافیہا کچھ بھی نہ ہوتا۔ اسی لئے حدیث شریف میں وارد ہے کہ خدا فرماتا ہے:۔

"لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الدُّنْیَا ۔۔۔ پیارے اگر تم نہ ہوتے۔ تو دنیا بھی میں پیدا نہ کرتا۔" (رواہ ابن عساکر حجۃ اللہ علی العالمین ص۲۹)

تو یہ بات ظاہر و ثابت ہو گئی۔ کہ حضور رحمتِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی طفیل یہ سارا عالم ہے۔ اور آپ ہی کے صدقہ میں ہر وجود کو ہر نعمت میسر ہوتی ہے۔ میں نے ایک نظم میں لکھا ہے ؎

تیرے صدقہ میں ملیں ہم کو یہ جانیں اپنی!
جانِ جاں تم پہ ہوں صدقے یہ ہماری جانیں

اسی حقیقت کا اظہار فارسی کے ان اشعار میں بھی ہے ؎

توئی کہ مطلعِ احسان و مظہرِ جودی ٭ کہ کن فکاں زتو دارند نام موجودی
دریں ضیافتِ ہستی بخوانِ جود و کرم ٭ ہمہ طفیلِ تواند و توئی مقصودی
ہنوز آدم و عالم نبود نام و نشاں ٭ کہ درسراچہ وحدت جلیسِ حق بودی

انبیاءِ کرام علیہم السلام

میرے بزرگو! ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رحمت سے سلسلہ انبیاء بھی جاری ہوا۔ اعلیحضرت فرماتے ہیں ؎

ترا قد مبارک گلبنِ رحمت کی ڈالی ہے
تجھے بو کر بنا اللہ نے رحمت کی ڈالی ہے

اس شعر میں لفظ "ڈالی" کو اعلیحضرت نے خوب نبھایا ہے۔ پہلے لفظ "ڈالی" سے مراد "شاخ" ہے، اور دوسرے لفظ "ڈالی" سے مراد بناءِ رحمت کا ڈالنا ہے آپ فرماتے ہیں۔ کہ حضور کا وجود باجود رحمت کی ایک شاخ ہے۔ اور نبوت کے سلسلۂ رحمت کی بنا اللہ نے حضور کے وجود باجود سے ہی ڈالی ہے۔ حضور ہی اس سلسلے کے اول ہیں۔ اور میرے بزرگو! اس سلسلہ کے آخر بھی حضور ہی ہیں۔ گویا یہ سلسلہ حضور ہی سے شروع ہوا۔ اور حضور ہی پر آکر ختم ہو گیا۔ دیکھ لیجئے۔ دائرہ کھینچنے کے وقت جس نقطہ سے دائرہ کی ابتداء جس جگہ سے ہوتی ہے۔ اس دائرہ کی تکمیل بھی اُسی جگہ پر آکر ہوتی ہے

جن کی برائی سے وہ توبہ کرنے کی وجہ سے بچ جاتا تھا۔ اور اس وجہ سے کہ وہ جان بوجھ کر غلطی نہیں کرتا تھا۔ اس لحاظ سے جب عبد کامل کا یہ حال ہوا تو پھر بندہ ناقص وہ ہوا

٭ جو اس سے بھی بڑھ کر نبی اور رسول کے سر عفو پہننے کی جرأت کر گذریں

اور پھر اگر خدائی کے قابل نہ ہونے کے لئے یہ استدلال کچھ بھی جاندار ہوتا تو خدا تعالیٰ حضرت عیسٰی کے معاملہ میں اسی سے کام لیتا نتیجہ کے طور پر اس مفروضہ میں یہ فساد ہے کہ جو آدمی بھی کسی موقعہ پر سنتِ رسول سے منہ موڑنا چاہے وہ کہہ سکتا ہے۔ یہ کام رسول کی ان غلطیوں سے ہے جو اس نے اس لئے کیں۔ تاکہ کہیں اس کے بہت زیادہ نیک ہوجانے کی وجہ سے لوگ اس کے خدا اور بندہ خدا ہونے کے متعلق دھوکہ میں نہ پڑ جائیں۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر یہاں اصل سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ایسے حال میں پیروی کس بات کی ہوگی۔ گیا اس غلطی کی یا اس خیال کی کہ بعض غلط تصورات کی پیداوار کو رد کرنے کے لئے خدا غلطی سے بھی منع نہیں فرماتا۔ لہذا ہمیں بھی ایسے غلط تصورات کے رد کرنے میں غلط وسائل سے کام لینا جائز ہے۔ اور اس میں باک نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسے حال میں پھر یہ جائز ہوجائیگا کہ ہم جس بات کو چاہیں ایسے غلط تصور کا نام دیدیں۔ اور اس کے رد کرنے کے لئے جس برائی اور گناہ کو چاہیں ایسی غلطی کا نام دے کر اسے اختیار کر ڈالیں۔

٭ امام ابن تیمیہ نے یہ ثابت کرنے پر زور صرف کیا ہے کہ چھوٹی خطائیں

تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود سے یہ دائرہ نبوت شروع کیا گیا۔ اور جب یہ دائرہ اسی وجود باجود تک پہنچا۔ تو وہاں پہنچکر ختم بھی ہو گیا۔ اس لیے کہ اس کی تکمیل ہو گئی۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ آج کے دن تمہارا دین میں نے کامل کر دیا۔

اس حقیقت کے پیش نظر خود ہی غور فرمالیجیے۔ کہ جب دین کامل اور دائرہ نبوت مکمل ہو گیا۔ تو قادیانی متنبی کے لیے اس دائرہ نبوت کے اندر آنے کی جگہ ہی کب باقی رہ گئی ہے۔ جو اُسے بھی نبی تسلیم کر لیا جائے۔ (استغفر اللہ العظیم)

ایک دوسری مثال

حضرات! ماں کی پرورش اور اس کی رحمت کی مثال سے آپ معلوم کر چکے۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ رحمت للعالمین ہیں۔ اس لیے آپ ساری مخلوق سے پہلے پیدا کئے گئے۔ اگر آپ کا وجود باجود نہ ہوتا۔ تو خدا کی ربوبیت کا بھی اظہار نہ ہوتا۔ اس حقیقت کو ایک دوسری مثال سے بھی سمجھیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہان کے لیے اللہ کی رحمت ہیں۔ اور اللہ کی رحمت کا ہر کوئی محتاج ہے کیوں دوستو! ہے کوئی شخص جو یہ کہہ سکے۔ کہ میں اللہ کی رحمت کا محتاج نہیں ہوں۔ توبہ! توبہ!! کوئی بے ایمان ہی ایسا کہے گا۔ ہمارا تو سب کا ایمان ہے کہ ہم سب اللہ کی رحمت کے محتاج ہیں۔ محتاج بھی ہیں۔ اور اس سے امیدوار بھی ہیں اللہ کی رحمت سے کیا کچھ نہیں مل سکتا۔ سب کچھ ملتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ۔ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ۔ اور اسی واسطے درِ رحمت پر ہماری یہی صدا ہے کہ ؎

نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں　　لیے ہوئے یہ دلِ بے قرار ہم بھی ہیں
ہمارے دستِ تمنا کی لاج بھی رکھنا　　ترے فقیروں میں اے شہر یار ہم بھی ہیں
تمہاری ایک نگاہِ کرم میں سب کچھ ہے　　پڑے ہوئے تو سرِ رہگذار ہم بھی ہیں

جب یہ ثابت ہوا کہ حضور سارے جہان کے لیے رحمت ہیں۔ اور رحمت کا ہر کوئی محتاج ہے۔ تو ثابت ہوا۔ کہ ہم سب محتاج ہیں۔ اور حضور محتاجُ الیہ مولانا

چاہیئے۔ بوجان بوجھ کر خوب گناہ کرے۔ اور توبہ کبھی نہ کرے۔ ادھر قرآن میں ایک مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ غلطی اور بھول چوک سے بڑے بڑے گناہ کر گذرتا ہے

بلا رسول سے سرزد ہوتی ہیں۔ مگر وہ ان پر قائم نہیں رہتا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے بھی اپنے مکتوبات میں ایسا ہی ظاہر فرمایا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ آنحضور کی جس بات کو قرآن میں وحی کہا گیا ہے معتمد مذہب میں اس سے مراد قرآن ہے۔ اگرچہ ان حضرات میں سے کسی نے بھی اپنے اس خیال کو پرویز صاحب کی طرح کبھی کسی مخالف حدیث تحریک اور سرگرمی کی بنیاد نہیں بنایا۔ اور نہ وہ اپنے خیال کو کسی طرح بھی ایسا مقام دے سکتے تھے۔ ادھر قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ غلطی خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی اس پر قائم نہ رہنا ایک اچھے مسلمان اور مومن کا کام ہے۔ اور اسی کی خصوصیت ہے نہ کہ نبی کی اور بڑی غلطیوں سے بچ کر چھوٹیوں کا شکار ہو جانا اور اس پر قابل مواخذہ نہ ہونا بھی عام مسلمان کا منصب ہے۔ نہ کہ نبی اور رسول کا۔ رہا قرآن کا رسول کی بات ہونا۔ تو یہ جہاں حقیقت کے خلاف ہے۔ وہاں یہ بھی قابل غور بات ہے کہ قرآن میں صرف رسول کی بات کو تو وحی نہیں کہا گیا بلکہ اسی کے ساتھ قرآن کے بکثرت مقامات پر یہ بھی موجود ہے کہ رسول کا وحی کی پیروی کے بغیر سرے سے اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ اور جب نہیں ہوتا تو آخر وحی کی وہ کونسی قسم ہے۔ جسکی پیروی میں رہتے ہوئے وہ غلطی بھی کر لیتا ہے۔ اور پیروی سی بھی نکلنے نہیں پاتا۔ ابنو

رومی فرماتے ہیں ؂

زیں سبب فرمود حق صلوا علیہ ؛ کہ محمد بود محتاج الیہ

یعنی اللہ نے اسی لئے ہمیں فرمایا ہے۔ کہ حضور پر صلوٰۃ و سلام پڑھو۔ کیونکہ ساری دنیا محتاج ہے۔ اور حضور صلے اللہ علیہ و سلم محتاجوں کی جائے پناہ۔

میرے بزرگو! اب ذرا دنیا کی دوسری چیزوں کی طرف نظر دوڑاؤ۔ انسان کو پانی کی بھی احتیاج ہے۔ آگ کی بھی، اور ہوا کی بھی۔ اور اسی طرح زمین کی بھی احتیاج ہے۔ اور دیکھ لو۔ ہر وہ چیز جس کی انسان کو احتیاج ہے۔ خدا نے انسان سے پہلے ان سب کی تخلیق فرمائی ہے۔ یعنی اس آگ۔ ہوا۔ پانی۔ اور زمین کو انسان سے پہلے پیدا فرما دیا گیا۔ تاکہ انسان دنیا میں آئے۔ تو اس کی ضرورت کی چیزیں پہلے ہی سے اس کے لئے موجود ہوں۔ گویا خداوند کریم نے جو انسان کا ربِّ حقیقی ہے۔ انسان کی ہر محتاجُ الیہ چیز کو انسان سے پہلے پیدا فرما دیا ہے۔ بھائیو! اب اسی قاعدہ کے پیشِ نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم رحمۃٌ لِّلعالمین ہیں۔ آپ کا وجود دنیا کی ہر شے کے لئے رحمت ہے۔ گویا دنیا کی ہر شے زمین ہو یا آسمان۔ پانی ہو یا ہوا۔ کائنات کی کوئی چیز بھی ہو۔ ہر چیز کے لئے حضور رحمت ہیں۔ اور یہ آپ معلوم کر چکے۔ کہ رحمت کا ہر کوئی محتاج ہے۔ تو گویا دنیا کی ہر شے حضور کی محتاج ہوئی۔ اور آپ ہر شے کے لئے محتاجُ الیہ۔ اور یہ بھی آپ معلوم کر چکے۔ کہ خدا تعالیٰ اپنی مخلوق کی محتاج الیہ چیز کو پہلے پیدا فرما دیتا ہے۔ تو ساری مخلوق کی چونکہ محتاجُ الیہ حضور ہی کی ذات ہے۔ اس لئے ساری مخلوق سے پہلے اللہ نے حضور ہی کو پیدا فرمایا۔

معراج کی شب

یہاں ایک اور بات بھی حل ہو گئی۔ فلسفی کہتے ہیں کہ شبِ معراج حضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنا مرکز زمین چھوڑ کر اوپر کیسے تشریف لے گئے۔ کرۂ ہوا سے گزر کر بغیر ہوا کے آپ زندہ کیسے رہے (معاذ اللہ) اس قسم کے عقلی ڈھکوسلے آپ ان عقلمند سیلہ و توفوں سے اکثر سنتے رہتے ہیں۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں۔ اس زمین اور پانی

یہاں تک کہ قتل بھی کر دیتا ہے۔ اور پھر وہ اپنے گناہ اور اپنی غلطی پر اصرار کرتا ہے اور نہ اس پر توبہ و استغفار کرنے میں سستی دکھاتا ہے۔ ایسے حال میں پھر عبد کامل اور بندہ ناقص کے درمیان نام کے بغیر کچھ بھی فرق نہیں رہتا۔ اس کے بعد غلطی کے مضر اثرات پر غور کیجئے! فرض کیجئے کہ رسول ایک غلطی کرتا ہے۔ جو بھول کر اس سے ہو جاتی ہے۔ تو وہ گناہ کسی طرح بھی نہیں ہو گا۔ پھر جب اس پر وہ اپنے اللہ سے معافی مانگتا ہے۔ تو یہ اس پہلو سے قابل تعریف ہے کہ وہ اپنی بات پر اڑ جانے کی بجائے اسے توبہ کے قابل سمجھنے لگا۔ خدا کی نگاہ میں تو اس کا کام پہلے بھی گناہ نہ تھا۔ اب اس کے اسے توبہ کر لینے پر لوگوں کے نزدیک بھی اس کا کام خوبی اور بھلائی کا کام ہو گا۔ اس کے بعد پرویز صاحب کے بقول اس کے کام کا اثر اور نتیجہ بھی مضر نہیں رہتا۔ تو پھر کس بزرجمہر کی منطق کا تقاضا ہے کہ آپ ایسے کام کو ضرور ہی غلطی کا نام دیں۔ اور بجائے غلطی کے اسے معجزہ نہ کہیں۔ ہم اگر بھول کر کسی گودام میں آگ کی چنگاری ڈال دیں تو اس کے بعد خواہ لاکھوں مرتبہ توبہ و استغفار کریں۔ وہ غلطی سے ڈالی گئی آگ اس توبہ و استغفار کو جیسے

٭ اور اس کے نتیجہ اس پر قائم بھی نہیں رہتا۔ اور بعد میں کسی اور قسم کی وحی کے ذریعہ معلوم کرتا ہے کہ پہلی وحی میں اسے کچھ تھوڑی سی غلط رہنمائی کیگئی تھی جس پر چلا کر اسے غلطی کی ہے۔ اور اگر نہ چلتا تو اتباع وحی کو چھوڑ کے اسی غلطی میں پڑتا۔ اور دونوں طرح غلطی کا ملزم وہی ہے ہمیں حیران ہوں کہ رسول کا منصب اتباع وحی ماننے کے بعد پھر ایسی چھوٹی غلطیوں کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

و ہوا کے ہم تو بیشک محتاج ہیں۔ اور ہم بغیر زمین کے بغیر آب و ہوا کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ یہ زمین۔ آب و ہوا ہمارے لئے تو ضروری ہیں۔ اس لئے کہ ہم ان کے محتاج ہیں۔ مگر یہ ہماری محتاجٌ الیہ زمین یا پانی یا ہوا خود حضور کی محتاج ہے۔ اور وہ سب کے لئے محتاج الیہ ہیں۔ تو محتاج تو بیشک محتاجٌ الیہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر محتاجٌ الیہ اگر بغیر محتاج کے رہے تو اُسے کیا پرواہ؟ دیکھئے اگر ہوا نہ ہو تو ہماری موت یقینی۔ اور اگر ہم نہ ہوں۔ تو ہوا کا کیا نقصان؟ اگر پانی نہ ہو تو ہم مرے سمجھو۔ اور اگر ہم نہ ہوں۔ تو پانی کا کیا بگڑتا ہے۔ زمین نہ ہو۔ تو ہمارے لئے مشکل اور اگر ہم نہ ہوں۔ تو زمین کا کیا نقصان؟

اسی طرح اگر حضور نہ ہوتے تو یہ زمین و آب و ہوا اور کائنات کی ہر چیز پردۂ عدم میں ہوتی۔ اور اگر یہ زمین و آب و ہوا وغیرہ نہ ہو۔ تو اس ذاتِ گرامی کا کیا نقصان؟ آخر جب یہ سب کچھ پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ حضور اس وقت بھی تو تھے۔ تو وہی محبوب اگر شبِ معراج ان چیزوں کے سوا وہاں تشریف لے گیا۔ جہاں ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہ تھا۔ تو کونسی ناممکن بات ہے۔ مگر ان فلسفیوں کو تو برائے نام فلسفہ لے ڈوبا ہے۔ ؎

فلسفی کو رفعتِ سرکار سے انکار ہے!
ایسے بدبختوں کی بے عقلی پہ رب کی مار ہے

مسلمانوں کیلئے رحمت حضرات! ہمارے آقا و مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے سارے جہان کے لئے رحمت فرمایا ہے اور ظاہر ہے۔ کہ نیک و بد مومن و کافر سبھی اس جہان میں ہیں۔ تو گویا حضور سبھی کے لئے رحمت ہوئے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ ہم حضور کے غلاموں یعنے مسلمانوں پر تو حضور کی رحمت ہی رحمت ہے۔ حضور نے اپنی امت کو ہر وقت یاد رکھا۔ حتیٰ کہ شبِ معراج وہاں پہنچکر بھی جہاں کوئی نہ پہنچ سکا تھا آپ نے ہمیں فراموش نہیں فرمایا۔ ہمارے لئے حضور نے راتوں کو بیداری فرمائی ہمارے لئے گریہ فرمایا۔ ہمارے لئے دعائیں فرمائیں۔ ہمیں مصائب و آلام

کبھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہیگی۔ اور لاکھوں کا مال ساعت میں جل کر راکھ ہو جائیگا۔ یہی کام اگر رسول کرتا ہے اور ایک پائی کا نقصان بھی نہیں ہوتا۔ تو اس سے بڑی حماقت اور کیا ہوگی کہ اسے غلطی کا نام دیا جائے۔ حقیقت میں اس کی عصمت کا ثبوت ہے۔

اسی طرح اس کے مسلم اوّل ہونے کا معاملہ ہے اگر دوسروں کی طرح وہ بھی غلطیوں میں پڑتا ہو تو اس کے تھوڑا غلط کار ہونے کا مطلب یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلم اوّل ہے۔ بلکہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ذرا زیادہ مسلم ہو۔ اور تھوڑا مجرم سمجھا جائے۔

۱۲۔ خدا تعالیٰ کا رگ گردن سے زیادہ ہر انسان کے قریب ہونا تو قرآن سے ثابت ہے مگر اس کا رگوں کے خون میں گرمی خون ہو کر رواں دواں اور تپش انگیز ہونا تو قرآن میں کہیں بھی موجود نہیں اور قرآن کے آداب میں سے یہ بھی ہے۔ کہ اس کے الفاظ کے سادہ مفہوم کو باقی رکھا جائے۔ اور اس میں اپنی طرف سے کچھ نہ بڑھایا جائے۔ ورنہ مفہوم کے بے قید ہونے پر اس کی الفاظ کی حفاظت کے کچھ معنی نہیں رہ جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے خدا کے قریب ہونے پر ہم اس طرح بحث نہ کرنے کے قرآن کی طرف سے پابند ہیں۔ کہ جب خدا ایک جگہ ایک انسان یا ایک چیز کے قریب ہوتا ہے تو کیا اس کے وہاں نہ رہنے یا مر جانے سے خدا بھی وہاں نہیں رہتا۔ قرآن کو مانتے ہوئے ہم اس کے پابند ہیں کہ ایسی بحث میں نہ خود پڑیں اور نہ دوسروں کو پڑنے دیں۔ اور صرف یہی مانتے اور منواتے پر ہی اکتفا کریں کہ خدا اپنے عرش عظیم پر رہتے ہوئے بھی ہر انسان کے قریب ہے

سے نجات دی۔ جہنم سے بچایا۔ جنت عطا فرمائی۔ قبر میں تشریف لاکر ڈھارس بندھائی۔ حشر میں شفاعت فرمائی۔ غرضیکہ حضور ہمارے لئے دونوں جہان میں رحمت ہی رحمت ہیں۔ ؎

رافع نافع دافع شافع کیا کیا رحمت لاتے یہ ہیں
ان کے نام کے صدقے جس سے جیتے ہم ہیں جلانے یہ ہیں

حضور سے قبل کسی نبی و رسول کی اپنی امت پر وہ رحمت و شفقت ثابت نہیں۔ جو رحمت و شفقت حضور نے اپنی امت پر فرمائی۔ کیا کوئی ایسا نبی و رسول گزرا۔ جس نے امت کے گنہ گاروں کے لئے رات رات بھر بیداری فرمائی ہے۔ مسلمانو! مبارک ہو۔ کہ یہ خاص رحمت حضور ہی میں نظر آئی۔ حضور نے خود شب بیداری فرماکر غلاموں کو چین کی نیند سلایا۔ ؎

چشم بے خواب کے صدقے کہ ہیں بیدار نصیب
آپ جاگے تو ہمیں چین کی نیند آئی ہے

پہلی امتوں کے لئے مال غنیمت حلال نہ تھا۔ مگر حضور کی رحمت سے ہمارے لئے یہ مال حلال ہے۔ پہلی امتوں کے لئے نماز بجز مسجد کے دوسری جگہ جائز نہ تھی۔ اور ہمارے لئے ساری زمین پر نماز جائز ہے۔ پہلی امتوں پر توبہ کرنا اعیاناً اور علی الاعلان لازم تھا۔ اور ہمارے لئے یہ رحمت کہ ہم خفیتہً اپنے اللہ کے حضور بصدقِ دل ندامت کے دو آنسو بھی بہا دیں۔ تو توبہ قبول۔ الغرض ؎

ڈوبی ناویں تراتے یہ ہیں ہلتی نیویں جماتے یہ ہیں!
ٹوٹی آسیں بندھاتے یہ ہیں چھوٹی نبضیں چلاتے یہ ہیں!
جلتی آگ بجھاتے یہ ہیں روتی آنکھ ہنساتے یہ ہیں!
شافع امت نافع خلقت رافع رتبے بڑھاتے یہ ہیں!
اپنی بنی ہم آپ بگاڑیں کون بنائے! بناتے یہ ہیں!
بندے کرتے ہیں کام غضب کا
مژدہ رضا کا سناتے یہ ہیں

ہونے پر اور اس کے علاوہ ہر کام پر قادر ہے۔ اور انسانوں کے موجود ہونے اور نہ ہونے سے اس کے ہر جگہ موجود ہونے میں کچھ بھی فرق نہیں آتا۔

۱۲۔ یہاں پر علامہ مشرقی صاحب کی طرح پرویز صاحب نے انسان کے فطری تقاضے اور حکم شریعت کو برابر ٹھہرا کر دونوں کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا ہے۔ حالانکہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور ان دونوں کے حدود کا نام ہے قانون فطرت اور قانون شریعت۔ اور انسانی وجود کا جو حصہ قانون شریعت کا مخاطب ہے۔ وہ اس کا فطری تقاضا نہیں۔ بلکہ اس کا شعور و ادراک ہے جو ہونے کو وہ بھی اس کے فطری تقاضے کی طرح اس کی فطرۃ میں داخل ہے۔ اور اس کی ہر ادا میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو کام بھی انسان کرے۔ وہ صفائی اور ستھرائی کے ساتھ انجام دے۔ پرویز صاحب کے اس بیان میں انسان کے فطری تقاضے کو سب کچھ ٹھہرا کر اس کے فطری شعور و احساس کو بالکل فراموش کر ڈالا گیا ہے۔ اس فطری تقاضے کی شان آپ کے نزدیک یہ ہے کہ وہ کبھی غلطی نہیں کرتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کبھی کسی غلط کام اور ناجائز چیز کی خواہش کر بیٹھے۔ اور اس عجیب و غریب فلسفہ کا ماخذ یہ خیال ہوا کہ خدا حق ہے۔ اور انسانی فطرۃ بھی حق ہے۔ اس لئے انسان کے فطری تقاضے کو بھی حق مان لینا چاہیئے۔ اور چونکہ خدا بھی حق ہے۔ اس لئے اس کے احکام کو انسان کا فطری تقاضا شہد اور شکر کی طرح مرغوب پاتا ہے۔

ان عجائبات کو آپ غالب[1] کے بیان کی طرح سنکر ان پر سر دھنیئے۔ اور انکی

---

[1] یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب ٭ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔

کافروں کیلئے رحمت

مسلمانوں کے علاوہ چونکہ کافر بھی اس جہان میں شامل ہیں۔ اس لئے بمصداق آیت کریمہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کافروں کے لئے بھی رحمت ہیں۔ مگر فرق یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کے لئے تو دونوں جہان میں یہاں بھی، اور وہاں بھی رحمت ہیں۔ اور کافروں کے لئے صرف اسی جہان میں یعنی دنیا میں ہی رحمت ہیں۔ چنانچہ مفسرین کرام لکھتے ہیں:-

هُوَ رَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِيْنَ فِي الدَّارَيْنِ وَ لِلْكَافِرِيْنَ فِي الدُّنْيَا بِتَاخِيْرِ الْعُقُوْبَةِ فِيْهَا۔ (مدارک التنزیل ص۲۷۹ حاشیہ خازن) — یعنے حضور مسلمانوں کے لئے دونوں جہان میں رحمت ہیں۔ اور کافروں کے لئے صرف دنیا میں۔ اس لحاظ سے کہ دنیا میں ان سے عذاب ٹل گیا"

پہلے نبیوں کی تکذیب کرنے سے کافروں پر عذاب نازل ہوتے تھے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت ان کافروں پر بھی اس طرح ہوئی۔ کہ یہ لوگ یہاں کے عذاب سے بچ گئے۔ چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے کہ کافروں نے خود دعا کی۔

کفار کی دعا

اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (پ۹ ع۱۸)

اے اللہ اگر یہی (قرآن) تیری طرف سے حق ہے۔ تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔ یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر لا"

دیکھئے! کافروں نے خود ہی اللہ سے یہ درخواست کی۔ کہ اے اللہ! اگر قرآن و اسلام سچا ہے۔ اور ہم جھوٹے ہیں۔ تو ہم پر پتھر برسا۔ یا کوئی اور دردناک عذاب لے آ۔ مگر حضور کی رحمت ان کافروں کے بھی آڑے آگئی۔ اور اللہ نے اس کا جواب یہ دیا۔ کہ

خدا کا جواب

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ (پ۹ ع۱۸)

اور اللہ کا کام نہیں۔ کہ انہیں عذاب کرے۔ جب تک اے محبوب تم ان میں تشریف فرما ہو"

دیکھا آپ نے۔ کافروں نے خود عذاب کی درخواست کی۔ مگر اللہ فرماتا

معقولیت پر غور کرتے ہوئے ایسے سوالات میں نہ پڑتے کہ جب حقیقت ایسی کچھ تھی تو پھر یہ خدا کی طرف سے کتابوں اور رسولوں کا سلسلہ کیوں قائم کیا گیا۔ اور جب قائم کیا گیا تو سننے والوں کی اکثریت عموماً انکی مخالف کیوں رہی کسی شہد کھلانے والے کی مخالفت تو آجتک کبھی نہیں ہوئی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک آدمی اچھی غذا کا حکم دے اور سننے والے اسے پتھروں سے مارنے پر آمادہ ہوں۔ اور گالیاں دیں۔ یہ تو اسی وقت ہوتا ہے کہ ایک آدمی زنا اور چوری کو فطری تقاضا سمجھے۔ اور خدا کی شریعت کا نمائندہ اسے اس کام سے منع کرے۔ وہ کم ناپ تول کرے۔ اور شریعت کا نمائندہ اسے ایسا کرنے سے روکے۔ اگر معیار انسان کا فطری تقاضا ہو تو آدمی کہہ سکتا ہے کہ چوری اور حرام خوری میں چونکہ طبیعت کو لطف آتا ہے اس لئے یہی خدا کا حکم ہے۔ اور نماز روزہ میں چونکہ طبیعت کو تنگی محسوس ہوتی ہے اس لئے انہیں سے خدا نے منع فرمایا ہے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا کی طرف سے عاید شدہ حکم ناگوار ہو۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ایک کام آدمی اپنی اور محض اپنی خواہش کے ساتھ کرے تو وہ خدا کی رضا کا باعث کب ہو سکتا ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ کھانا تو ایک آدمی کھائے اور بھوک دوسرے کی اتر جائے۔ اگر آپ اپنے کام کو جاتے ہوئے دس بار بھی راستہ میں ایک آدمی کو مل کر اس کی تعظیم کریں۔ تو وہ اس سے کبھی خوش نہیں ہوگا۔ جبتک کہ آپ اس کی ملاقات کے لئے اس کے گھر پہ نہ جائیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ایک کام اس لئے کرنے پر رضامند ہوں کہ بس اسی میں کوئی تنگی اور گرانی نہیں۔ اور اس سے خدا خوش ہو جائے۔

ہے۔ کہ میں ان کافروں پر بھی عذاب نازل نہ کروں گا۔ اس لئے کہ رحمۃ للعالمین ان میں تشریف فرما ہیں۔

تو میرے بھائیو! ہمارے حضور کی رحمت اس دنیا میں ہر نیک و بد، مومن و کافر کے لئے عام ہے۔ آپ مسلمانوں کے لئے تو رحمت ہی ہیں۔ آپ کافروں کے لئے بھی رحمت ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو۔ جبکہ حضور کی رحمت ہمہ گیر رحمت ہے۔ بارش جب ہوتی ہے تو اچھے بُرے ہر مقام کو سیراب کرتی ہے۔ ہمارے رؤف و رحیم آقا کی رحمتوں سے اس دنیا میں سبھی مستفید ہوئے۔ اسی لئے اعلیٰحضرت نے لکھا ہے ؎

نجدی اس نے تجھ کو مہلت دی کہ اس عالم میں ہے
کافر و مرتد پہ بھی رحمت رسول اللہ کی!

نوح علیہ السلام

اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ سنئے۔ آپ کی عمرِ تبلیغ ساڑھے نو سو سال تھی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا۔ (پ ۲۰ ع ۱۴) بیشک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو وہ اُن میں پچاس سال کم ہزار برس رہا۔"

دیکھا آپ نے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی عمرِ تبلیغ کتنی طویل تھی۔ اور یہ عرصہ یعنی ساڑھے نو سو سال کا آپ کی تبلیغ فرمانے کا عرصہ تھا۔ ویسے آپ کی عمر شریف اس سے بھی زیادہ تھی۔ مگر میرے بھائیو! یہ دنیا کیا ہے۔ ہزاروں سال جیو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ نوح علیہ السلام کے پاس جب ملک الموت

دنیا کی زندگی

حاضر ہوا۔ اور دریافت کیا۔ کہ حضور! اس قدر طویل عمر پانے کے بعد اب آپ کا تشریف لے چلنے کا وقت آگیا ہے۔ ذرا فرمایئے تو اتنے طویل عرصہ زندگی کو آپ نے کیسا محسوس کیا۔ تو حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا۔" بس یوں معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے ایک حویلی ہو۔ جس کے دو دروازے ہوں۔ اور میں ایک دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اور اب

بغیر اس کے کہ آپ اس کی رضا کے لئے کچھ بھی تکلیف اٹھائیں۔ حالانکہ خدا کا مطالبہ اور خود ہماری عقل کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے حقوق کا سب سے بڑھ کر لحاظ رکھا جائے۔ اور اس کی رضا کے لئے سب سے بڑھ کر محنت اٹھائی جائے تو اس کی رضا حاصل ہو۔

انسان کے اندر اس کے فطری تقاضے کے ساتھ ایک اور قوت بھی ہے۔ جسے فطری احساس اور انسانی شعور کہا جاتا ہے۔ اور یہی اس کی انسانیت اور انسان ہونے کی حیثیت کا اصل اور مخصوص سرمایہ ہے۔ اس احساس و شعور سے جہاں دوسرے حیوانات یکسر محروم ہیں۔ وہاں یہ انسان کے اندر اس قدر پختہ ہوتا ہے کہ کسی مرحلہ پر بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ایک حیوان اپنے پیٹ کی بھوک یا جنسی شہوانی بھوک مٹاتے وقت اس سوچ میں کبھی نہیں پڑتا۔ کہ کونسا پانی چارہ پاک اور جائز ہے۔ اور کونسا جانور اس کا محرم رشتہ دار ہے۔ مگر انسان کے اندر یہ فطری احساس اس حد تک پائیدار ہوتا ہے۔ کہ وہ بھوک پیاس سے موت کے قریب پہنچ کر بھی اس احساس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اور جہاں اس کے فطری تقاضے اور احساس کے درمیان کشمکش پیدا ہو وہاں وہ فطری احساس کے پیچھے چلتا ہے۔ اور جب کبھی اس کے احساس پر اس کا فطری تقاضا غالب آجاتا ہے۔ تو اس کا احساس دب ضرور جاتا ہے۔ مگر مرتا نہیں۔ اور موقعہ پا کر پھر اپنا کام کرنے لگ جاتا ہے۔ اس فطری احساس کی ہمہ وقتی نگرانی کا یہ عالم ہے کہ جب انسان برائی میں ہمہ تن مشغول ہوتا ہے اس وقت بھی یہ خیال اس کا دامن نہیں چھوڑتا کہ کہیں برائی میں وہ حد سے بڑھ نہ جائے۔

دوسرے دروازے سے نکل رہا ہوں" یہ جواب حضرت نوح علیہ السلام کا ہم جیسوں کو سمجھانے کے لئے خوب ہے۔ واقعی عمر کا جو حصہ گزر چکا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ اور اسی طرح جو عمر کا باقی حصہ ہے۔ وہ بھی نہ رہے گا۔ ہاں ایمان و اسلام ایک ایسی چیز ہے۔ جو ہمیشہ ساتھ رہیگی۔

میرے بھائیو! پھر ایسی ناپائیدار دنیا سے دل لگانا اور اپنی عاقبت کی فکر نہ کرنا کس قدر حماقت ہے؟ مگر افسوس آج عاقبت کی فکر نہیں۔ اور حبِ دنیا میں اس قدر فنا ہیں۔ کہ انجام کا کچھ احساس ہی نہیں۔ میرے بھائیو! یہ دنیا یعنی غفلت و ناعاقبت اندیشی کی دنیا بظاہر بڑی دل رُبا ہے۔ اپنی زیب و زینت اور نمائش سے لبھا تو لیتی ہے۔ مگر اپنے شکار کو پھر زندہ نہیں چھوڑتی —— اعلیحضرت فرماتے ہیں:- ؎

شہد دکھائے زہر پلائے قاتل ڈائن شوہر کش!

کس مردار پہ تو للچایا دنیا دیکھی بھالی ہے

یعنے دکھاتی تو یہ شہد ہے۔ مگر قابو پا لینے کے بعد زہر کا پیالہ پلا دیتی ہے۔ یہ حقیقت جاننے والا اس سے چوکنا رہتا ہے۔ مگر جو غافل ہے وہ غفلت میں آکر اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ اعلیحضرت فرماتے ہیں ؎

سُونا جنگل، سونا پاس ہے، سونا زہر ہے اٹھ پیارے

تو کہتا ہے میٹھی نیند ہے، تیری مت ہی نرالی ہے

یعنے دیکھ اے غافل! یہ جنگل ہے اور جنگل بھی بھیانک ہے اور سونا جنگل اور اس جنگل میں تیرے پاس سونا (یعنی ایمان) ہے۔ اب اس سُونے جنگل میں جہاں ہر قسم کا خطرہ ہے۔ اور تیرے پاس قیمتی سونا ہے تیرا سو جانا انتہائی حماقت ہے۔ یہاں جاگنا اور بیدار رہنا درکار ہے۔

پس اے بھائی اس دنیا میں بیدار ہو۔ یعنی یادِ حق میں رہو۔ خدا کو بھول جانا یہ سو جانا ہے۔ اور یہی دنیا ہے۔ اور یاد رکھو جو غریب آدمی بھی یادِ حق سے غافل ہے۔ وہ سویا ہوا اور دنیا دار ہے۔ اور جو کروڑ پتی بھی یادِ حق سے غافل نہیں۔ بلکہ احکامِ شریعت کا پابند ہے۔ وہ بیدار ہے۔ اور

اور یہ حقیقت ہے کہ انسان کے سوا آپ کسی بھی نوع حیوانات کے کسی بھی فرد میں انسانی خصوصیت کا یہ جوہر نہیں پائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس بلند اور ناقابل تغیر فطرت پر اللہ نے انسان کو پیدا فرمایا ہے۔ وہ اس کی یہی فطرت ہے۔ جس کے تحت اس کا انسانی شعور و احساس قائم ہوتا ہے۔ اور اسے بھلائی اور برائی کی تمیز حاصل ہونے کیساتھ بھلائی سے محبت اور برائی سے نفرت ہوتی ہے۔ اور یہی وہ شرف ہے جس سے حضرتِ انسان مختص ہے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ جس شرف سے حضرتِ انسان مختص ہے وہ یہ نہیں بلکہ اسکی قوتِ فیصلہ ہے۔ اسی انسان کی قوت فیصلہ کو آپ روح خداوندی وغیرہ جیسے نام دیتے ہیں۔ اور جو اختیار و ارادہ بھی ہے ہم کہتے ہیں کہ محض قوتِ فیصلہ سے تو کوئی حیوان بھی خالی نہیں۔ جبلی اور فطری تقاضاؤں سے بھی انہیں نہیں کر دیتا۔ ورنہ ایک پیاس سے بے حال ہو جانے والا حیوان کنویں میں چھلانگ لگا دینے سے کبھی بھی دریغ نہ کرتا۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ کنویں میں گر کر باہر آنا ممکن نہیں۔ اور پھر اپنے ارادہ سے گر کر پانی پینے کی بجائے پیاسا رہنے کو اختیار کرتا ہے۔ گویا

لہ نہیں سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان کو بندر اور حیوان کی اولاد فرض کر لیا گیا ہے۔ شفقت کیخلاف ہے۔

۲ فیصلہ کرنے کا نام اختیار و ارادہ ہے۔ حیوانات کی نقل و حرکت ان کے جبلی تقاضوں کی رُو سے ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے سامنے بیک وقت ایک سے زیادہ ممکنات آتے ہیں۔ ان ممکنات میں سے وہ صرف ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔ قرآنی فیصلے۔ ص ۲۴۵

دیندار ہے۔ دنیا دار نہیں۔ دنیا نام ہے خدا کو بھول جانے کا ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن!
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن!

اسلام یہ نہیں کہتا۔ کہ تم اچھا نہ کھاؤ۔ اچھا نہ پہنو۔ روپیہ پیسہ نہ کماؤ۔ موٹروں میں نہ پھرو۔ نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ؎

اڑاؤ عیش کرو عشرتیں بہت پھولو
اڑو جہاز میں موٹر کی گود میں جھولو
اڑو بلندی پہ اتنا فلک کو بھی چھُولو
خدا کے واسطے لیکن خدا کو مت بھُولو

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی عمر شریف عرصہ تبلیغ کی ساڑھے نو سو سال تھی۔ دیکھا آپ نے پہلے لوگوں کی عمریں کتنی طویل ہوتی تھیں۔ اور آج ہماری عمریں؟ تیس سال فی کس۔ ہماری عمروں کی

ہماری عمریں

اوسط رہ گئی ہے۔ گویا آج سے کچھ عرصہ قبل اگر ایک آدمی سو سال کی عمر پاتا تھا۔ تو اس نئی تہذیب کے دور میں سو سال میں تین جنٹلمین بھگتتے ہیں۔ اور یہ تھوڑی عمر کچھ ایسی عام ہوگئی ہے۔ کہ اپنی عمر کو خواہ مخواہ کم بتانا ایک فیشن ہوگیا ہے۔ چنانچہ آپ نے تجربہ کیا ہوگا۔ کہ ستر سالہ بڈھے سے بھی عمر کا پوچھا جائے۔ تو وہ جواب اس طرح دے گا۔ کہ میری تو ابھی عمر ہی کیا ہے۔ یہی کوئی تیس پینتیس سال۔ یہ تو نزلے نے بال سفید کر دیئے ہیں

لطیفہ

اسی طرح ایک لطیفہ بھی مشہور ہے۔ کہ ایک ستر سالہ بوڑھا اپنے پچاس سالہ دوست سے کہہ رہا تھا۔ کہ میری عمر زیادہ سے زیادہ چالیس کی ہوگی۔ اس کے پچاس سالہ دوست نے کہا۔ اور میں زیادہ سے پچیس سال کا ہوں گا۔ پاس ہی چارپائی کے اوپر ایک نوجوان مسخرہ بیٹھا تھا۔ جو واقعی پچیس سال کا تھا۔ وہ ان دونوں کی یہ باتیں غور سے سُن رہا تھا۔ جب وہ اپنی اپنی عمر بیان کر چکے۔ تو یہ نوجوان چارپائی پر سے خود بخود ہی نیچے گر گیا۔ ان بڈھوں نے کہا۔ ارے تو کیوں گرا؟ تو وہ بولا! جناب میری پیدائش کی گھڑی

اس کے سامنے اصل سوال زندہ رہنے کا ہوتا ہے۔ مگر انسان کے سامنے ہر ایسے انتخاب کے وقت اصل سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا کرنے میں خوبی اور بھلائی ہے۔ ورنہ جہاں تک محض قوت فیصلہ وانتخاب کا تعلق ہے یہ کوئی بزرگی نہیں کہ اسے روح خداوندی کا نام دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ بھلائی کے شعور کے بغیر بیکار ہوتی ہے۔ اور بھلائی کا شعور انسان میں اگر نہ ہو تو اسے خدا کی کتاب کے گر بتانا ایسا ہی لاحاصل ہو جیسے بھینس کے آگے بین بجانا۔

فطری احساس اور فطری تقاضا کے تسلیم کر لینے کے بعد انسان دو متضاد قوتوں کے مجموعہ کا نام قرار پاتا ہے یہ دو قوتیں اگر ایک دوسرے کے موافق ہوتیں تو دو کی بجائے صرف ایک ہی قوت ہوتی۔ اس لئے ان دونوں کا ہمیشہ کے لئے ایکدوسرے سے برسر جنگ رہنا لازمی ہے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ جو کام انسان کا فطری احساس ہو وہی اس کا فطری تقاضا بھی ہو۔ چنانچہ اس کا فطری تقاضا ہوتا ہے کہ اسے غذا حاصل ہو۔ خواہ وہ ناپاک ہو یا کسی سے چھین کر حاصل کرے۔ مگر اس کا فطری احساس یہ ہوتا ہے کہ روٹی پاکیزہ اور جائز ہونی چاہیئے۔ اس طرح ان دونوں متضاد قوتوں کی جنگ زندگی بھر انسان کے ساتھ رہتی ہے اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب اسے ان میں سے کسی ایک قوت کی پیروی میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔ تو وہ دوسری قوت کا خون کر کے صرف ایک کو پروان چڑھاتا ہے۔ اگر وہ صرف اپنے فطری احساس کے پیچھے لگ جائے تو بہت سی ان چیزوں سے بھی پرہیز کرنے لگ جاتا ہے۔ جن پر اس کی زندگی اور تندرستی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اور حواس کی زندگی اور تندرستی

رات ہی کو ہوتی ہے ؎

ہاں تو یہ ثمروں میں کمی ساری برکت ہے اس نئی تہذیب کی۔ پہلے لوگوں کے عقائد خالص، خوراک خالص، گفتار خالص۔ کردار خالص۔ اور اب سب کچھ نخالص اور نخالص بھی خاص نخالص۔ شاید اسی لئے ہمارے پنجاب میں عوام دہقانیوں کا طبقہ خالص کو کہتا ہی "نخالص" ہے۔ یعنی مثلاً انہیں گھی لینا ہو۔ اور دوکاندار سے یہ کہنا چاہتے ہوں۔ کہ بھئی خالص گھی دینا۔ تو یوں کہیں گے "بھئی نخالص گھی دینا" گویا خالص کی جگہ نخالص نے لے لی۔ اسی طرح یہ لوگ فضول کو "بے فضول" کہنے کے عادی ہیں۔ اور اسی طرح اب چونکہ انقلاب کا زمانہ ہے ہر چیز میں آپ انقلاب دیکھیں گے۔

انقلاب

وہ تو بھلا عام دہقانوں کی بات تھی۔ اس روشن دماغ اپ ٹوڈیٹ طبقہ نے بھلا کیا کیا گل نہیں کھلائے؟ وہ عورت جو کبھی عورت تھی۔ آج کل مرد بنی پھر رہی ہے۔ اور وہ مرد جو کبھی مرد تھا۔ آج عورت بن بن کر پھر رہا ہے۔ میں نے اپنی "آجکل" کی ایک نظم میں لکھا ہے ؎

نئی تہذیب کا نقشہ عیاں ہے میاں بیوی ہے اور بیوی میاں ہے
برابر مرد کے عورت کو سمجھیں زمیں کو کہہ رہے ہیں آسماں ہے

اور پھر اس انقلاب ہی کا کرشمہ ہے ؎

شباب آور ہے سرخی اور پوڈر کہ ستر سال کی بڑھیا جواں ہے

شرم و غیرت جو پہلے مسلمان کی ایک متاع عزیز تھی۔ اور جس کے اپنانے والے کو فرض شناس حساس اور مومن کہتے تھے۔ آج وہ قیمتی شے ایک بیکار چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ اور اب شرم و غیرت کھانے والے آدمی کو وحشی، جنگلی، اور رجعت پسند کہتے ہیں۔ پہلے سب سے بڑے عالم دین کو مُلّا کہا جاتا تھا اور پھر مُلّا کا سب سے زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔ جیسے حضرت مُلّا جیون جو حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے۔ مُلّا جامی اور مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی (رحمۃ اللہ علیہم) اور آج یہ لفظ بڑی حقارت کے موقعہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔

کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اور اگر اسے فطری تقاضا کے تحت کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے فطری احساس کو بالکل پامال کر کے نرا حیوان بن جاتا ہے۔ اور اپنی خواہش کی تکمیل میں دوسروں کے حقوق کی اور اپنے انسانی شعور کی پروا تک نہیں کرتا۔ اسلامی شریعت اور آسمانی ہدایت کا منصب یہ ہے کہ وہ انسان کے لئے ایسے خطوط و حدود مہیا کرے جن کے ذریعہ وہ ان دونوں اندھی بہری برسرِ پیکار قوتوں کو راہِ اعتدال پر لا کر انہیں اپنی نشوونما میں مزاحم ہونے کی بجائے اس کا معاون بنائے۔ اور انسان کا کمال اس میں ہے کہ وہ خدا کی ہدایت کے مطابق ان دونوں قوتوں سے وہی کام اسی طرح لے جیسے خدا کو پسند ہو۔ خواہ اس کی اپنی یا دوسروں کی پسند کچھ اور ہو۔

متشابہات کا دائرہ

"اس حق مطلق سے[1] تطابق و توافق پیدا کیا جائے یعنی جس فطرت اللہ پر انسان کی فطرت متفرع ہے اس سے[2] ہم آہنگی پیدا ہو بس فطرت انسانی کا فطرت اللہ پر متفرع ہونا یہ[3] ہے مبدا۔ اور اس کا اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر لینا یہ[4] ہے معاد۔ مبدا اور معاد کو ملانے والا خط ہے صراطِ مستقیم[5] جس پر ساری کائنات چل رہی[6] ہے۔ اس لئے کہ خود خدا حق مطلق صراطِ مستقیم پر ہے۔ ان ربی علیٰ صراطٍ مستقیم"۔ ص ۳۰۲

مسٹر اور مُلّا

حضرات! اس عظیم الشان لفظ کو تحقیر سے بولنے والے اور مُلّا کو حقیر سمجھنے والے اپنے آپ کو "مسٹر" کہلا کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ یہ کتنا بڑا انقلاب ہے کہ آج ایک مسلمان "مُلّا" یا "حافظ" کہلانا پسند نہیں کرتا۔ اور مسٹر کہلانا پسند کرتا ہے۔ مولوی و مُلّا کی شکل و صورت پر، جو اسلامی ہے۔ مذاق اڑتا ہے۔ اور ایڈن و چرچل اور سٹالن کی شکل و صورت کو جو کافروں کی ہے۔ اپناتا ہے۔ اور چاہتا ہے۔ کہ اسے دیکھ کر ہر کوئی اسے انگریز سمجھے۔ اور اسے سب "صاحب بہادر" کہیں۔ اور اسی شوق میں وہ اپنی صورت کے علاوہ اپنی آواز کا لہجہ بھی اسی انگریزی سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ آتا کو آٹا، جاتا کو جاٹا اور کلکتہ کو "کال کاٹا" کہہ کر گویا ثابت کرے گا۔ کہ ہم بھی میڈ اِن انگلینڈ ہیں۔ ایک شاعر نے کیا خوب لکھا ہے ؎

طاقِ دل میں چراغ انگریزی   سر کے اندر دماغ انگریزی
چال انگریزی ڈھال انگریزی   جسم کا بال بال انگریزی
جسم ہندی میں جان انگریزی   منہ کے اندر زبان انگریزی

چھل رہا ہے گلا تو چھل جائے!
لہجہ صاحب سے اپنا مل جائے!

لطیفہ

کہتے ہیں ایک اسی قسم کے صاحب بہادر تالاب پر بیٹھے بیٹھے مچھلی کا شکار کھیل رہے تھے۔ اور اٹھ کر کانٹے کو درست جو کرنے لگے۔ تو پتلون کے دھکے سے تالاب میں جا پڑے۔ اب پتلون میں کسے ہوئے تو تھے۔ اور پتلون میں کسا ہوا آدمی؟ اس کا یہ عالم ہوتا ہے۔ جو ایک شاعر نے لکھا ہے کہ ؎

مجھ کو ذوقِ مے ہے، اور واعظ کو شوقِ چائے ہے!
اپنا اپنا شغل ہے، اور اپنی اپنی رائے ہے!
نقشِ پائے یار کو چوموں تو چوموں کس طرح!
ہو بُرا پتلون کا مجھ سے نہ بیٹھا جائے ہے!

اب وہ صاحب بہادر معہ پتلون کے تالاب میں جو گرے تو ہاؤں واؤں

اس صراط مستقیم کی جادہ پیمائی میں خدا اس سے آگے آگے ہے۔ اس لئے اس کا مطمع نگاہ اس کے نقوش قدم شرعن الہیہ ہونے چاہئیں۔ اسی کا نام ارتقار مدارج انسانیت ہے۔ ارتقار بلندی اس لئے کہ اسکا رب ذی المعارج سیڑھیوں والا ہے۔ ص۳۰۲

حضور بنفس نفیس بارگاہ ایزدی میں پہنچے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان روایات کی رو سے خدا کسی خاص مقام پر تھا۔ جہاں پہنچکر اس سے ملاقات کی گئی۔ غور فرمایئے! اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصور کیا اندازہ پیش کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کائنات کے ہر مقام پر موجود ہے۔ ص۳۵۲

۱۔ اس عبارت کے صحیح اور غلط ہونے کی بجائے اس کے معقول اور قابل فہم ہونے پر غور کیجئے۔ انسان کو خدا کے ہم آہنگ ہونے کو کہا جا رہا ہے۔ جنکی فطرت پہلے ہی سے خدا کی فطرت پر متفرع ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے درخت کی شاخوں اور پتوں کو اس کے ہم آہنگ بنایا جائے۔ جو اگر مقصود یہ ہو کہ وہ اوپر سے اتر کر جڑوں کے نیچے آجائیں۔ تو یہ محال ہے۔ اور اگر مدعا یہ ہو کہ وہ اسس درخت کو چھوڑ کر کسی اور درخت کے سر پر سوار نہ ہوں تو یہ پہلے سے حاصل ہے۔ انسان کو جب پہلے ہی آپ اس پوزیشن میں لئے ہیں کہ اس کی فطرت خدا کی فطرت پر متفرع ہے تو پھر نئے سر سے اس کا خدا کے ہم آہنگ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ یہی حال تطابق و توافق کا ہے۔ تطابق کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسرے چیز کے ہر طرح برابر ہونا۔ اور ایک انسان کا

مار نہ سکے۔ اور لگے ڈوبنے۔ اتفاقاً ایک دہقانی کا اس طرف سے گزر ہوا۔ اس نے صاحب بہادر کو ڈوبتے دیکھا۔ تو از راہِ ہمدردی تالاب میں کود کر صاحب بہادر کو باہر نکال دیا۔ صاحب بہادر باہر جو نکلے تو دہقانی سے کہا۔ "تھینک یو۔" دہقانی نے صاحب بہادر کو پکڑ کر پھر تالاب میں پھینک دیا۔ صاحب چلایا کہ ارے یہ کیا؟ تو یہ دہقانی بولا۔ صاحب! خود ہی تو کہا ہے کہ "پھینک دو"

اب غور کیجئے۔ کہ اس دہقانی سے بھلا انگریزی بولنے کی کیا ضرورت تھی اس بے موقع انگریزیت نے غوطے کھلائے۔ باوجود اس کے میں یہ کہتا ہوں۔ کہ بچارہ مسٹر، فیشن کی رو میں بہ گیا ہے۔ ورنہ دل اس کا بھی معترف ہے۔ کہ کل اسی ملائیت نے کام آنا ہے۔ اور یہ جانتا ہے کہ وہ ان کفار کی اندھی تقلید میں اپنی صورت تک بگاڑ بیٹھا ہے۔ میرے بزرگو! یہ بات میں یونہی نہیں کہہ رہا۔ دیکھ لیجئے ہم ملا ہیں۔ ملا رہیں گے۔ اور ملا ہی مریں گے۔ اور

ہم ملا ہیں

ہماری خدا سے دلی دعا ہے۔ کہ وہ ہمیں ملا ہی اٹھائے اور ملا جیون۔ ملا جامی۔ ملا عبدالحکیم جیسے مقبولوں کے ساتھ ہمارا حشر ہو۔ اب ذرا مسٹر سے بھی پوچھئے۔ کہ کیا تمہارے لئے بھی ایسی دعا کی جائے۔ کہ تم مسٹر ہو، مسٹر بن کے جیو۔ اور مسٹر ہی رہ کر مرو۔ اور خدا تمہیں مسٹر ہی اٹھائے۔ اور مسٹر چرچل۔ مسٹر سٹالن، اور مسٹر ڈاروِن جیسے مردودوں کے ساتھ تمہارا حشر ہو۔ میرا یقین ہے۔ کہ مسٹر ایسی دعا پر کبھی راضی نہ ہوگا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ دل اس کا بھی معترف ہے۔ کہ یہ جو انبیاء کی سیرت وصورت اپنانا ہے۔ یہی قیامت میں کام آنے والی ہے اور جن لوگوں کی شکل وصورت پر یہ مذاق اڑا رہا ہے۔ دراصل یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ اور یہی شکل وصورت کل کام آئے گی۔ تو پھر اے مسٹرانِ کرام! جس چیز کو تمہارا ضمیر اچھا جانتا ہے۔ محض تکمیلِ فیشن کے لئے اُسے بُرا کہہ کر اپنی عاقبت کیوں خراب کرتے ہو۔ اور جس شکل وصورت کے ساتھ، اور جن غیر مسلموں کے ساتھ تم کل اٹھنا نہیں چاہتے۔ آج بھی انکی رفاقت کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟

خدا کے بالکل برابر ہونا ممکن نہیں۔ اور توافق کے معنی ہیں۔ دو یا زیادہ آدمیوں کا ایک دوسرے کی باتوں کو مان کر اتفاق کر لینا ادھر خدا اور بندے کے درمیان یہ معاملہ بھی نہیں بلکہ خدا کا منصب ہے حکم دینا۔ اور بندے کا کام ہے حکم ماننا چاہے وہ اسے پسند ہو یا نہ ہو۔ اور اس کی طبیعت اس پر مائل ہو یا نہ ہو۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ انسان کی فطرت خدا کی فطرت پر متفرع ہے۔ تو پھر اس کو اس کے مطابق بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ اپنی کسی الگ خصوصیت کا مالک نہیں رہ جاتا جو اسے خدا کے موافق و مطابق بنانے کا موقعہ پیش آئے۔ اس کے بعد پھر اس میں نری لفاظی ہی ہے اور کچھ نہیں۔

۲۔ یہ سمجھ پانا قریب محال ہے کہ ہم آہنگ ہوتے اور انسان کا خدا کے ہم آہنگ ہونے کا مفہوم اور اس کی تحقیقت کیا ہے۔ ایک انسان کا دوسرے انسان سے ہم آہنگ ہونا تو یہ ہے کہ دونوں کا رہنا سہنا اور چلنا پھرنا ایک جیسا ہو جائے۔ مگر خدا سے انسان کا ہم آہنگ ہونا تو اس سے بھی زیادہ محال ہے۔ کہ ایک غلام یا رعایا کا فرد اپنے آقا یا بادشاہ کے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس لئے کہ بادشاہ اور غلام تو بہرحال ایک جیسے انسان ہوتے ہیں۔ مگر انسان اور خدا کا یہ معاملہ نہیں اور یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا اور انسان اپنا اپنا مقام چھوڑے بغیر ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہو جائیں۔

۳۔ خدا کی فطرت پر انسان کی فطرت کے متفرع ہونے کے متعلق بھی پرویز صاحب کچھ نہیں بتاتے کہ اسے عمل میں لانے والا کون ہے۔ خدا یا انسان۔ انسان تو اپنی ابتدا کے لئے کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوتا نہیں۔ لہذا اسے آغاز امر

دعائے نوح علیہ السلام

ہاں تو میں حضرت نوح علیہ السلام کی عمر شریف کا ذکر کر رہا تھا۔ کہ آپ کی عمر تبلیغ ساڑھے نو سو سال تھی۔ آپ نے اپنی عمر شریف میں دن رات اپنی قوم کو تبلیغ فرمائی۔ مگر قوم ایمان نہ لائی۔ بلکہ اور بھی مغرور و مفرور ہوئی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے رب سے عرض کی:-

رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَہَارًا فَلَمْ یَزِدْھُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا۔ (پ۲۹ ع۹) یعنی اے رب میں نے اپنی قوم کو دن رات تیری طرف بلایا۔ مگر میرے بلانے سے وہ اور بھی دور ہی بھاگی"

حضرت نوح علیہ السلام نے آخر ان بے دینوں کے خلاف یہ دعا فرما دی کہ:-

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا۔ (پ۲۹ ع۹) اے رب! ان کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ"

یعنی ان کا بیڑا غرق کر! اور ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی۔ طوفانِ نوح آیا اور سب غرق ہو گئے۔

دعائے رحمت صلے اللہ علیہ وسلم

اب آئیے! ذرا رحمۃٌ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کی رحمتِ عامہ کا نظارہ دیکھئے۔ میدانِ احد میں ایک طرف کفار ہیں۔ اور ایک طرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم معہ اپنے جانثاروں کے (رضی اللہ عنہم) کافروں کی شرارتوں کا یہ عالم ہے کہ ؎

بھرے تھے جھولیوں میں ان کی پتھر سنگباری کو
نشانہ دور سے کرنے لگے محبوب باری کو

ادھر اس سنگ باری سے حضور کے دندانِ مبارک کو تکلیف پہنچتی ہے رخِ انور سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ صحابہ کرام بے چین ہو جاتے ہیں۔ اور عرض کرتے ہیں۔ اُدْعُ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ۔ حضور ان مشرکوں کے خلاف دعا فرمایئے یا رسول اللہ! حضرت نوح علیہ السلام نے بھی تو دشمنوں کے خلاف دعا فرما کر کافروں کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ آپ بھی ان کے خلاف دعا فرمایئے۔ حضور نے فرمایا۔ لو میں دعا کرتا ہوں۔ تم آمین کہو۔ دوستو! ذرا دیکھنا حضرت نوح

میں وجود کا مالک بنانے کا کام خدا ہی کا ہو سکتا ہے۔ انکا انجام جو پرویز صاحب کے بقول خدا سے اس کا ہم آہنگ ہونا ہے۔ اس میں بھی صفائی پر تشکر آپ یہ نہیں بتاتے کہ یہ ایسا کچھ اس کا انجام ہے یا ہونا چاہیئے۔ اگر ہے تو پھر انسان خدا کا ہم آہنگ ہے ہی۔ اور اسے کسی خارجی کوشش اور ہدایت کے ذریعہ خدا کے ہم آہنگ بنانا کچھ بھی مفید نہیں اور اگر اس کا یہ انجام ہے نہیں بلکہ ہونا چاہیئے تو اس کے معنی ہوں گے کہ یہ انسان کا اپنا کام ہے۔ کہ وہ خود ہی اپنی پسند کے مطابق اپنا انجام بنائے۔ اور یہ بالکل باطل اور عقلاً محال ہے کہ اس کے آغاز کا مالک خدا ہو اور اس کے انجام کا مالک وہ خود ہو اور چاہے تو اپنے انجام کو ظہور میں لائے یا نہ لاسکا۔ نہ لائے عقلاً یہی کچھ قابل تسلیم ہے کہ یا تو اس کے آغاز کی طرح اس کے انجام کا مالک بھی خدا ہو اور یا پھر اپنے آغاز کا مالک و مختار بھی وہ خود ہو۔ اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ عبارت اپنی تمام لفظی رعنائی اور چمک دمک کے باوجود کس قدر بے معنی ہے۔

۴۔ مبدا کے معنی ہیں آغاز و ابتدا اور معاد کے معنی ہیں انجام و انتہا۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ انسان کا آغاز ہے اس کا خدا کی فطرت پر متفرع ہونا۔ اور اس کا انجام ہے خدا کے ہم آہنگ ہونا۔ یہاں یہ مان لیجئے کہ آغاز میں خدا کی فطرت پر متفرع ہونے میں ایک مسلمان اور کافر برابر ہیں۔ اور برابر ہونے پر مجبور ہیں۔ نہ پہلا اپنی مرضی سے خدا کی فطرت پر متفرع ہوتا ہے اور نہ دوسرے کو اس سے انکار کی طاقت ہوتی ہے۔ اس سے آگے دونوں کے انجام کا مرحلہ ہے۔ جو ہے خدا کے ہم آہنگ ہونا۔ یہاں بھی اگر دونوں یکساں خدا کے

علیہ السلام کے ہاتھ اٹھے۔ تو انہوں نے یہ دعا فرمائی۔ کہ اے رب ان کافروں کو مت چھوڑ۔ اور آج رحمتِ عالم کے ہاتھ اٹھے تو یہ دعا ہوتی ہے۔ سے

کہ اے پروردگار آمرزگار ان کو معافی دے
نہ کر ان کی خطاؤں کا شمار ان کو معافی دے

صحابہ نے عرض کی۔ حضور یہ تو ان کی معافی کی دعا مانگ لی۔ آپ نے، ان کی ہلاکت کی دعا فرمائیے تو سے

یہ سن کر رحمۃ للعالمین نے ہنس کے فرمایا!
کہ میں اس دہر میں قہر و غضب بن کر نہیں آیا

مشکوٰۃ شریف صـــ میں اس موقعہ پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد درج ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا وَّ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً ـــ میں لعنت بھیجنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ میں تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اور مسلم شریف میں ہے۔ کہ آپ چہرۂ انور سے خون مبارک پونچھتے جاتے تھے۔ اور فرماتے جاتے تھے۔ رَبِّ اغْفِرْ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (مسلم شریف ص۱۰۱ ج۲)

اے رب! میری قوم کو بخش دے۔ یہ لوگ جانتے نہیں ہیں۔

سلام مسلمانو! ذرا پڑھو تو میرے ساتھ مل کر:۔

سلام اس پر کہ گھر والے بھی جس کو تنگ کرتے تھے!
سلام اس پر وطن والے بھی جس سے جنگ کرتے تھے
سلام اس پر کہ جس نے دشمنوں کو بھی قبائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں
سلام اس پر جو دشمن پر بھی رحم و فضل فرمائے
سلام اس پر کہ جس نے رحمتوں کے پھول برسائے

ہر چیز کیلئے رحمت میرے بزرگو! دیکھا آپ نے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر دوست دشمن کے لئے کس قدر رحمت ہیں؟ اور کیوں نہ ہو جب کہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں اور "عٰلمین" میں جو چیز بھی

ہم آہنگ ہونے پر مجبور ہوں۔ تو پھر مومن و کافر کی تمیز نہیں رہتی۔ اور اگر جبر کی بجائے خود خدا کے ہم آہنگ ہونے میں بااختیار مانے جائیں اور بطور امر واقعہ بھی کہہ دیا جائے کہ خدا کے ہم آہنگ صرف مومن ہوتا ہے اور وہی اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ تو کافر جو خدا کے ہم آہنگ ہوگا نہیں۔ کیا اس کے آغاز کا انجام کبھی نہیں آئیگا۔ نہ اچھا اور نہ برا۔ ایسے سوالات میں پڑے بغیر آپ معرفت کے ان نکات کی داد دینی چاہیئے۔ تاکہ پرویز صاحب کو کسی محترم[1] عرشی صاحب کی ضرورت پیش نہ آئے۔

۵۔ اس الجھاؤ کا بھی کوئی حل نہیں کہ آغاز و انجام کے نقاط کو ملانے والے اس صراط مستقیم کی نوعیت کیا ہے۔ اور اس پر کائنات کیسے خدا کے پیچھے چل رہی ہے۔ کیا وہ زمین کے ان محسوس راہوں میں سے کوئی راہ ہے جو چند میل کے فاصلے میں بھی سیدھے نہیں رہتے یا وہ کوئی غیر محسوس معنوی راہ ہے۔ اور اگر ہے۔ تو پھر اس پر ساری کائنات بمع انسان کے کیسے چل رہی ہے یا چلائی جا رہی ہے۔ انسان کے حالات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہر حال اس راستہ پر جانوروں کی طرح ہانکے اور کھینچے بغیر چلایا جا رہا ہے۔ اور خدا کا منصب صرف اسے رہنمائی کرنا ہے۔ اس صورت میں اس راہ کے مسافر صرف وہی لوگ ہیں جو اس پر چلنا چاہتے ہیں۔ مگر اس عبارت سے ان ساری باتوں کا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ

---

[1] اپنی کتاب قرآنی فیصلے میں اپنے آپکو جاہل ٹھیراتے ہوئے پرویز صاحب نے عرشی صاحب کا ایک خط شائع کیا ہے جس میں انہوں نے کسی مضمون کے ہر نقطے کی آپ کو دل کھولکر داد دی ہے۔ اور ایک ایک نقطہ کے کئی پہلو نکالے ہیں۔

ہے وہ حضور کی رحمت سے مستفید ہے۔ حضور کے وجود باوجود سے عالم کا ذرہ ذرہ فیضیاب ہوا۔ وہ زحمتیں، جو حضور سے قبل دنیا میں تھیں۔ وہ سب جاتی رہیں۔ حضور کے تشریف لانے سے قبل تمام روئے زمین پر قحط سالی مسلط تھی۔ درخت خشک۔ زمینیں غیرآباد۔ اور جانور لاغر ہو رہے تھے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ہوئی۔ تو قریش جو قحط کی شدت میں تھے۔ آپ کی برکت سے نوبہال ہو گئے۔ زمین پر سبزے کی بہار ہوئی۔ ہر جانب سے خیر و برکت نمودار ہوئی۔ درختوں میں پھل آیا۔ تمام جہان میں ارزانی ہوئی۔ بھیڑ بکریوں۔ گائے بھینسوں میں طاقت آئی۔ ان کا دودھ حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ عرب والوں نے اس سال کا نام ہی سنۃ الفتح والابتہاج رکھا۔ ؎

عجب خیر و برکت کا آیا یہ سال ہوا جس کے آنے سے عالم نہال
تھے اہل عرب قحط سالی سے تنگ اڑا شدتِ غم سے چہرے کا رنگ
نزول اُن پہ اب حق کی رحمت ہوئی عیاں ہر طرف خیر و برکت ہوئی
چھٹے قحط کی سختیوں سے قریش لگے ہونے ہر گھر میں سامانِ عیش
پھلے باغ اور خشک سالی گئی کدورت دلوں سے نکالی گئی
زمیں پر تمام آیا سبزہ نکل درختوں میں خوب آیا کثرت سے پھل
گئے باغ جنت کے دروازے کھل
معطر ہوئے ارض و افلاک کل

دافع البلاء میرے بزرگو! یہ جو دنیا کی ساری زحمتیں دور ہو گئیں۔ اسی رحمتِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی برکت سے، اور خوب یاد رکھیے! کہ رحمت کا کام ہی یہ ہے۔ کہ وہ زحمت کو دور کرے۔ اور اگر مصیبت ومشکل کے وقت حضور کام نہ آئیں۔ جیسا کہ گستاخوں کا عقیدہ ہے۔ تو پھر وہ رحمت ہی کب ہوئے؟ لہٰذا! مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور یہی حقیقت ہے کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سارے جہان کے لئے رحمت یعنے دافع البلاء بن کر تشریف لائے ہیں۔ آپ رنج و مصیبت کو دور فرماتے، اور اپنی رحمت سے مسرور فرماتے ہیں۔ اور یہ میں ہی نہیں کہتا۔ خود خداوند کریم کا ارشاد ہے:-

یہاں ہر انسان کے لیے اپنے آغاز سے انجام کو پہنچنے کا صرف ایک واحد راستہ ہے جو ہے صراط مستقیم۔ اور جس پر چلے بغیر اس کے لیے کوئی چارہ نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے نالہ کو دریا میں اور دریا کو سمندر میں جانا خود بخود لازم ہوتا ہے۔ اور پانی کسی کی یا اپنی کوشش کے بغیر اپنے مقام کو پہنچ کر رہتا ہے۔

ادھر قرآن کا یہ فیصلہ ہے کہ صراط مستقیم ایک ایسی راہ ہے جس پر انسان اپنی کوشش و ارادہ سے چلا کرتا ہے۔ اور جب چلتا ہے تو بڑی محنت کے ساتھ منزل کو پہنچا کرتا ہے۔ نہ خود بخود پہنچتا ہے اور نہ آسانی کے ساتھ۔

۶۔ یہاں اس سوچ میں نہ پڑیئے کہ اس عجیب آغاز و انجام کا ماخذ قرآن کی کوئی آیت ہے یا کسی پاگل انسان کا دماغ۔ بلکہ اس سوچ میں پڑے بغیر اس کی الجھنگی کا شکار ہو جائیے۔ یہ ایک پاگل کی بات اس لئے ہو سکتی ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا صراط مستقیم پر چل رہا ہے تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے۔ کہ ساری کائنات بھی خدا کے ہمراہ ہو تو اس کے قدم آگے بڑھیں ورنہ نہیں۔ اور یہ کہنا کہ چونکہ خدا صراط مستقیم پر چل رہا ہے اس لئے کائنات بھی اس کی دیکھا دیکھی یہی کام کر رہی ہے۔ یہ معنی رکھتا ہے کہ جو کام خدا کرتا ہو وہ لازماً کائنات کو کرنا چاہیئے۔ خدا اگر بارش برسائے اور مارے جلائے تو کائنات کو بھی یہ کرنا ضروری ہے اور بالآخر اس کے حقوق خدائی کے بٹوارہ میں بھی اس کے پاس کائنات کے ہر فرد کو پہنچ جانا چاہیئے۔ یہ تو ہے اس کی معقولیت کا عالم زیبا۔ لیے اس ترتیب اور شکل کے ساتھ قرآن میں پا لینا تو یہ محال سے بھی زیادہ انہونی بات ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَکۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ ۫ یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ (پ ۹ ع ۹) وہ جو غلامی کریں گے۔ اس رسول بے پڑھے غیب کی خبریں دینے والے کی جسے لکھا ہوا پائیں گے اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں وہ انہیں بھلائی کا حکم دیگا۔ اور برائی سے منع فرمائے گا۔ اور گندی چیزیں ان پر حرام کرے گا۔ اور ان پر سے وہ بوجھ اور گلے کے پھندے جو ان پر تھے اتارے گا۔"

دیکھ لیجئے! اس آیت میں صاف صاف ارشاد ہو رہا ہے کہ وہ رسول کریم نبی عظیم صلی اللہ علیہ وسلم جس کا ذکر توراۃ اور انجیل میں بھی ہے۔ آمر بھی ہے ناہی بھی ہے۔ شارع بھی ہے۔ اور تکلیفوں کے بوجھ بھی اتارتا ہے۔ اور مصیبتوں کے پھندے بھی کاٹتا ہے۔ گویا دافع البلا ہے۔ تو فرمایئے قرآن سے حضور کا دافع البلاء ہونا ثابت ہوا یا نہیں؟ پھر جو حضور کو دافع البلاء کہنا شرک کہتے ہیں۔ خود ہی فیصلہ کر لیجئے۔ کہ جھوٹ کہتے ہیں۔ یا نہیں؟ ہمارا تو قرآن کے ارشاد وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ کے مطابق ایمان ہے کہ ؎

شافع امت نافع خلقت رافع رتبے بڑھاتے یہ ہیں
دافع یعنی حافظ و حامی دفع بلا فرماتے یہ ہیں
فیض جلیل خلیل سے پوچھو آگ میں باغ کھلاتے یہ ہیں

آمر و ناہی اور شارع

میرے بزرگو! یہ جو آیت ابھی ابھی آپ نے سنی۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آمر و ناھی — اور شارع بھی ہیں۔ یعنی آپ پاک چیزوں کو ہمارے لئے حلال فرماتے ہیں۔ اور ناپاک چیزوں کو حرام فرماتے ہیں۔ گویا آپ ہی کی زبانِ حق ترجمان ہمارے لئے شریعت ہے۔ آپ جو فرماویں وہی ہو جاتا ہے

۷۔ جس آیت کے ایک جزو کا یہ مفہوم ہے کہ خدا صراطِ مستقیم پر ہے وہ حضرت ہود کا بیان یعنی ان کی حدیث ہے۔ اور حدیث کے متعلق پرویز صاحب کا مسلم اصول یہ ہے کہ اس کی دین میں کوئی حیثیت نہیں۔ اور جب نہیں تو پھر یہ ایک اتنی بڑی لمبی چوڑی دماغی تخلیق کی بنیاد کیسے بن گئی؟ جس تخلیق میں انسان کے آغاز و انجام کے درمیانی فیصلہ میں خدا آگے آگے ہے۔ اور تمام کائنات کے کتے بلے اور گیدڑ بھیڑیے وغیرہ اس کے پیچھے پیچھے صراطِ مستقیم پر اپنے آپ سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ نہ کسی کو گم ہونے کا کھٹکا ہے۔ اور نہ گمراہ ہونے کا۔ کیا اس کے بعد بھی آپ کے ہوا پرست ہونے میں کوئی شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ جی میں آیا تو سارے ذخیرہ حدیث کو باطل کر دیا۔ اور دل کیا تو اس کے کسی ایک ٹکڑے کو اپنے رنگین عجائبات کا ماخذ بنا کر اس پر طلسمات کا اچھا خاصہ ایک محل تعمیر کر ڈالا۔ ورنہ حضرت ہود نے اپنی اس حدیث میں یہ کب فرمایا تھا کہ میرا رب صراطِ مستقیم پر خود بھی چلنے کی مشق کر رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ تمام کائنات کے کیڑوں مکوڑوں کو اپنے پیچھے ریل کے ڈبوں کی طرح لے کر چلنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے جس کا مطلب ہے کہ کائنات کا فرض کچھ بھی نہیں۔

۸۔ شئونِ الٰہیہ جو پرویز صاحب کے بقول خدا کے قدم ہیں۔ قرآن میں ان کے متعلق صرف اتنا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر روز ایک نئی شان میں ہے۔ اور آگے شان کے معنی قدم بنا لیا یہ پرویز صاحب کا ذاتی شاہکار اور قابلیت کا مظاہرہ ہے۔ ورنہ قرآن سے یہ کہیں بھی نہیں پایا جاتا کہ خدا ہر روز ایک قدم رکھتا ہے اور ایک اٹھاتا ہے۔ پھر اس پر غور کیجیے کہ صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے بھی چلنے

اور امت کے لئے شریعت بن جاتا ہے۔

حج چنانچہ آیئے اس حقیقت کو ایک حدیث میں بھی ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وعظ فرمایا۔ اور فرمایا:۔

اَیُّھَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَیْکُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوْا فَقَالَ رَجُلٌ اَکُلَّ عَامٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَسَکَتَ حَتّٰی قَالَھَا ثَلٰثًا فَقَالَ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ ۔۔۔ (مشکوٰۃ شریف ص۲۱۳) ۔" اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے۔ لہٰذا حج کیا کرو۔ ایک شخص نے پوچھا کیا ہر سال یا رسول اللہ! حضور خاموش رہے۔ اس شخص نے تین بار یہی سوال کیا۔ حضور نے فرمایا۔ اگر میں ہاں کہہ دیتا۔ تو ہر سال ہی حج فرض ہو جاتا۔ اور تم اس کی طاقت نہ رکھتے۔"

حضرات! اس حدیث سے ثابت ہوا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حق ترجمان سے اگر ہاں نکل جاتی۔ تو ہم پر ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ گویا آپ کا ارشاد ہی امت کے لئے شریعت ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو۔ جب کہ اس زبان سے نکلتی ہی وہ بات ہے۔ جو اللہ کی مرضی کی ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۔ (پ۲۷ ع ۵)۔" اور وہ کوئی بات ہی خواہش سے نہیں کرتے۔ وہ تو نہیں مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔"

معلوم ہوا۔ کہ حضور جس کام روک دیں۔ اس کام پر اللہ بھی ناراض ہے اور جس کام کا حضور ارشاد فرمائیں۔ خدا بھی اسی کام پر خوش ہے ؎

جنابِ مصطفےٰ ہوں جس سے ناخوش ؞ نہیں ممکن کہ ہو اس سے خدا خوش
پسندِ حق تعالےٰ تیری ہر بات ؞ ترے انداز خوش، تیری ادا خوش

میرے بزرگو! اور دوستو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آمر و ناہی۔ اور شارع ہونا ایک واقعہ اور حقیقت ہے۔ مگر اس دور الحاد میں ایک

والوں کے سر پر یہ معصیت باقی رہی کہ وہ خدا کے قدم بہ قدم چلیں۔ تو ان کا چلنا معتبر ہو ورنہ نہیں۔ حالانکہ دنیا میں یہ اندھیر گردی کہیں بھی نہیں۔ اور ایک آدمی جب ایک صحیح راستہ پر چل پڑتا ہے تو اس کے لئے کسی کے نشاناتِ قدم پر چلنا ضروری نہیں ہوتا۔ پھر اس مقصد کے لیے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ خدا کے پیچھے چلنے والی تمام کائنات ایک دوسرے کے پیچھے چلنے کی بجائے ایک دوسرے کے برابر صف کی شکل میں چلے۔ دوسری یہ کائنات کے افراد میں سے ہر فرد کے برابر خدا کا قدم ہو۔ ورنہ اگر اس کے قدم اونٹ کے قدم کے برابر ہوں۔ تو چیونٹی ان کی پابندی کبھی نہیں کر سکتی اگرچہ خدا اس پر اور ہر ایک کام پر قادر ہے۔ مگر دنیا میں تو اس طرح صف بندی کی شکل میں خدا کے قدم بقدم پوری کی پوری کائنات کا چلے جانا کہیں کسی کو بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس بنا پر یہ نرا خیالی نقشہ ہی ٹھہرا۔ اور یوں عقل کل ایسا ہو سکتا ہے جو اس خیالی نقشہ کے ان ہوائی اشاروں پر خود اپنے یا معاشرہ کے نظام زندگی کو تعمیر کر لے۔

۹۔ مدارج انسانیت کی وضاحت قرآن میں کہیں نہیں۔ یہ شاید اقبال مرحوم کی خوشہ چینی ہے۔ اقبال بھی اگر آج ہوتے تو اپنے خیالات پر اس ظلم عظیم کا اندازہ فرماتے۔ ارتقائے انسانیت تو سنا تھا۔ یہ ارتقائے مدارج انسانیت معلوم نہیں کیا چیز ہے۔

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ یہ ہے خدا کے نشانات قدم پر انسان کا چلنا ادھر اقبال ہی اپنی مثنوی اسرار و رموز میں انسان کیلئے انبیاء علیہم السلام کے

کافرانہ عقیدہ یہ بھی پھیلایا جا رہا ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) شارع نہیں ہیں۔ آپکے ارشاد سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہے قرآن ہی ہے۔ اور حدیث کوئی شے نہیں (معاذ اللہ) چنانچہ یہ عقیدہ آج کل کے ملحدین قرآن کا لبادہ اوڑھ کر انکارِ حدیث کے سلسلہ میں پھیلا رہے ہیں اور صاف لکھ رہے ہیں۔ کہ حدیث ایک سحر ہے۔ اور اس کو آگے لانا ملّا کی ایجاد ہے۔ اور ہمارا جھگڑا ملّا سے اسی بات پر ہے۔ کہ وہ حدیث کو آگے کیوں لاتا ہے، چنانچہ اس قسم کا ایک منکرِ حدیث لکھتا ہے:۔

"آج ساری ملت اسلامیہ حدیث کی اس ساحری میں گرفتار ہو چکی ہے"

(طلوعی کتابچہ دو اسلام ص۱۴) — "ملا سے میرا نزاع اس بات پر ہے کہ وہ حدیث کو آگے لا کر بے شمار ظواہر کو جزوِ اسلام بنانا چاہتا ہے" (ص۱۱)

دیکھا آپ نے! یہ یورپ زدہ طبقہ۔ حیوانوں کی طرح کھڑے ہو کر موتنے والا گروہ حدیثِ رسول اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیسے ناپاک خیالات رکھتا ہے۔ ان لوگوں کا مقصد یہ ہے۔ کہ حدیثِ رسول کو برطرف کر کے قرآن میں اپنی من مانی کاروائیاں کی جائیں۔ اور حلال حرام کا امتیاز اڑا کر گویا اس شعر کے مطابق عیش اڑائیں۔ کہ ؎

کہاں کا حلال اور کہاں کا حرام
جو صاحب کھلائے وہ چٹ کیجئے

اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا گویا ترانہ یہ ہے کہ ؎

منظور ہے کہ سیم تنوں کا وصال ہو
مذہب وہ چاہیے کہ زنا بھی حلال ہو

چنانچہ دیکھ لیجئے۔ کہ قرآن پاک میں حلال و حرام کی فہرست بہت مختصر ہے۔ اس کی تفصیل تو بارشادِ قرآن يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ۔ حضور ہی کی زبان پاک سے معلوم ہوئی۔ اور وہ ساری تفصیل احادیث شریفہ میں ہے۔ اور ان لوگوں نے احادیث کا انکار کر کے گویا

نشانات[1] قدم کو دلیل راہ ٹھیرا لیتے ہیں۔ اور یہ ہے بھی عقل کی بات کہ انسان انسانوں کے قدم بقدم چلنے کا مکلف ہو۔ ورنہ خدا کے نشانات قدم کو پالینا اور ان پر چلنا کسی انسان کے لئے کسی طرح ممکن نہیں۔ مگر جہاں تخیلات کی دنیا آباد کرنا مقصود ہو وہاں یہ سوچنا ضروری نہیں ہوتا کہ بات کسی ڈھب کی ہو۔

۱۔ قرآن میں جو متواتر مقامات پر خدا کے عرش پر متمکن ہونے کا بیان موجود ہے اس کا تو پرویز صاحب مزاح کرتے ہیں۔ اور جہاں ہوائے نفس کی تسکین کے لئے ارتقاء اور بلندی کی سیر کو نکلے تو اللہ رب العزت کو سیڑھیوں والا خدا بنا ڈالا۔ اور یہ نہ سوچا کہ اگر خدا[2] کہیں اوپر بالا خانے میں آرام فرما ہے جس کے پاس سیڑھیوں کے ذریعہ چڑھ کر پہنچا جا سکتا ہے تو پھر خدا کو اور تشریف لیجانا کیوں ضروری ہوا۔ ایسے تو یہیں زمین پر لوگوں سے گھل مل کر رہنا چاہیئے تھا۔ اور یہی اسکا اوپر اور کسی جہت میں نہ ہونا ہی تو قرآن کے خلاف کہا تھا۔

قرآن میں صرف اتنا ہے کہ مراتب یا آسمانوں والے خدا کے ہاں صرف فرشتے اور روح ہی اوپر کو جاتے ہیں پر پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اگر خدا نے تنہا

---

[1] تارک آئین براہیم خلیل — انبیاء را نقش پائے او دلیل۔

[2] اللہ تعالیٰ جو کائنات کے ہر مقام پر موجود ہے مکان و زمان کی تمام نسبتوں سے منزہ و مبرا ہے اور جہت سمت کے تمام ؎

اپنے لئے کھانے پینے میں آزادی حاصل کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے۔ اسی لئے انہوں نے لکھ دیا ہے۔ کہ قرآن میں مردار۔ خون۔ سوّر کا گوشت اور جو قت ذبح غیرخدا کے نام سے پکارا ہوا جانور صرف یہ چار چیزیں حرام بیان کی گئی ہیں۔ اور ــــ "ان کے علاوہ اور کچھ حرام نہیں۔ خدا کہتا ہے۔ ہم نے صرف چار

چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ملا کی شریعت حرام و حلال کی ایسی ایسی لمبی لمبی فہرستیں پیش کرتی ہے۔ کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔" (طلوع اسلام ماہ جون ۵۳ء)

کچھ سمجھے آپ؛ "ملا کی شریعت" کی آڑ میں "حدیث رسول" پر وار ہو رہا ہے۔ کیونکہ ان چار چیزوں کے علاوہ دوسری ناپاک چیزیں اللہ کے رسول نے حدیث میں حرام قرار دی ہیں۔ اور ملا انہیں کو پیش کرتا ہے۔ مگر چونکہ حدیث رسول پر ایمان نہیں رہا۔ اس لئے ان چار چیزوں کے سوا ان کے لئے سب کچھ حلال ہے گویا کتا۔ بلا۔ بندر۔ گدھا۔ سانپ۔ بچھو۔ گوہ۔ موت۔ پیپ وغیرہ اور جملہ خبیث درندے۔ پرندے اور گندی چیزیں سب کچھ ان کے لئے حلال، طیب، طاہر اور شیر مادر ہیں۔ پھر آگے لکھتے ہیں:-

"اللہ نے جو چیزیں حرام قرار نہیں دی ہیں۔ ان میں سے طبیعت کی رغبت اور پسند کے مطابق کھانی چاہئیں۔" (رسالہ مذکور)

گویا کسی منکر حدیث رسول کی طبیعت کتا کھانے پر چاہے تو بیشک کھائے۔ اور دوسرے کی رغبت اگر گوہ تناول فرمانے پر ہو۔ تو بیشک تناول فرمائے۔ اس صورت میں منکرین حدیث کا قومی ترانہ یہ موزوں رہے گا کہ ؎

اے پیٹ تیرے واسطے ہم کیا سے کیا بنے
منکر حدیث کے ہوئے اور بے وفا بنے
ملا کی بات چھوڑ طبیعت کا دیکھ رُخ
گوہ، موت اور کتا و بندر غذا بنے

قدرت کا انتقام

میرے بھائیو! اگر غور کیا جائے۔ تو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے والے منہ کی اس دنیا میں بھی یہ

فرشتوں اور روح کو اپنے حضور مشرف ہونے کا اعزاز بخش کر ان کے ساتھ لے جا اور خصوصی مروّت کا ثبوت دیا ہے۔ تو اب ہم زبردستی اس کی بلا اجازت خود ہی اس کے پاس پہنچ کر رہیں گے۔ کیونکہ خدا کا اور خدا کی سیڑھیوں کا سراغ تو بہر حال آپ کو مل گیا۔ اس کے بعد پھر ارضی مخلوق کے اندر رہنا پست ہمتی نہیں تو اور کیا ہے۔

۱۱۔ ملاحظہ ہو عناد کا کرشمہ۔ حدیث معراج پر اپنی چرب زبانی سے گندگی اور غلاظت کے ڈھیر ڈال دیئے۔ اس کے ایک ایک جزو کی رسوائی کی۔ اور ظاہر کیا کہ آنحضورؐ کے سامنے دودھ اور شراب کے پیالے پیش کرنے کا قصہ کتنا بیہودہ ہے۔ اور نمازیں کس بھونڈے طریقہ پر فرض ہوئیں۔ اس کے بعد جو یکایک خدا کی عظمت کی سوجھی تو اس کے دامن تقدس سے روایات کے داغ دھبے یہ کہہ کر دھونے بیٹھ گئے کہ یہ خیال خدا کی شان کے بالکل خلاف ہے۔ کہ اس کے کہیں اوپر کی جانب ہونے کو مانا جائے۔ ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ خدا ہر مقام پر موجود ہے۔ اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ وہ اوپر کی طرف اور عرش پر نہیں اور نہیں تو کیوں نہیں۔ جب ہر جگہ موجود ہے تو اوپر کیوں موجود نہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ عرش اور آسمانوں پر اس لئے موجود نہیں کہ حدیث کو جھٹلانا ہے۔ ورنہ ویسے تو اگر اس کے ہر جگہ موجود ہونیکو مانا جائے

---

* تصورات سے بلند و بالا ہے۔ اسے آسمانوں پر کسی خاص مقام پر متعین کر دینا قرآن کے تصور ربوبیت کے کس قدر منافی ہے۔ ط ۲۳۶

سزا ملی ہے۔ کہ اے گستاخ منہ! تجھ سے جب یہ ناپاک کلمے نکلے ہیں۔ تو لے یہ ناپاک چیزیں کھا۔

تقویۃ الایمان

حضرات! یہ تو ذکر تھا منکرین حدیث چکڑالویوں کا مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے۔ کہ وہابیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ حضور کا ارشاد شریعت نہیں ہے۔ چنانچہ دیکھئے ان کی مذہبی کتاب تقویۃ الایمان کیا کہتی ہے؟ اس میں صاف یہ لکھا ہے۔ کہ

"یا خود پیغمبر کو یوں سمجھئے۔ کہ شرع انہیں کا حکم ہے۔ ان کا جو جی چاہتا تھا۔ اپنی طرف سے کہہ دیتے تھے۔ اور وہی بات انکی امت پر لازم ہو جاتی تھی۔ سو ایسی باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے (تقویۃ الایمان صلا)

دیکھ لیجئے! تقویۃ الایمان نے بھی وہی کچھ لکھ دیا۔ جو کچھ منکرین حدیث کا عقیدہ ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے۔ کہ تشریع رسالت کے انکار کی سزا میں اگر منکرین حدیث نے گندی چیزیں کھائی تھیں۔ تو اسی قسم کی سزا ان لوگوں کو بھی ملی۔ چنانچہ ان لوگوں کے قطب — مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی سے کسی نے سوال کیا۔ کہ گاؤ کی اوجھڑی اور بکرے کے کپورے کھانے درست ہیں یا نہیں؟ تو مولوی صاحب نے جواب دیا۔

الجواب - درست ہیں۔ (فتاویٰ رشیدیہ صنا ج ۳)

حضرات! عبرتناک نظارہ ہے۔ جس منہ سے گیارہویں شریف کے طیب وطاہر کھانے کے متعلق ناجائز اور حرام ہونے کا فتوے صادر ہوتا تھا۔ اس منہ میں دیکھئے کیا نظر آ رہا ہے۔

اور سنیئے — ! سائل پوچھتا ہے۔ کہ کوا کھانے والے کو عذاب ہوگا یا ثواب؟ گنگوہی صاحب جواب دیتے ہیں:-

الجواب :- ثواب ہوگا۔ (فتاویٰ رشیدیہ صـ۱۶۳ ج ۲)

یہ ہے قدرت کا انتقام! کہ تشریعِ رسالت کے انکار کی سزا میں کسی کو کتا۔ بلا۔ بندر۔ اور گوہ۔ موت کھانا پڑا۔ اور کسی کو کپورے اور کوے۔ لہذا اے مسلمانو! اپنا ایمان مضبوط رکھو۔ اور اس بات پر یقین رکھو۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ

تو اسے آسمانوں پر بھی موجود ماننا لازم آتا ہے۔

۱۲۔ یہ ہے خرابی اور فساد کی اصل بنیاد کہ آدمی خود ہی ایک خوشنما تصویر اپنے دماغ میں رکھ لیتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد واقعات و معاملات پر غور کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ اور ان کی موجودہ شکل و ہیئت کے مطابق اپنے دماغی تصور کو بدلنے کی بجائے انہیں اپنے دماغی تصور کے مطابق بنانا اور ڈھالنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ طریق غور و فکر ویسے تو ہر جگہ ناپسند ہوتا ہے۔ مگر قرآن و حدیث کے واقعات و احکام میں تو اس سے کام لینا انتہائی خطرناک نتائج کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ایک آدمی کسی فن طب کی کتاب کا مطالعہ کرنے بیٹھے اور پہلے اپنے دماغ میں کامیاب ڈاکٹری اور طب کا ایک تصور قائم کرے تو وہ اس کتاب کے کسی بھی حصّہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اِلاّ ماشاء اللہ۔ اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس کتاب کے اندر درج ہونے والی ہر ہدایت اور نسخہ ہر حال میں اس کے دماغی تصور کے مطابق ہی اترے۔

اس مقام کے مناسب اب یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ آنحضور کا واقعہ معراج اور خدائے تعالیٰ کا صراطِ مستقیم پر ہونا۔ یہ دونوں باتیں متشابہات میں سے ہیں۔ قرآن کی وضاحت کے مطابق قرآنی آیات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محکمات اور دوسری متشابہات۔ پہلی آیتیں وہ ہیں جنہیں انسان عام طور پر سمجھ لیتے ہیں۔ اور دوسری وہ ہیں جنکا کوئی واضح مفہوم نہیں ہوتا۔ اس بارہ میں قرآن کی واضح ہدایت یہ ہے کہ چونکہ متشابہات کی حقیقت کا ادراک انسانی دماغ کی طاقت سے باہر ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی حقیقت میں مغز کھپانے

علیہ وسلم آمر و ناہی اور شارع ہیں۔ آپ جو کچھ بھی ارشاد فرمائیں وہ ہمارے لئے شریعت ہے۔

ہاں! تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم رحمت ہیں۔ اور رحمت کا کام زحمت کو دور کرنا ہے۔ بنا بریں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مخلوق کی زحمتوں کو دور فرمایا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مصیبت کے وقت حضور ہی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ چنانچہ سنیئے:۔

بالکل سفید آنکھوں میں نور پیدا کر دیا

حضرت حبیب بن فدیک رضی اللہ عنہ کے والد اسی سال کے تھے اور بالکل نابینا ہو گئے تھے۔ حدیث میں آتا ہے۔

اِنَّ اَبَاہُ خَرَجَ بِہٖ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ ایک دن حبیب بن فدیک کے والد اپنے بیٹے کے ساتھ حضور علی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی نابینا آنکھیں پیش کیں۔ حضور نے دریافت فرمایا کہ انہیں کیا ہوا۔ انہوں نے عرض کیا۔ حضور! آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں مگر ایک دن ایک سانپ کے انڈے پر میرا پاؤں جا پڑا۔ تو اسی وقت دونوں آنکھیں اندھی ہو گئیں"۔

فَنَفَثَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ عَیْنَیْہِ فَاَبْصَرَ وَ ھُوَ یُدْخِلُ الْخَیْطَ فِی الْاِبْرَۃِ۔ رحمۃ اللہ علی العالمین ص۲۲۲)"۔

"حضور نے ان کی آنکھوں میں اپنا تھوک مبارک ڈالا۔ تو وہ فوراً دیکھنے لگے۔ اور نظر اس قدر تیز ہو گئی۔ کہ سوئی میں دھاگا ڈال لیتے تھے"۔

دیکھا مسلمانو! صحابہ کرام مصیبت کے وقت حضور کے پاس ہی پہنچتے تھے اور وہیں سے رحمت پاتے تھے۔ اور پھر یہ بھی دیکھو کہ حضور بھی یہ نہیں فرماتے۔ کہ میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔ جو کچھ لینا ہے۔ خدا سے لو۔ نہیں نہیں۔ صحابہ کا تو ایمان ہی یہ تھا۔ اور حضور کی بھی تعلیم یہی تھی کہ

کی بجائے ان پر صرف ایمان لا کر انہیں مان لیا جائے۔ جیسی کچھ وہ ہیں اور عمل کی اصل توجہ کا مرکز محکمات کو بنایا جائے۔ اور انہیں کو عام سمجھ کے مطابق عمل میں لایا جائے۔[۱]

عقل پرستوں کی طرف سے اس پر یہی اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ جب متشابہات میں بیان ہونے والے امور عقل سے باہر تھے۔ تو انہیں قرآن میں لایا کیوں گیا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ سوال بھی متشابہات سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انہیں کی طرح ناقابل حل ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے۔ کسی چیز کے سمجھ سے باہر ہونے کا تقاضا یہ کبھی نہیں ہوتا۔ کہ وہ سرے سے ہو ہی نہیں۔ اور نہ انسان کے سامنے آئے۔ عالم موجودات میں لکھوکھا چیزیں ایسی ہیں جو موجود ہوتی ہیں۔ مگر انسان ان کے وجود اور حقیقت سے بالکل بے خبر ہے۔ اور سب بے خبر انسانوں سے احمق ترین انسان وہ ہے جو یہ کہے کہ ایسی چیزیں پھر ہیں کس لئے جن سے ہم واقف نہیں۔ اس لئے کہ جس چیز کے بنانے اور مٹانے میں انسان کے ارادہ واختیار کو کچھ بھی دخل حاصل نہ ہو۔ اس کے ہونے اور نہ ہونے کے اسباب پر اس کا بحث کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ کیونکہ اس کے اسباب خواہ کچھ ہوں وہ بہرحال ہے۔ ادھر

---

[۱] یہاں ہم جس عقل کی بات کر رہے ہیں وہ خدا کی قائل اور اسے ماننے والی ہے ورنہ مطلق عقل پرستی کا تقاضا تو یہی ہے کہ سرے سے خدا کو نہ مانا جائے چنانچہ دہریت کے خیال کی اصل بنیاد یہی دعویٰ ہے کہ خدا چونکہ ہماری عقل ※

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مَفَر مقر ! !
جو وہاں سے ہو یہیں آکے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

زخموں کو اچھا کر دیا

اور سنئے! حضرت حارث بن اوس رضی اللہ عنہ کو ایک جنگ میں سر اور ٹانگوں میں تلوار کے بڑے بڑے زخم آگئے۔ حدیث کے لفظ ہیں۔ فاحتملوہ فجاؤا بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "صحابہ کرام اسے اٹھا کر حضور کے پاس لے آئے"

دیکھ لیجئے! اس مصیبت میں صحابہ کرام کہاں پہنچے۔ حدیث میں موجود ہے۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس۔ پھر کیا ہوا۔ سنیئے!
فتفل علی جرحہ فلم یؤذہ ـــ "حضور نے اس کے زخموں پر تھوک مبارک ڈالا۔ تو وہ اچھے ہو گئے" (کتاب مذکور صـ۲۴)

ٹوٹی ہوئی ٹانگ درست کر دی

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ کی کوٹھے پر سے گر جانے کے سبب ٹانگ ٹوٹ گئی۔ حضرت عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:-

فحدثت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ـــ تو میں نے اپنی یہ تکلیف حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے بیان کی"

دیکھ لیجئے۔ تکلیف کا بیان ازالہ تکلیف کے لئے کس کے سامنے کیا؟ حضور کے سامنے پھر کیا ہوا؟

فقال ابسط رجلک فبسطتھا فمسحھا فکانھا لم اشکھا قط (کتاب مذکور صـ۲۵) حضور نے فرمایا ٹانگ پھیلاؤ۔ میں نے پھیلائی۔ تو حضور نے اپنا دستِ رحمت اس پر پھیرا۔ تو میری ٹانگ اس طرح ٹھیک ہو گئی۔ جیسے کبھی ٹوٹی ہی نہ تھی"

مسلمانو! اس قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ صحابہ کرام مصیبت کے وقت حضور کے پاس پہنچتے تھے۔ آخر کیوں؟ صرف اس لئے کہ یہی بارگاہِ رحمت ہے۔ زحمتوں کا ازالہ اسی درِ رحمت سے ہو سکتا

جب ہم غور کرتے ہیں تو متشابہات سے کسی بھی کلام کو خالی نہیں پاتے۔ اگر آپ کہیں کہ آگ جلاتی ہے اور پانی بجھاتا ہے تو اس میں بھی تشابہ کا پہلو یہ موجود ہے کہ اس پر شبہ گذرتا ہے کہ شاید یہ دونوں عناصر ارادہ و اختیار اور قوت کے مالک ہیں اور اپنے اختیار کے ساتھ جلاتے اور بجھاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں نہ وہ قوت کے مالک ہیں اور نہ ارادہ کے مالک ہیں۔ بلکہ ان سے صرف ان کا خالق اپنے منشا کے مطابق یہ کام لے رہا ہے۔ ہمیں جو اس میں تشابہ کا سراغ نہیں ملتا تو محض اس لئے کہ ہمارے روزمرّہ بول چال میں اسباب کے واقعہ ہونے اور بکثرت واقع ہونے سے ہر آدمی سمجھ چکا ہے کہ جب آگ جلاتی ہے تو اپنے ارادہ کیساتھ نہیں جلاتی یہ حال جب انسانی کلام کا ہے کہ اس کا کوئی جزو بھی تشابہ سے خالی نہیں اور یہ اشتباہ

---

* میں نہیں آتا اس لئے اسے نہ مانا جائے مطلب یہ ہوا کہ انکی عقل میں جو کچھ نہ آئے اسے نہ مانا جائے خواہ وہ موجود ہو۔ اور اس سے بڑھکر موحد بھی ہوا اسی سے ملتا جلتا حال مذہبی عقل پرستوں کا ہے۔ ان کے ہاں اولین مقام عقل کا ہے اور بعد میں خدا کا۔ اس بنا پر وہ خدا کے بڑے پکے معتقد ہیں مگر ہیں اسلئے کہ انکی عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ خدا کو آغاز کائنات کی ضرورت کے تحت یا کسی اور وجہ سے مانا جائے آج اگر ان کی عقل کا فیصلہ کہیں اس کے خلاف صادر ہو تو بجائے اس کے کہ وہ عقل کو ناخن لیں خدا کا انکار کر دیں گے مختصر یہ کہ عقل پرست عقل کے فیصلہ کے تحت خدا کو مانتے ہیں اور خدا پرست خدا کی ہدایت کے تحت عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور جہاں خدا کی ہدایت اور عقل کے درمیان نزاع پیدا ہو تو یہ اس لیے عقل کو چھوڑ کر خدا کی بات مان لیتے ہیں کہ اس کی ہر بات کا سمجھنا عقل کا منصب نہیں۔*

ہے۔ اسی لئے صاحبِ قصیدہ بردہ شریف نے بھی لکھا ہے کہ ؎

یَا اَکْرَمَ الْخَلْقِ مَالِیْ مَنْ اَلُوْذُ بِہٖ
سِوَاکَ عِنْدَ حُلُوْلِ الْحَادِثِ الْعَمَمِ

"یعنی اے بہترین خلائق صلے اللہ علیہ وسلم، میں مصیبتوں کے وقت آپکے سوا اور کس کی پناہ میں جاؤں۔ یعنی اہل مصائب کی جائے پناہ صرف ایک آپ ہی کی تو ذات ہے۔"

حضرت امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ کو لاعلاج بیماری سے شفا دیدی

میرے بزرگو! حضرت امام قسطلانی علیہ الرحمۃ، جو بہت بڑے امام و محدّث ہیں اور بخاری شریف کے شارح بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب مبارک مواہب لدنیہ میں اپنی ایک بیماری کا اور اس سے شفا کا تذکرہ فرمایا ہے۔ سنیے! امام موصوف فرماتے ہیں۔ کہ "مجھے ایک ایسی بیماری لگ گئی۔ جس کا علاج کر کرکے طبیب تھک گئے۔ اور انہوں نے اس بیماری کو لاعلاج قرار دے دیا۔ فرماتے ہیں۔ کہ جمادی الاولیٰ ۸۹۳ھ کی اٹھائیسویں شب کو میں نے مکہ معظمہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی۔ اور مدد چاہی ــــ امام موصوف کے الفاظ یہ ہیں:-

فَاسْتَغَثْتُ بِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃَ الثَّامِنِ وَالْعِشْرِیْنَ مِنْ جُمَادِی الْاُوْلٰی سنۃ ثَلَاثٍ وَتِسْعِیْنَ وَثَمَانَ مِائَۃٍ بِمَکَّۃَ زَادَھَا اللّٰہُ شَرَفًا ــــ میں نے اس بیماری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد چاہی۔ جمادی الاولیٰ ۸۹۳ھ ہجری کی اٹھائیسویں شب کو مکہ معظمہ میں۔"

دیکھیے! امام موصوف تین سو میل دور مکہ معظمہ میں بیٹھ کر حضور سے مدد مانگ رہے ہیں۔ اور بیماری کے ازالہ کے لئے فریاد کر رہے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ مسلمان کا ایمان ہی یہ ہے کہ ؎

فریاد امتی جو کرے حالِ زار کی ∴ ممکن نہیں کہ خیر بشر کو خبر نہ ہو

امام موصوف فرماتے ہیں کہ میں نے جب فریاد کی تو:-

صورت ہیں کہ انسان کی ہر ادا سے ہم واقف ہو سکتے ہیں۔ تو خدا کے کلام میں تشابہ کا ہونا کونسی حیرت کی بات ہے۔

دوسری چیز اس مقام پر یہ ہے کہ متشابہ آیت وحدیث کے متعلق چار طرح کے لوگوں کے چار مذاہب ہیں۔ ان میں سے ایک گمراہ ہے۔ اگرچہ مسلمان چاروں ہیں۔ گمراہ گروہ وہ ہے جو اسلام کو ناقص پاکر خود اپنے خیال سے[1] اپنے دماغ میں ایک خوبصورت تصور قائم کر لیتا ہے۔ پھر اس تصور کو مقبول عام بنانے کے لئے پہلے متشابہات سے کام لیتا ہے۔ اور جب محکم آیات کے احکام اس کے آڑے آتے ہیں۔ تو انہیں متشابہات پر قیاس کر کے انہیں کے مقام پر لاتا ہے۔ اور ان میں من مانی کارروائی اور تصرف کرتا ہے۔ یہ حال قرآن کا کر ڈالنے کے بعد جب اس سے احترام حدیث کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ تو اسے خلاف عقل کہکر وہ سرے سے اس کا غلط ہونا ظاہر کر دیتا ہے۔ اور قرآن و حدیث کے اس طرح کس بل نکالتے چلے جاتے ہوئے وہ اپنے مصنوعی تصور اسلام سے کبھی ہٹنے کا نام تک نہیں لیتا۔

---

*٭ اور وہ خدائی بات کو چھوڑ کر اس لئے عقل کی پیروی کرتے ہیں کہ خدا کی ہدایت کا عقل کے خلاف ہونا ممکن نہیں۔ البتہ یہ وہ نہیں بتاتے کہ عقل کے ہوتے ہوئے خدا کی ہدایت کیوں ضروری ہے

[1] اسکی نہایت شاندار مثال پرویز صاحب کی شخصیت ہے آپکی اس ساری خدایت اسلام و قرآن کے باوجود جس کا اظہار کیا جاتا ہے کوئی ایک چیز بھی قرآن سے ایسی نہیں بتائی جا سکتی جسے آپنے حمایتہ بنا ڈالا ہو۔ چنانچہ آپکی کتاب نظام ربوبیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کمیونزم کا دستور عمل ہے۔ ہر بات کو قرآنی اصطلاح کا نام دیکر ٭

فَبَیْنَا اَنَا نَائِمٌ اِذْ جَاءَ رَجُلٌ مَعَهٗ قِرْطَاسٌ یُکْتَبُ فِیْهِ هٰذَا دَوَاءُ دَاءِ اَحْمَدَ بْنِ الْقَسْطَلَانِیْ مِنَ الْحَضْرَۃِ الشَّرِیْفَۃِ بَعْدَ الْاِذْنِ الشَّرِیْفِ

میں سو رہا تھا۔ کہ ایک شخص آیا۔ جس کے پاس کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس پر یہ لکھا تھا: "یہ احمد بن قسطلانی کے مرض کی دوا ہے بارگاہِ شریف سے اذنِ شریف کے بعد"

امام موصوف فرماتے ہیں:۔

ثُمَّ اسْتَیْقَظْتُ فَلَمْ اَجِدْ بِیْ وَاللّٰهِ شَیْئًا مِّمَّا کُنْتُ اَجِدُهٗ وَحَصَلَ الشِّفَاءُ بِبَرَکَۃِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ــــ پھر میں جاگا تو اللہ کی قسم مجھے جو بیماری تھی۔ وہ بالکل نہ رہی اور حضور کی برکت سے مجھے شفا ہو گئی"　　(مواہب لدنیہ صفحہ ۳۹۲ ج۲)

حضرت فقیہہ اعظم علیہ الرحمۃ کو مرض فالج سے شفا دیدی

میرے بزرگو! دوستو!! اور عزیزو!!! یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے۔ اور ایک دنیا جانتی ہے کہ والدی المعظم حضرت فقیہہ اعظم رحمۃ اللہ علیہ پر مرض فالج کا حملہ ہوا۔ اور آپ سخت بیمار ہو گئے۔ ان دنوں سیالکوٹ چھاؤنی میں ایک بنگالی ڈاکٹر تھا۔ جو بڑا قابل تھا۔ اُسے لایا گیا۔ اس نے حالت دیکھ کر مایوسی کا اظہار کیا۔ اور بتایا کہ فالج پیر بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ تاہم علاج کرتا ہوں۔ اس نے علاج شروع کیا۔ مگر بد دلی کے ساتھ۔ حضرت والد ماجد کی حالت یہ تھی۔ کہ دونوں ٹانگیں بالکل بے جان ہو چکی تھیں۔ کھڑے ہونا تو درکنار، بیٹھ بھی نہ سکتے تھے۔ ہم سب بڑے پریشان تھے کہ والد ماجد علیہ الرحمۃ کا عشقِ رسول رنگ لایا۔ اور ایک عجیب کرشمہ کا ظہور ہوا۔ جسے اس بنگالی ڈاکٹر نے۔ کوٹلی والوں نے۔ ہندو اور مسلمانوں نے سیالکوٹ کے کئی باشندوں نے اپنے اور بیگانوں نے۔ الغرض سب نے دیکھا۔ اور میں نے اخبار الفقیہہ امرتسر ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء میں اس پیارے واقعہ کو شائع کر دیا۔

حضرات! بات یہ ہوئی کہ ایک رات جبکہ والد ماجد سو رہے تھے اور

دوسرا گروہ متشابہات کی مناسب تاویل کرتا ہے مثلاً جہاں خدا کے ہاتھوں کا قرآن میں ذکر ہے اس سے مراد ہے اس کی قدرت اور تصرف۔ اور عرش و کرسی سے مراد ہے اس کا غلبہ و اقتدار۔ اس گروہ کا نقطہ نظر غلط ہونے کے باوجود جاذب نظر ضرور ہے۔ اور غلط اس لئے ہے کہ متشابہات کی تاویل کرنے کا اور ان میں کلام کرنے کا قرآن میں کہیں بھی حکم نہیں دیا گیا۔

تیسرا گروہ تفویض و سپردگی کا پہلو لے کر کہتا ہے کہ متشابہات کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کہ وہ کیا ہیں۔ انکا علم صرف اللہ کو ہے۔ یہ گروہ پہلے دو گروہوں کی نسبت کم غلطی پر ہے۔ اور غلطی پر اس لئے ہے کہ ایسی سپردگی کا قرآن میں کہیں بھی حکم نہیں دیا گیا کہ خدا کیطرف سے ایک چیز پر ایمان لانے کا حکم دیا جائے اور انسان کہے کہ میں نہیں جانتا کہ یہ چیز کیا ہے۔ چوتھا گروہ متشابہات پر ایمان لاکر کہتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو بات بھی جن الفاظ میں کہی گئی اسے انہیں الفاظ میں مانا جائے۔ بغیر اس کے کہ اس کی تحقیق میں پڑا جائے۔ اس لئے کہ خدا نے ان کی حقیقت کے سراغ لگانے کا کہیں بھی حکم نہیں فرمایا جو کچھ فرمایا ہے وہ صرف یہ ہے کہ دوسری آیات کی طرح متشابہات پر بھی ایمان لایا جائے۔ یہی اہل حق کا گروہ ہے۔

متشابہات کے ان چاروں مذاہب پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فساد کا اصل نقطہ آغاز ہے۔ قرآن کو اپنی عقل کے تابع بنانا۔ مثلاً عقل یہ چاہتی ہے کہ خدا کو انسانوں کی طرح کسی خاص طرف اور مقام سے مقید نہ مانا جائے۔ اس وجہ سے قرآن و حدیث میں جہاں کہیں اس خیال کے خلاف کچھ نظر آیا۔ فوراً عقل

میں پاس بیٹھا پنکھا ہلا رہا تھا۔ اچانک سوتے میں حضرت والد ماجد علیہ الرحمۃ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں حیران رہ گیا۔ کہ یہ کیا بات ہے۔ اسی وقت والد ماجد بیدار ہوئے۔ اور مجھ سے پوچھا کہ تم نے کچھ دیکھا؟ میں نے عرض کیا کہ آپ سوتے ہوئے رو رہے تھے۔ پھر رو کر فرمایا کہ حضور نبیِ کریم رؤف و رحیم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ اور اپنے دستِ رحمت سے میری بند آنکھوں کو کھول کر فرمایا۔ کہ آنکھیں کھولو۔ اب ہم ایک دوسرے مریض کی جانب جا رہے ہیں۔"

والد ماجد نے پھر فرمایا کہ حضور میری آنکھیں کھول کر مجھے اچھا فرما گئے ہیں۔ مجھے اٹھاؤ۔ میں اب اچھا ہوں۔ چنانچہ اسی وقت ہم نے انہیں کھڑا کیا تو یہ دیکھ کر فرطِ مسرت سے آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ کہ ٹانگوں میں طاقت آ گئی۔ اور بوجھ سہارنے لگی ہیں۔ ہم نے پھر لٹا دیا۔ اور صبح ہی والد ماجد نے چلنا شروع کر دیا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اس اعجاز رحمت کا قصبہ بھر میں چرچا ہو گیا۔ اور لوگ بڑی خوشیوں کے ساتھ زیارت کو آنے لگے۔ بنگالی ڈاکٹر بھی یہ واقعہ سن کر حیران رہ گیا۔ دو ہی دن میں حضرتِ والد ماجد کو صحت ہو گئی۔ پھر اس خاص کرم رحمت کی خوشی میں ایک محفلِ میلاد کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں اکثر علمائے کرام و نعت خوانانِ عظام شریک ہوئے۔ سیالکوٹ اور مضافات کے اکثر احباب اس محفل میں شریک ہوئے۔ کوٹلی کے ہر فرد۔ زن و مرد نے اس میں شرکت کی۔ حتیٰ کہ غیر مسلم بھی آئے۔ علماء کرام نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دافع البلاء ہونے پر تقریریں کیں نعت خوانوں نے اسی موضوع پر نعتیں سنائیں۔ اور سب سے بعد حضرت والد ماجد نے خود روتے ہوئے اس خواب کا ذکر فرمایا۔ اور فرمایا۔ کہ اس واقعہ کے بعد کون کہہ سکتا ہے۔ کہ حضور رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم دافع البلاء نہیں ہیں۔ میری طرف دیکھ کر حضور کے دافع البلاء ہونے پر ایمان لاؤ۔ یہ واقعہ کوٹلی کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ سچ فرمایا اعلیحضرت نے سے

ڈوبی ناؤیں تراتے یہ ہیں ہلتی نیویں جماتے یہ ہیں

پرستوں کی طرف سے پہلے ایک مہذب اور بالآخر معاندانہ قسم کا انکار شروع کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر ایسے کسی خیال پر ایک فرقہ کی بنیاد ڈال دی جاتی ہے جو دیکھتے دیکھتے فرقہ بن جاتا ہے۔ اور فرقہ بنانے والوں کا راستہ نہ قرآن روک سکتا ہے اور نہ حدیث و تاریخ۔ چنانچہ اس معیار کو سامنے رکھ کر آپ ہر فرقے کے مفاسد اور اس کے اسباب تخلیق کو آسانی کے ساتھ پا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے اہل شیعہ کو لیجئے۔ یہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کے وقت کا بتاتے ہیں۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ بعد از خاندان بنو امیہ کی حکومت قائم ہونے سے پہلے نہ ان کا یہ ماتمی شعار اور تبرا بازی تھی اور نہ ان کی نمازیں اہل سنت سے الگ ہوتی تھیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ خدا کیطرف سے اس کا حکم بیان کرنے والا ایسا انسان ہونا چاہیئے جو غلطی سے پاک ہو۔ اور اسے امام معصوم کا لقب[1] دے دیا گیا۔ مگر جب امام معصوم کے متعلق توحید و رسالت کی طرح قرآن و حدیث میں

---

[1] امام معصوم کے تصور میں بھی ان کے ہاں مختلف ترمیمیں ہوئیں۔ اسکی وجہ یہ ہوئی کہ معیاری امام معصوم ایک دن کیلئے بھی عالم وجود میں نہیں آیا۔ سب سے پہلے امام معصوم حضرت علیؓ ہیں جنہیں چھوڑ کر صحابہ نے دوسروں کو خلیفہ مان لیا۔ اس امر واقعہ سے اہل شیعہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ امام معصوم کو اگر کوئی بھی ماننے والا نہ ہو تو وہ امام ہی رہتا ہے۔ جیسے نبی کسی کے ماننے بغیر بھی نبی رہتا ہے۔ حالانکہ قرآن میں ایسا کہیں بھی موجود نہیں۔ پھر یہ امر واقعہ کہ حضرت علیؓ نے پہلی خلافتوں کو مان لیا اور امیر معاویہ کیساتھ ثالثی فیصلہ پر صلح کر لی۔ اور امام حسنؓ نے امیر معاویہ کو خلافت سونپ دی۔ بقیہ

ٹوٹی آسیں بندھاتے یہ ہیں !　　چھوٹی نھنھیں چلاتے یہ ہیں
جلتی جانیں بجھاتے یہ ہیں !　　روتی آنکھ ہنساتے یہ ہیں
ماتم گھر میں ایک نظر میں　　شادی شادی رچاتے یہ ہیں
لاکھوں بلائیں کروڑوں دشمن　　کون بچائے بچاتے یہ ہیں

ایک پیاسے قافلے کو سیراب فرما دیا

حضرت مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے مثنوی شریف میں دشتِ عرب کے ایک پیاسے قافلے کا ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے۔ کہ ان بیکس لوگوں کی کس طرح حضور رحمتِ عالم نے بروقت امداد فرمائی۔ فرماتے ہیں۔ عرب کے ایک بیابان میں ایک بہت بڑا قافلہ جس میں چھوٹے بڑے سبھی تھے۔ اور ان کے جانور بھی تھے۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے زندگی سے مایوس ہو گیا۔ بھائیو! عرب کا بیابان اور پانی ؟ خطۂ عرب میں پانی کی بڑی قلت ہے۔ قافلے والوں کے پاس پانی ختم ہو گیا۔ اور وہ زندگی و موت کی کشمکش میں پھنس گئے۔ مولانا رومی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:-

ے　درمیانِ آں بیاباں ماندۂ ! ٭ کاروانے مرگِ بر خود خواندۂ

"یعنی وہ قافلہ پیاس کے مارے موت کو دعوت دے رہا تھا"

ے　اشتراں شاں را زباں آویختہ ٭ خلق اندر ریگ ہر سو ریختہ

"اور ان کے اونٹوں کی (پیاس کے مارے) زبانیں لٹک رہی تھیں۔ اور ہر طرف مخلوق ریت پر پڑی ہوئی تھی"

ے　ناگہانے آں مغیثِ ہر دو کون ٭ مصطفےٰ پیدا شدہ از بہرِ عون

"اچانک ان لوگوں کی مدد کے واسطے دونوں جہانوں کے فریاد رس، اور آقا و مولیٰ حضور رحمتِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے آئے"

مسلمانو! دیکھ لو! مولانا رومی علیہ الرحمۃ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دونوں جہانوں کا فریاد رس کہہ رہے ہیں۔ اب اگر کسی کو توحید کا مروڑ اٹھے۔ تو وہ مولانا رومی علیہ الرحمۃ کو مشرک کہے۔ بھائیو! حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم واقعی دونوں جہان کے فریاد رس ہیں۔ اللہ کی رحمت اگر کام نہ آئے

کچھ نہیں بتایا گیا۔ اور جملہ صحابہ انصار و مہاجرین نے بھی امام معصوم کو چھوڑ کر دوسروں کو خلیفہ بنالیا۔ اور انہیں کے اور امہات المومنین کے حق میں قرآن نے رضائے الٰہی کی اور جنت کی بشارت دیدی جن میں سے بعض نے حضرت علیؑ کے خلاف جنگ بھی کیا تو اہل شیعہ نے فرض کر لیا کہ خدا کو آنے والے حالات کا علم نہ تھا۔ اور یہ کہ وہ کرنا کچھ چاہتا تھا اور کر کچھ اور بیٹھا۔ اور پھر اپنی غلطی پر ہی قائم رہا۔ اس طرف خدا کی طرح ناکارہ صفات کو منسوب کرتے ہوئے انہوں نے قرآن کی بھی پرواہ نہ کی۔ اور ان میں سے بعض کے خلاف آج تک یہ الزام بھی موجود ہے۔ کہ وہ قرآن کو بھی محفوظ اور متواتر نہیں مانتے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ جن تصورات پر وہ اڑ گئے ان کی پیروی میں وہ کسی چیز کو حتیٰ کہ قرآن کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ یہ ہے عمر میں سب سے بڑا اور

---

* اور امام حسینؑ نے یزید کے سامنے تقیہ نہ کیا۔ ان شواہد سے اہل شیعہ کے ہاں امام معصوم کا تصور یہ ٹھہرا کہ وہ غلطی بھی کر جاتا ہے۔ مگر اپنی غلطی میں وہ آزاد ہوتا ہے۔ اور اس پر خدا کی طرف سے ایسے مواخذہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی غلطی میں اس کی پیروی کی جاتی ہے۔ اسلئے وہ پہلی خلافتوں کے کے ماننے میں حضرت علی کی اور امیر معاویہ کی خلافت ماننے میں حضرت امام حسنؑ کی پیروی نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی نے تقیہ کے تحت پہلی خلافتوں کو مان لیا تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ چاہے جس طرح بھی انہوں نے مانا۔ بہر حال آپ لوگوں کو انتخاب کی پیروی میں صحابہ کی خلافت پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے۔ اور پھر جب حضرت علی نے تقیہ کے تحت پہلی تینوں خلافتوں کو مان لیا تو دوسروں کو کیا علم تھا کہ وہ تقیہ سے مان رہے تھے یا دل سے۔ اس بنا پر قصوروار کسکو مانا جائے اس کے بعد جب امام معصومین کا دور گذر گیا تو اہل شیعہ نے امام غائب کا تصور قائم کر لیا۔ جس کی امامت کا عقیدہ کے طور پر ماننا ضروری ہوتا ہے۔ اور پیروی اسکی بجائے دوسرے سے *

مصائب و آلام کو دور نہ فرماتے۔ تو وہ رحمت ہی کب ہوتی۔؟ مسلمانو! ہمارے حضور اللہ کی رحمت ہیں۔ اور وہ دو عالم کے لیئے فریاد رس ہیں۔ یہی حقیقت ہے اور اسی پر ایمان رکھو۔

ہاں تو وہ قافلہ جو پیاس کے مارے مر رہا تھا۔ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا۔ جب اس نے دیکھا۔ کہ ہماری مدد کو رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم پہنچ گئے ہیں۔ تو اس کی جان میں جان آئی۔ سے

رحمش آمد گفت ہیں زوتر دوید ؛ چند یارے سوئے آں کیثاں روید

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ حالت دیکھ کر رحم آ گیا۔ اور فرمایا۔ چند آدمی اس ٹیلے کی طرف جائیں۔"

سے کہ سیاہے بر شتر مشک آورد ؛ سوئے میر خود بزودی میرود!

"ٹیلے کے اس پار ایک سیاہ رنگ کا حبشی غلام اونٹ پر رکھ کر پانی کی ایک مشک لا رہا ہے۔ اور اپنے آقا کی طرف جا رہا ہے۔"

سے آں شتربانِ سیہ را باشتر ؛ سوئے من آرید با فرمانِ مر!

"فرمایا اس حبشی کو اونٹ سمیت میرے پاس لے آؤ۔ اگر خوشی سے آئے تو بہتر۔ ورنہ پکڑ کر لے آؤ۔"

چنانچہ چند آدمی ٹیلے کے اس پار گئے تو دیکھا۔ واقعی ایک حبشی غلام پانی کی مشک لیئے اونٹ پر سوار جا رہا ہے۔

سے پس بدو گفتند مے خواند ترا! ؛ ایں طرف فخر البشر خیر الورٰی

"انہوں نے اس حبشی سے کہا۔ کہ تجھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم بلا رہے ہیں۔"

سے گفت من نشناسم اُو را کیست او ؛ گفت اُو آں ماہ روئے قند خو

"حبشی بولا میں نہیں جانتا وہ کون ہیں۔ وہ بولے کہ وہ حضور چاند کے چہرے والے اور میٹھی عادت والے ہیں"

سے نوعہا تعریفش کردند ش کہ ہست ؛ گفت مانا اُو مگر او ساحر است

الغرض صحابہ نے اس سے حضور کی طرح طرح کی تعریفیں کیں۔ مگر وہ

دیر پا فرقہ عملی حیثیت سے اُن کے چند ایک مسائل ہیں جو یہ امام معصومین کی طرف سے پیش کر کے ان پر قائم ہیں مثلاً تقیہ ۔ تعزیہ ۔ تبرا ۔ نکاح متعہ اور تین بخشی ہے اور پاؤں پر مسح کرنا ۔ بعد میں جس قدر فرقے بھی وجود میں آئے ۔ انہوں نے شعائر دین اور فروعی مسائل میں امت کے سواد اعظم سے الگ راہ نہیں نکالی ۔ ان کا اختلاف عقائد بس نظری حد تک ہی محدود رہا ۔ نماز اور جماعت الگ کرنے والے صرف یہی لوگ ہیں جو گنے چنے خوارج کے بعد اپنی الگ خصوصیات کے مالک ہوئے ۔

دوسرے نمبر پر نافیہ اور معتزلہ ہیں جنہوں نے ذات باری کی صفات کا انکار کیا نہ اس لیے کہ قرآن میں اور قرآن ماننے والوں کی تاریخ میں یہ انکار پایا گیا ۔ بلکہ اس لیے کہ عقل اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتی کہ صفات خدا کی ذات میں شامل ہیں یا اس سے الگ ۔ اور اگر الگ انہیں مانا جائے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ پہلے خدا موجود تھا یا اس کی صفات تھیں ۔ اگر وہ بعد میں ہوئیں تو کس نے خدا کو بنا کر دیں ۔ اور اگر اس کی ذات ہی میں داخل تھیں تو ذات کو ماننے کے ساتھ انہیں مستقل طور پر الگ ماننا کچھ معنی نہیں رکھتا ۔ حالانکہ

٭ مجتہدوں کی ہوتی ہے ۔ حالانکہ قرآن میں ایسا حکم کہیں بھی نہیں دیا گیا ۔ کہ مانا کسی کو جائے اور پیروی اس کی بجائے دوسروں کی ہو ۔

۱؎ اہل شیعہ کے یہ خصوصی مسائل سب کے سب قرآنی مسائل ہیں اور صدیوں سے اختلاف کے موجب ہو چکے ہیں اس سے پرویز صاحب کا یہ دعویٰ بُری طرح پامال ہوتا ہے کہ اختلاف کا باعث صرف علم حدیث ہے اور قرآن کے مسئلہ میں اختلاف نہیں ہوتا جو فرقہ بندی کا موجب ہو آپ کہتے ہیں کہ نظام ربوبیت میں رزق یابی کی طرح فہم قرآن بھی حکومت کی طرف سے ہی بتلایا جائیگا جس سے لوگ مرتے ۔

بولا۔ شاید وہی جادو گر ہے۔ جس کے چرچے ہو رہے ہیں۔ میں تو اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ صحابہ اسے پکڑ کر زبردستی حضور کی خدمت میں لے آئے۔ حضور علیہ السلام نے اس حبشی کو تسلی دی کہ گھبراؤ مت۔ تمہیں کوئی تکلیف نہ دی جائے گی۔ اور تمہارا پانی بھی بالکل چھینا نہ جائے گا۔ تم ذرا یہ مشک میرے حوالے کرو۔ حبشی سے وہ مشک لے کر حضور صلے اللہ علیہ و سلم نے اپنا دستِ رحمت اُس مشک پر پھیرا۔ اور پھر قافلے والوں سے فرمایا۔ کہ لو سب آ کر پانی پی لو۔ اور اپنی پیاسیں بجھا لو۔ خود بھی پیو۔ جانوروں کو بھی پلاؤ۔ اور اپنے سارے برتن بھی بھر لو۔ تاکہ راستے میں کام آئے۔ ؎

جملہ را از مشک او سیراب کرد ؛ اشتراں وہر کسے زاں آب خورد

الغرض حضور نے اس مشک کے تھوڑے سے پانی سے ان سب کو سیراب کر دیا۔ اور اونٹوں اور سب لوگوں نے اس میں سے پیٹ بھر کر پانی پیا۔ اور مشک ویسی کی ویسی بدستور بھری ہوئی تھی۔ حبشی یہ معجزہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ اور والہانہ طور پر آگے بڑھا ؎

مصطفٰے دستِ مبارک بر رخش ؛ آں زماں مالید کرد اُورا درخش

حضور صلے اللہ علیہ و سلم نے اس کے چہرے پر اپنا دستِ نور پھیرا۔ تو اس سیاہ رنگ حبشی کا سیاہ رنگ کافور ہو گیا۔ اور وہ نورٌ علےٰ نور ہو گیا۔ اور چمکنے لگا۔ ؎

شد سفید آں زنگی زادۂ حبش ؛ ہمچو بدرو روز روشن شد شبش!

وہ حبشی چودھویں کے چاند کی طرح سفید ہو گیا۔ اور اس کی رات دن بن گئی۔

پھر وہ حبشی مسلمان ہو گیا۔ اور اجازت لے کر اپنے مالک کے گھر پہنچا تو مالک نے پوچھا تو کون ہے۔ غلام بولا۔ میں آپ کا غلام ہوں۔ مالک نے کہا جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ میرا غلام تو کالا سیاہ ہے۔ غلام بولا۔ مگر میں اس کے پاس سے ہو کر آیا ہوں۔ جس نے ساری کائنات کو اپنی ضیا پاشیوں سے منور فرما دیا ہے۔ پھر غلام نے اپنا سارا قصہ سنایا۔ جسے سن کر وہ

قرآن کے نزدیک ایسے سب سوالات بے محل تھے۔ اور صرف خدا کو اس کی ذات اور صفات میں بے مثل مان لینا کافی تھا۔ اور یہ کہ وہ اچھی صفات کا مالک ہے۔ اور بری صفات سے پاک ہے۔

معطلہ کہتے ہیں کہ پہلے پہل تو خدا کی صفات تھیں مگر بعد میں وہ انہیں کھو بیٹھا یا وہ خود بخود زائل ہو گئیں۔ نہ اس لئے کہ قرآن میں یہ ہے بلکہ اس لئے کہ عقل کا فیصلہ یہی ہے۔ کیونکہ پہلے اس کی صفات کا مصرف یہ تھا کہ ان سے کام لے کر خدا نے نظام کائنات کو بنا کر چلایا۔ اب آگے خدا کو کچھ اور بنانا نہیں۔ اب جو انہیں مانا جائے تو ان کے لئے کھپت کہاں ہے۔ گویا انہوں نے فرض کر لیا کہ ان کی نظروں میں آنے والی دنیا کے علاوہ اور کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہ جاتی۔ جسے انہیں کیطرح بنانا اور پروان چڑھانا خدا کا منصب ہو۔ ہم نے تو سب کچھ بن گیا۔ اور یہ بھی نہ سوچا کہ آئے دن جب ایک دنیا کی دنیا اپنی جگہ کو چھوڑتی ہے۔ اور ایک دنیا کی دنیا نیا جنم لے کر اپنے تمام علائق زندگی کے ساتھ اس کی جگہ لیتی ہے تو کیا یہ خدا کی دائمی صفات کے بغیر ممکن ہے۔ یہ سب کچھ اگر خدا کے بلا تصرف ہو رہا ہے تو آغاز عمر میں ایسا کچھ اس کے تصرف کے بغیر ہونا کیوں ممکن نہ تھا۔

قدریہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی ذات میں سب کچھ کرنے پر قادر ہے۔ نہ اس لئے کہ قرآن کا فیصلہ یہی ہے بلکہ اس لئے کہ اگر انسان کے معاملہ میں خدا کو قادر مانا جائے۔ تو یہ عقلاً صحیح نہیں کہ جو انسان خدا کا پابند اور مجبور ہو اس کی غلطی پر خدا اسے سزا دے وہ یہ نہیں بتاتے کہ جب انسان اپنے معاملہ میں آزاد ہے۔ تو وہ بیمار اور غریب کیوں ہو جاتا ہے۔ ایسے تو ہمیشہ تندرست اور خوشحال ہونا چاہیئے۔

جبریہ اس کے برعکس کہتے ہیں کہ انسان اپنے معاملہ میں مجبور اور بے بس ہے۔

اس کا مالک بھی مسلمان ہو گیا۔

جانوروں کیلئے بھی رحمت

حضرات! ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ اور "عٰلمین" میں جانور بھی شامل ہیں۔ اس لئے ہمارے حضور جانوروں کے لئے بھی رحمت ہیں۔ چنانچہ کتب حدیث میں ایک ہرنی کا واقعہ موجود ہے۔

ہرنی کا قصّہ

طبرانی شریف کی حدیث ہے۔ کہ ایک جنگل کی ہرنی کسی شکاری کے جال میں پھنس گئی۔ اور رحمۃ للعالمین بھی اس جنگل میں آ پہنچے۔ ہرنی نے دیکھا۔ تو حدیث کے یہ لفظ ہیں۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا۔ اِذَا مُنَادٍ يُنَادِيْهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! — کوئی پکارنے والا

حضور کو پکار رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے۔ یا رسول اللہ!

حضور نے توجہ فرمائی۔ تو ہرنی جال میں پھنسی ہوئی نظر آئی۔ اور وہی پکار رہی تھی۔ حضور نے دریافت فرمایا۔ تو نے مجھے کیوں پکارا۔ تو ہرنی بولی۔

اُدْنُ مِنِّیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! — حضور ذرا میرے پاس تشریف لایئے"

حضور آگے بڑھے اور فرمایا:-

مَاحَاجَتُكِ — تمہاری کیا حاجت ہے؟

گویا حضور حاجت روا ہیں۔ اور نہ صرف انسانوں ہی کے بلکہ جانوروں کے بھی۔ ہرنی نے عرض کیا۔ حضور میرے دو بچے ہیں۔ میں انہیں دودھ پلانے جا رہی تھی۔ کہ اس جال میں پھنس گئی۔ حضور! میرے بچے میری راہ دیکھ رہے ہونگے۔ آپ رحمتِ عالم ہیں اور میں بھی مستحق ہوں۔ مجھ پر رحم فرمایئے اور تھوڑی دیر کے لئے اپنی ضمانت پر مجھے اس جال سے رہا کرا دیجئے۔ تاکہ میں اپنے بچوں کو دودھ پلا آؤں۔ حضور میں دُودھ پلاکر پھر واپس آجاؤں گی۔ حضور نے فرمایا اچھا جا! اور بچوں کو دودھ پلا - اور دیکھ دودھ پلا کر پھر جلدی واپس آجانا۔ ہرنی نے عرض کیا۔ بہت اچھا حضور! اور چلی گئی۔ حدیث کے لفظ ہیں:-

فَذَهَبَتْ فَاَرْضَعَتْ خَشْفَیْهَا ثُمَّ رَجَعَتْ — "ہرنی گئی اور

کیونکہ یہ کچھ عقل کی بات نہیں کہ ایک طرف ہم خدا کو قادر مطلق مانیں اور دوسری طرف انسان کو بھی قدرت وارادہ کا مالک سمجھیں۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ جب انسان مجبور محض ہے تو موت اور تکلیف سے بچنے کی تدبیر کیوں کرتا ہے۔ اور اس حد تک کہتا ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جائیں تو وہ بھی اپنے مقدور بھر ان سے کام لئے بغیر نہیں رہتا حالانکہ اسے کبھی اپنے نفع اور نقصان کے خیال میں نہیں پڑنا چاہیئے تھا۔

اتحادی وجودیہ کہتے ہیں کہ ہر چیز خدا سے ہے۔ اور ہر چیز میں خدا ہے اس لئے کہ عقلاً یہ کچھ اچھا نہیں کہ خدا بھی ہو اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی اور چیز بھی اپنے موجود ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ پھر گندگی اور غلاظت سے کیوں پرہیز کیجاتی ہے اور جن سب چیزوں میں خدا ہے وہ فنا کیوں ہوتی ہیں۔

عدل کے بارہ میں معتزلہ کہتے ہیں کہ خدا پر فرض اور واجب ہے کہ وہ انصاف کرے۔ اور ظلم نہ کرے۔ کیونکہ اگر اسے انصاف کا پابند نہ مانا جائے تو انصاف لازم نہیں رہ جاتا۔ اور کیا معلوم کہ اگر اسے مختار مانا گیا تو وہ انصاف پر قائم رہیگا یا نہیں۔ اس لئے بجائے اس کے کہ عادل و منصف ہونا اس کی صفت ہو۔ مانا یہ جائے کہ انصاف اس لئے کرتا ہے کہ بے انصافی کرنے پر قادر نہیں۔

انہیں سے ملتے جلتے دو ایک مذاہب معجزات کے متعلق بھی ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ خدا کیطرف سے کوئی رسول بھی خلاف عادت واقعہ کبھی نہیں دکھاتا اس لئے کہ جن قواعد کے تحت خدا نے نظام عالم کا یہ سلسلہ قائم کر رکھا ہے ان کا وہ خود بھی پابند ہے۔ اور ان کا پابند رہتے ہوئے وہ اس نظام میں خلاف

بچوں کو دودھ پلا کر پھر واپس آ گئی۔"

دوستو! جانور جال سے چھوٹ کر پھر اس راہ سے بھی کنارا کرتے ہیں۔ مگر اللہ رے سلطنت مصطفےٰ کہ ہرنی کی یہ تاب نہیں۔ کہ وہ حکم سرکار پا کر واپس نہ آئے وہ ہرنی گئی۔ اور پھر واپس آ گئی۔ شکاری نے یہ معجزہ دیکھا تو حیران رہ گیا حضور نے پھر اس شکاری سے فرمایا۔ اب تم اس ہرنی کو چھوڑ دو۔ شکاری نے کہا۔ بہت اچھا۔ اور ہرنی کو چھوڑ دیا۔

فَخَرَجَتْ تَعْدُوْا وَهِیَ تَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ — ہرنی دوڑتی ہوئی نکل گئی۔ اور یہ کہتی گئی کہ میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور آپ (یا رسول اللہ) اللہ کے رسول ہیں۔ (حجۃ اللہ علی العالمین صـ۳۹۱)

ہرنی کی مؤدّب اولاد

یہ روایت نزہۃ المجالس کے صـ۹۴ جلد ۳ پر بھی موجود ہے۔ اور نزہۃ المجالس میں اس روایت کے درج کرنے کے بعد ایک بزرگ کا اور واقعہ بھی لکھا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ کہ میں ایک دن حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی قبرِ انور کے حضور حاضر تھا۔ کہ مسجد میں ایک ہرنی آ گئی۔ اور قبر انور کے سامنے ہو کر اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ گویا حضور کو سلام عرض کر رہی تھی۔ سلام عرض کرنے کے بعد پھر پیٹھ کئے بغیر الٹے پاؤں مسجد سے نکل گئی۔ اور اپنی پیٹھ قبر انور کی طرف نہ ہونے دی۔ وہ بزرگ فرماتے ہیں۔ یہ ہرنی یقیناً اس ہرنی کی اولاد میں سے تھی۔ جسے حضور نے جال سے آزاد کرایا تھا۔

میرے بزرگو! یہ تو ایک جانور کا ادب ہے۔ کہ قبر انور کی طرف پیٹھ نہیں ہونے دی۔ اور ایک برائے نام مسلمان نجدی سپاہی بھی ہم نے دیکھے ہیں۔ جو روضۂ انور کے ساتھ پیٹھ لگا کر دن بھر بیٹھے رہتے ہیں۔ اور قبر انور کی طرف اپنی پیٹھ کئے رہتے ہیں۔

اُونٹ کی فریاد

ایک اونٹ کا قصہ بھی سن لیجئے۔ حدیث شریف میں ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایک انصاری کے

عادت کاموں کی گنجائش رکھکر اس کو درہم برہم نہیں کر سکتا۔ دوسرا اگر وہ کہتا ہے کہ خدا قانون فطرت کا پابند تو نہیں مگر اس کا وعدہ یہی ہے کہ وہ اس کے نظم میں کسی تبدل و تغیر کو راہ نہ دے۔ اس بنا پر کسی معجزہ کا واقع ہونا ممکن نہیں ورنہ معجزہ کا واقعہ ہو نا مان لینے کے بعد یہ ماننا لازم آتا ہے کہ شاید خدا کبھی جھوٹ سے بھی کام لیتا ہے۔ اس لئے کہ ایک طرف خود اس کا فیصلہ ہے کہ نظم عالم میں گڑبڑ پیدا نہ کرے۔ اور دوسری اگر وہ معجزہ کو بھی صادر ہونے دے تو یہ جھوٹ کے بغیر اور کچھ بھی نہیں۔

سب سے زیادہ دلچسپ حماقت کے مرتکب یہی لوگ ہیں جو ایک طرف پنیچ اور روشن خیال ہونے کے مدعی ہیں۔ اور دوسری طرف حماقت میں اپنے پیشواؤں سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ ایک ملازم جو اپنے افسر کے پروگرام کو ناقص بتائے اور ایک چرواہا جو وکیلوں کی طرح قانونی مسائل میں رائے زنی کرے وہ بھی ان سے کم احمق ہوتا ہے۔

عبادت کا خدا

"چونکہ خدا عبادت ہے۔ ان صفات عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے اس لئے قوانین خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی فطرت عالیہ کے قوانین کی اطاعت ہے کسی غیر کی محکومیت نہیں" ۔ صفحہ ۲۲

باغ میں تشریف لے گئے۔ اس باغ میں اونٹ تھا۔ اس اونٹ نے حضور کو دیکھا تو فریادی بن کر حضور کی خدمت میں آیا۔ حدیث میں آتا ہے۔ کہ اس اونٹ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور وہ رو رو کر حضور سے کچھ فریاد کرنے لگا۔ حضور نے پوچھا۔ اس اونٹ کا مالک کون ہے؟ ایک نوجوان نے عرض کیا حضور! یہ اونٹ میرا ہے۔ حضور نے فرمایا۔ تو اس جانور کے باب میں اللہ سے نہیں ڈرتا ــــ فَإِنَّهُ شَكَا إِلَيَّ أَنَّكَ تُجِيعُهُ ۔ (حجۃ اللہ ص۵۵۹)

"اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو"

چڑیا کی فریاد

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ہم ایک سفر میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ کہ ہم ایک درخت کے پاس سے گزرے۔ اس درخت پر ایک چڑیا کے دو بچے تھے۔ ہم نے وہ پکڑ لیے۔ اُن بچوں کی ماں چڑیا نے دیکھا تو اڑتی ہوئی حضور کے سامنے آگری۔ اور فریاد کرنے لگی۔ حضور نے پوچھا۔ اس کے بچوں کو کس نے پکڑا ہے؟ ہم نے عرض کیا۔ ہم نے یا رسول اللہ! فرمایا۔ جاؤ ان بچوں کو اپنی جگہ پر رکھ آؤ ــــ (حجۃ اللہ ص۴۶۶)

دیکھا میرے بزرگو! جانور بھی اسی بارگاہِ رحمت میں آ آ کر اپنی فریادیں سناتے حاجتیں پیش کرتے، اور مرادیں پاتے ہیں۔ اعلیحضرت فرماتے ہیں:۔

ہاں یہیں کرتی ہیں چڑیاں فریاد ہاں یہیں چاہتی ہے ہرنی اولاد
اسی در پہ شترانِ ناشاد گلۂ رنج و عنا کرتے ہیں
آستینِ رحمتِ عالم الٹے کمرِ پاک پہ دامن باندھے
گرنے والوں کو چہِ دوزخ سے صاف الگ کھینچ لیا کرتے ہیں

مدرسۂ دیوبند

میرے بزرگو! اس موقعہ پر یہ بات بھی سن لیجئے کہ احادیث سے ثابت ہے۔ کہ ہرنی، اونٹ اور چڑیاں سب حضور کی بارگاہِ رحمت میں حاضر ہوتے اور اپنی اپنی عرضیں پیش کرتے تھے۔ اور حضور ان کی فریاد رسی فرماتے تھے۔ معلوم ہوا۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ان جانوروں کی زبان بھی جانتے تھے۔ جبھی تو یوں فرمایا۔ کہ اونٹ مجھ سے یہ کہہ رہا ہے

لفظ عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مفہوم کے ہم معنی ہے۔ لفظ عبادت کے ذریعہ ایک ایسی چیز کا ڈھانچہ پیش کیا جاتا ہے جس کے وجود کا تانا بانا تمام تر خیالی اور ذہنی ہو۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے بتائے جانے سے پہلے سننے والے کے نزدیک اس کا خیالی وجود بے حقیقت ہو۔ اور محض الفاظ کے ذریعہ جسم دیکر بتلانے والا اسے بتلائے۔ زید کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک انسان ہے نہ یہ کہ وہ عبارت ہے۔ ایک ایسی اور ایسی چیز سے اس لئے کہ زید ایک وجود کا مالک ہے بخلاف اس کے یرقان کا چونکہ کچھ وجود نہیں۔ نہ محسوس اور نہ غیر محسوس اس لئے اس کے متعلق کہا جائیگا کہ یرقان عبارت ہے۔ لیجئے اور ایسے مرض ز اور اس کی تشریح کے بعد ہی سننے والے کو کچھ پتہ چلیگا کہ وہ کس چیز کا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے ایک ایسی چیز سے باخبر کیا گیا جس کا اس کے نزدیک کوئی وجود نہ تھا۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے اس احترام و عقیدت اور وقار کا جو خدا کے متعلق پرتیز صاحب کے دل میں موجزن ہے۔ اور جب آپ خدا کو عبارت کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ تو کتنے گہرے گمنامی کے غار سے اسے باہر لا کر اسکی عظمت کو دوبالا کرتے ہیں۔

آگے اس پر غور کیجئے کہ وہ کونسی صفات ہیں جنہیں ہر انسان یکساں اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہ آدمی کے چاہنے سے ہی ان کا تعین ہوگا تو ہو سکتا ہے کہ کوئی آدمی چوری اور سینہ زوری کی صفت کو پسند کرے۔ تو کیا اس کیلئے

۱؎ اللہ اس ذاتِ بے مثل کا نام ہے جس میں یہ تمام صفات انتہائی نقطہ کمال تک تکمیل یافتہ ہیں۔ سلیم کے نام۔ ص ۲۲۲

اور ہرنی یہ کہہ رہی ہے۔ تو مسلمانو! اب ذرا انصاف سے کہنا۔ کہ جو لوگ اپنے مدرسہ دیوبند اور دیوبندی مولویوں کی عظمت بیان کرنے کے لئے یہ کہنے لگیں۔ کہ حضور کو زبان اردو ہمارے مدرسہ دیوبند اور ہمارے مولویوں کی وجہ سے آگئی۔ وہ پرلے درجے کے گستاخ اور بیوقوف ہیں یا نہیں؟

میرے سنی بھائیو! دیکھو عبارت یہ ہے:۔

ایک صالح فخر عالم علیہ السلام کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوئے۔ تو آپ کو اردو میں کلام کرتے دیکھ کر پوچھا۔ یہ کلام کہاں سے آگئی؟ آپ تو عربی ہیں۔ فرمایا جب سے علمائے مدرسہ دیوبند سے ہمارا معاملہ ہوا۔ ہم کو یہ زبان آگئی۔ (براہین قاطعہ ص۲۶)

دیکھا آپ نے؟ ان دیوبندیوں نے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو عالم ماکان ومایکون ہیں۔ اور اولین وآخرین کے علوم کے منبع ومخزن ہیں اور جو جانوروں تک کی زبان کے جاننے والے ہیں۔ انہیں زبانِ اُردو سے ناواقف بتا کر پھر اپنے مدرسہ دیوبند اور اپنے دیوبندی مولویوں کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے یہ خواب گھڑ لیا کہ حضور نے (معاذ اللہ) فرمایا۔ کہ مجھے یہ زبان ان دیوبندی مولویوں اور مدرسہ دیوبند کی وجہ سے آگئی ہے۔ توبہ! توبہ!!

؎
قادیانی کی طرح خواب سناتے نجدی
ذاتِ بے عیب کو یہ عیب لگاتے نجدی
جن کو اللہ نے ہر شئے کا بنایا عالم
اپنے مُلّوں سے انہیں اردو پڑھاتے نجدی

تعلیم رحمت

میرے بھائیو! ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم جو رحمتِ عالم بنکر تشریف لائے ہیں۔ آپ کی تعلیم بھی تعلیم رحمت ہے۔ آپ نے اللہ کی مخلوق پر رحم فرمانے کی تاکید فرمائی۔ اور فرمایا:۔

لَا يَرْحَمُ اللهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاس — (مشکوٰۃ شریف ص۴۱۳)

"جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔ اللہ اس پر رحم نہ کرے گا۔"

اسی حدیث کا ترجمہ یہ شعر ہے ؎

ایسی ہی صفات کا مجموعہ اس کا خدا ٹھہرے گا۔ پھر جب وُہ کچھ صفات کو اپنی پسند کا شرف دے گا تو کیا پھر وُہ اِن سے خدا کی طرح ڈر کر ان کا وفادار رہیگا۔ اور ان سے اپنی توقعات کو وابستہ رکھیگا۔ اور انہیں اپنے نفع ونقصان کا اور زندگی وموت کا مالک سمجھیگا۔

پھر کہتے ہیں کہ وُہ اچھی صفات جو انسان اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور جن کا مطلب خدا ہے۔ وہ اچھی صفات کا مجموعہ کچھ قوانین بھی بنایا کرتا ہے جنکی اطاعت وپیروی کو انسان اپنا کام سمجھتا ہے کسی کی نوکری نہیں سمجھتا۔ وہ جب ان صفات کو قبول کر لیتا ہے تو وہ قوانین بنانے لگ جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وُہ صفات جب انسان خود ہی اختیار کرتا ہے اور وہ اس کے لئے خدا اور قانون ساز بھی ہوتی ہیں۔ تو پھر خدا کی طرف سے کتابیں اور رسول کیوں بھیجے گئے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جو کام انسان اپنے چاہنے سے پورا کرے۔ اسی کیلئے رسول بھیجے جائیں جواب یہ ہے کہ ایسی صفات کو خواہشات کا بُت کہنا چاہیئے نہ کہ خدا۔

فرعون کے منہ میں مٹی

"جب وہ بنی اسرائیل کے تعاقب میں غرق ہونے لگا تو اس نے چلا کر کہا اٰمنت برب موسیٰ۔ میں موسیٰ کے خدا پر ایمان لاتا ہوں معلوم ہے اس اقرار وایمان کا جواب خدائے غیور کیطرف سے کیا ملا تھا۔ یہی نا کہ الآن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین۔" ص ۱۵۵

کرو مہربانی تم اہل زمیں پہ
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پہ

مسلمانو! حضور علیہ السلام کی اس تعلیم رحمت میں ہزارہا خوبیاں ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور دیگر بزرگان دین جو حضور کے صحیح معنوں میں متبع تھے۔ یہ رحمت و شفقت علی الخلق کامل طور پر نظر آتی ہے۔ اُن نفوس قدسیہ نے حتی الامکان اللہ کی مخلوق پر رحم ہی فرمایا۔ اور خود تکلیف اٹھا کر بھی رحم علی الخلق کا دامن نہیں چھوڑا۔ حضور کی اس تعلیم رحمت نے بڑے بڑے جلالی مزاج والوں میں رحم و عفو کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جن کی جلالت وسطوت اور جن کا رعب و دبدبہ شہرۂ آفاق ہے۔ آپ ایک مرتبہ نماز تہجد ادا

فاروق اعظم کی ایک حکایت

کرنے کو مسجد میں آ رہے تھے۔ کہ اندھیرے کے باعث ایک شخص کے پاؤں پر حضرت کا پاؤں آ گیا۔ شاعر لکھتا ہے :۔

روایت ہے اک شخص کے پاؤں پر ٭ پڑا سہو سے پائے حضرت عمرؓ
کہا اس نے اندھا ہے لے بیخبر ٭ لگے معذرت کرنے حضرت عمرؓ
کہ اندھا نہیں میں خطا وار ہوں ٭ خطا بخشنے کا طلب گار ہوں

بزرگوں کے الطاف کو دیکھئے!
کہ کیا کیا کرم عاجزوں پر کئے

دیکھا آپ نے؟ آج ایک معمولی سپاہی کو بھی اس کی غلطی پر بھی ٹوکا جائے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ مگر فاروق اعظم! وہ فاروق اعظم جنکے نام سے قیصر و کسریٰ بھی کانپ اٹھتے تھے۔ اور جن کی سطوت و جلالت کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اپنی ایک لغزش پر ایک عامی سے معافی کے طلبگار ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے اندھا کہہ دینے پر کوئی غصہ نہیں فرماتے۔

شاہ عبدالرحیم صاحب علیہ الرحمۃ اور ایک کتے کی حکایت

مسلمانو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم

اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے۔

"یہ روایت قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے اس وجہ سے اس کا صحیح ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ جبریل ہر جگہ اللہ کی طرح موجود نہیں رہتے۔ قرآن میں صاف کہدیا گیا ہے۔ کہ فرشتے بلا حکم الٰہی نہیں اترتے وما نتنزل الا بامر ربک۔ جبریل روح القدس ہیں۔ جنکا وظیفہ یہ ہے کہ انبیائے کرام کے پاس اللہ کے پیغامات پہنچائیں نہ کہ کلمہ حق کے روکنے کے لئے کسی کے منہ میں مٹی ٹھونسیں۔ اور فرشتے اپنے ارادہ یا جذبہ سے کوئی کام نہیں کرتے۔ بلکہ ویفعلون ما یؤمرون۔ وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ اگر جبریل کا یہ فعل حکم الٰہی سے تھا تو پھر فرعون ان کے اوپر غالب کیوں رہا۔ کیونکہ قرآن میں تو تصریح ہے کہ اس نے کلمہ پڑھ دیا۔ قال آمنت انہ لا الٰہ الا الذی آمنت بہ بنوا اسرائیل وانا من المسلمین۔ فرعون نے کہا کہ میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں بغیر اس معبود کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں۔ اور میں مسلمان ہوں اور جبریل کی ساری محنت اکارت گئی۔" مقام حدیث۔ صـ ۳۲

معراج انسانیت میں تو پرویز صاحب ظاہر کرتے ہیں کہ فرعون کے اظہار دعوٰی ایمان کو خدا نے رد فرما دیا تھا۔ اس کے بعد مقام حدیث میں لیے پورا پکا مسلمان ٹھیرا کر اس کے چہرہ سے مٹی صاف کرتے ہوئے حدیث پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ حدیث جسکو نشانہ بنایا ہے۔ وہ ہے جسمیں ہے کہ حضرت ابن عباس نے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جبریل نے بیان فرمایا ہے کہ جب فرعون غرق ہو رہا تھا تو وہ

رحمت سے بزرگانِ دین نے نہ صرف انسانوں ہی پر بلکہ جانوروں پر بھی رحم و شفقت فرما کر دکھایا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب علیہ الرحمۃ نے ایک بار ایک کتے کا بچہ کیچڑ میں پڑا دیکھا۔ سردی سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ ایک حمام قریب تھا۔ وہاں لے جا کر اس کو غسل کرایا۔ اور پھر اُسے گرم جگہ رکھا۔

اور ایک مرتبہ یہی صاحب کہیں جا رہے تھے۔ کہ ایک چھوٹا راستہ جسے پگڈنڈی کہتے ہیں۔ اور جس پر بمشکل ایک آدمی ہی چل سکتا ہے۔ اس پر آپ چل رہے تھے۔ کہ اتفاقاً سامنے سے ایک کتا آ گیا۔ پگ ڈنڈی کی دونوں جانب کیچڑ اور نجاست تھی۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ اے کتے تو نیچے اتر۔ تاکہ میں نکل جاؤں۔ کتے نے جواب دیا۔ تعجب ہے کہ آجکل کے درویشوں میں تکبر پایا جانے لگا ہے۔ آپ نے اس وقت اپنے آپ کو اچھا سمجھا ہے اور مجھے حقیر۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ یہ بات نہیں بلکہ بات یہ ہے۔ کہ میں مکلف ہوں۔ تو مکلف نہیں۔ اگر میں نجاست میں آلودہ ہو گیا تو بلے دھوئے نماز نہ پڑھ سکوں گا۔ اور دھونے سے مشقت میں پڑوں گا۔ اور اگر تو نجاست میں آلودہ ہو گیا۔ تو تیرا کوئی حرج نہیں۔ سوکھ کر پھر ویسا ہی ہو جائیگا۔ کتے نے جواب دیا۔ حضرت! یہ سچ ہے۔ مگر یہ یاد رکھئے۔ اگر آپ اتر گئے اور نجاست میں آلودہ ہو گئے۔ تو یہ نجاست ایک لوٹے سے دُھل جائے گی اور اگر میں نیچے اتر گیا۔ اور آپ پاک صاف نکل گئے۔ تو یاد رکھنا۔ کہ آپ کے دل میں تکبر و غرور پیدا ہو گا۔ اور وہ سات سمندر سے بھی نہ دُھل سکے گا۔ اب آپ کو اختیار ہے۔ اس بات سے حضرت شاہ صاحب پر ایک کیفیت طاری ہوئی اور نیچے اتر گئے۔ اور کتا نکل گیا۔

مسلمانو! دیکھا آپ نے ان بزرگوں نے کتوں تک پر رحم و شفقت فرمائی اور اس بات پر کوئی یورپ زدہ شخص اعتراض نہ کرے۔ کہ کتے نے کلام کیسے کر لیا تھا۔ ہوا آج اگر تمہارے گراموفون ریکارڈ تمہارے سامنے بول سکتے ہیں تو اللہ والوں سے جانور کیوں بات نہیں کر سکتے۔ یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں۔

منظر نہایت قابل دید تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لایا ہوں۔
اور میں اس کے منہ میں سمندر کی مٹی ڈال رہا تھا تاکہ کہیں وہ رحمت میں نہ آ جائے۔
فرعون کا مسئلہ پہلے قرآن سے واضح ہو جانے پر اس پر فاسش کا اندازہ
ہو سکیگا۔ جو ترمذی اور اس کے راویوں کو اور ابن عباس و جبریل کو فرعون کے
ساتھ تھی۔ اس میں پہلی چیز یہ ہے کہ فرعون نے ڈوبتے وقت صرف یہی کہا
تھا کہ میں بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لا کر مسلمان ہوا ہوں۔ اس طرح وہ اپنے
دعوی کے مطابق تو مسلمان ٹھیرتا ہے۔ مگر قرآن کے اس بارہ میں دو
مستقل اصول ایسے ہیں جن کے پیش نظر وہ مسلمان نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان میں
سے ایک اصول یہ ہے کہ جو آدمی یا قوم خدا کا عذاب دیکھکر ایمان لائے
اس کا ایمان خدا کے ہاں مقبول نہیں ہوتا۔ اور قرآن ہی واضح ہے کہ فرعون
نے عذاب پاکر ہی ایمان کا اظہار کیا تھا۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ قرآن میں ایمان
کا آخری اور کم از کم تقاضا یہ ہے کہ توحید اور رسالت کا دوگونہ اقرار کیا جائے۔
اور قرآن ہی سے واضح ہے کہ فرعون کا ایمان ایسا نہ تھا بلکہ اس نے صرف توحید
کا اقرار کرکے اپنی مسلمانی کے اظہار پر زور دیا۔ اور حضرت موسیٰ کی رسالت کو
ماننے سے گریز کیا جنہیں وہ آخری دم جھٹلاتا اور ستاتا رہا۔

ان دو باتوں کے علاوہ فرعون کے نامسلم ہونے کے متعلق قرآن میں اور بہت
کچھ ہے۔ ایک مقام پر ہے کہ اللہ نے دنیا و آخرت کے عذاب میں اسے پکڑ لیا
ہے۔ ایک جگہ ہے کہ ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا جو سارے کے سارے
ظالم تھے۔ ایک اور جگہ ہے کہ وہ لوگ ہم نے آگ کی طرف دعوت

اور ان کی کرامات حق ہیں۔

دوستو! یہ ہیں ہمارے اسلاف جن کے حالات آپ نے سنے اور ایک ہم بھی ہیں۔ جن کے حالات یہ ہیں سے

شنیدم کہ مردانِ راہ خدا! دلِ دشمناں ہم نکردند تنگ!
ترا کے بیسّر شود ایں مقام کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

آجکل کی قومی ہمدردی

بھائیو! آج کل اس ترقی یافتہ زمانہ میں بڑے بڑے لوگ ہمدردی کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اور ہمدردِ قوم ہونے کے مدعی بنتے ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ قوم سے ان کو نہ مناسبت ہے۔ نہ محبت۔ بنگلوں میں آبادی سے باہر رہتے ہیں۔ اور دنیا بھر کی غذائیں چائے، بسکٹ، ڈبل روٹیاں، پیسٹریاں۔ کیک۔ انڈے۔ پھل فروٹ وغیرہ سب کچھ رگڑ جاتے ہیں۔ اور ان کے غریب بھائی شہر میں ننگے۔ بھوکے پھرتے ہیں۔ اور ان کو خبر تک بھی نہیں۔ اگر کسی کے لئے کچھ خیر خواہی وغیرہ بھی کرتے ہیں تو وہ بھی اپنے ہی جیسے امیروں کے لئے۔ تو اس کا نام قومی ہمدردی نہیں ہے۔ اس لئے کہ قوم نام ہے مجموعہ افراد کا۔ اور مجموعہ میں اعتبار اکثریت کا ہوتا ہے۔ اور اکثر افرادِ قوم میں یہی غریب لوگ ہیں۔ امیر تو بہت تھوڑے ہیں تو اس اعتبار سے قوم گویا غریبوں کا نام ہوا۔ تو قومی ہمدردی کے معنے یہ ہونگے غریبوں کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ مگر وہ لوگ غریبوں سے ہمدردی کیا کرینگے جن کے خیال میں غریبی خود جرائم کی فہرست میں درج ہو۔ ہاں قومی ہمدردی رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے سکھلائی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

اَلْمُؤْمِنُوْنَ کَرَجُلٍ وَّاحِدٍ اِنِ اشْتَکٰی عَیْنُہٗ اِشْتَکٰی کُلُّہٗ وَ اِنِ اشْتَکٰی رَأْسُہٗ اِشْتَکٰی کُلُّہٗ ـــ (مشکوٰۃ شریف ص۴۲۲) سارے مسلمان ایک آدمی کی طرح ہیں۔ جس کی آنکھ دکھے۔ تو سارا جسم ہی اس کا دکھنے لگتا ہے۔ اور اگر سر دکھے۔ تو سارا جسم اس کا دکھنے لگتا ہے۔

اس حدیث کا ترجمہ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے یہ اشعار ہیں:۔

دینے والے بیدُر بنائے۔ اور قیامت کے روز اُن کی امداد نہیں ہوگی۔ ہم نے اس دُنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگائی اور قیامت کے روز وہ مکروہ اور قبیح ہوں گے۔ اور یہ بھی نہ ہم نے خود اسکو اور اس کی فوجوں کو پکڑا اور دریا میں دے مارا۔ اب دیکھ لو ظالموں کا انجام۔ ایک جگہ یہ بھی ہے۔ فرعون قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے رہے گا۔ اور انہیں آگ کے گھاٹ اتار لگا۔ جو اترنے میں سب سے بُری گھاٹ ہے۔ اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت ڈالی گئی۔ اور اسی طرح قیامت کے روز یہ بہت بُری بلا ہے جو کسی کے پیچھے ڈالی جاسکتی ہے۔ اسی سے ملتا جلتا قرآن میں اور تذکرہ بھی ہے جو فرعون کے متعلق پایا جاتا ہے

فرعون کی مِسل کے اس معائنہ کے بعد یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ وہ قابل غرق تھا ہی اور اسی لئے غرق ہوا۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جب خدا نے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا تو یہ اس کے مسلمان ہونے کا ثبوت ہے۔ حالانکہ اس کے جسم کو خدا نے اس غرض کے لئے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا کہ وہ لوگوں کے لئے نشان رہے۔ نہ اس لئے کہ وہ مسلمان تھا ورنہ ایک مسلمان کو مار کر اس کے جسم کو لوگوں میں نشان اور تماشہ بنانا اس کی کچھ بھی عزت نہ تھا تقاضا

ہے اس نے ان اہم سوالات کو قیامت پر ملتوی رکھا ہے اور قیامت بھی صرف وہ جو مرنے کے بعد آئیگی وہ اس قیامت سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا جو اسکی ایک ایک سانس میں پوشیدہ ہے۔ اور اس جنت و دوزخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا جو قدم قدم پر اس کے سامنے ہے۔ قرآنی فیصلے۔ صـــ ٢٣٢ ×

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند ☆ کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بہ درد آورد روزگار ☆ دگر عضوہا را نماند قرار

تو اے میرے بھائیو! قومی ہمدردی یہ ہے کہ قوم کا ایک فرد بھی پریشان ہو۔ تو ساری قوم پریشان نظر آنے لگے۔ مگر یہاں اس قسم کی ہمدردی؟ یہاں تو نفسی نفسی کا عالم ہے۔ خوب یاد رکھئے۔ آج جس قدر بھی مشکلات ہیں۔ ان سب کی وجہ یہی ہے۔ کہ ہم حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دامانِ رحمت کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ آؤ! اور پھر مضبوطی سے اسی دامنِ رحمت کو پکڑ لو۔ اور اس مادر پدر آزادی کو چھوڑ کر زلفِ نبی کے گرفتار بن جاؤ پھر دیکھو کہ ؎

ہو سلسلہ الفت کا جسے زلفِ نبی سے!
الجھے نہ کوئی کام نہ پابندِ بلا ہو!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

نہیں ہوتا۔ یہ مان لینے کے بعد کہ وہ واقعی مجرم تھا جبریل کا اس کے منہ میں مٹی ڈالنا اور یہ خواہش کرنا کہ وہ خدا کی رحمت کا مستحق نہ ہو۔ کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں رہتا یہ کہنا کہ فرشتے خدا کی طرح ہر جگہ حاضر نہیں رہتے۔ بالکل بے وجہ ہے۔ آخر حدیث میں یہ کب ہے کہ جبریل خدا کی طرح ہر جگہ حاضر رہتا ہے۔ یا خود بخود بلا حکم خداوندی دریا میں پہنچ گیا۔ یہ کچھ جب ہے نہیں تو ایسا اعتراض کچھ معنی نہیں رکھتا۔ رہا جبریل کی محنت کا اکارت جانا۔ تو یہ نقط نظر کا دھوکہ ہے ورنہ جبریل نے تو مٹی ٹھونسنے کا یہ عمل فقط اس جھڑک اور عتاب کے عملی مظاہر کے تحت انجام دیا تھا جو فرعون کے ادھورا ایمان لانے پر ایسے خدا کی طرف سے وارد ہوا یعنی کا تتمہ دینے سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا۔ کہ آن کے کہا سے اس ادھورے ایمان کی یہی قدر ہے۔ اس بعد از وقت ایمان کے جواب میں مرحبا جزاک اللہ سننے کی امید مت رکھو۔

پھر بھی شکر ہے پرویز صاحب حدیث کو جھٹلانے کی دھن میں یہ تو مان گئے کہ فرشتے بھی کہیں وجود کے مالک ہیں۔ ورنہ کتاب ابلیس و آدم میں تو انہیں فقط خیالی اور معنوی قوتوں کا نام دیا تھا۔ سچ ہے۔ دروغ گو را حافظہ نباشد۔

---

* یہ ہے اپنے انکار کو قرآن سے فائق بنانے کی کوشش۔ قرآن کہتا ہے کہ موت کے بعد تمہیں قیامت کو خدا کے حضور حاضر ہونا ہو گا۔ اور وہاں کی کامیابی کیلئے اس زندگی کو نیک بنانا ہو گا۔ مگر آپ کہتے ہیں کہ اس قیامت کا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ جبتک کہ قدم قدم پر قیامت کو موجود نہ سمجھا جائے۔

پانچواں وعظ

"اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۝

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انْحَرْ۔ اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ (پ ۳۰ ع ۳۳)

اے محبوب! بیشک ہم نے تمہیں بیشمار خوبیاں عطا فرمائیں۔ تو تم اپنے رب کے لئے نماز پڑھو۔ اور قربانی کرو۔ بیشک جو تمہارا دشمن ہے۔ وہی ہر خیر سے محروم ہے۔

حضرات! آج میں نے آپ کے سامنے قرآن پاک کی ایک چھوٹی سی سورت پڑھی ہے۔ یہ سورت اگرچہ بظاہر چھوٹی سی ہے۔ مگر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات کا ایک سمندر اس میں موجزن ہے۔ قرآن پاک ایک ایسی جامع کتاب ہے۔ کہ اس کی چھوٹی سی عبارت میں بھی دین و دنیا کے مسائل

غیر قرآنی وحی

"قرآن کے علاوہ ان کے ہاں اور کوئی تعلیم وحی پر مبنی نہیں" ص ۴۲

یہ سوال کہ وحی صرف قرآن ہی میں ہے یا اس کے باہر بھی ہے متعدد الجھنوں کا باعث ہوا ہے۔ ان میں سے ایک الجھن یہ ہے کہ رسول کی ہر بات وحی ہے یا نہیں۔ دوسری یہ ہے کہ اگر وہ وحی ہے تو قرآن کی طرح محفوظ کیوں نہیں تیسری الجھن یہ ہے کہ اگر وحی نہیں تو اسے مانا کیوں جائے۔ چوتھی الجھن یہ ہے کہ اگر اسے مانا جائے تو وقتی طور پر مانا جائے یا ہمیشہ کے لیئے۔ پانچویں الجھن ہے کہ اگر وہ وقتی طور پر ماننے کے قابل ہے تو اسے باقی کیوں رکھا جائے تو وہ باقی کیوں ہے۔

جہاں تک پہلی الجھن کا تعلق ہے۔ یہ تمام تر پرویز صاحب کے دماغ ہی کی پیداوار ہے۔ ورنہ یہ سوال نہ تو قرآن میں چھیڑا گیا۔ اور نہ ہی قرآن لانے والے اور اس کے ماننے والوں کے درمیان پیدا ہوا۔ ان کے زمانہ میں عقیدہ وعمل کا طریقہ صرف یہ تھا کہ قرآنی احکام کو لوگ اس طریقہ پر عمل میں لاتے جو انہیں رسول سمجھاتا تھا۔ بغیر اس سوال کے کہ رسول کا بتایا ہوا طریق عمل قرآن کی طرح وحی ہے یا نہیں۔ یہی انہیں قرآن میں بھی ہدایت کی گئی تھی۔ اسی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اقسام وحی کا سوال یکسر خلاف قرآن اور تمام تر باعث فتنہ ہے۔ اور صحیح راہ یہی ہے کہ امت مسلمہ کو اسی فطری حالت پر رکھا جائے۔ جس پر وہ نزول قرآن کے وقت تھی۔ مگر اب چونکہ یہ سوال اس

سمو دیئے گئے ہیں۔ اور یہ قرآن پاک کا اعجاز ہے۔

بسم اللہ کی "ب" کا نقطہ

علامہ اسمٰعیل حقی علیہ الرحمۃ روح البیان میں لکھتے ہیں۔ کہ سارے علوم قرآن پاک میں ہیں۔ اور قرآن پاک کے سارے علوم سورۃ فاتحہ میں ہیں۔ اور سورۃ فاتحہ کے سارے علوم "بسم اللہ" میں ہیں۔ اور "بسم اللہ" کے سارے علوم بسم اللہ کی "ب" میں ہیں۔ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ جو باب مدینۃ العلم ہیں وہ فرماتے ہیں۔ اَنَا النُّقْطَۃُ تَحْتَ الْبَاءِ۔ "ب" کے نیچے کا نقطہ میں ہوں۔ (روح البیان ج۱ ص۶) گویا بسم اللہ کی ب کا نقطہ بھی اسرار و علوم کا ایک منبع و مخزن ہے۔ اور اس ایک نقطہ میں بھی کئی علوم مضمر ہیں۔

ریلوے ٹائم ٹیبل کا نقطہ

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ ایک مرتبہ راولپنڈی کے ایک جلسہ میں میں نے یہی روایت بیان کی۔ تو ایک جنٹلمین نے تقریر کے بعد مجھ سے سوال کیا۔ کہ مولانا یہ روایت کچھ عجیب سی ہے۔ کہ ایک نقطہ میں سب کچھ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے پاس ریلوے ٹائم ٹیبل تھا۔ میں نے اس میں سے ریلوے لائن کے نقشے کا صفحہ اس کے سامنے رکھ کر پوچھا۔ فرمایئے۔ اس میں لاہور کہاں ہے، اس نے ایک جگہ انگلی رکھ کر بتایا۔ کہ لاہور یہ ہے۔ میں نے کہا یہ کہاں؟ تو بولا۔ یہ میری انگلی کے نیچے۔ میں نے کہا۔ ہوش سے بات کیجئے۔ اتنا بڑا لاہور۔ آپ کی انگلی کے نیچے کیسے آگیا۔ تو بولا یہ جو نقطہ سا ہے۔ یہی لاہور ہے۔ میں نے کہا۔ تو آپ کے سوال کا جواب ہو گیا۔ یہ جو ٹائم ٹیبل کا نقطہ ہے۔ اس کی حیثیت یہ ہے کہ آپ اسے لاہور کہہ رہے ہیں۔ گویا انارکلی بازار اسی نقطہ میں ہے۔ کشمیری بازار اسی ایک نقطہ کے اندر موجود ہے۔ تو اگر آپ کے ریلوے ٹائم ٹیبل کے ایک نقطے میں اس قدر جامعیت ہے۔ تو ربِّ کائنات کی جامع کتاب قرآن پاک کے نقطے کی جامعیت کا انکار کیسے ہو سکتا ہے؟ اس میرے الزامی جواب پر، وہ خاموش ہو گیا۔ بہرحال یہ سورت اس کتاب پاک کی ہے۔ جس میں سب

قدر زور کے ساتھ اٹھایا گیا ہے کہ اس پر بڑی بڑی کتابیں پرویز صاحب نے لکھ رکھی ہیں۔ اس لئے اس کا جواب صفائی کے ساتھ دیا جانا ضروری ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کی ہر بات وحی ہے۔ اور وحی کے بغیر کچھ نہیں خواہ سوتے میں یا جاگتے میں۔ اور علم کے طور پر کہے یا ہنسی اور مذاق کے طور پر۔ اور خواہ ایسے اس کے کہنے کے بعد خدا کی طرف پوچھا جائے۔ کہ تم نے ایسا کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے تقریباً ہر مقام پر خدا اور رسول کی اطاعت و ایمان کا یکساں حکم دیا گیا ہے جس کی وجہ سے دونوں کے ساتھ ایمان لانا بھی لازم ہے۔ اور دونوں کی اطاعت بھی ہمیشہ کے لئے یکساں لازم ہے۔ مسلمان ہونے کے لئے جس طرح رسول کے زمانہ میں خدا اور رسول پر ایمان لانا ضروری تھا۔ اسی طرح آج بھی ضروری ہے کیونکہ دونوں پر ایمان لانا یکساں لازم ٹھیرایا گیا۔ پھر اگر الٰہی حکم کی بدولت خدا کی طرح رسول پر ایمان لانا آج بھی[1] ضروری ہے۔ تو ایسا ہی حکم جو دونوں کی اطاعت کے لئے دیا گیا ہے۔ اور بالکل یکساں دیا گیا ہے۔ اس میں یہ کیسے معقول ہو سکتا ہے کہ ایک اطاعت لازم ہو اور دوسری نہ ہو۔ ایسی صورت میں جب کہ ایک ہی اطاعت لازم اور ضروری تھی تو دونوں کی اطاعت کا یکساں

---

[1] جب تک کوئی شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان نہ لائے۔ قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان لا ہی نہیں سکتا۔ سلیم کے نام۔ ص۸۸

گویا پرویز صاحب کے نزدیک رسول پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور اس کی اطاعت ضروری نہیں بلکہ ممنوع ہے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے الگ ہو کر رسول پر ایمان لانے سے بھی رد کرتے ہیں۔

کچھ ہے۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ ہماری ناقص عقلیں قرآن پاک کے جملہ علوم تک نہ پہنچ سکیں۔ مگر قرآن پاک میں دین و دنیا کی جملہ مشکلات کا حل موجود ہے۔

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْاٰنِ لٰکِنْ تَقَاصَرَ عَنْهُ اَفْهَامُ الرِّجَالِ

ایک بوڑھے باپ کی حکایت

حضرت امام محمد رضی اللہ عنہ جو ہمارے امام اعظم رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ ان کے زمانہ میں ایک لاولد بوڑھا آدمی تھا۔ آخری عمر میں اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ بوڑھا مارے خوشی کے آپے سے باہر ہوگیا اور خوشی میں قسم کھا بیٹھا۔ کہ خدا کی قسم میں اپنی اس بچی کو جہیز میں دنیا بھر کی ساری چیزیں دوں گا۔ اور لڑکی جب بڑی ہو گئی۔ اور اس کی شادی ہونے لگی۔ تو بڈھے کو اس کی قسم یاد دلائی گئی۔ اب وہ حیران ہوا کہ دنیا کی ساری چیزیں تو جہیز میں دینا میرے بس کی بات نہیں۔ اب قسم کیسے پوری کروں؟ حضرت امام محمد علیہ الرحمۃ سے یہ مسئلہ دریافت کیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ تم جہیز میں قرآن پاک دیدو۔ قرآن دیا تو گویا دنیا کی سب چیزیں دے دیں۔ دیکھا آپ نے کیسا عجیب فیصلہ ہے۔ واقعی قرآن پاک دین و دنیا کی ساری برکتوں پر حاوی ہے۔

آجکل کا جہیز

مگر یہ تو پرانی باتیں ہیں۔ جب کہ لوگ۔ جہیز میں قرآن پاک دیا کرتے تھے۔ اب تو جہیز میں ریڈیو سیٹ اور گراموفون دیا جاتا ہے۔ کہ لے بیٹی! دن رات گانے ہی سنتی رہنا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آج کل کی لڑکیاں قرآن و حدیث کے علاوہ گھر کا کام کاج بھی نہیں جانتیں ہاں گانے بجانے کی باتوں میں ماہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں نے "آجکل" کی ایک نظم میں لکھا ہے؎

ڈینجرس ہی ڈینجرس ہیں عضو سب ؛ سرخ تلوے سرخ ناخن سرخ لب
ہو نہ ہو سینے پرونے کی تمیز ؛ ناچنے گانے کا ہو لڑکی کو ڈھب

لطیفہ ایک پرانے زمانے کی بڑھیا نے اپنی پوتیوں اور نواسیوں میں

اس شدّ ومد اور تکرار کے ساتھ قرآن میں حکم آنا کسی طرح بھی مفید نہ تھا۔
اس پر اب یہ کہنا کہ رسول کی اطاعت حاکم اور امیر وقت کی حیثیت میں تھی بہت بڑی عقل و فہم سے نکلی ہوئی بات ہے۔ اور قرآن پر بے جا زیادتی۔ کیونکہ اطاعت امیر کا حکم دینے کے تو سرے سے کوئی معنی نہ تھے۔ ایسا حکم اگر کسی حیثیت سے دینا بھی پڑتا۔ تو صرف ایک بار دینا کافی تھا۔ جیسے کھانے پینے کا حکم صرف ایک ہی مقام پر دیا گیا ہے جو حقیقت میں کھانے پینے کا حکم نہیں بلکہ فضول خرچی کی ممانعت ہے۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کا کوئی مقام بھی اطاعت رسول کے اس حکم سے خالی نہیں۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ اس بات کو سمجھنے کے لئے قرآنی احکام کی دو قسمیں ٹھہرا لیجئے۔ ایک حکم وہ جو خدا نے براہ راست اپنے بندوں کو فرمایا ہے۔ اور دوسرا وہ جو اس نے رسول کی زبانی انہیں بھیجا۔ اور رسول کو فرمایا کہ تم ایسا کہو۔ پہلی قسم کے احکام میں یہ حکم بھی ہے کہ رسول کی اطاعت کرو۔ اس میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ فلاں امر میں تم رسول کی اطاعت کرنا۔ اور فلاں میں نہ کرنا۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ جو حکم براہ راست خدا نے فرمایا ہے اسے بھی اسی طرح انجام دینا چاہیئے جیسے رسول نے بتایا ہو یا کر کے دکھایا ہو۔ مثال کے طور پر وضو کو لیجئے۔ ایک وضو وہ ہے جو زید کرتا ہے۔ ایک وہ ہے جو عمر کرتا ہے۔ اور ایک وہ جو ہر انسان اپنے ہی خیال سے کرتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ آنے والے اطاعت رسول کے حکم کا تقاضا یہ ہے کہ وضو صرف اور صرف اسی طریقہ پر کرنا چاہیئے۔ جیسے رسول نے کیا ہے۔ یہ پوزیشن ان احکام کی واضح ہو جانے کے بعد اب ان

بڑے افسوس کے ساتھ یہ بات کہی۔ کہ" آجکل" کی لڑکیاں تو" سوئی" کو بھی نہیں جانتیں۔ کہ وہ کس مصرف کے لئے ہے" یہ سن کر اس کی ایک۔ پوتی بولی۔ دادی جان۔ جانتیں کیوں نہیں۔ میں بتاتی ہوں۔ سوئی سے ریکارڈ بجایا جاتا ہے"! دیکھا آپ نے! بڑھیا تو کپڑے سینے کی سوئی کا کہہ رہی تھی۔ مگر پوتی نے گراموفون ریکارڈ کی سوئی سمجھ لیا۔

میرے بزرگو! قرآن کو اپناؤ! اپنی اولاد کو قرآن سکھاؤ۔ اور اپنی بچیوں کو قرآنی زیور و لباس جہیز میں دو۔ یہ جو دنیاوی نمائش کے لئے جہیز دیا جاتا ہے۔ اور نمائش کا لفظ میں نے اس لئے اختیار کیا ہے۔ کہ جہیز میں زیادہ تر نمائش ہی مقصود ہوتی ہے۔ دیکھ لیجئے۔ بازار سے جب جہیز کا سامان خریدنے کے لئے جاتے ہیں۔ تو دکاندار یہ پوچھتے ہیں۔ کہ یہ سامان استعمال کے لئے چاہیئے۔ یا جہیز میں دینے کیلئے؟ گویا جہیز کا سامان استعمال کے قابل نہیں ہوتا۔ ہاں نمائشی ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جہیز کا سامان عموماً پڑا خراب ہی ہو جاتا ہے۔ استعمال کے وہ لائق ہی نہیں ہوتا۔ نمائش جو اس سے مقصود تھی۔ وہ حاصل ہو گئی۔ اب بجز اس کے کہ پڑا پڑا خراب ہوتا رہے۔ اور کس کام کا؟ ہاں تو آج کل جو نمائشی جہیز دیا جاتا ہے۔ اس کا کیا فائدہ؟ جب کہ اسلامی جذبات کا کوئی زیور اس جہیز میں نہ ہو۔

خاتونِ جنّت کا جہیز

حضور سلطانِ دارین صلے اللہ علیہ و سلم کی لختِ جگر، حضرت خاتونِ جنت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا جہیز دیکھئے۔ شاعر نے کیا خوب لکھا ہے۔ ؎

متاعِ دنیوی جو حصۂ زہرا میں آتی تھی!
کھجوری کھردرے سے بان کی اک چارپائی تھی
مشقت عمر بھر کرنا لکھا تھا جو مقدر میں
ملیں تھیں چکیاں دو تاکہ آٹا پیس لیں گھر میں

باپ کے گھر سے آج کل کی لڑکیاں رنگ۔ رنگ کا لباس پہن کر نکلتی ہیں۔ مگر شہنشاہِ دو عالم صلے اللہ علیہ و سلم کی صاحبزادی کا امتیازی

احکام پر غور کیجیے۔ جن میں رسول کو خدا نے فرمایا کہ تم ایسا حکم دو۔ اور ایسی بات بتاؤ مثلاً قرآن میں ہے کہ تم کہو! اللہ ایک ہے۔ اس میں یہ نہیں کہ تم اس حکم کو خدا کی طرف سے پہنچاؤ یا قرآن کی طرف سے۔ اس لئے اس کا انکار کرنے والا بھی ایسا نہیں کہے گا کہ میں اسے خدا کا حکم ہونے کی وجہ سے نہیں مانتا۔ وہ تو صرف اسے رسول کی بات سمجھ کر اس کا انکار کرے گا۔ اور اسطرح بیک وقت رسول قرآن اور خدا تینوں کا منکر ٹھہر لگا۔

اس طرح قرآن میں ہر جگہ اطاعت رسول کا حکم موجود ہونے پر سوچا جا سکتا ہے۔ اور یہ سوچنا نہایت ضروری ہے کہ آخر اطاعت امیر کا حکم اس تاکید کے ساتھ دینا کیسے مفید ہو سکتا تھا جبکہ لوگ اسلام لانے سے پہلے بھی اپنے امیر و حاکم کا حکم مانتے تھے۔ اور جو ایمان نہیں لائے تھے وہ۔ اور جو آج بھی قرآن کو نہیں مانتے۔ سب کے سب اپنے امیر اور سردار کا کہا مانتے ہیں۔ اگرچہ وہ نہ قرآن مانتے ہیں اور نہ قرآن کا یہ حکم ہی کچھ ان کے علم و عقیدہ میں ہے۔ پھر کیا جو کام بغیر کسی حکم و ہدایت کے ہو رہا ہو اس کے لیے بھی کہیں یا کبھی اسقدر تاکید کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے۔ یا کبھی وہ مفید اور معقول بھی ہو سکتا ہے۔ اس حکم کو اور اس کی اتنی کچھ تاکید کو تو اسی وقت معقول کہا جا سکتا ہے کہ اطاعت رسول کے کام کو ہمہ وقتی اور دائمی لازم حکم کی حیثیت سے مانا جائے۔ یہ جب حقیقت ہے۔ تو یہاں اصل اہمیت کے قابل یہ سوال ہے کہ رسول کی پیروی اور اطاعت کا مقصد کیا ہے۔ نہ یہ کہ وحی کی اقسام کیا ہیں۔ اس لئے کہ اقسام وحی کی حیثیت تو ڈاک اور تار سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ اصل قدر و قیمت تو پیغام ہی کی ہوتی ہے ایک لکھے آدمی کا پیغام کبھی اس بنا پر لازم حکم نہیں سمجھ لیا جاتا۔ کہ وہ تار کے ذریعہ پہنچا ہے۔ اور نہ ہی ایک سرکاری حکم اس لئے بیکار ٹھہرایا جاتا ہے

لباس ملاحظہ فرمایئے ؎

چلی تھی باپ کے گھر سے نبی کی لاڈلی پہنے
حیا کی چادریں عفت کا جامہ صبر کے گہنے

میں نے اپنی ایک نظم میں لکھا ہے ؎

دیکھئے اس قسم کے زیور سے ان کو پیار تھا
صبر کے کانٹے تھے اور تقویٰ گلے کا ہار تھا
تھیں ادھر پہنی ہوئیں صبر و رضا کی چوڑیاں
اور اُدھر پہنی ہوئیں شرم و حیا کی چوڑیاں

حضور علیہ السلام کی اولاد کرام

حضرات! اس سورت کا شانِ نزول سننے سے قبل یہ بات معلوم کر لیجئے۔ کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو صاحبزادے تھے۔ اور چار صاحبزادیاں۔ صاحبزادیوں کے چار ہونے میں تو کوئی اختلاف نہیں۔ ہاں صاحبزادوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ چنانچہ امام قسطلانی علیہ الرحمۃ نے مواہب لدنیہ شریف میں لکھا ہے کہ متفق طور پر یہ بات ہے۔ کہ حضور کے دو ہی صاحبزادے تھے۔ حضرت قاسم اور حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ مگر بعض نے یہ بھی کہا ہے۔ کہ طیب و طاہر بھی دو صاحبزادے تھے۔ بہرحال حضور کی صاحبزادیوں کے چار ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ حضور کی ان چار

چار صاحبزادیاں

صاحبزادیوں کے نام تھے۔ زینب۔ رقیہ۔ ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن۔ حضرت زینب کی شادی ان کے خالہ زاد بھائی ابوالعاص سے ہوئی۔ حضرت رقیہ اور ام کلثوم کی شادی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ پہلے حضرت رقیہ کی اور آپ کی وفات کے بعد پھر ام کلثوم کی۔ اسی واسطے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ذوالنورین کہلاتے ہیں۔ اور اسی لئے اعلیٰ حضرت نے لکھا ہے۔ ؎

نور کی سرکار سے پایا دوشالہ نور کا
ہو مبارک تجھ کو ذوالنورین جوڑا نور کا

کہ وہ ڈاک کے ذریعہ پہنچا ہے۔ اور نہ ہی اس کے ڈاک کے ذریعہ پہنچنے پر یہ اعتراض معقول ہو سکتا ہے۔ کہ حکومت کے لئے تار کے ذریعہ اپنا حکم بھیجنے میں کیا مشکل ہے کہ وہ ایسا نہیں کرتی۔ اور نہ یہ کہ ہر حکم کا ریکارڈ اس نے اپنے آئین میں کیوں نہ کر رکھا۔

دوسری الجھن کا حل یہ ہے کہ اگر قرآن کے رو سے اطاعت رسول کو لازم مان لیا جائے تو پھر یہ کہنا ممکن نہیں رہتا کہ رسول کا حکم محفوظ نہیں۔ اس لئے کہ لازم حکم کی حفاظت بھی لازمی ہوتی ہے۔ ورنہ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ خدا نے جس کعبہ کا حج فرض فرمایا ہے وہ زمین پر ہے نہیں۔ بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ بیہودہ بات ہے کیونکہ طواف کعبہ کا حکم تو صرف ایک جگہ قرآن میں ہے۔ مگر اطاعت رسول کے حکم سے تو قرآن کا کوئی بھی مقام خالی نہیں پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس حکم کا کوئی مضمون نہ ہو اور اگر ہو تو صرف اس کی موجودگی تک ہو دنیا میں اسطرح کا رد ذ انسان بھی کوئی نہیں ہے تا کہ وہ کسی کو حکم تو دے مکان بنانے کا مگر اس مکان کے لئے کوئی زمین نہ دے اور جب اسی دنیا میں ممکن ہے اور ہوتا رہتا ہے کہ جو آدمی کسی حکومت کا باغی ہو جائے۔ وہ نہ حکومت کو مانتا ہے اور نہ اس کے

۱؎ پرویز صاحب نے اپنی کتابوں اور خاص کر کتاب مقام حدیث میں اس سوال کو کافی سے زیادہ دوہرایا ہے کہ اگر حدیث میں ہونے والے امور بھی وحی تھے تو خدا نے انہیں قرآن میں کیوں نہیں بیان کر دیا۔ اور خود رسول کیلئے کیا مشکل تھا۔ کہ وہ انہیں مثل قرآن کیطرح لکھوا تا۔ یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ مشکل و آسانی کے علاوہ اور کئی پہلو ہوتے ہیں۔ ورنہ حکومت اپنا حکم صرف تار کے ذریعہ بھیجتی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان سے فرمایا "اے عثمان! اگر میری سو لڑکی بھی ہو۔ اور ان کا یکے بعد دیگرے انتقال ہوتا جائے۔ تو میں یکے بعد دیگرے تمہارے نکاح میں دیتا جاؤں۔ (مواہب لدنیہ صفحہ ۱۹۶ جلد ۱)۔
سبحان اللہ! کیا شان ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی۔ اسی ایک روایت سے حضرت عثمان کی فضیلت ظاہر ہے۔ مگر ؎

دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے!

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا درجہ بلند ہے۔

روایاتِ شیعہ

میرے بزرگو! حضور کی صاحبزادیوں کا چار ہونا کچھ ایسا متفقہ مسئلہ ہے۔ کہ اس میں شیعہ روایات بھی مختلف نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کی معتبر کتاب اصول کافی ہے:۔

تَزَوَّجَ خَدِیْجَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا وَھُوَ بِضْعٌ وَعِشْرِیْنَ سَنَۃٍ فَوُلِدَ مِنْھَا قَبْلَ مَبْعَثِہٖ قَاسِمٌ وَرُقَیَّۃُ وَزَیْنَبُ وَاُمُّ کُلْثُوْم وَوُلِدَ بَعْدَ الْمَبْعَثِ الطَّیِّبُ وَالطَّاھِرُ وَالْفَاطِمَۃُ عَلَیْھَا السَّلَام۔ (اصول کافی صفحہ ۲۷۸ ج ۱ سطر ۳) ــــ یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کیا۔ تو بعثت سے پہلے قاسم۔ رقیہ۔ زینب۔ ام کلثوم پیدا ہوئیں۔ اور بعثت کے بعد طیب و طاہر اور فاطمہ پیدا ہوئیں۔

اور سنئے۔ حیات القلوب میں ہے:۔

"بر سند معتبر از حضرت صادق روایت کردہ است۔ کہ از برائے رسولِ خدا از خدیجہ متولد شدند۔ طاہر۔ قاسم۔ فاطمہ۔ رقیہ ام کلثوم۔ زینب" (حیات القلوب صفحہ ۷۱۸ ج ۲)

یعنی معتبر سند سے حضرت صادق سے روایت ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت خدیجہ سے جو اولاد ہوئی۔ وہ یہ ہے۔ طاہر۔ قاسم۔ فاطمہ۔ رقیہ۔ ام کلثوم۔ اور زینب۔

قانون کو۔ تو یہ کون نہ ہونے والا کلام ہے کہ آدمی اطاعت رسول کے انکار سے حدیث کا اور حفاظت حدیث کا انکار کر گذرے۔ ایک مومن قرآن کو تو بہر حال قرآن کے الفاظ پر غور کرنا ہو گا۔ وہاں جب اطاعت رسول کا حکم موجود ہے تو اسے اب دنیا کی کوئی طاقت حالات کی کسی تبدیلی کے تحت نہیں بدل سکتی۔ آج اگر حدیث کو غیر محفوظ فرض کر کے اطاعت رسول سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر یہ کہنا کیا مشکل ہے کہ چونکہ زنا اور سود کا رواج عام ہو گیا ہے اس لئے ان کی ممانعت ہے نہیں اور نہ ان کا ختم ہونا ممکن ہے۔

حدیث کے ساتھ اطاعت رسول کے تعلق کو واضح کرنے کے لئے ایک نہایت عمدہ مثال یہ ہے کہ قرآن میں اہل کتاب کو حکم دیا گیا ہے کہ تمہاری دینی حیثیت کا اعتبار اسوقت تک کچھ بھی نہیں جب تک کہ تم تورات و انجیل کو قائم نہ کرو۔ اور قرآن میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے تورات و انجیل میں گڑبڑ کر رکھی تھی اور وہ محفوظ نہ تھیں۔ جسکا مطلب ہوا کہ وہ جیسی کچھ شکل میں تھیں اسی شکل میں ان پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا یہی حال اطاعت رسول کا ہے۔ خدا نے اس کا حکم دیا اور یہ بھی فرمایا کہ رسول دنیا میں باقی نہیں رہیگا۔ اور یہ کہیں نہیں فرمایا کہ اس کے بعد اس کی اطاعت باقی نہیں رہے گی۔ تو کیا اس سے یہی نہیں سمجھا جائے گا۔ کہ رسول کی حدیث جس شکل میں ہے اسی میں اس سے اطاعت رسول کا کام لینا ہو گا۔ نہ یہ کہ اسے غیر محفوظ ٹھیرا کر اطاعت کے حکم کو بے معنی بنایا جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے تورات و انجیل کو غیر محفوظ کہہ کر ان کا مقام کسی مرکز ملت اور حاکم وقت کو دلایا جائے۔ اور اس کے قانون کو تورات و انجیل کے برابر سمجھا جائے۔ اور ان کے محفوظ ہونے یا نہ ہونے کا سوال کھڑا

کیوں دوستو! ایسے متفقہ مسئلہ میں آج اگر کوئی شخص اختلاف کرے۔ اور خواہ مخواہ یوں کہے۔ کہ حضور کی ایک ہی صاحبزادی تھی۔ تو وہ غلط گو ہوا یا نہیں؟ یقیناً ہوا۔ اور ایسے لوگ اس حقیقت کو اس لئے جھٹلاتے ہیں۔ تاکہ حضرت عثمان کی فضیلت ثابت نہ ہو جائے۔ مگر ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ بجز اس کے کہ اپنی ہی نادانی ظاہر کرتے ہیں۔ موٹی بات ہے۔ کہ خود خدا نے قرآن میں فرمایا ہے:۔

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ ــــــ (پ۲۲ ع ۵)

اے نبی! اپنی بیبیوں اور بیٹیوں سے فرما دے۔"

دیکھ لیجئے خدا نے یہاں "بَنٰتِكَ" جمع کے صیغہ سے فرمایا ہے کہ اپنی بیٹیوں سے فرما دے۔ اگر حضور کی ایک ہی بیٹی ہوتی۔ تو اللہ "بِنْتِكَ" فرماتا۔ کہ اپنی بیبیوں سے اور بیٹی سے فرما دے۔ مگر اللہ تو جمع کے صیغے سے فرمائے کہ بیٹیوں سے فرما دے اور یہ خواہ مخواہ یہی کہتے چلے جا رہے ہیں۔ کہ حضور کی تو ایک ہی بیٹی تھی۔ میرے بزرگو! یہ لوگ خود تو قرآن کے تابع نہیں ہوتے۔ ہاں قرآن کو اپنے تابع کرنے کے لئے یوں کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ اللہ نے یہاں جمع کا صیغہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تعظیم کی خاطر ارشاد فرمایا ہے اگر یہ بات مان لی جائے۔ تو پھر کل کو کوئی یوں بھی کہہ دے گا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی بھی ایک ہی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور قرآن میں "قل لازواجك" جو اللہ نے جمع کے صیغہ سے ارشاد فرمایا ہے۔ وہ حضرت خدیجہ کی تعظیم کے لئے فرمایا ہے۔ تو بھائیو! جس طرح یہ بات غلط ہے۔ اسی طرح وہ بات بھی غلط ہے۔

حضرات! اس سورۂ کوثر کا شان نزول بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو دو صاحبزادے تھے۔ ان میں سے مبلغ رسال تک کوئی نہ پہنچا۔ یعنی بالغ کوئی نہ ہوا۔ دونوں قبل بلوغت ہی وصال فرما گئے۔ اور اس کی وجہ یہ بھی ہے۔ کہ وہ صاحبزادے بالغ ہو کر یا نبی ہوتے یا نبی نہ ہوتے۔ اگر وہ نبی نہ ہوتے تو دشمن

ختم نبوت

کر کے انہیں یکسر باطل کہہ دیا جائے۔

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اطاعت رسول کا مطلب یہ ہے کہ حاکم وقت کی پیروی کیجائے۔ اور حدیث کا انکار کیا جائے۔ حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو پھر قرآن میں ایسا ہی حکم ہوتا۔ مگر یہاں حال یہ ہے کہ اطاعت رسول کا حکم ہر جگہ ہے اور اطاعت حاکم کا حکم اگر کہیں ہے بھی تو طرح طرح کی قیود و پابندیوں کے ساتھ ہے۔ پھر کیا ایک لازم اور دائمی حکم کی شان یہی ہوتی ہے اور اطاعت امیر کے ایسے ہی حکم کا مقام یہ ہے کہ اس سے حدیث رسول کو باطل ٹھہرا دیا جائے۔

تیسری الجھن اسی دوسری کی پیداوار ہے یعنی اگر یہ مان لیا جائے کہ رسول کی بات وحی نہیں تو پھر اسے مانا کیوں جائے۔ اور آج تو کیا خود عہد رسالت میں بھی آنحضور کی بات کو کیوں مانا گیا اور کیوں اس کے ماننے کا خدا نے حکم فرمایا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جب قرآن کے ساتھ آپکی کسی بات کی ضرورت نہ تھی۔ تو آپ بولتے کیوں رہے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ آنحضور کی بات کو اس لئے ماننے کا حکم دیا گیا کہ آپ وقت کے حاکم اور امیر تھے۔ اس پہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حاکم اور امیر کی بات کو کیوں مانا جاتا ہے۔ اور کس حد تک ماننا چاہیئے۔ قرآن کہتا ہے کہ اسکی وہی بات مانی جائے جو وہ خدا کی شریعت کے مطابق بتائے۔ اور اسی حد تک مانی جائے۔ جو وہ کہے۔ اور مانی اس لیئے جائے کہ اس کے پاس حکومت کا ڈنڈا اور قانون کا شکنجہ ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ ظالم سے مظلوم کو اس کا حق دلواتا ہے اس لحاظ سے اطاعت حاکم وامیر کا تقاضا صرف اتنا ہے کہ آپ اس کی قانونی گرفت سے بچتے رہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ اس کی ہر بات غلطی سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اس لیئے اس

اعتراض کرتے کہ دیکھو صاحب! پہلے نبیوں کی اولاد نبی ہوتی رہی۔ مگر ان کی اولاد نبی نہیں ہوئی۔ اور اگر نبی ہوتے تو حضور کی ختم نبوت میں فرق آتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو ان اعتراضات سے بچانے کے لئے کسی صاحبزادے کو بالغ نہ ہونے دیا۔

مرزائیوں کا فریب

میرے بھائیو! اس موقعہ پر مرزائی عموماً ایک روایت سنایا کرتے ہیں کہ:۔

لَوْ عَاشَ اِبْرَاهِیْمُ لَکَانَ صِدِّیْقًا نَبِیًّا ط۔ اگر حضور کے صاحبزادے ابراہیم زندہ رہتے۔ تو نبی ہوتے"

اس سے وہ یہ بات ثابت کرتے ہیں۔ کہ حضور کے بعد نبی آنے کا امکان تھا۔ جبھی تو کہا گیا ہے۔ کہ اگر وہ زندہ رہتے تو نبی ہوتے۔ مگر چونکہ وہ زندہ نہ رہے۔ اس لئے نبی نہ ہوئے۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ یہ روایت بیشک ابن ماجہ میں موجود ہے۔ مگر یہ تو لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ پڑھنا اور "اَنْتُمْ سُکَارٰی" چھوڑ جانے والا قصہ ہے کہ اپنے مطلب کا جملہ پڑھ لیا۔ اور اگلا حصہ چھوڑ دیا۔ ذرا اس حدیث کے آگے جو دوسری حدیث ہے وہ بھی تو پڑھی ہوتی۔ دیکھئے اس حدیث میں کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

لَوْ قُضِیَ اَنْ یَّکُوْنَ بَعْدَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَبِیٌّ لَعَاشَ اِبْنُہٗ وَ لٰکِنْ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ ۔ (ابن ماجہ ص۱۱۰) یعنی اگر یہ بات مقدر ہوتی۔ کہ حضور کے بعد بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے۔ تو حضور کے صاحبزادے زندہ رہتے۔ لیکن حضور کے بعد تو کوئی نبی نہیں"

میرے بھائیو! سنا آپ نے یہ ہے اصل حقیقت۔ مگر اس حدیث کو مرزائی نہ پڑھتے ہیں نہ سناتے ہیں۔ حالانکہ یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری شریف میں بھی ہے۔ چنانچہ دیکھئے بخاری شریف ص۹۱۳ ج۲ باب من تسمی باسماء الانبیاء۔ اور ابن ماجہ میں اسی حدیث کے حاشیے پر لکھا ہے کہ:۔

اَلَّذِیْ اَخْرَجَہُ الْبُخَارِیُّ فِیْ بَابِ مَنْ تَسَمّٰی بِاَسْمَاءِ الْاَنْبِیَاءِ صَحِیْحٌ لَا شَکَّ فِیْ صِحَّتِہٖ ۔ (ابن ماجہ ص۱۱۰) یعنی جس حدیث کا

کے کامل اتباع کا کچھ بھی حکم نہیں۔ رہا رسول کا معاملہ تو اس کی ہر بات مانی جائے جس میں کوئی بھی شرط اور قید نہیں۔ اور نہ صرف وہی بات مانی جائے جو وہ کہے بلکہ ہر اٹھنے بیٹھنے اور رہنے سہنے میں اس کا اتباع کیا جائے۔ اور اپنی زندگی کو اس کی زندگی کے مطابق بنایا جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اول اور براہ راست اسی کے پاس آتا ہے۔ اور خدا کی طرف سے اس کے قرآن حاصل کرنے اور اسے اپنی ذات پر نافذ کرنے اور لوگوں کو پڑھانے اور سنانے کے دوران بے شمار ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا مطالعہ و مشاہدہ تنہا وہی کرتا ہے۔ اور کوئی دوسرا ان سے واقف ہو نہیں سکتا۔ ایسے مسائل جو قرآن کا ایک حصہ نازل ہونے سے دوسرے حصہ کے نزول تک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا خدا کی رضا کے مطابق صحیح حل ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری قرآن کا نازل ہونا کیونکہ ان میں سے کسی ایک مسئلہ کا غلط حل پوری قرآنی تعلیمات پر برا اثر ڈالتا ہے ان کے علاوہ کچھ مسائل عام ہوتے ہیں جو قرآن کے مجموعی احکام سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کا بھی صحیح حل ہونا لازم ہوتا ہے۔ رسول ان دونوں طرح کے مسائل کو خدا کی رضا کے مطابق صحیح حل کرتا ہے۔ اور ان پر عمل کرتا ہے اور دوسروں سے کراتا ہے اسی لئے اس کی اطاعت و اتباع کا اس قدر تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے اور یہ حال رسول کے بغیر کسی دوسرے امیر کا کبھی نہیں۔ اس لئے کسی بھی امیر کی نہ تو بلا قید اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور نہ اس کی ہر حرکت و سکون میں اس کے کامل اتباع کا انسان کو پابند بنایا گیا۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک انسان قانونی اور عدالتی نظام کے ماسوا ہر امر میں اس کی مخالفت کرے۔ اور پھر بھی کامل مسلمان رہے۔

بخاری نے اخراج کیا ہے وہ بلا شک صحیح ہے"۔

اور جو حدیث مرزائی پیش کرتے ہیں یعنی لَوْ عَاشَ اِبْرَاهِیْمُ لَکَانَ صِدِّیْقًا نَبِیًّا ـــ اس کے متعلق جملہ محدثین نے لکھا ہے۔ کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:-

وَفِیْ سَنَدِہٖ اَبُوْ شَیْبَۃَ اِبْرَاهِیْمُ بِنْ عثمان الواسطی وَهُوَ ضَعِیْفٌ

(مرقاۃ ص۲۹۵ وکذا فی مواہب لدنیہ ص۳۱ ج۱) ـــ یعنی اس کی سند میں ابو شیبہ راوی ہے۔ جو ضعیف ہے۔

اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں۔

"بصحت نرسیدہ و اعتبارے ندارد" (مدارج النبوۃ ص۲۶۷ ج۲)

تو میرے بھائیو! مرزائیوں کا یہ ایک فریب ہے۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ و سلم کے بعد اگر کوئی نبی ہونا ممکن ہوتا۔ تو آپ کے صاحبزادے زندہ رہتے اور نبی ہوتے۔ تو اس سورۃ کوثر کا شانِ نزول یہ ہے۔ کہ حضور کے صاحبزادوں کا انتقال ہو گیا۔ تو کافروں نے کہنا شروع کر دیا۔ کہ بس اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسل باقی نہ رہے گی۔ اور آپ ابتر ہو گئے ہیں۔ (معاذ اللہ) ابتر اسے کہتے ہیں۔ جس کی نسل باقی نہ رہے۔ کافروں نے اپنے زعم باطل میں یہ سمجھ لیا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نہ اب نسل باقی رہے گی۔ اور نہ ہی آپ کا ذکر و نام باقی رہے گا۔ کفار کی اس بکواس سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو رنج و ملال ہوا۔ تو اللہ نے اپنے محبوب کی تسکین خاطر کے لئے یہ سورت نازل فرمائی اور فرمایا:-

شانِ نزول

"اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ۔ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ"

یعنے اے محبوب! ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا ہے۔ یعنے آپ پر ہم نے بڑے بڑے انعامات فرمائے ہیں۔ ہر نعمت کثرت کے ساتھ آپ کو عطا فرمائی ہے۔ گویا یہ بے ایمان جو بکتے ہیں۔ کہ آپ ابتر ہو گئے ہیں۔ پیارے

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ رسول کی اطاعت کا طول و عرض بھی یہی کچھ ہے۔ کہ وہ اس کی قانونی گرفت سے بچنے کے لئے لازم ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ جہاں اس کے پاس حکومت کا ڈنڈا نہ ہو اس کی بات ماننے کے کچھ معنے نہیں۔ اور اعمال کا جو وسیع دائرہ قانونی و عدالتی نظام کی زد سے باہر ہے۔ اس کے اندر اس کی بھلائی اور خوبی کی ہدایات و عادات پر چلنا کچھ ضروری نہیں۔ بلکہ ضروری یہ ہے کہ ان میں اس کا مسخر اڑایا جائے۔

چوتھی الجھن یہ ہے کہ رسول کا حکم دائمی ہے یا ہنگامی۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ وہ تین وجوہ سے دائمی نہیں۔ بلکہ وقتی تھا۔ اول اس لئے کہ اس میں وقتی مسائل بتائے گئے۔ دوم اس لئے کہ وہ محفوظ نہیں۔ سوم اس لئے کہ بعد کے خلفا نے آپ حضور کے بعض فیصلوں میں تبدیلی کر دی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ تینوں وجوہ باطل ہیں۔ کیونکہ ایک بات کو جب آپ حق تسلیم کرتے ہیں تو یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ ایک وقت میں حق ہو اور دوسرے میں نہ ہو۔ اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی حفاظت نہ کی جائے۔ اس لئے کہ قرآن بھی تو اپنی حقانیت ہی کی بنا پر محفوظ ہے۔ تیسری یہ وجہ ہے کہ رسول کے فیصلوں کو بعد کے خلفا نے بدل کر انہیں وقتی بنایا تو اس میں صداقت کی بجائے مغالطہ زیادہ ہے۔

رسول کے وقت جو قرآن بہت ہی سادہ قلم دوات سے کپڑے، چمڑے اور چٹائی کے ٹکڑوں پر مہینوں کی محنت کے بعد ایک نسخہ لکھا جاتا تھا۔ اور اب ایسے اعلیٰ کاغذ و کتابت سے پریس کے ذریعہ ایک وقت میں ہزاروں کی تعداد میں چھاپ دیا جاتا ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ زمانہ نبوت کی کتابت

یہ ان کی بکواس ہے۔ ہم نے ہر خیر و خوبی میں آپ کو کثرت عطا فرمائی ہے۔ پیارے تو نماز پڑھ اور دیکھ یہ جس قدر نمازی تیری اقتداء میں ہیں۔ یہ سب تیرے ہی نام لیوا، اور تیری ہی روحانی اولاد ہے۔ قربانی کے دنوں یعنے ایام حج میں دنیا کے گوشہ گوشہ سے کھچے چلے آنے والے سب تیرے ہی غلام ہیں۔ پیارے تیرا ذکر، تیرا نام تو ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ تیری نسل تیری امت تیرے نام لیوا قیامت تک باقی رہیں گے۔ ہاں جو تیرا دشمن ہے۔ وہی نامراد مریگا۔ بے نام و نشان ہو جائے گا۔ اور کوئی اس کا نام تک لینے والا نہ رہے گا۔ گویا اے محبوب! جو تیرا دشمن ہے۔ اصل میں وہی ابتر ہے۔ ؎

مٹ گئے مٹتے ہیں مٹ جائیں گے اعداء تیرے
نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا!

ذکر مصطفےٰ

چنانچہ میرے دوستو! یہ حقیقت ہے۔ دیکھ لو۔ جس قدر چرچا اور جس قدر نام ہمارے آقا و مولیٰ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اس قدر چرچا آج تک نہ کسی کا ہوا نہ ہوگا۔ عرش پر ہے تو حضور کا چرچا۔ فرش پر ہے تو حضور ہی کا چرچا۔ ؎

عرش پہ تازہ چھیڑ چھاڑ فرش پہ طرفہ دھوم دھام
کان جدھر لگا یئے تیری ہی داستان ہے

مسجدوں میں مدرسوں میں، اور خانقاہوں میں حضور ہی کا ذکر۔ گھروں میں شاہراہوں میں انہیں کا تذکرہ۔ کلمہ طیبہ میں۔ نمازوں میں دعاؤں اور اذانوں میں الغرض زمینوں اور آسمانوں میں انہیں کا ڈنکا بج رہا ہے ؎

وہ جن کا ذکر ہوتا ہے زمینوں آسمانوں میں
نمازی کی دعاؤں میں، مؤذن کی اذانوں میں

انبیاء کرام کی مقدس زبانوں پر۔ صحابہ کرام کی مجلسوں میں۔ اولیاء کرام اور اماماِن دین کے ارشادات میں۔ علماء کرام کے مواعظ اور نعت خوانوں کی نعت خوانیوں میں اسی محبوب کا ذکر ہوتا نظر آ رہا ہے۔ یہی ایک تو ہیں جو ہمہ گیر محبوبیت پا کر تشریف لائے۔ سب انہی کے فدائی ہیں۔ اور سب

قرآن کے طریقہ کو بدل ڈالا گیا۔ آخر ذرائع کتابت کی بنہات کو کتابت قرآن کی تبدیلی کہنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

اسی طرح صاحب اولاد لونڈیوں کو آغاز امر میں بیع کر دیا جاتا تھا۔ قرآن میں جب احکام وراثت نازل ہوئے اور ماں کو اولاد کا وارث بنایا گیا۔ تو ایسی لونڈیوں کو غلامی کی حالت میں رکھنا ممکن نہ رہا کیونکہ غلام کا کوئی وارث ہو سکتا ہے اور نہ وہ کسی کا وارث ہوتا ہے۔ احکام وراثت بھی قرآن کے آخری دور میں نازل ہوئے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ایسا کوئی معاملہ پیش نہ آیا۔ چنانچہ حضرت عمر نے ایسی لونڈیوں کی بیع کی مطلقاً ممانعت کر دی جن کے مالک سے ان کی اولاد ہو۔ یہ ان کا قرآن ہی کے حکم پر عمل تھا جو ڈھیل سے واقع ہوا۔

نکاح متعہ جسے میعادی یا عارضی نکاح کہنا چاہیئے۔ اس کا بھی عرب میں صدیوں سے رواج تھا۔ اور ایک عورت کے کئی کئی متعہ کے خاوند ہوتے تھے اور بچہ ہونے پر وہ ان سب میں سے جسے چاہتی اس کا باپ ٹھیراتی۔ شراب اور سود کی طرح اس ممانعت میں بھی ڈھیل دی گئی۔ یا نہ دی گئی۔ اور اس کی قطعی ممانعت سے کچھ لوگ ناواقف رہے۔ اس بنا پر حضرت عمر نے اسے بالکل بند کرا دیا۔ نہ اس لیے کہ پہلے یہ جائز تھا۔ بلکہ اس لئے کہ پہلے اس معاملہ میں جو ڈھیل چل سکتا تھا۔ اسے ختم کر دیا گیا۔

لے اہل تشیع متعہ کو قرآن کے خلاف نہیں پاتے۔ اور اس پر مزید یہ کہ وہ آئمہ معصومین اس پر ایسا بڑا ثواب اہل جنت کی بشارتیں سناتے ہیں۔ اور زیادہ مرتبہ کرنے والے کو بڑے امام کا مرتبہ دلاتے ہیں۔

انہیں کے ذکر کے شیدائی۔ ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے!
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

پھر ایسے محبوبِ پاک کا ذکر مٹ جائے؟ اور ان کا نام لیوا کوئی نہ رہے؟ توبہ! توبہ!! یہ بات بھلا کب ممکن ہے۔ اجی جس محبوب کا خدا خود مدّاح و ذاکر ہو۔ اس کے ذکر کو کون مٹا سکتا ہے۔ اور جب کہ خدا خود اپنے محبوب کے لئے فرماتے۔ کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ اے محبوب ہم نے تمہارا ذکر تمہارے لئے بلند کر دیا" تو جس کے ذکر کو بلند کرنے والا خدا ہو۔ اس ذکر کو کوئی مٹائے

ع ایں خیال است ومحال است وجنوں

مولانا رومی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ کہ خدا نے حضور سے وعدہ فرمایا ہے کہ ؎

رونقت را روز روز افزوں کنم نام تو بر نقرہ و بر زر زنم
منبر و محراب سازم بہرِ تو از محبت قہرِ من در قہرِ تو
چاکرانت ملک ہا گیرند وجاہ دین تو باقی زماہی تا بماہ
تا قیامت باقیش داریم ما!
تو مترس از نسخِ دیں اے مصطفےٰ!

یعنے اے محبوب میں تیری عزت و رونق کو دن بدن دو بالا کروں گا۔ اور سونے و چاندی پر تیرا نام منقش کروں گا۔ تیرے لئے منبر و محراب بناؤنگا۔ تیری محبت کے پیشِ نظر میں تیرے غصے میں اپنا غصہ ظاہر کروں گا۔ تیرے غلام بڑے بڑے ملکوں پر قابض ہو کر عزت پائیں گے۔ اور تیرا دین زمین سے آسمان تک باقی رہے گا۔ اور تیرے دین کو ہم خود قیامت تک باقی رکھیں گے۔ پیارے تو نسخ دین سے مت ڈر!

حضرت عبد المطلب کا خواب

حضرت عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے ایام شباب میں ایک خواب دیکھا۔ کہ ایک درخت زمین سے نکلا ہے۔ جڑیں اس کی زمین میں اور چوٹی آسمان سے جا لگی ہے۔ اور درخت کی ایک ٹہنی مشرق کے کنارے اور دوسری ٹہنی مغرب کے کنارے

طلاق کی حالت عجیب ہوگئی تھی کہ ایک آدمی سو سو طلاق کہکر بھی اپنی بیوی کا
خاوند بنا رہتا تھا۔ قرآن میں جب طلاق کی زیادہ سے زیادہ تعداد تین مقرر کیگئی
اور ان میں بھی ایک ایک ماہواری ایام کا وقفہ بھی ضروری ٹھیرا۔ تو لوگ کچھ زمانہ
بعد بھی اپنی عادت سے باز نہ آسکے۔ اور انہیں ڈھیل کے عذر کا موقعہ دیا گیا۔ وہ
جب پرانی عادت اور قرآنی طلاق سے بے خبری کے باعث بیک وقت تین یا
زیادہ طلاق کے الفاظ کہہ بیٹھتے تو وہ ایک ہی طلاق ٹھیرائی جاتی تھی۔ بعد میں
جب یہ پرانی عادت اور بے خبری کا عذر کچھ بھی معقول نہ رہا۔ تو حضرت عمر نے
بیک وقت تین یا زیادہ طلاق کہنے والے کی طلاق قطعی قرار دی۔ اور اس سے
بڑھ کر یہ بھی کیا کہ زیادہ طلاق کہنے والوں کو کوڑوں سے پیٹا۔ اب اگر متعدد طلاق کے باب
میں اہل سنت اور اہل حدیث دونوں حضرت عمر کو فیصلہ رسول کی خلاف ورزی کا
مرتکب گردانیں تو سوائے اس کے اور کیا کہا جائے۔ کہ خدا انہیں دین کا فہم عطا
فرمائے۔ اور وہ مراتب کا لحاظ رکھیں۔ اس انقلاب ذہن کے بعد وہ بخوبی جان
لیں گے کہ عہد رسالت میں جو ایک سے زیادہ طلاقوں کو بیکار ٹھیرایا گیا۔ اور ایک
وقت میں انہیں مؤثر نہ ٹھیرایا گیا۔ تو وہ ایک حکم کی ڈھیل پر تھا۔ اور بعد میں اس
ڈھیل کی ضرورت نہ تھی یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمر نے بغیر کسی تمہیدی
کارروائی کے ایک سے زیادہ طلاقوں کی تعداد کو معتبر ٹھیرایا تو آپ کے اس
فیصلہ کے خلاف آواز تک نہ اٹھی۔ اور نوادر جس روایت پر اہل حدیث کا عمل
ہے اس کے راوی ابن عباس کا مسلک بھی حضرت عمر کے موافق ہے۔
آنحضور کے زمانہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے سر سے بچنے کیلئے قرآن

اہل حدیث بلا تعداد طلاق کو ہی قرآن اور سنت کے مطابق سمجھتے ہیں۔

جا لگی ہے۔ ملک عرب کے کچھ لوگ اس درخت کی ٹہنیوں کو پکڑے ہوئے ہیں۔ ایک جماعت اس درخت کو کاٹنے کے لئے آئی۔ تو ناگہاں ایک خوبصورت نوجوان اس درخت کی جڑ سے نمودار ہوا۔ جس نے اس کاٹنے والی جماعت کو مار بھگایا۔ حضرت عبدالمطلب نے صبح ایک معبّر سے اس کی تعبیر پوچھی۔ تو اس نے بتایا کہ :-

لَیَخْرُجَنَّ مِنْ صُلْبِكَ رَجُلٌ یَمْلِكُ الْمَشْرِقَ وَ الْمَغْرِبَ ــــ
(خصائص کبریٰ ص۳۹ ج۱) ــ آپ کی پشت سے ایک ایسا مبارک وجود پیدا ہوگا۔ جو مشرق و مغرب کا مالک ہوگا۔"

پنجابی شاعر نے اس خواب کا تذکرہ کرتے ہوئے اسکا ترجمہ کیا ہے ؎

پشت تری تھیں بچہ ہوسی رب دیاں سمجھ عطائیں
مالک ہوسی کل دنیا دا مشرق مغرب تائیں

ہاں تو بھائیو! ایسے محبوب کا بھی ذکر مٹ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! تو کافروں کی یہ بکواس کہ حضور ابتر ہو گئے ہیں۔ (معاذ اللہ) اور اب انکا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے گا۔ محض بکواس ہی ہے۔

کوثر کا معنے

میرے دوستو! اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اپنے محبوب کو انا اعطیناک الکوثر فرمایا ہے۔ کہ اے محبوب ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کوثر کا معنے کیا ہے؟ تو بھائیو! آپ نے ابتداء ہی اس کا ترجمہ سنا۔ یعنی "اے محبوب! بیشک ہم نے تمہیں بیشمار خوبیاں عطا فرمائیں۔" یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے۔ اور یہی ترجمہ انسب و اولیٰ ہے۔ اور مفسرین کرام علیہم الرحمۃ نے بھی یہی لکھا ہے۔ چنانچہ علامہ حقی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

اَلتَّعْدَادُ الْکَثِیْرُ مِنَ الْخَیْرِ قَالَ فِی الْقَامُوْسِ الْکَوْثَرُ الْکَثِیْرُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ۔ (روح البیان ص۵۰۲ ج۴) یعنی بہت سی خوبیاں اور ہر شے کی کثرت۔

اور صدر الافاضل مراد آبادی علیہ الرحمۃ اس آیت پر لکھتے ہیں :-

"اور فضائل کثیر عنایت کرکے تمام خلق پر افضل کیا حسن ظاہر بھی دیا

فیصلہ کے تحت انہیں زکوٰۃ کے مال سے کچھ حصہ دلایا جاتا تھا۔ وہ لوگ اپنے اس حصہ
کی وصولی کے لئے خلافت صدیقی میں بھی آنکلے۔ حضرت ابوبکر نے انہیں ان کے مقرر
حصہ کا حکم لکھ کر دے دیا۔ اور فرمایا کہ جاؤ حضرت عمر سے بھی اس کی تصدیق کرالو۔
وہ جب حضرت عمر کے پاس گئے اور انہیں پروانہ دکھایا۔ تو انہوں نے اسے لیکر
اس کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اور فرمایا کہ اگر ماننا ہو تو اسلام مان لو۔ ورنہ جو جی میں آئے
کر گذرو۔ وہ دوبارہ حضرت ابوبکر کے پاس گئے۔ اور ان سے کہا کہ بتایئے تو!
آپ خلیفہ ہیں یا عمر؟ انہوں نے فرمایا خلیفہ تو میں ہی ہوں مگر میں حضرت عمر کی
بات کو رد نہیں کرونگا۔ یہ سنکر وہ چلتے بنے۔ اور پھر کبھی نہ آئے۔ اس واقعہ
پر شیخین کے فیصلہ کو خلاف قرآن سمجھنا بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ قرآن میں تو صرف ان
لوگوں کو دینے کے لئے کہا گیا ہے جن کے فساد سے ڈر ہو۔ اور وہ لوگ اسوقت
اس پوزیشن میں تھے نہیں کہ ان سے ڈرا جاتا

اسی طرح عرب علاقوں کے مختلف لوگوں نے اپنے اپنے علاقہ کی زبان سے قرآن
پڑھنا چاہا۔ تو قرآن کو متواتر بنانے کے لئے ضروری تھا کہ انہیں اسکی رخصت دی
جاتی۔ لیکن بعد میں جب قرآن متواتر ہو گیا تو حضرت عثمان نے بعض صحابہ کے توجہ دلانے
سے قرآن کو صرف قریش کی زبان میں لکھوا کر اسے شائع فرمایا۔ اور صرف اسی
ایک قرأت کو باقی رکھا۔ ان کے اس فیصلہ کو بھی صرف وہی عہد رسالت کے
دستور و تعامل کے خلاف کہہ سکتا ہے جو اس کا متمنی ہو کہ امت ہمیشہ کے لئے [illegible] خدا
سے ہدایت کی رہنمائی جائے۔

ان سے اور آیت بھی دوسرے لفظوں سے سمجھا جا سکتا ہے [illegible] کہ خلفاء کے

حسنِ باطن بھی۔ نسب عالی بھی دی نبوت بھی۔ کتاب بھی حکمت
بھی علم بھی شفاعت بھی۔ حوض کوثر بھی۔ مقام محمود بھی۔
کثرتِ امت بھی اعدائے دین پر غلبہ بھی۔ کثرتِ فتوح بھی۔
اور بے شمار نعمتیں اور فضیلتیں جن کی نہایت نہیں (کنز الایمان)

معلوم ہُوا کہ انا اعطیناک الکوثر فرما کر خدا نے اس امر کا اعلان فرمایا ہے۔ کہ ہم نے اپنے محبوب کو ہر قسم کی خوبیاں۔ فضائل و کمالات اور بہت کچھ عطا فرمایا ہے۔ سہ

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ
ساری کثرت پاتے یہ ہیں

ہمارے حضور صلے اللہ علیہ و سلم کے پاس کیا ہے جو نہ ہو۔ خالقِ کل نے اپنے حبیب کو مالکِ کل بنا دیا ہے۔ سہ

خالقِ کل نے آپ کو مالکِ کُل بنا دیا!
دونوں جہاں ہیں آپ کے قبضہ و اختیار میں

تقویۃ الایمان مگر کس قدر عداوت ہے نجدیوں کی کتاب تقویۃ الایمان کو حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ و سلم سے کہ وہ اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ جس کا نام محمد ہے وہ کسی چیز کا مالک و مختار نہیں۔" خدا تو فرماتے۔ کہ اے محبوب! ہم نے آپ کو بہت کچھ عطا فرمایا اور یہ کہے کہ وہ کسی چیز کے مالک ہی نہیں۔

میرے دوستو! مسلمان کا تو یہ ایمان ہے کہ خدا نے مصطفٰے کو سب کچھ دیا۔ اور مصطفٰے نے خدائی کو سب کچھ دیا۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ کہ گویا اللہ تعالیٰ اپنے محبوب سے فرماتا ہے کہ:۔

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الکوثر فَاعۡطِ اَنۡتَ الۡکَثِیۡرَ۔ (تفسیر کبیر صـ۱۲۴ جلد ۸)
یعنی پیارے ہم نے آپ کو بہت کچھ دیا۔ اور آپ بھی لوگوں کو بہت کچھ دیجئے۔"

دیکھ لیجئے۔ خدا نے اپنے محبوب کو سب کچھ دے کر خدائی کو اس در پر لا ڈالا۔ اور اسی لئے محبوب کو یہ حکم فرمایا کہ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡھَرۡ۔

فیصلوں کو سنت نبوی کے خلاف کہنا انسان کی اپنی سمجھ کا قصور ہوتا ہے۔ ورنہ ایک طرف انہیں مسلمان کہنا اور عہدِ اوّل کا مسلمان سمجھنا اور پھر یہ کہنا کہ انہوں نے فیصلہ رسول کو توڑا۔ یہ دونوں باتیں میل نہیں کھاتیں۔ اس لئے کہ قرآن میں فقط فیصلہ رسول کے خلاف کچھ سوچنا بھی ایمان کے منافی ٹھہرایا گیا ہے۔

پانچویں الجھن یہ ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ رسول کا حکم وقتی تھا۔ تو پھر اسے ایک زندہ اور پائیدار رفق کی حیثیت سے باقی رکھتے ہوئے حدیث رسول کو زندہ کیوں رکھا گیا۔ اور اسے آج کیوں مانا جائے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ حدیث کو غلطی سے باقی رکھا گیا۔ اور دین میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ مگر اس سے تو یہ سوال مزید الجھ جاتا ہے۔ کہ اگر حدیث اور حکم رسول کی یہ کچھ حقیقت تھی۔ تو اس کی اتنے بڑے پیمانہ پر اتنے زمانہ میں اتنی بڑی بڑی کتابیں کیوں لکھی گئیں۔ جن کے لاکھوں سے بھی زیادہ تعداد میں راوی اور پڑھنے والے بڑھتے گئے۔ آخر ان کی اس قدر بڑی محنت کا محرک کیا ہوا۔ کیا یہی بات کہ جس حدیث کا انہوں نے اہتمام کیا۔ اس کا دین میں کوئی مقام نہ تھا۔ اور کیا وجہ ہوئی کہ سب کے سب اہل ایمان حدیث اور اس کے مختلف فنون و علوم۔ اور ان علوم سے پیدا ہونے والے بلیشمار علوم کی اشاعت و ترویج میں پیچھے جھاڑ کر لگ گئے۔ اور نہ صرف لاکھوں حدیثیں جمع کر ڈالیں بلکہ ان کے راویوں اور کاتبوں اور مخالفوں کے حالات کو بھی ضبط میں لا کر چھوڑا۔ اور سیرۃ رسول کا ظاہر و باطن ہر پہلو ریکارڈ کیے بغیر نہ چھوڑا۔ کیا یہ سب کچھ اسی وجہ سے ہوا کہ غلطی سے چند انسانوں نے حکم رسول کو وحی سمجھ لیا تھا۔ اور عام مسلمان ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ آخر

محبوب! مانگنے والے کو جھڑکنا نہیں۔ یعنی یہ لوگ تیرے پاس سائل بن کر آئیں۔ تو انہیں جھڑک مت دینا۔ اگر تم نے ہی جھڑک دیا تو یہ بچارے پھر کہاں جائیں گے۔ ؎

بے ٹھکانوں کا ٹھکانا ہے یہی! اب کہاں جائیں تمہارے در سے ہم
دیکھ لینا سب مرادیں مل گئیں جب لپٹ کر روتے انکے در سے ہم

"سب کو صدقہ عطا ہوا تیرا"

یہاں مجھے حضرت مولانا حسن میاں علیہ الرحمۃ کے بھی چند اشعار یاد آ گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ زمین والے ہوں، یا آسمان والے۔ ہر کسی کو حضور ہی کا صدقہ عطا ہوا چنانچہ مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ ؎

اے جناں میرے گل کے صدقے ہیں تختہ تختہ بسا ہوا تیرا!
لے فلک مہر حق کے باڑے سے کاسہ کاسہ بھرا ہوا تیرا
لے چمن بھیک ہے تبسم کی غنچہ غنچہ کھلا ہوا تیرا
ہوں زمیں والے یا فلک والے سب کو صدقہ عطا ہوا تیرا
ایسی شوکت کے تاجدار کہاں تخت تختِ خدا ہوا تیرا
اس وجاہت کے بادشاہ کہاں حکم حکمِ خدا ہوا تیرا
اس جلالت کے شہریار کہاں ملک ملکِ خدا ہوا تیرا
جیسے تو نے دیا خدا نے دیا دین رب کی دیا ہوا تیرا
حوصلے کیوں گھٹیں غریبوں کے ہے ارادہ بڑھا ہوا تیرا!

بگڑی باتوں کی فکر کر نہ حسن
کام سب ہے بنا ہوا تیرا

چور

دوستو! اگر ایک حویلی میں دعوتِ عام ہو اور یہ اعلانِ عام ہو۔ کہ جسے کچھ لینا یا کھانا ہو۔ وہ اس حویلی میں آ کر کھا لے اور لے جائے تو ہر شریف آدمی اس حویلی میں حویلی کے دروازے سے اندر جائیگا۔ مگر چور اور اچکا دروازے سے نہیں۔ دیواریں پھاند کر اندر جانے کی کوشش کریگا اور پھر پکڑا بھی جائیگا۔ تو بھائیو! اس دنیا میں خداوندی نعمتوں کے حصول کے

اور لوگوں کی بات کو جو وحی نہیں مانا جاتا تھا۔ تو کسی اور کی تاریخ اور حالات زندگی اور کچھ اہتمام کیوں نہیں کیا گیا۔

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ یہ سوچنا ہمارا کام نہیں کہ علم حدیث یہ کیسے اور کب وجود میں آگیا۔ گویا آپ کا کام ہے صرف اسے جھٹلانا اور اندھے دھند جھٹلاتے چلے جانا۔

غیر قرآنی وحی کے دلائل

"ومنهم من یستمع الیک حتیٰ اذا خرجوا من عندک قالوا للذین اوتوا العلم ماذا قال انفاً اولٰئک الذین طبع اللہ علیٰ قلوبهم واتبعوا اهواءهم۔

ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تیری طرف کان لگائے ہوئے رہتے ہیں حتیٰ کہ جب وہ تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں سے جنہیں علم دیا گیا ہے پوچھتے ہیں کہ اس پیغمبر نے ابھی ابھی کیا کہا تھا۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی۔ اور وہ خواہشات کی پیروی کے عادی ہو چکے ہیں" ص ۲۲۵

اس آیت میں ایسے منافقوں کا ذکر ہے جو آنحضور کی بات کو پوری طرح سُن لینے کے بعد بڑے بڑے ذہین لوگوں سے نہایت بے پروائی کے ساتھ پوچھتے تھے کہ بھئی کیا بات ہوئی۔ کچھ رسول میاں کی بات ہمیں بھی بتا دو گے۔ کیا کچھ سنا سنایا۔ اب کیا کہہ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو اس طرح بے توجہی کا شکار بنانے والوں کے دل پر اللہ نے مہر کر دی۔ اور کیوں کر دی۔

لئے درِ مصطفےٰ ہی ایک ایسا دروازہ ہے۔ جس سے سب کچھ مل سکتا ہے لہذا شریف بن کر اسی دروازہ کو لو۔ اور چور اچکے بن کر اس دروازہ کو چھوڑ کر دیواریں پھاندنے کی کوشش مت کرو۔

وسیلۂ مصطفےٰ

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

بے ان کے واسطے سے خدا کچھ عطا کرے
حاشا غلط غلط یہ ہوس بے بصر کی ہے

یعنی اللہ تعالیٰ جو کچھ اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ وہ اسی وسیلۂ مصطفےٰ سے عطا فرماتا ہے۔ اور ان کے وسیلہ کے بغیر کچھ مل جائے ؟ یہ ناممکن ہے۔ اور اگر کچھ ملے بھی۔ تو پھر میرے دوستو! وہ چیز حلال نہیں رہتی۔ چنانچہ دیکھئے ایک مثال عرض کروں۔

تاجر اور چور

فرمایئے! ایک تاجر کو روٹی دینے والا کون ہے؟ سب یہی کہینگے کہ اللہ تعالیٰ! اور یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور یہ بھی فرمایئے۔ کہ چور کو روٹی دینے والا کون ہے؟ اس کا جواب بھی یہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ! دیکھئے۔ جب گھر کا مالک سوتا ہے۔ تو یہ کہہ کر سوتا ہے۔ یا اللہ تیرا ہی آسرا۔ اور جب چور چوری کے لئے نکلتا ہے۔ تو وہ بھی یہی کہتا ہے۔ کہ یا اللہ تیرا ہی آسرا۔ اور چونکہ اللہ سب کا رازق ہے۔ اس لئے ہر نیک و بد اسی کا آسرا ڈھونڈتا ہے۔ اور وہ سب کو رزق دیتا ہے۔

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ

یہاں مجھے حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد آگیا۔ یہ ایک صحابی رسول ہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں انکا ایک واقعہ لکھا ہے۔ کہ ایک مرتبہ وہ قافلہ سے بچھڑ کر کسی جنگل میں نکل گئے۔ جنگل میں ایک بڑا زبردست شیر رہتا تھا۔ اس نے حضرت سفینہ کو دیکھا۔ تو حملہ کرنے کے لئے منہ پھاڑ کر حضرت سفینہ کی طرف دوڑا۔ حضرت سفینہ خطرے میں گھر گئے۔ مگر قربان جائیں ان لوگوں کے عزم و استقلال کے۔ کہ مطلق گھبرائے نہیں۔ اور ڈرے نہیں۔ ایک آج ہم بھی ہیں۔ کہ چوہے سے بھی ڈر جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر نے اسی قسم کی بہادری کا نقشہ اس شعر میں کھینچا ہے کہ؂

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اس لئے کر دی کہ وہ وقت کے امیر کی بات کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بخلاف اس کے قرآن کہتا ہے کہ اس لئے کر دی کہ آں حضور کی گفتگو وحی تھی۔ اور اس پر توجہ نہ دینا ہدایت سے محرومی کا باعث تھا۔ اور ہدایت و تعلیم سے محروم ہونا ہی دل پر مہر لگ جانا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ جو لوگ آنحضور کی دعوت و تبلیغ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ ان کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ جس دعوت و تبلیغ اور جس فرمائش میں غلطی کی گنجائش ہو اس کے نہ سننے سے انسان کے دل پر خدا کی مہر کبھی نہیں لگا کرتی خواہ وہ فرمائش امیر کی ہو یا کسی امیر الامراء کی۔ مہر تو ہمیشہ حق اور صداقت کو ٹھکرا دینے سے انسان کے دل پر خدا کی طرف سے لگائی جاتی ہے۔ اور ایسی بات کے رد کر دینے سے جو حق ہو اور صرف حق جس کے پاس کچھ بینائی ہو وہ اندھا کیسے ہو سکتا ہے۔ کچھ بینائی سے محروم ہونے والا تو بہر حال آنکھوں والا ہوتا ہے۔

"لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق ان تقوم فیہ۔ فیہ رجال یحبون ان یتطہروا۔ واللہ یحب المطہرین۔

اے پیغمبر اس بات کی کہ تم اس میں کھڑے ہو۔ اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں وہی مسجد زیادہ حقدار ہے جس کی بنیاد اول روز سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ یعنی مسجد قبا اس میں ایسے لوگ آتے ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک و صاف رہیں اور اللہ بھی پاک و صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" صفحہ ۳۷

لے قرآن کریم نے نماز پڑھنے کے لئے نہیں کہا قیام صلوٰۃ یعنی نماز کے نظام کے قیام کا حکم دیا ہے۔ صفحہ ۳۲۸

بفضلِ خدا میں ہوں ایسا دلیر!
سمجھتا ہوں بلی کو مانند شیر!

مگر حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ ڈرے نہیں۔ بلکہ ڈٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اور شیر کو مخاطب فرما کر فرمانے لگے:-

یَا اَبَا الْحَارِثِ اَنَا مَوْلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ — "او شیر! خبردار! میں رسول اللہ کا غلام ہوں" (مشکوٰۃ شریف ص۵۳۷)

ابوالحارث شیر کی کنیت ہے۔ حضرت سفینہ نے شیر کو مخاطب فرما کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا نام لیا اور فرمایا۔ خبردار! اس بات کا خیال رکھنا۔ میں غلام کس ذاتِ پاک کا ہوں؟ مجھے اذیت نہ پہنچانا کہ میں رحمت عالم کا غلام ہوں۔ اتنا کہنا تھا۔ کہ وہ شیر کتے کی طرح خوشامد کرتے ہوئے اپنی دم ہلانے لگا۔ اور سفینہ کو کچھ نہ کہا۔ بلکہ سفینہ کے ساتھ ساتھ چل کر حضرت سفینہ کو قافلہ میں ملا کر واپس ہوا۔ ایک پنجابی شاعر نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ شیر نے گویا زبانِ حال سے کہا ؎

شیر کہیا سفینے تائیں سن راہی راہ جاندے!
جو غلام رسول اللہ دے اسیں غلام اہناندے!

میرے بھائیو! سوچو کہ جنگل میں شیر حملہ کر کے آجائے۔ اور آدمی تنہا، اور نہتا ہو تو کیا یہ موت کا سامنا نہیں ہے؟ ہے اور یقیناً ہے! تو فرمایئے اس قدر مشکل کے وقت ایک صحابی رسول کو مناسب تو یہ تھا۔ کہ اللہ کا نام لیتے اور یوں کہتے۔ او شیر! خبردار۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مگر حدیث کے لفظ یہ ہیں کہ انہوں نے یوں کہا:-

اَنَا مَوْلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ — "میں رسول اللہ کا غلام ہوں"

میرے بھائیو! گویا مصیبت کے وقت ایک صحابی رسول نے خدا کا نہیں۔ بلکہ رسول خدا کا نام لیا۔ آپ جانتے ہیں۔ ایسا کیوں کیا؟ سنیئے! اس لئے کہ صحابی رسول نے سوچا کہ اگر اللہ کا نام لیا۔ تو اللہ جس طرح میرا رب ہے۔ اسی طرح شیر کا بھی رب ہے۔ وہ اللہ اگر میرا حافظ ہے۔ تو اس

اس آیت میں جس مسجد کی یہ کچھ نشان بیان کی گئی ہے۔ اس کے بنانے کا اور ویسے
مطلقاً مسجد بنانے کا قرآن میں کہیں بھی حکم نہیں دیا گیا۔ اِدھر جب مسلمانوں نے
آنحضور کی سرکردگی میں مسجد قبا کو تعمیر کر ڈالا تو خدا نے اس مسجد کے متعلق فیصلہ
دیا کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے اور اوّل روز سے تقویٰ پر ہے۔ ہم اس سے
یہ نتیجہ حاصل کئے بغیر نہیں رہتے۔ کہ اس مسجد کی تعمیر وحی کے مطابق عمل میں
آئی تھی ورنہ اس کے اندر نہ تو کھڑا ہونے کا حکم آنحضور کو قرآن میں دیا جاتا اور نہ
اس کی بنیاد تقویٰ پر بتائی جاتی۔ اور نہ ہی یہ بات کچھ عقلاً صحیح ہو سکتی ہے کہ جو وحی
مسجد میں کھڑا ہونے اور نہ ہونے کے متعلق ہدایت دینے کو موجود ہو وہ
مسجد بنانے کے وقت آپ کے پاس نہ آئے۔ اور آپ کو کھلا چھوڑ دے۔ کہ
آپ چاہیں تو مسجد تعمیر کریں۔ اور چاہیں تو نہ کریں۔

پرویز صاحب کا ایک خانہ ساز[1] قاعدہ یہ بھی ہے کہ قرآن میں صرف اصولی احکام
بیان کئے گئے ہیں جو کبھی تبدیل نہیں ہوتے، اور ان احکام سے جزئیات کا بنانا
اسلامی حکومت کا کام ہے[2]۔ مگر مسجد قبا کے متعلق جو کچھ قرآن میں وارد ہے وہ

---

[1] یہ قاعدہ خانہ ساز اس لئے ہے کہ آپ اس پر کبھی قائم نہیں رہے اس کا سب سے بڑا ثبوت
یہی ہے کہ آپ اطاعت رسول کے قرآنی حکم کو وقتی بتا کر اسے تبدیلی کا شکار بنا ڈالتے ہیں اور یوں وہ اپنے
ہی مصنوعات پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ کہاں تو آپ کا یہ کہنا کہ قرآن میں جو چند ایک جزئیات ہیں وہ بھی
دائمی ہیں اور کہاں اطاعت رسول کو وقتی ٹھہرانا اور کہاں جزئیات کا اختیار حکومت کو دینا۔ اور
کہاں اطاعت رسول کے بارہ میں یہ اختیار خود ہی استعمال کرنا [2] اس نے بجز چند مستثنیات کے
اسلامی نظام کیلئے صرف اصول متعین کئے ہیں انکی جزئیات متعین نہیں کیں۔ فردوس گمگشتہ ۲۰۱

شیر کا رازق بھی وہی ہے۔ تو کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ مجھی کو اس شیر کا لقمہ بنا دے۔ اس لئے میں اس وقت رحمۃ للعالمین کا نام لیتا ہوں۔ تاکہ ان کی رحمت کی بدولت میں اس مصیبت سے نجات پاؤں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور وہ رحمتِ عالم کی بدولت اللہ کی حفاظت میں آ گئے ؎

نہ کیونکر نام لوں ہر دم تمہارا یا رسول اللہ!
ہوئیں حل مشکلیں جب دم پکارا یا رسول اللہ!

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا۔ کہ تاجر کو بھی روٹی دینے والا اللہ، اور چور کو بھی روٹی دینے والا اللہ۔ وہ بھی اللہ سے لیتا ہے۔ اور یہ بھی اللہ ہی سے لیتا ہے۔ پھر ذرا سوچئے۔ کہ تاجر کی روٹی حلال کیوں؟ اور چور کی روٹی حرام کیوں؟ جب دونوں ہی اللہ سے لیتے ہیں۔ تو پھر ایک کی حلال کس لئے؟ اور ایک کی حرام کس لئے؟ — تو سنئے صاحب! اس کا جواب یہ ہے۔ کہ تاجر اپنی روٹی اللہ سے لیتا ہے۔ مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے ہوئے اپنی جائز محنت اور تجارت کر کے لیتا ہے۔ گویا وسیلۂ مصطفےٰ سے اور درِ مصطفےٰ پر پہنچکر اللہ سے لیتا ہے۔ اور چور درِ مصطفےٰ کو چھوڑ کر اور وسیلۂ مصطفےٰ سے منہ موڑ کر براہِ راست اللہ سے لیتا ہے۔ تو جس نے حضور کے وسیلے سے اللہ کی روٹی لی۔ اس کی روٹی حلال۔ اور جس نے یہ وسیلہ چھوڑ کر براہِ راست اللہ سے روٹی لی۔ اسکی روٹی حرام!

منکوحہ عورت اور فاحشہ

ایک مثال اور سن لیجئے۔ ایک منکوحہ عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک بچہ کسی فاحشہ رنڈی کے ہاں بھی پیدا ہوتا ہے۔ فرمایئے! منکوحہ عورت کو وہ بچہ کس نے دیا؟ خدا نے ہی تو دیا۔ اور اسی طرح اس رنڈی کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا۔ وہ کس نے دیا؟ وہ بھی اللہ ہی نے دیا۔ مگر سب جانتے ہیں کہ رنڈی کا بچہ حرامی اور منکوحہ کا بچہ حلالی۔ حالانکہ دونوں بچے اللہ ہی نے دیئے ہیں۔ اور انکی ماؤں نے اللہ ہی سے لئے ہیں۔ اگر حلالی بچہ روتا ہوا آیا ہے۔ تو حرامی بھی اسی طرح روتا ہوا آیا ہے۔ حلالی کی بھی دو ٹانگیں، دو ہاتھ، دو

آپ کے اس قاعدہ کا ساتھ نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کے بنانے کا قرآن میں کہیں بھی حکم نہیں دیا گیا۔ قرآن میں صرف یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ہے کہ آپ فلاں مسجد میں کھڑے ہوں۔ اور فلاں میں کھڑے نہ ہوں۔ اگر آپ کہیں کہ مسجد میں کھڑا ہونیکا حکم اصولی تھا۔ اور اسکی تعمیر کا کام جزئیات میں سے تھا تو پھر جہاں مسجد کوئی بنائیگا نہیں وہاں اس کے اندر کھڑا ہونے کا یہ اصولی حکم بیکار ٹھہریگا۔ اس لئے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ مسجد بنانے کا کام قیامت تک کے لئے دائمی اور امت مسلمہ کا شعار اور اصولی حکم تھا۔ اور اس میں کھڑا ہونے کا کام تمام تر ہر انسان کی سمجھ میں آنے والا تھا۔ اور ہر انسان سمجھ سکتا ہے کہ اسے کونسی مسجد میں نماز کے لئے جانا چاہیئے۔ اس لئے یہ قاعدہ کلیۃً باطل ٹھہرا کہ قرآن میں صرف اصولی احکام ہیں اور جزئیات نہیں۔

اسی طرح آپ کا ایک اصول یہ ہے کہ احکام حدیث کو تاریخ کے درجہ میں مانا جائے۔ اور دین میں تاریخ کا کچھ بھی اعتبار نہیں۔ اس لحاظ سے آپ یہ امر واقعہ تو جھٹلا سکتے ہیں کہ آں حضور نے مسجد تعمیر کی کیونکہ یہ قرآن میں ہے نہیں اور یہ ماننے سے آپ قرآن کے رو سے پابند ہیں۔ کہ آنحضور کو ایک خاص مسجد میں کھڑا ہونیکا حکم دیا گیا تھا۔ یعنی مسجد کا بنانا کوئی بھی دینی حکم نہیں اور اس کے اندر کھڑا ہونا دینی حکم ہے۔ یہ ہے آپ کے نظریات کی نیرنگی کا عالم۔ پھر اس سے سوچا جاسکتا ہے کہ جب مسجد میں کھڑے ہونے اور نہ ہونے میں آپ وحی کے پابند تھے تو ایک مسجد کو بنانے اور دوسری کو گرانے کا کام آپ وحی کے بغیر کیسے کر سکتے تھے۔ اور اس کے بعد وہ کونسا ایسا کام رہ جاتا ہے جس میں وحی کی ہدایت ضروری نہ ہو۔ اور جو

آنکھیں۔ اور دو کان ہیں۔ اور حرامی کی بھی دو ٹانگیں، دو ہاتھ۔ دو آنکھیں اور دو کان ہیں۔

ہمسری کے مدعی

میرے بزرگو! یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اگر وہ حرامی بچہ اس ظاہری حالت کی بنا پر اس حلالی بچے سے ہمسری کا مدعی بننے لگے۔ اور یوں کہنا شروع کر دے۔ کہ وہ بھی میرے ہی جیسا بشر ہے۔ تو اس حرامزادے کی یہ حرامزدگی ہے یا نہیں؟ وہ حرامزادہ اس حلال زادے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ یہی حالت کافروں کی ہے، جنہوں نے انبیاء کرام کو اپنے جیسا سمجھا۔ اور ان سے یوں کہا۔ مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا — اسی لئے مولانا رومی نے فرمایا ہے۔ ؎

کافراں را دیدۂ بینا نبود ÷ نیک و بد در دیدشاں یکساں نمود
ہمسری با انبیاء برداشتند ÷ اولیاء را ہمچو خود پنداشتند

یعنے کافروں کے پاس دیکھنے والی آنکھ نہ تھی۔ اسی لئے ان کی نظر میں نیک و بد برابر تھے۔ اور انہوں نے انبیاء سے ہمسری کے دعوے کئے۔ اور اولیاء کو اپنے جیسا بشر کہنے لگے۔

آئینۂ حق نما

بھائیو! آج بھی کئی گستاخ ایسے ہیں۔ جو حضور سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنے جیسا بشر کہتے ہیں۔ حالانکہ کہاں وہ ذاتِ نورٌ علیٰ نور اور کہاں یہ لوگ سر تا پا فتور۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

بات اصل میں یہ ہے۔ جو حضرت مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے لکھی ہے۔

؎ دید احمد را ابوجہل و بگفت
زشت روئے کز بنی ہاشم شگفت

ایک مرتبہ ابوجہل نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا کہ بنی ہاشم میں تم ایک بدصورت پیدا ہوئے ہو۔ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ)

دید صدیقش بگفت اے آفتاب
نے ز شرقی نے ز غربی خوش بتاب

مسجد میں ٹھہرا ہونے سے کم اہم ہو اور یہ کیسے معقول ہو سکتا ہے۔ کہ آپ کے داخلہ مسجد پر تو خدا پابندی لگا دے۔ اور جب آپ ایک زانی کو پتھروں سے چور کرنے لگیں تو خدا کچھ بھی آپ کا ہاتھ نہ روکے اور آپ کو اپنی سمجھ پر چلنے دے۔

"تھوڑے ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا کہ اس تحریک انقلاب کی اوّلین جولان گاہ وہی ارض مقدس بنے گی۔ اس لئے حضور نے صحابہ کو اجازت دیدی کہ وہ اس دارالسلام کی طرف منتقل ہوتے چلے جائیں"۔ ص ۳۶۲

یہ اسوقت کا ذکر ہے جب ہجرت مدینہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو حکم فرمایا تھا۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ آنحضور کو انصار مدینہ کے ایثار سے اندازہ ہو گیا تھا۔ کہ مدینہ ہی تحریک اسلامی کا مرکز بنیگا۔ اس لئے آپ نے وہاں کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بالکل ایسا ہی جیسے حضرت امام حسینؓ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب کوفہ ہی خلافت اسلامی کا مرکز بن کر رہے گا۔ اس پر اپنے ساتھیوں اور بھائی بندوں کو وہاں بھیجنا شروع کر دیا۔ اور اپنا اور اپنے کنبہ کا نمبر بعد میں رکھا۔ کیونکہ ان ساتھیوں کے بعد بھی وہاں کا ماحول آپ کے موافق تھا۔ مگر آنحضورؐ نے ایسے ماحول میں رہ کر اپنے صحابہ کو رخصت کر دیا جہاں ان کے بغیر آپ کا پرسان حال اور کوئی بھی نہ تھا۔ اب اسے خوش قسمتی کہئے کہ آپؐ کا یہ اندازہ حضرت حسینؓ کی طرح غلط نہ نکلا۔ ورنہ آج یہ اسلام کے اور اسلامی تحریک کے لیل و نہار نہ ہوتے۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح مشرکین مکہ عقل ہی کی راجدھانی اور سربراہی میں تدبیر امور کرتے تھے۔ اسی طرح رسول کا بھی تمام تر بھروسہ اپنے عقل کی ہدایت پر تھا۔ بخلاف اس کے قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ رسول کا ہر کام وحی کے

اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دیکھ کر کہا۔ اے آفتابِ حسن! مشرق و مغرب میں تجھ جیسا کوئی خوبصورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے فرمایا۔ کہ تم دونوں ہی سچ کہہ رہے ہو ؎

حاضریں گفتند اے صدر الورٰے
راست گو گفتی دو ضد گو را چرا؟

حاضرین نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! یہ کیا بات ہے؟ کہ صدیق اکبر نے آپ کو خوبصورت کہا۔ تو آپ نے انہیں فرمایا کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ اور اس بے ایمان ابوجہل نے بدصورت کہا تو آپ نے اسے بھی فرما دیا کہ تم بھی سچ کہہ رہے ہو۔ ؎

گفت من آئینہ ام مصقول دست!
ترک و ہند و در من آں بیند کہ ہست

حضور نے فرمایا! میں دستِ قدرت کا صیقل کردہ ایک آئینہ حق نما ہوں اور آئینہ جس کے سامنے ہوگا۔ دیکھنے والا اس میں اپنی برائی و خوبی دیکھے گا۔ جیسا آپ ہوگا ویسا ہی نظر آئیگا۔ گویا صدیق اکبر کا خود اپنا دل نورِ ایمان سے منور تھا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ تو میں اُسے حسن و نور نظر آیا۔ اور ابوجہل کم بخت خود ہی سیاہ دل اور سیاہ رو تھا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ تو اُسے میں اچھا نظر نہ آیا۔ در اصل دونوں نے اپنی اپنی ترجمانی کی ہے۔ اس لئے میں نے دونوں کو ہی سچا کہا ہے۔

تو میرے بھائیو! اس مثال کے پیشِ نظر ہم کہتے ہیں۔ کہ آج بھی جو لوگ سیاہ باطن ہیں۔ ابوجہل کے تابع بن کر وہ حضور کو اپنے جیسا بشر کہتے ہیں۔ اور جن کے دل نورِ ایمان سے منور ہیں۔ وہ حضور کو اللہ کا نور سمجھتے ہیں۔ اور صدیق اکبر کی اتباع میں اعلیحضرت کی طرح یہی نغمہ گاتے ہیں کہ ؎

باغ طیبہ میں سہانا پھول پھولا نور کا
مست بو ہیں بلبلیں پڑھتی ہیں کلمہ نور کا
تیری نسل پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عینِ نور تیرا سب گھرانا نور کا

مطابق ہوتا ہے۔ خواہ وہ صحابہ کو ہجرت کے لئے مدینہ بھیجنا ہو یا کہیں سیر گاہ میں سیر کے لئے بھیجنا ہو۔ ورنہ اگر محض اندازہ سے اتنا بڑا اقدام کر دیا جاتا تو جانے والوں کو بھی یہ خیال پریشان کئے بغیر نہ چھوڑتا کہ ہم کہاں سے کٹ کر کن سے جوڑے جا رہے ہیں اور اس کے کیا نتائج ہوں گے۔

"نبی اکرم کو مخالفین کے ان ارادوں کا علم ہو چکا تھا۔ آپ نے بمشاورت[1] حضرت ابوبکر، ہجرت کے سامان مکمل کر لئے۔" ص ۳۷۲

دشمنوں کے ارادوں کا یہ علم آپ کو کیسے ہو گیا۔ کیا انہوں نے آپ کو اس کی اطلاع دے دی۔ بالکل نہیں۔ پھر کیا صحابہ نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر آپ کو اس کا سراغ پہنچایا۔

ہرگز نہیں وہ تو پہلے ہی مدینہ جا چکے تھے پھر کیا آپ نے بذات خود یہ کام کیا کبھی نہیں۔ پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے اپنے خیال اور گمان سے دشمنوں کے اس ارادہ کو بھانپ لیا۔ وہی خیال اور گمان جس کی پیروی سے قرآن میں روکا گیا ہے اور جس سے باز رہنے کا تقاضا پرویز صاحب کے نزدیک یہ ہے کہ حدیث رسول کو نہ مانا جائے۔ جو خیال اور گمان کا مدار ہے۔ ادھر قرآن کہتا ہے کہ آنحضور کا ہر خیال اور عمل وحی کے مطابق ہوتا چلا ہے وہ دشمنوں کا ارادہ ہو یا دوستوں کا۔

اس کے بعد اصول و جزئیات کو لیجئے ہجرت کا عمل ایک دائمی اور اصولی کام ہے مگر اس کا ابتدائی حکم آنحضور کو قرآن میں نہیں دیا گیا پھر اچھے مقام ہجرت کے لئے دعا کرنا۔ اور ہجرت نہ کرنے والوں کو سست کہنا جزئیات میں سے تھا اور

---

۱ آپ نے بحکم خداوندی مکہ سے ہجرت فرمائی اور یوں قریش کے خفیہ منصوبے خاک میں مل گئے "جوئے نور" ص ۱۱۲

لطیفہ

کہتے ہیں ایک شہر ایسا شہر تھا۔ جس کے باشندوں نے کبھی آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ اس شہر کا ایک باشندہ کہیں جا رہا تھا۔ اتفاقاً راستے میں اسے ایک آئینہ مل گیا۔ اس نے اُسے جو اٹھایا تو اس میں اپنی شکل دیکھ کر سمجھا۔ کہ یہ میرے ابا جان کا فوٹو ہے۔ چنانچہ بڑی حفاظت سے اسے گھر لے آیا۔ اور بڑے اہتمام سے ایک الماری میں رکھ دیا۔ اب ہر روز دفتر میں جاتے ہوئے اور وہاں سے آتے ہوئے الماری کھولتا۔ اور بزعم خویش اپنے ابا کے درشن کرتا۔ چند دنوں کے بعد اس کی بیوی کو جو بڑی بدشکل ، چیچک زدہ چہرے والی اور کانی بھی تھی۔ شک گزرا۔ کہ یہ الماری میں ہر روز کسے دیکھتے ہیں؟ چنانچہ ایک بار خاوند کے دفتر چلے جانے کے بعد اٹھی۔ اور الماری کو کھول کر جو دیکھا۔ تو آئینہ میں اسے اپنی شکل نظر آئی۔ اب آئینہ اس نے بھی کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے جو اپنی شکل دیکھی۔ تو غصے میں آ کر بولی۔ میں تو پہلے ہی جانتی تھی۔ کہ یہ کسی عورت پر فدا ہو گئے ہیں۔ ذرا دیکھو تو۔ ان کا دماغ چل گیا ہے۔ کہ میرے جیسی حور کو چھوڑ کر اس چڑیل پر عاشق ہو گئے ہیں۔ اس حرامزادی کی ذرا شکل تو دیکھو۔ چیچک زدہ منہ۔ آنکھ سے کانی۔ دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔

حضرات غور کریجیئے۔ کہ یہ عورت جتنے عیوب و نقائص بیان کر رہی تھی۔ کیا وہ اس آئینہ میں تھے یا وہ سب کے سب خود اس کی اپنی ہی ذات میں تھے؟ یقیناً وہ اپنے ہی عیوب کو آئینہ پر تھوپ رہی تھی۔ حالانکہ آئینہ اسے اپنی شکل دکھا رہا تھا۔ کہ دیکھ تو ایسی ہے۔ وہ عورت اپنے خاوند سے بدگمان ہو کر رونے لگی۔ اتنے میں شوہر آ گیا اور اس نے روٹی مانگی۔ تو بولی۔ روٹی مجھ سے کیوں مانگتے ہو۔ اس الماری والی کانی سے مانگو۔ شوہر نے کہا۔ مگر وہ تو میرے ابا ہیں۔ وہ بولی مجھے بہکاتے کیوں ہو۔ وہ تو کوئی بدمعاش بھوتنی ہے۔ اب دونوں میاں بیوی آپس میں جھگڑنے لگے۔ میاں کہتا تھا۔ وہ میرے قابلِ تعظیم ابا جان ہیں اور عورت کہتی تھی۔ نہیں۔ بلکہ وہ ایک بدشکل عورت ہے۔ میرے دوستو! ان کا جھگڑا

یہ قرآن میں موجود ہے اس سے بھی آپ کا یہ اصول باطل ٹھہرتا ہے۔ کہ قرآن میں صرف اصولی احکام کو لایا گیا ہے۔ اور یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ کہ ہجرت کی دعا کرنا اصولی حکم ہو۔ اور اس دعا سے ہجرت مقام ہجرت اور اوقات ہجرت جیسے امور کا تعین کرنا جزئیات میں سے ہو۔

"یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی حضور کو یقیناً اس کا علم ہو گا۔ بالآخر ایک رات طے پا گیا کہ آپ مکہ کو چھوڑ دیں" ص ۳۷۳

یعنی دشمنوں کا آنحضور کے درپے قتل ہونا کوئی ایسی بات نہ تھی جسے وہ صیغہ راز میں رکھنا ضروری سمجھتے۔ انہوں نے کھلم کھلا آپ کو اس کی اطلاع دیدی کہ وہ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے مناسب ہو تو اپنے بچاؤ کی تدبیر کر لو۔ اول تو یہی محال اور ناممکن تھا۔ پھر اگر آں حضور نے فی الواقع حالات سے دشمنوں کے منصوبہ قتل کا سراغ لگا لیا تو یہ کہاں آپ پر لازم تھا کہ آپ ان کے پروگرام کو بالکل قطعی اور اٹل سمجھ لیں جس میں ان کی ناکامی اور تبدیلی کسی طرح بھی ممکن نہ ہو۔ اور پھر انہی کی سنی سنائی سے اپنے بچاؤ کی فکر میں لگ جائیں جس کی ضمانت قرآن میں اللہ نے آپ کو دے رکھی تھی اور پھر اس بچاؤ کے لیے کام وہ کریں جس کا آپ کو کچھ بھی حکم نہیں دیا گیا تھا۔ جو قرآن میں واضح ہوتا۔ پرویز صاحب کے بقول جب آپ قرآن کے سوا کسی بھی وحی سے آشنا نہ تھے۔ اور قرآنی پروگرام میں یہ شامل نہ تھا کہ مخالفین کے منصوبہ قتل جیسے چھوٹے موٹے معاملات سے آنحضور کو باخبر رکھا جاتا اس لیے خدا نے تو اس کا کچھ بھی اہتمام نہ فرمایا۔ مگر آپ کے دشمنوں کو شاید رحم آیا اور انہوں نے اپنے ارادہ قتل سے آپ کو آگاہ کر دیا۔ اور پھر جب ایک رات

بالکل ایسا ہی جھگڑا تھا۔ جیسے دو آدمی بحث کرنے لگیں۔ ایک کہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے نور ہیں اور دوسرا کہے نہیں۔ بلکہ وہ تو ہمارے جیسے ایک بشر تھے۔ اب ان میاں بیوی کا جھگڑا بڑھا۔ تو ایک پادری صاحب وہاں سے گزرے۔ اور سارا قصہ سن کر بولے۔ مجھے وہ فوٹو دکھاؤ۔ چنانچہ پادری صاحب کو الماری کھول کر آئینہ دکھایا گیا۔ تو وہ بھی چونکہ اسی شہر کے تھے۔ دیکھ کر بولے۔ یہ تو کسی پیر پادری کا فوٹو ہے۔ یہ کہہ کر آئینہ اٹھا لیا اور گرجے میں لے گئے۔

تو میرے بزرگو! ہمارے حضور ایک آئینہ حق نما ہیں۔ جس نے دیکھا۔ اسے اپنے ہی جذبات کا عکس نظر آیا۔ دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ اس کانی عورت کی طرح نہ بنائے۔ ہاں تو میں بیان یہ کر رہا تھا۔ کہ منکوحہ عورت کو جو بچہ دیا۔ وہ بھی اللہ نے دیا۔ اور رنڈی کو جو بچہ دیا۔ وہ بھی اللہ ہی نے دیا۔ پھر یہ کیا؟ کہ منکوحہ کا بچہ حلالی۔ اور رنڈی کا حرامی۔ تو اس کا جواب بھی یہی ہے کہ منکوحہ عورت نے در مصطفےٰ پر پہنچ کر اور سنت رسول پر عمل کر کے یعنی نکاح کر کے حضور کے وسیلے سے اللہ سے بچہ لیا۔ لہذا یہ بچہ حلالی اور رنڈی نے در مصطفےٰ کو چھوڑ کر وسیلۂ رسول سے منہ موڑ کر براہِ راست اللہ سے بچہ لیا۔ لہذا اس کا بچہ حرامی!

تو اے میرے بزرگو! معلوم ہوا کہ اللہ کی ہر نعمت حضور ہی کے وسیلہ سے ملتی ہے۔ اور اگر حضور کے وسیلہ کو چھوڑ دیا جائے۔ تو پھر اس کی ہر نعمت نعمت نہیں رہتی۔ بلکہ لعنت بن جاتی ہے۔ لہذا مسلمان کا یہی ایمان ہے جو اعلیحضرت نے بیان فرمایا کہ ؎

لا و ربّ العرش جس کو جو ملا اُن سے ملا
بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی
وہ جہنم میں گیا جو ان سے مستغنی ہوا
ہے خلیل اللہ کو حاجت رسول اللہ کی

کوثر! حضرات! آپ سن چکے کہ اللہ نے اپنے محبوب کو کوثر عطا فرمایا ہے

کو مکہ چھوڑ کر مدینہ کو جانا طے پایا تو پھر یہ طے کرنے والا بھی آخر کون ہو سکتا تھا۔ خدا نے تو صرف اچھے مقام ہجرت اور اچھی طرح نکلنے کی دعا سکھا کر اپنی رہنمائی کا کام پورا کر دیا جو اصولی حکم تھا۔ اور ایسے الفاظ میں یہ دعا سکھائی جن کا ہر حال دعا میں قائم رکھنا ضروری تھا۔

حیرت تو یہ ہے کہ آپ حدیث کو جھٹلانے کی بنیاد ہی ظن اور گمان کو ٹھہراتے ہیں۔ ادھر آپ خود ہی بیان کرتے ہیں کہ آنحضور کو دشمنوں کے ارادہ کا علم ہوا ہوگا اور اس پر آپ نے ہجرت کی ٹھان لی ہوگی۔ یہ کچھ کہنے سے نہ تو رسول ہی ظن کا پیرو ٹھہرتا ہے اور نہ آپ خود گمان کے متبع ہوتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپی کا منظر یہ سامنے آتا ہے کہ چونکہ نفس ہجرت کا واقعہ حدیث و تاریخ میں ثابت ہے۔ اس لیے اس کے جھٹلا دینے میں پروا نہیں ہونی چاہیئے۔ مگر اس کا یہ جزئی واقعہ کہ دشمنوں کے نکالنے پر آنحضور اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ غار میں رہے۔ یہ قرآن میں ہے اور اس کا جھٹلانا جائز نہیں۔ اس طرح ایک ہی واقعہ میں پرویز صاحب کے دماغ نے کفر اور اسلام کے اس طرح ڈانڈے ملا کر چھوڑے ہیں کہ ایک طرف اسلام ہے اور اس سے ذرا دوسری طرف سرکیں تو آگے کفر ہے۔ یہ کہہ دیجئے کہ آنحضور نے ہجرت نہیں کی مگر یہ نہ کہئے کہ ہجرت کے سفر کے دوران آپ ایک غار میں نہیں رہے۔ آپ کے قرآنی فلسفہ تاریخ کا تقاضا یہ ہے کہ واقعہ ہجرت کو قتل بے شک کر دیجئے مگر ایسے زخمی مت کیجئے۔

قرآن ان سارے توہمات کی پیداوار کو اسطرح روکتا ہے کہ اس کے فیصلہ کے مطابق رسول کا ہر قول و فعل وحی کے مطابق ہوتا تھا۔ جب آپ نے ہجرت فرمائی

اور کوثر کا معنیٰ ہے۔ "بیشمار خوبیاں اور بہت کچھ" تو جسے خود معطی حقیقی بہت کچھ دینے کا اعلان فرمائے۔ اس کے پاس کیا کچھ نہ ہوگا؟ میرے بھائیو! یہ ساری دنیا جس میں امریکہ و افریقہ۔ یورپ و ایشیا۔ زمین و آسمان۔ چاند سورج، اور دیگر بے شمار مخلوق سب کچھ ہے۔ یہ زمین کی وسعت اور اس کے وسیع وطویل جنگلات بے پایاں سمندر اور دریا یہ پہاڑوں کا طویل و عریض سلسلہ اور ان کی سربفلک بلندیاں اور یہ چاند و سورج کی وسعتیں۔ ساتوں زمینوں۔ اور ساتوں آسمانوں کی عظمتیں وغیرہا من المخلوقات یہ ساری کی ساری چیزیں "متاع الدنیا" ہیں۔ اور ان سب کو خدا نے متاع الدنیا قلیل فرمایا ہے۔ یعنی ان سب کی سب اشیاء کو جن کا شمار اور جن کی عظمتیں احاطہ علم انسانی سے باہر ہیں۔ خدا فرماتا ہے "قلیل" یعنی تھوڑی ہیں تو میرے بزرگو! اللہ کا "تھوڑا" آپ نے دیکھ لیا کہ کس قدر بڑا اور احاطہ علم انسانی سے بھی باہر ہے۔ مگر اللہ رے عظمت شان مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کہ وہی خدا جس نے ساری دنیا کے سارے سامانوں کو "تھوڑا" فرمایا ہے۔ اپنے محبوب کے لیئے فرماتا ہے۔ اسے محبوب! ہم نے آپ کو کوثر یعنے "بہت زیادہ" عطا فرمایا۔ تو میرے عزیزو! جب خدا کے قلیل ہی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ تو اسکے کوثر کا اندازہ کون کرسکتا ہے

ے ہے انتہائے عُلا ابتدائے اوج یہاں!
ورا خیال سے ہے شان بارگاہِ رفیع!

خداوند کریم کا ایک چُلّو

میرے بزرگو! بڑوں کی ہربات بڑی۔ خدا سب سے بڑا ہے۔ تو اس کے "کوثر" کی عظمت کو کون بیان کر سکے؟ یہاں مجھے ایک حدیث یاد آگئی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ اللہ نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا ہے۔ کہ وہ میری امت میں سے چار لاکھ آدمیوں کو بغیر حساب کے جنت میں داخل کردے گا۔ حدیث کے لفظ ہیں۔ کہ یہ سن کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

زِدْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! — "یا رسول اللہ اس سے زیادہ کیجیے"

تو یہ بالکل اسی طرح خدا کا حکم تھا۔ جیسے نماز و روزہ خدا کے احکام ہیں۔ ہجرت کا اقدام نہ تو دشمنوں کے ڈر سے کیا، اور نہ ہی جان کی حفاظت کے طور پر آپ نے اسے اختیار فرمایا۔ بلکہ آپ ہر حال میں خدا کے حکم کے پابند تھے۔ چنانچہ جب اور جہاں آپ کو حکم ہوا۔ آپ اپنے مقام سے خاص اسی وقت نکلے اور اپنے خون کے پیاسوں کے دور رس پہرے اور گھیرے سے بسلامت نکل آئے۔ اور بسلامت پہنچ گئے۔ ورنہ وحی کے بغیر انجام پانے والے پروگرام ایسے کامل کبھی نہیں ہوتے اور نہ ان کا کوئی جزو خامیوں سے خالی ہوا کرتا ہے

"اس کے بعد خاص اہتمام سے جماعت کا التزام کیا گیا۔ اور نمازیوں کو بلانے کے لئے اذان تجویز ہوئی"۔ صد بہ بہ

یہ جماعت کا التزام کیوں کیا گیا۔ اور لفظ اذان کس نے تجویز کر کے دی؟ قرآن میں یہ تو ہے کہ نمازیوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو۔ مگر جماعت کی یہ ہیئت کذائی تو قرآن میں کہیں بھی موجود نہیں کہ پیچھے ایک خاص ترتیب کے ساتھ لوگ کھڑے ہوں آگے ایک امام ہو جس کے ہر قولی وعملی اشارہ کی وہ سب پیروی کریں۔ نہ قول میں اس کے خلاف کچھ کہیں اور نہ عمل میں اس کے خلاف جائیں۔ اسی طرح اذان کا بھی حکم قرآن میں موجود نہیں۔ اس کی جزئیات ہیں۔ یہ تو ہے کہ جب تم اذان سن لو تو فوراً اللہ کے ذکر کی طرف لپکو۔ اور یہ کہ کفار اپنی بیوقوفی سے تمہاری اذان کا مخول اڑاتے ہیں۔ حیرت اس پر ہے کہ جس چیز کا مذاق اڑانا کفر ہے ... اس کا حکم قرآن میں موجود نہیں۔ اس سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ نماز اور اذان کا ہر جزو وحی کے مطابق عمل میں آیا وہاں اس سے پرویز صاحب کا یہ اصول بھی باطل ٹھہرتا ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر فرمایا۔ اچھا تو اللہ اس طرح اپنے دونوں چلو بھر کے میری امت کو جنت میں داخل کر دے گا۔ صدیق اکبر نے پھر عرض کیا۔

زِدْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ — یا رسول اللہ اور زیادہ کیجئے"

اتنے میں حضرت عمر بولے۔ اے ابوبکر! چھوڑ بھی دیجئے اب بس بھی کر۔ اس طرح تو لوگ عمل کرنا چھوڑ دیں گے۔ صدیق اکبر نے فرمایا:۔

وَمَا عَلَیْكَ اَنْ یُّدْخِلَنَا اللّٰہُ کُلَّنَا الْجَنَّةَ — یعنی (اے عمر!) اگر اللہ ہم سب کو یونہی جنت میں داخل کر دے۔ تو تیرا کیا بگڑتا ہے"

حضرت عمر نے جواب دیا:۔ اِنَّ اللّٰہَ اِنْ شَاءَ اَنْ یُّدْخِلَ خَلْقَہٗ الْجَنَّةَ بِکَفٍّ وَّاحِدٍ فَعَلَ — "اللہ اگر چاہے۔ تو اپنی ساری مخلوق کو اپنے ایک ہی چلو سے جنت میں داخل کر دے"

یعنی اے ابوبکر! اللہ کی عظمت و بڑائی کے پیشِ نظر اس کے چلوؤں کو بھی تو دیکھو۔ اس کے ایک چلو کی بھی وسعت اس قدر ہے۔ کہ یہ ساری مخلوق اس کے ایک ہی چلو میں آسکتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کی یہ بات سنی۔

فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَدَقَ عُمَرُ — تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عمر نے سچ کہا۔ (مشکوٰۃ شریف ص۴۸۶)

اختیارِ مصطفٰے

میرے دوستو! اس حدیث سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا اختیار بھی ثابت ہوا۔ ذرا حدیث کی طرف پھر غور کیجئے۔ اور دیکھئے حضور فرماتے ہیں۔ میرے اللہ کا مجھ سے وعدہ ہے۔ کہ وہ چالا لاکھ میرے امتی بغیر حساب کے جنت میں داخل کر دے گا۔ اس پر صدیق اکبر کا عرض کرنا "زِدْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" یا رسول اللہ اور زیادہ کیجئے۔ کیا ہی ایمان افروز اور نجدیت سوز جملہ ہے۔ گویا صدیق کا یہ ایمان ہے کہ اس مقدار میں اضافہ کر دینا یہ حضور کے اختیار میں ہے۔ حضور جو کچھ

قرآن میں صرف اصول ہیں اور جزئیات نہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں اس لئے وحی ہیں کہ یہ کسی طرح بھی درست نہیں کہ جو چیز اپنے اصل کے اعتبار سے وحی کا حکم نہ ہو اس کی جزئیات قرآن میں ہوں اور ان کے انکار سے کفر لازم آئے۔ مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ جس اذان کا تحزل اڑانا کفر ہو اسکا انکار کرنا گناہ نہ ہو۔

"حضور نے اس تقسیم کی بجائے مختلف مہاجرین کو مختلف انصار کا بھائی بھائی بنا دیا۔ یہی وہ سلسلہ موالات ومواخات ہے جس کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے" ۔ صت ۳۷

اس سے آگے پرویز صاحب نے آیت جو دی ہے اس میں ہے کہ مسلمان مہاجرین اور انہیں پناہ و حمایت میں لینے والے انصار سب ایک دوسرے کے ولی اور حامی ہیں۔ یہ آیت گویا اس معاہدہ برادر خوانگی کے جزئی احکام میں سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار کے درمیان قائم فرمایا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ برادر خوانگی اور بھائی چارہ بھی وحی کے مطابق عمل میں آیا تھا۔ ورنہ اس کی جزئیات کا قرآن میں درج ہونا ممکن نہ تھا۔

پرویز صاحب جو تاریخ و حدیث کو جھٹلانا اصل دین سمجھتے ہیں۔ تو اس سے لازم آتا ہے کہ ایک مسلمان قرآن کے بیان کے مطابق یہ تو ضرور مان لے کہ دور اول کے مہاجرین وانصار ایک دوسرے کے حامی و مددگار تھے۔ مگر وہ ہرگز نہ مانے کہ ان کے درمیان رسول نے بھائی چارہ قائم فرمایا تھا۔ کیونکہ یہ تاریخی واقعہ ہے جسے جھٹلانا ہی چاہیئے۔ آپ کے اس نظریاتی تضاد کا یہاں کوئی حل بھی ممکن نہیں۔ کہ جس واقعہ کے اصل کو جھٹلانا جا رہا ہے۔ اس کے جزو کو جھٹلانا کیوں لا

یہاں فرما دیں گے۔ وہی کچھ وہاں بھی ہو جائے گا۔ چار لاکھ کا وعدہ اللہ کا ہے۔ مگر اس میں اضافہ کے لئے صدیق اکبر حضور سے فرما رہے ہیں۔ گویا ہم غلاموں کے لئے وعدہٗ مصطفٰے وعدہٗ خدا ہی ہے۔ یعنے اس لبِ اقدس سے جو ارشاد ہو گا۔ وہی مرضیٔ حق ہو گی۔ اور مَا اَرٰی رَبَّکَ اِلَّا یُسَارِعُ فِیْ هَوَاكَ کے مطابق حضور کے وعدے کو اللہ پورا فرما دے گا۔ اسی لئے مولانا حسن میاں علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں۔ کہ ؎

دکھائی جائے گی محشر میں شانِ محبوبی
کہ آپ ہی کی خوشی آپ کا کہا ہو گا
خدائے پاک کی چاہیں گے اگلے پچھلے خوشی
خدائے پاک خوشی ان کی چاہتا ہو گا

میرے بزرگو! اس حدیث پاک سے میں بتانا آپ کو یہ چاہتا تھا کہ اللہ کا ایک چلو اس قدر بڑا ہے۔ کہ یہ ساری مخلوق اس میں آسکتی ہے۔ تو ذرا غور کیجئے۔ اللہ کے کوثر کی عظمت و وسعت کس قدر ہو گی۔ تو اللہ نے جس محبوب کو "کوثر" عطا فرمایا ہو۔ فرمایئے اس کے پاس کیا نہ ہو گا، اور یہ زمین و آسمان اور ما فیہما کیوں نہ اس کی ملک و اختیار میں ہو گا۔ ؎

وہی نورِ حق وہی ظلِّ رب ہے انہیں سے سب ہے انہیں کا سب
نہیں ان کی ملک میں آسمان کہ زمیں نہیں کہ زماں نہیں

حضور مالک ہیں

میرے دوستو! اللہ نے جب فرما دیا۔ کہ اے محبوب! ہم نے آپ کو "بہت کچھ دیا" اور اللہ کے اس "بہت کچھ" میں "سب کچھ" ہے۔ تو معلوم ہوا کہ حضور کی ملک میں "سب کچھ" ہے۔ اور آپ زمین و آسمان کے بتملیکِ حق مالک ہیں۔ اعلیحضرت علیہ الرحمۃ "نجدی" کو مخاطب فرما کر فرماتے ہیں۔ ؎

ان کو تملیکِ ملیکُ الملک سے
مالکِ عالم کہا، پھر تجھ کو کیا
ان کے نامِ پاک پر دل جان مال

کفر ہے۔ اور کہاں قرآن کے اندر یہ دین و تاریخ اور کلیات و جزئیات کی تقسیم موجود ہے۔

"حضور نے مدینہ کی حفاظت کے متعلق مہاجرین و انصار اور یہود مدینہ کے درمیان ایک معاہدہ کیا۔ ص ۲۷۹"

ایک طرف پرویز صاحب کے بقول یہ فرض کر لیجئے۔ کہ یہ معاہدہ وحی کے مطابق نہیں تھا کیونکہ قرآن میں موجود نہیں۔ اور دوسری طرف اس ماحول کو نظر میں رکھیئے جہاں یہ معاہدہ انجام پایا۔ ایک طرف وہاں یہودی قوم کے مخالف قبائل ہیں۔ جو آپس میں سے تمام اختلافات کے باوجود مذہب کے سبب اسلام کے عناد پر متفق ہیں۔ اور وہ اپنی طاقت میں بھی مسلمانوں سے کم نہیں۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑنا بھی خطرناک ہے۔ اور ان کے ماتحت ہو کر رہنا بھی خلاف غیرت ہے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنا ماتحت بنانا بھی بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ دوسری طرف نئے پرانے اور بے وطن خالی ہاتھ مسلمان ہیں جو اسلام کی کل کائنات ہے۔ سوچیے! اگر اس آگ پانی اور چوروں درندوں کی جو کھی لڑائی اور گھیرے میں وحی کی رہنمائی موجود نہ ہو تو اور کہاں اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ کیا وحی کا منصب صرف یہی اصولی گر بتانا تھا۔ کہ جو معاہدہ کرو اس کے پابند رہو۔ اور یہ بتانا اس کا کچھ بھی فرض نہ تھا۔ کہ مفید معاہدہ کے لوازمات کیا ہیں۔

چونکہ قرآن میں یہ معاہدہ موجود نہیں اس لئے پرویز صاحب اسے وحی ماننے کو تیار نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ وحی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ رسول کا ہر عمل وحی سے ہے۔

تجھ سا سب کچھ دیا پھر تجھ کو کیا!

سب جانتے ہیں کہ ایک آدمی اگر اپنے سوٹ کیس پر اپنا نام لکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس سوٹ کیس کا مالک وہ ہے۔ جس کا نام اس پہ لکھا ہے۔ اس قاعدہ کے مطابق آیئے ذرا احادیث کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اللہ نے زمین و آسمان کی ہر چیز پر اپنے حبیب کا نام لکھ دیا ہے۔ تاکہ اس حقیقت کا اعلان ہو جائے۔ کہ خالقِ کائنات نے اپنے محبوب کو مالکِ کائنات بنا دیا ہے۔

جنت کی ہر چیز پر حضور کا نام

چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادہ حضرت شیث علیہ السلام سے

قولہ۔ اِنَّ رَبِّیْ اَسْکَنَنِی الْجَنَّۃَ فَلَمْ اَرَ فِی الْجَنَّۃِ قَصْرًا وَلَا غُرْفَۃً اِلَّا اِسْمُ مُحَمَّدٍ مَکْتُوْبًا عَلَیْہِ وَلَقَدْ رَاَیْتُ اِسْمَ مُحَمَّدٍ مَکْتُوْبًا عَلٰی نُحُوْرِ الْحُوْرِ الْعِیْنِ عَلٰی وَرَقِ قَصَبِ آجَامِ الْجَنَّۃِ وَعَلٰی وَرَقِ شَجَرَۃِ طُوْبٰی وَعَلٰی وَرَقِ سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰی وَعَلٰی اَطْرَافِ الْحُجُبِ وَبَیْنَ اَعْیُنِ الْمَلٰئِکَۃِ۔ (خصائص کبریٰ ص ۷ ج ۱) ــــ اللہ نے جب مجھے جنت میں ٹھہرایا۔ تو میں نے ہر جگہ نام محمد لکھا دیکھا۔ ہر محل و جھروکہ پر یہ نام نظر آیا۔ حضور کا نام نامی میں نے حور عین کے سینوں جنت کے پتوں۔ شجر طوبیٰ۔ اور سدرۃ المنتہیٰ کے پتوں پر۔ اور پردوں کے کناروں پر اور فرشتوں کی آنکھوں میں ــــ لکھا پایا۔

آسمانوں پر حضور کا نام

اور سنو! حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ شبِ معراج! مَا مَرَرْتُ بِسَمَاءٍ اِلَّا وَجَدْتُ اِسْمِیْ فِیْہَا مَکْتُوْبًا۔ میں جس آسمان سے گزرا۔ سب پر اپنا نام لکھا پایا۔ (حجۃ اللہ علی العالمین)

ہر شے پر

میرے بزرگو! اہل نظر اور سعید ارواح کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی کئی اشیاء پر لکھا ہوا ظاہر بھی فرمایا ہے۔ تاکہ لوگ سمجھیں۔ کہ اللہ کی ہر چیز کے یہ مالک ہیں۔ خالق نے انہیں مالک بنا دیا ہے۔ اور ہر چیز کو مخلوق فرما کر اسے ان کا مملوک کر

مسئلہ قبلہ اور ناسخ و منسوخ

"جب تک کسی خاص معاملہ میں خدا کا حکم نہیں آتا تھا۔ آپ اسی روش کی اقتدار کیا کرتے تھے۔ جسے اہل کتاب انبیاء سابقین کی طرف منسوب کرتے تھے بشرطیکہ ایسی روش اسلام کی کسی اصولی تعلیم کے خلاف نہ جاتی ہو خود قرآن میں گذشتہ انبیاء کے تذکرہ کے بعد ارشاد ہے۔ اُولٰئک الّذین ہدی اللہ فبہدٰہم اقتدہ۔

اے پیغمبر یہ وہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے راہ حق دکھادی پس انہیں کی راہ کی تم بھی پیروی کرو۔" ص ۳۸۵

یہ ہے قرآن کے ساتھ کھیلنے کا مظاہرہ۔ آیت کا مضمون سامنے موجود ہے۔ اس کے اندر آنحضور کو پہلے انبیاء کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم میں نہ کوئی اگر مگر ہے اور نہ بشرطیکہ۔ لیکن ہر دو صاحب آیت کے اس سادہ حکم کے ساتھ یہ سارے پائو براپنی طرف سے لگا رہے ہیں کہ تم انکی باتوں پر اس شرط کے ساتھ عمل کرنا کہ وہ کسی اصولی حکم کے خلاف نہ ہوں۔ یہ بالکل قرآن اور اسوہ انبیاء کو انگریزی سکولوں میں دینیات کے کورس کا انتظام دینا ہے جو وہاں طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے۔ اور وہ اس دینیات کے پیریڈ کو ہنسی اور غپ شپ کی نذر کرتے ہیں۔ یعنی آنحضور اس مسئلہ میں کے ساتھ اسوہ انبیاء کے اس قرآنی حکم کی پیروی کرتے تھے۔ کہ اگر اہل کتاب ان انبیاء کی طرف سے خود ہی گھڑ کر سمجھے آپ کو پیش کر دیا جاتے اور وہ ہوتا بھی کسی اصولی حکم کے موافق تو آپ اس کو مان لیتے تھے۔ اور اگر وہ اپنے طور پر

دیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ ہم حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔ کہ ایک پرندہ دیکھا جس کے منہ میں سبز رنگ کا ایک موتی تھا۔ وہ موتی اس پرندے نے حضور کے آگے پھینک دیا۔ حضور نے اس موتی کو دیکھا۔ تو اس سبز رنگ کے موتی میں ایک سبز رنگ کا کیڑا تھا۔ اس کیڑے پر زرد رنگ سے لکھا ہوا تھا۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ — (حجۃ اللہ علے العالمین ص۲۱۲)

میرے بزرگو! اور بھائیو!! حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا نام اس موتی کے کیڑے پر لکھا ہوا حدیث سے ثابت، اور اس کے علاوہ اور بھی کئی واقعات اس نامِ پاک کے ظہور کے ہیں۔ چنانچہ علامہ نبہانی علیہ الرحمۃ نے اپنی جامع کتاب حجۃ اللہ علے العالمین میں انہیں درج فرمایا ہے۔ ایک روایت اُن سے یہ ہے کہ ایک جزیرہ میں ایسا درخت پایا گیا۔ جس کے پتوں پر لآ الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔ ایک دوسری روائیت سنئے۔ فرماتے ہیں کہ بلادِ ہند میں ایک ایسا درخت دیکھا گیا۔ جس کا پھل اخروٹ کی مانند ہوتا ہے۔ اسے توڑا جائے۔ تو اس میں سے ایک سبز رنگ کا کاغذ سا نکلتا ہے۔ جس پر سرخی سے لکھا ہوتا ہے۔ لآ الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یہ روائیت کتاب مذکور کے ص۲۱۲ پر موجود ہے۔ جس کا دل چاہے دیکھ لے۔ اور پھر راوی نے آگے یہ بھی لکھا ہے کہ:-

وَهُمْ يَتَبَرَّكُوْنَ بِتِلْكَ الشَّجَرَةِ وَيَسْتَسْقُوْنَ بِهَا اِذَا مُنِعُوا الْغَيْثَ

اور وہ لوگ اس درخت سے برکت حاصل کرتے ہیں اور بارش بند ہو جائے تو اس درخت کے وسیلہ سے دعا مانگتے ہیں۔ تو بارش ہونے لگتی ہے۔

دیکھا آپ نے میرے بھائیو! یہ فیض و برکت اس درخت میں کیسے آگیا؟ صرف اس نام پاک کی برکت سے۔

اور سنئے! نبہانی علیہ الرحمۃ اس اپنی کتاب میں درج فرماتے ہیں کہ ایک مچھلی ایسی شکار کی گئی۔ جس کے ایک پہلو پر لآ الٰہ الا اللہ اور دوسرے

اسکی ضرورت نہ سمجھتے تو آپ خود تعلیم انبیاء کے حصول کی غرض سے ان کے پاس چلے گئے
آرام میں کبھی خلل نہ ڈالتے۔ اور اس عجیب شان بے نیازی سے قرآن کا یہ حکم تعمیل
پاتا جسکا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ آپ کو کچھ نہ بتاتے یا کسی اصولی حکم کے خلاف
کر بتاتے تو اس صورت میں اس حکم کا سرے سے کوئی بھی مصرف نہ ٹھہرتا سوائے
اس کے قرآن میں اس سے ایک سطر کا اضافہ ہو۔ اور اگر بالفرض وہ آپ کو بتلاتے
کہ نماز سے پہلے یا اس کے بعد ڈھول بجا کر تھوڑا سا ناچنا چاہیے۔ اور یہ ناچنا
بجانا کچھ اصولی حکم کے خلاف تو ہے نہیں اس لئے کہ اسلام میں تفریح کی اجازت
ہے۔ ایسی صورت میں پھر کیا آنحضور پر ناچنا فرض ہو جاتا۔ بس ایسے پہلوؤں
پر کچھ سوچنے کی بجائے آپ کے قرآنی دعووں اور نعروں پر ہی سر دھنئے۔

یہ آیت پرویز صاحب کے چند ایک تخلیقی اصولوں پر پانی پھیرتی ہے۔
اول اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ نبی کی پیروی ہر زمانہ میں اس کے نبی ہونے کی حیثیت
سے لازم ہے خواہ وہ امیر وقت ہو یا نہ ہو۔ اور دنیا میں موجود ہو یا نہ ہو۔ دوم یہ
کہ نبی کی اپنی بات اور اس کی آسمانی کتاب کی تعلیم یکساں وحی اور دائمی ہدایت
ہے۔ اس لئے کہ آنحضور کو جب قرآن میں وحی کا پابند بنایا گیا۔ تو اگر پہلے انبیاء
کی تعلیم وحی نہ ہوتی۔ تو آپ کو ان کی پیروی کا کبھی حکم نہ دیا جاتا۔ کیونکہ آپ وحی کے
پابند تھے۔ سوم اس میں پہلے انبیا کی تعلیم کو دینی تعلیم کے طور پر ماننا اور منوایا
گیا ہے۔ جس کا مصرف پرویز صاحب[1] کے ہاں[2] ایسے تاریخی واقعات[3] کہہ دینے کے
سوا کچھ بھی نہیں جو بعد کے حالات میں نہ کارآمد ہوتے ہیں اور نہ قابل حفاظت اور محفوظ۔

۱۔ قرآنی فیصلے ص ۔ ۲۔ مقام حدیث ص ۔ ۳۔ اسباب زوال امت ص ۱۲۷

پہلو پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔ ایک اور راوی فرماتے ہیں۔ کہ ۱۰۹۷ھ میں میرے پاس ایک بکری تھی۔ جس نے ایک بچہ جنا۔ جس کا رنگ سیاہ تھا۔ اور اس پر کچھ سفید گول دائرہ میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ "محمد" (صلے اللہ علیہ وسلم)

اور سنئے! فرماتے ہیں افریقہ میں میں نے خود دیکھا ہے۔ کہ ایک شخص کی داہنی آنکھ کی سفیدی میں باریک سرخ خط میں لکھا تھا۔ "محمد رسول اللہ" (صلے اللہ علیہ وسلم) علامہ نبہانی فرماتے ہیں۔ کہ قطب کبیر۔ عالم شہیر اور صادق خبیر سیدنا و مولانا شیخ عبدالوہاب شعرانی رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب لواقح الانوار القدسیہ میں فرمایا کہ ایک شخص میرے پاس بکری کا بھنا ہوا سر لایا۔ اور مجھے دکھایا کہ اس کی جبین پر لکھا ہوا تھا۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُهٗ اَرْسَلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط۔

دوستو! یہ ایک بہت بڑے قطب وقت کا مشاہدہ ہے۔ اس میں شک کرنے والا دل کا اندھا ہی ہو سکتا ہے۔ اور ہمارا تو ایمان ہے۔ کہ بیشک بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کا نام ان اشیاء پر لکھ کر اپنے محبوب کی عظمت اور آپ کی ملک و حکومت کا اظہار فرمایا ہے۔

حضرت ابوعبداللہ محمد بن الفضل مالکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب تحفۃ الاخیار میں فرماتے ہیں۔ میں نے ایک سفر میں ایک محلہ میں ایک ہرنی دیکھی۔ جس کے دونوں کانوں پر "محمد" لکھا ہوا تھا۔ حضرت مقری فرماتے ہیں۔ میں نے ۱۰۲۶ھ میں شہر فاس میں ایک سیاہ رنگ کا ہتھیلی بھر پتھر دیکھا۔ جس پر قلم قدرت سے ایک طرف لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور دوسری طرف محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔ اس پتھر کی مالک ایک عورت تھی۔ میں نے اس پتھر سے دوگنا سونا دے کر اسے خریدنا چاہا۔ مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ مجھے معلوم ہوا۔ کہ عورتیں اس پتھر سے بڑا فائدہ حاصل کرتی ہیں۔ عسر ولادت کے وقت جو عورت اس مبارک پتھر کو ہاتھ میں پکڑ لے۔ بچہ بڑی آسانی سے پیدا ہو جاتا ہے

اب اس آیت سے ان بے سروپا مفروضات کو ملا کر جس مسئلہ کا عنوان بنایا گیا ہے۔ وہ ہے قبلہ کا مسئلہ۔ یہ مسئلہ نہ تو ایسا ہو سکتا ہے جس کے متعلق خدا کا واضح حکم نہ ہوتا۔ کیونکہ نماز ادا کرنے کا حکم جب بالکل ابتدائی دورِ نبوت میں مسلمانوں کو اور خود رسول کو دیا گیا۔ تو یہ کسی طرح بھی درست نہ تھا۔ کہ وہ بلا قبلہ نماز کا حکم ہو۔ اور نہ مکی دورِ نبوت کے ابتدائی وقت میں آنحضور کو قبلہ کا حکم بتانے والے اہلِ کتاب ہی مکہ میں تھے۔ پھر اسوقت آنحضور نے اس مسئلہ قبلہ کے متعلق پہلے انبیاء کی تعلیم اہلِ کتاب کی بجائے کس سے حاصل کی۔ اس کے بعد جب آپ نے ہجرت فرمائی تو دوران سفر میں اور آتے ہی مدینہ میں جو نماز پڑھی اور جو نمازیں آپ کے آنے سے پہلے مدینہ کے انصار مہاجرین ادا کر رہے تھے۔ کیا وہ اہلِ کتاب سے قبلہ کا مسئلہ دریافت کر کے اپنی نمازوں میں اس پر عمل کرتے رہے اور سب نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اہلِ کتاب کے قبلہ کو اختیار کر لینا کسی اصولی حکم کے خلاف نہیں۔ داد دیجئے ان قرآنی حقائق کی۔

"وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیھا الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیہ۔

اور جس قبلہ کی طرف تم اب رخ کئے ہوئے ہو اسے ہم نے اس لئے قبلہ بنایا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون لوگ اللہ کے رسول کی پیروی میں سچے ہیں۔ اور کون لوگ اپنے پاؤں پھر جانے والے ہیں۔" ص ۲۸۹

قرآن پر جس فدا کاری کا مظاہرہ پرویز صاحب نے یہاں کیا ہے وہ بس آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ ترجمہ میں واضح یہ کرتے ہیں کہ جس قبلہ کی طرف آنحضور اب

اے صل علیٰ نام ہے کیا نامِ محمدؐ!
ہر درد سے لیتا ہے بچا نامِ محمدؐ!

میرے دوستو! درود شریف پڑھو۔

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكَ وَسَلَّمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰه!

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكَ وَسَلَّمَ يَا حَبِيْبَ اللّٰه!

اورغور کرو۔ کہ جس کے نام پاک میں یہ فیض و برکت ہے۔ کہ ایک پتھر پر نقش ہو کر اس پتھر کو لا علاج امراض کی دوا بنا دیتا ہے۔ بھلا خود اس نام والے وجود باجود میں کس قدر برکتیں ہوں گی۔ اور پھر وہ اللہ والے جن کے دلوں میں یہ نام پاک نقش ہے۔ ان اللہ والوں کے فیوض و برکات سے انکار کرنا کیوں جہالت نہ ہوگی؟

میرے بزرگو! یہ جس قدر واقعات میں نے سنائے ہیں۔ یہ اور ان کے علاوہ اور بھی کئی ایک واقعات علامہ نبہانی علیہ الرحمۃ کی کتاب حجۃ اللہ علی العالمین میں صـ۲۱ سے لے کر صـ۲۱۶ تک موجود ہیں۔ جس کی طبیعت چاہے دیکھ لے۔

اور سنئے! علم الحیوانات کے ماہر عالم اور اسلامی دنیا کے مایۂ ناز محقق حضرت علامہ دمیری رحمۃ اللہ علیہ جن کی کتاب حیٰوۃ الحیوان میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن ہارون فرماتے ہیں۔ کہ میں بحر مغرب میں سفر کر رہا تھا۔ کہ ایک ایسے شہر میں پہنچا۔ جس کا نام برطون تھا۔ میرے ساتھ ایک غلام تھا جس کے پاس مچھلی پکڑنے کا جال تھا۔ اس نے جال دریا میں ڈالا تو ایک ایسی مچھلی جال میں آگئی جو بالشت بھر تھی۔ ہم نے اسے دیکھا۔ تو اس کے داہنے کان کے نیچے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ لکھا تھا۔ اور اوپر سر پر "محمدؐ" اور پھر بائیں طرف نیچے "رسول اللہ" لکھا ہوا تھا۔ (حیٰوۃ الحیوان صـ۲۱۴ ج۲)

میرے بزرگو! ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ کہ دہلی کے رائے سینا کی تعمیر کے وقت ایک سنگِ مرمر ایسا دستیاب ہوا۔ جس میں اسم محمد لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ قلم قدرت سے لکھے ہوئے اس نام کا فوٹو بھی لیا گیا اور

اس وقت رخ کرتے ہیں وہ اللہ نے بتایا ہے ایسا ترجمہ کر دینے کے بعد پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آنحضور پہلے جس قبلہ پر تھے ۔ وہ کس کا بنایا ہوا تھا اور کیوں تھا ۔ اور اگر کوئی ایسا سوال اٹھائے بھی تو آپ کہیں گے ہمیں کیا معلوم پہلے کوئی قبلہ تھا بھی یا نہیں ۔ بہر حال قرآن میں جس قبلہ کا حکم آیا وہ یہی کعبہ ہے جواب بھی موجود ہے ۔ گویا آپ کا فرض صرف قرآن کی وکالت کرنا ہے ۔ قرآن لانے والے کے اعمال کی صفائی دینے کے آپ کچھ بھی مکلف نہیں ۔ اور اس کی طرف جو غلطی اور برائی بھی منسوب کر دی جائے ۔ اس کے متعلق آپ کہہ دیں گے کہ شاید رسول نے قرآنی احکام آنے سے پہلے یہ غلطی اور برائی کی ہوگی ۔ یا ان کے آنے کے بعد ان کے سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہوگی ۔

ادھر آپ قرآن کا کوئی اردو یا کسی بھی اور زبان کا ترجمہ دیکھ لیجئے ۔ اس کے اندر اس آیت کے معنے یہ ہوں گے ۔

"اور نہیں بنایا ہم نے وہ قبلہ جس پر تم پہلے تھے مگر اس لئے تاکہ معلوم ہو" ...

یہی آیت کے معنے اور یہی قرآن کا اسلوب بیان ہونے کے ساتھ اس کا منصب بھی ہے کہ وہ معاملہ کے سارے پہلوؤں کو واضح کرے نہ یہ کہ ایک پہلو واضح کر دے اور دوسرے کو اندھیرے میں رکھے ۔ اگر وہ صرف دوسرے قبلہ کا حکم بتائے اور پہلے کے متعلق کچھ بھی روشنی مہیا نہ کرے ۔ تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ اپنے مقصد نزول میں ناکام رہا ۔ اور جس کامل ہدایت کا اس نے ڈھنڈورا پیٹا تھا اسے پورا کر کے نہ دیا ۔ نہ تو پہلا قبلہ اختیار کرنے والوں کو موقعہ پر رہنمائی کی اور نہ بعد والوں کو پہلے قبلہ کی حقیقت بتا کر دی ۔

اس مبارک نام کے عکسی قطعے عام ملتے رہے ہیں۔ میں نے خود اس عکسی قطعے کی زیارت کی ہے۔ آپ میں سے بھی کئی حضرات نے یہ مبارک نام دیکھا ہوگا۔

اور کچھ عرصہ ہوا۔ جبل پور کے لوگوں نے اس نام پاک کا اعجاز اس طرح دیکھا تھا۔ کہ ایک رات کو اچانک تیز روشنی ہوئی۔ لوگوں نے اوپر دیکھا تو آسمان پر نوری خط سے لکھا تھا۔ "محمد" اور ان حرفوں سے نور نکل رہا تھا۔ اس واقعہ کا تذکرہ حسن نظامی نے بھی اپنے اخبار "منادی" میں کیا تھا۔ اور ہمارے قصبہ کوٹلی کا یہ واقعہ تو کوٹلی کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ کہ ایک عورت روٹی پکا رہی تھی کہ اچانک توے پر پکتے پکتے اس روٹی پر نام محمدؐ لکھا گیا۔ عورت نے اپنے والد کو وہ روٹی دکھائی۔ وہ شخص وہ روٹی حضرت والد ماجد فقیہ اعظم علیہ الرحمۃ کے پاس لے آیا۔ حضرت نے اسے چوما اور پھر کوٹلی کے ہر مسلمان اور ہندو۔ سکھ افراد نے بھی اسکی زیارت کی۔ اسی واقعہ کو جلال الدین شاعر نے پنجابی نظم میں لکھا ہے۔ جسکا نام قلم قدرت ہے۔ اور جسکا اشتہار آپ ماہ طیبہ میں پڑھتے رہے ہیں۔ اور جو ہزاروں کی تعداد میں نکل چکی ہے۔ اور ہزاروں لوگوں نے اس نورانی واقعہ کو پڑھا ہے۔

حضرات! اب آپ خود ہی سوچ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جو حضور کا نام ہر شے پر لکھ دیا۔ آخر کیوں؟ یاد رکھئے صرف اس لئے کہ اللہ کے بندے جان جائیں۔ کہ اللہ تعالیٰ جو خالق کل ہے۔ اس نے اپنے محبوب کو ہر شے کا مالک بنا دیا ہے ؎ خالقِ کل نے آپ کو مالکِ کل بنا دیا!

دونوں جہاں ہیں آپ کے قبضہ و اختیار میں

باوجود ان حقائق کے جو شخص یہ کہے کہ جس کا نام محمد ہے۔ وہ کسی چیز کا مالک و مختار نہیں۔ تو فرمایئے اُسے کیا کہا جائے۔ بجز اس کے کہ ظالم تو اس نام سے واقف ہی نہیں۔ اور تیری قسمت میں اس نام پاک کا عرفان ہے ہی نہیں۔

مالکِ جنت حضرات! پہلی حدیث سے ثابت ہوا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام جنت کی ہر چیز پر بھی لکھا ہے۔ چنانچہ امام قسطلانی شارح بخاری مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں:-

چنانچہ اس سلسلہ بیان کی پہلی آیت یہ ہے کہ کچھ بیوقوف قسم کے لوگ ضرور کہیں گے کہ مسلمانوں نے وہ قبلہ کیوں چھوڑ دیا جس پر وہ پہلے کاربند تھے۔ اس پر سوچا جا سکتا ہے کہ کبھی کبھی ہونے والے اعتراض اور سوال کو بیوقوفوں کا سوال کہہ کر بھی بلا جواب چھوڑا جا سکتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پوچھا جائے ایک بنا بنایا مکان گرائے جانے کے متعلق اور جواب میں بتایا جائے کہ ہم نے نیا مکان فلاں اور فلاں فوائد کے پیش نظر بنایا ہے آخر جن لوگوں کا سوال پہلے قبلہ کے متعلق تھا۔ اور وہی ان کا اپنا قبلہ بھی تھا انہیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ کہ نئے قبلہ میں کیا کیا حکمتیں ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر جو تصرف پرویز صاحب نے آیت کے ترجمہ میں کیا ہے وہ سوائے دھوکہ اور مغالطے کے کبھی بھی فائدہ کا حامل نہیں۔ اور غیر قرآنی وحی سے آنکھیں بند کر لینے کے سوا اس کا اور کوئی مقصد نہیں۔

اب دیکھئے کہ انہیں معنی کے اختیار کر لینے سے یہ مقصد کہاں تک پورا ہوا۔ فرضی طور پر مان لیجئے۔ کہ خدا نے ہی دوسرا قبلہ بنایا اور اس لئے بنایا تاکہ رسول کا اتباع کرنے اور نہ کرنے والوں کا حال کھل کر سامنے آجائے یہ کچھ مان لینے کے بعد بھی یہ سوال باقی رہتا ہے۔ کہ پہلا قبلہ کس لئے اختیار کیا گیا۔ اور پھر کس کے حکم سے اسے چھوڑا گیا۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ وہ پہلے انبیاء کی پیروی میں اختیار کیا گیا۔ ہم کہتے ہیں کہ پہلے انبیاء کی طرف قبلہ کے حکم پر جو وحی کی گئی وہ قرآن میں تو ہے نہیں۔ اور اس میں جب ان کی پیروی کا آنحضور کو حکم دیا گیا اور اسی حکم کے تحت قبلہ میں ان کی پیروی سے وہ قبلہ بنا تو پھر اس کے بنانے والا خدا ہی تو ہوا نہ کہ کوئی اور۔ اس کے بعد کیا اس عجیب و غریب ترجمہ کی کیا قدر و قیمت رہ جاتی ہے اس کے ساتھ ہی اس ترجمہ سے ایک اور سوال

وَكُنْيَتُهٗ اَبُو الْقَاسِمِ لِاَنَّهٗ يُقَسِّمُ الْجَنَّةَ بَيْنَ اَهْلِهَا (مواہب لدنیہ ص۱۹۵ ج۱)

یعنی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابو القاسم ہے۔ اس لئے کہ آپ مستحقین میں جنت بانٹتے ہیں۔

کیوں بھائیو! اگر حضور جنت کے مالک نہ ہوں۔ تو اسے تقسیم کیسے فرمائیں؟ بہر حال یہ جنت حضور کی ہے۔ اور الحمد للہ، ثم الحمد للہ! کہ جنت بھی حضور کی ہے۔ اور ہم گنہگار امت بھی حضور کی ہیں۔ اور حضور کے فضل و کرم سے امید ہے۔ کہ ہم جنت میں ضرور جائیں گے۔ اس لئے کہ ؎

گنہگاروں کو جنت سے کوئی روکے تو کیوں روکے
جو وہ جنت محمد کی، تو یہ امت محمد کی

ہاں جو ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ملک و تصرف کے قائل نہیں وہ بیشک ہمارے حضور کی جنت سے محروم رہیں گے۔ اسی لئے اعلیحضرت نے فرمایا ہے۔ ؎

تجھ سے اور جنت سے کیا مطلب وہابی دور ہو
ہم رسول اللہ کے، جنت رسول اللہ کی

ایک اور حدیث

لیجئے ایک اور حدیث سنیئے۔ جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم جنت کے بھی مالک ہیں اور متصرف و مختار ہیں۔ جسے چاہیں دیں۔ جسے چاہیں نہ دیں۔ حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں خدمت کے لئے رات کو حضور کے پاس سوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے حضور کو وضوء کرایا۔ تو حضور علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا۔ "سَلْ" یعنی کچھ مانگ! میں نے عرض کیا۔ اَسْئَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِي الْجَنَّةِ۔ "حضور میں آپ سے یہ مانگتا ہوں۔ کہ جنت میں آپ کے ساتھ رہوں۔"

یعنی یا رسول اللہ! جنت بھی دیجئے اور جنت میں اپنی رفاقت بھی عطا فرمایئے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَوَ غَيْرَ ذٰلِكَ۔ کچھ اور بھی؟ عرض کیا۔ بس یا رسول اللہ یہی جو عرض کر چکا۔ فرمایا! اچھا نماز کثرت سے پڑھتے رہو۔

یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نئے قبلہ کو قرآن میں حکم آجانے کے بعد ہی رسول نے اور مسلمانوں نے اختیار کیا تو اس کے اختیار کرنے میں رسول کی پیروی کا کونسا پہلو ہے۔ اور یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ جو کام قرآن کے حکم کی حیثیت سے رسول اختیار کرے وہی جب دوسرے کرنے لگیں تو وہ رسول کی پیروی ہو جائے

جس چیز کو رسول کی پیروی کہا جا سکتا ہے اس کے ایسا ہونے کا کم از کم تقاضا یہ ہے کہ قرآن میں اس کی صراحت نہ ہو۔ ورنہ جو چیز قرآن کے اندر ایک حکم کے طور پر موجود ہو اسے تو بہر حال خدا کا حکم کہا جائیگا نہ کہ رسول کا۔ وضو میں مسواک اور کلی کو تو رسول کی پیروی کا نام دیا جاتا ہے۔ اور ان کے چھوڑنے والے سے یہ لڑائی لڑی جا سکتی ہے کہ وہ رسول کی پیروی کا تارک ہے۔ مگر وضو کے جو فرائض قرآن میں موجود ہیں ان کے تارک کو تو قرآن کا تارک اور ان کے منکر کو قرآن کا منکر کہا جائے گا۔ نہ کہ سنت رسول کا تارک و منکر۔ بالکل یہی حال قبلہ کے معاملہ کا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اندر قبلہ کا حکم آجانے سے پہلے جس قبلہ کو اختیار کر رکھا تھا در اصل اسی کے اختیار کرنے میں آپکی پیروی تھی اور جو لوگ اس موقعہ پر آپ کا ساتھ نہ دیتے صرف انہیں کے متعلق یہ کہنا صحیح ہو سکتا تھا کہ انھوں نے قبلہ کے بارہ میں رسول کی پیروی نہیں کی۔ پھر جب دوسرے قبلہ کا حکم آجانے پر آپ نے پہلے قبلہ کو چھوڑ دیا تو صرف اس کے چھوڑنے والوں کو رسول کا پیرو کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ قرآن میں جہاں دوسرے قبلہ کا حکم ہے وہاں پہلے کو چھوڑنے کا کوئی بھی حکم نہیں۔ ایسی موقعہ پر اگر کوئی آدمی دوسرے قبلہ کو اختیار کر لینے کے ساتھ پہلے قبلہ کا تعلق بھی باقی رکھتا تو اس کے متعلق یہ کہنا

مسلمانو! یہ حدیث مشکوٰۃ شریف کے صـ۸۴ پر موجود ہے۔ دیکھ لو۔ اول تو خود حضور کا ارشاد کہ مجھ سے کچھ مانگ لو۔ اس امر پر شاہد ہے کہ حضور مالک و معطی ہیں۔ آپ اپنے غلاموں کو دینے والے ہیں۔ بھلا وہ جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ کب یہ کہتا ہے۔ کہ مجھ سے کچھ مانگ لو۔ اور پھر صحابہ کرام کا عقیدہ بھی دیکھئے۔ کہ حضرت ربیعہ نے یہ نہیں عرض کیا۔ کہ حضور! آپ سے مانگ کر کیوں ارتکابِ شرک کروں۔ ہمیں جو مانگنا ہے اللہ سے مانگ لینگے۔ نہیں بلکہ عرض کیا۔ حضور آپ سے جنت اور اس میں آپ کی رفاقت مانگتا ہوں۔ گویا صحابہ کا ایمان تھا۔ کہ حضور جنت کے مالک ہیں۔ جبھی تو جنت مانگی اور پھر حضور نے بھی یہ نہیں فرمایا۔ کہ جنت پر میرا کیا اختیار۔ نہیں! بلکہ فرمایا۔ اچھا نمازیں پڑھتے رہنا۔ گویا ہم نے تمہیں جنت اور اس میں اپنی رفاقت دیدی۔ سبحان اللہ یہ شان ہے ہمارے حضور کے ملک و اختیار کی۔ سچ ہے۔ ؎

کس چیز کی کمی ہے مولا تری گلی میں
دنیا تری گلی میں عقبےٰ تری گلی میں

اب پوچھیے اس نام کی تقویۃ الایمان اور کام کی تفویۃ الایمان سے کہ تیری یہ بیہودگی کہ "جس کا نام محمد ہے۔ وہ کسی چیز کا مالک و مختار نہیں۔ تفویۃ الشیطان اور جہنم کا سامان ہے یا نہیں؟ مسلمانو! اپنے عقیدہ پر جمے رہو۔ کہ ہمارے حضور خدائی بھر کے مالک و مختار ہیں۔ اور یہ شان اللہ نے انہیں عطا فرمائی ہے۔ وہ دینے والا ہے۔ اور یہ لینے والے ہیں۔ اور تماشا یہ ہے۔ کہ وہ دیتا ہے یہ لیتے ہیں۔ اور دشمنانِ رسول جلتے ہیں۔ اور کیوں نہ جلیں۔ جبکہ انہیں جلنا ہی ہے۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔ ایسے لوگ حاسد اور بخیل ہیں۔ اور انکا عجب حال ہوتا ہے۔ دیتا کوئی ہے اور جلتے یہ ہیں۔ چنانچہ ایک منظوم لطیفہ ہے ؎

منظوم لطیفہ

بیوی بولی شوم کی کیوں ہے بدن علیل
کیا گرہ سے کھل پڑا یا کسی کو دیا

یعنی ایک بخیل کی بیوی نے اپنے بخیل خاوند کو دیکھا۔ کہ وہ بڑا پریشان سا نظر آرہا ہے۔ تو پوچھا کیا کچھ گر گیا ہے؟ یا کسی کو کچھ دے بیٹھے ہو؟ جو

صحیح ہوتا کہ اس کے پاؤں رسول کی پیروی سے[۱] ہٹ رہے ہیں۔

قبلہ کو اختیار کرنے اور اسے چھوڑنے کے ان چارگانہ پہلوؤں پر غور کرنے سے جہاں اطاعت رسول کی حکمت واضح ہوتی ہے وہاں اس کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پرویز صاحب کو اطاعت رسول کے انکار سے جتنا شغف ہے اتنا قرآن سے عشق نہیں۔ ورنہ آیت کے ایسے غلط معنی نہ کرتے۔

اسی مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو ناسخ اور منسوخ کا بھی ہے۔ جس کے پرویز صاحب قائل نہیں اور اطاعت رسول کے علاوہ یہ دوسری وجہ ہے اس بات کی کہ آپ پہلے قبلہ کو وحی کا حکم نہ مانیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے جب دوسرے قبلہ کا حکم فرمایا تو پہلے قبلہ کا حکم باقی نہ رہا۔ اور منسوخ ہو گیا۔

شریعت میں ناسخ و منسوخ کے انکار کا باعث عام طور پر یہ خیال ہے کہ جب خدا سب کچھ جانتا ہے اور آنے والے حالات بھی تمام تر اس کے اپنے ارادہ کے تحت بلکہ اس کے لانے سے آتے ہیں۔ تو وہ ایسا حکم کیوں دے بیٹھتا ہے۔ جو بعد میں کسی وقت معطل اور موقوف کرنا پڑ جائے۔ ایک انسان تو اگر ایسا کرے تو وہ اس لئے مجبور ہوتا ہے کہ وہ آنے والے حالات سے بے خبر ہوتا ہے۔ مگر خدا کے علم کا تو یہ حال کبھی نہیں کہ حکم دیتے اور قانون بناتے وقت اس کے سامنے آنے والے

---

۱ اس مقام کو اچھی طرح سمجھ لینے سے پرویز صاحب کی کتابوں کے ان سب مقامات کی غلطی کا کچھ سراغ مل سکتا ہے جہاں خدا اور رسول کی اور حکومت کی اطاعت کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کیا گیا ہے۔

پریشان نظر آرہے ہو۔ تو وہ بخیل بولا :- ؎

نہ گرہ سے کھل پڑا نہ کسی کو دیل
دیتے دیکھا اور کو تو ہے بدن علیل

یعنی نہ تو کچھ گرہ سے گرا ہے۔ نہ کسی کو کچھ دیا ہے۔ بلکہ کسی دوسرے آدمی کو سخاوت کرتے دیکھا ہے۔ اس لئے پریشان ہوں۔"

مسلمانو! یہی حال ان دشمنوں کا ہے۔ کہ حضور کا خدا حضور کو دیتا ہے اور یہ اس کی عطا کو دیکھ کر جلتے ہیں اور مرتے ہیں مگر ؎

رہے گا یونہی ان کا چرچا رہے گا۔
پڑے خاک ہو جائیں جل جانے والے

عمل ضروری ہے

میرے بزرگو! اس حدیث سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ہمیں جنت میں جانے کے لئے عمل بھی کرنا ضروری ہے دیکھئے حضور علیہ السلام نے حضرت ربیعہ سے فرمایا کہ نمازیں پڑھتے رہنا۔ گویا جنت میں تجھے لے تو جاؤں گا۔ مگر تم بھی عبادت میں کوشش کرنا۔ میرے عزیزو! آج کل ہم میں سے بھی ہر ایک جنت کا طالب تو ضرور ہے۔ مگر افسوس کہ نماز روزہ کے معاملہ میں ہم بڑے سست واقع ہوئے ہیں۔ نام کے مسلمان ہیں۔ ایک بار کلمہ پڑھ لیا۔ اور پھر چھٹی۔ نہ نماز نہ روزہ نہ حج نہ زکوٰۃ، اور نہ کوئی اور نیک عمل۔ اور کہا یہ جاتا ہے۔ کہ صاحب! جس نے کلمہ پڑھ لیا۔ بس وہ جنت کا مالک بن گیا۔ پھر اس نماز روزہ کی کیا حاجت! توبہ! توبہ!! میرے دوستو!

ریلوے ٹکٹ

ریلوے ٹکٹ کی مثال سامنے رکھو۔ دیکھئے آپ مثلاً لاہور سے کراچی تک جانے کے لئے ٹکٹ خریدیں۔ تو اس ٹکٹ پر یہ لکھا ہوا موجود ہوگا۔ "لاہور سے کراچی" مگر یہ ٹکٹ لے کر آپ پھر اپنے گھر جا لیٹیں۔ اور آرام سے سو جائیں۔ اور اگر کوئی پوچھے کہ آپ کراچی کیوں نہیں گئے۔ تو آپ اس کے سامنے ٹکٹ کر دیں۔ کہ یہ دیکھئے میرے پاس کراچی کا ٹکٹ موجود ہے۔ میں کراچی پہنچ جاؤں گا۔ تو سب آپ کو بیوقوف کہینگے۔

حالات نہ ہوں۔ پرویز صاحب اسکا حل یہ بتاتے ہیں کہ خدا کے جس حکم کو نہ ماننا ہو اسے بغیر کسی وجہ اور دلیل کے عبوری[1] دور کا حکم کہہ کر چھوڑ دیا جائے۔ مثلاً اگر آپ نماز اور روزہ کو ادا نہ کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا حکم عبوری دور کے لئے تھا۔ جو اب باقی نہیں۔ اس لئے کہ کسی حکم کے عبوری ہونے اور نہ ہونے کے لئے کوئی معیاد تو ہے نہیں۔ سوائے اس کے کہ وحی کے ذریعہ معلوم ہو کہ فلاں حکم فلاں وقت اور تاریخ تک رہے گا۔ اور اس کے بعد متروک یا عبوری سمجھا جائے گا۔ اسلام کے لئے اگر وحی کی ایسی ہدایت موجود ہوتی تو اس پر پھر یہی سوال وارد ہوگا۔ کہ ایک حکم جاری ہونے کے بعد کیوں متروک ہوا۔ اور ایک وقت اس کے کرنے اور نہ کرنے والے برابر ٹھہرے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ حالات کے بدلنے[2] سے حکم خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے زنا کا رواج ختم ہو جانے پر اس کی سزا کا حکم باقی نہیں رہتا۔

کتنا نکتہ رس دماغ ہے آپ کا۔ سزا جاری کرنے سے شریعت کا مقصد ہی یہ ہے

---

[1] وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ و خیرات وغیرہ سے متعلق احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں سے معاشرہ گذر کر انتہائی منزل تک پہنچا ہے نظام ربوبیت۔ صہ ۲۵

[2] ایک ایسا وقت آجائے کہ کوئی شخص زنا کا مرتکب ہی نہ ہو۔ اب ظاہر ہے۔ کہ اسوقت زنا کی سزا کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہیگی۔ یہ حکم موجود تو رہیگا لیکن نافذ العمل نہیں ہوگا۔ نظام ربوبیت۔ صہ ۲۲۸

اور جواب بھی دیں گے۔ کہ صاحب! اگرچہ آپ کے پاس یہ ٹکٹ موجود ہے جس پر "لاہور سے کراچی" لکھا ہوا ہے۔ مگر آپ جب تک پلیٹ فارم پر جاکر ٹرین پر سوار نہ ہوں گے۔ اور ۲۴ گھنٹے کی زحمت سفر برداشت نہ فرمائیں گے۔ آپ اس ٹکٹ کے باوجود بھی ہرگز کراچی نہ پہنچ سکیں گے۔ تو اسی طرح میرے بھائیو! ہمارے پاس لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا ٹکٹ تو بیشک موجود ہے۔ اور بیشک یہ ٹکٹ سیدھا جنت کا ہی ہے۔ مگر خوب یاد رکھیئے کہ یہ ٹکٹ لے کر بھی ہم جب تک عملی پلیٹ فارم پر قدم نہ رکھیں گے اور نماز و روزہ اور دیگر ارکانِ اسلامیہ کی ٹرین پر سوار نہ ہوں گے۔ اس وقت تک ہم اس ٹکٹ کے باوجود بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا ضروری ہے۔ کہ مسلمان کو اگر جنت کی خواہش ہے۔ تو احکام شریعت پر عمل بھی کرے۔ اور اپنے آپ کو اس شعر کے مطابق بنائے کہ ؎

مصوّر دیکھنا تصویر میری یوں بناتی ہو
ادھر حکم الٰہی ہوا اِدھر گردن جھکاتی ہو

حوضِ کوثر

حضرات! کوثر کا ترجمہ اور تفسیر آپ سن چکے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو "بہت کچھ" عطا فرمایا۔ مفسرین کرام علیہم الرحمۃ نے کوثر سے مراد حوض کوثر بھی بیان کیا ہے۔ مگر جب کوثر کا ترجمہ بیشمار خوبیاں" "خیر کثیر" اور "بہت کچھ" کیا جائے گا۔ تو حوض کوثر بھی خود بخود اس میں آجائے گا۔ چنانچہ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کوثر کی تفسیر "خیر کثیر" سے فرمائی۔ تو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ لوگ تو کہتے ہیں۔ کوثر سے مراد حوضِ کوثر ہے۔ تو ابن عباس نے فرمایا۔

هُوَ مِنَ الْخَيْرِ الْكَثِيْرِ۔ حوض کوثر بھی خیر کثیر میں سے ہی ہے۔ (روح البیان ج ۳ ص ۵۰۹)

تو میرے بھائیو! ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو منجملہ خیر کثیر کے یہ حوض کوثر بھی عطا ہوا۔ اور حضور اس حوض کوثر کے بھی مالک ہیں۔ یہ حوض کوثر کیا ہے؟ حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ یہ ایک جنت کی نہر ہے

مَاءُهُ اَبْيَضُ مِنَ اللَّبَنِ وَرِيْحُهُ اَطْيَبُ مِنَ الْمِسْكِ وَكِيْزَانُهُ

کہ زنا باقی نہ رہے۔ اب اگر کسی جگہ زنا کا رواج ختم ہو جاتا ہے اور پھر بھی کوئی زنا کر گزرتا ہے تو کیا اس پر سزا کی حد جاری نہیں ہوگی۔ ضرور ہوگی۔ اور جب ہوگی تو پھر سزا کا حکم نافذ العمل کیسے نہیں ہوگا۔ کیا اس کے نافذ العمل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زنا کرنے اور نہ کرنے والے ہر ایک کو زانی کہہ کر پیٹا جائے

بہر حال احکام کو ترک کر دینے اور موقوف ٹھہرانے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ چاہے انہیں عبوری کہا جائے یا حالات سے مشروط۔ مگر قبلہ کے مسئلہ میں تو یہ دونوں مفروضات بھی موجود نہیں۔ اس میں نہ تو کوئی شرط ہے۔ اور نہ حالات کی تبدیلی۔

قرآن مجید میں اس کا حل نہایت ہی سادہ اور عمدہ بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور جب قادر ہے تو وہ اپنے ایک حکم کو بدلنے اور اس کی جگہ دوسرا حکم لانے پر بھی قادر ہے۔ رہا یہ امر کہ اس ادل بدل میں حکمت کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس طریقہ پر خدا کا حکم ماننے والوں اور عادات پر چلنے والوں کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ اور پتہ چل جاتا ہے کہ کون حکم کو رواج کے طور پر مانتا ہے۔ اور کون اطاعت کے جذبے سے۔ قرآن کے اس بیان سے خدا کے قادر مطلق اور حکیم ہونے کے ساتھ یہ پتہ بھی چل جاتا ہے۔ کہ کوئی دوسرا اس قدرت اور حکمت کا مالک نہیں۔ کہ اپنی مرضی سے خدا کے کسی حکم کو عبوری یا مشروط کہہ کر چھوڑ دینے کا فیصلہ دیدے۔ نہ صرف اسی لئے کہ دوسرے کے پاس خدا کی حکمت اور قدرت موجود نہیں۔ بلکہ اسلئے بھی کہ خدا کے سوا ہر کائنات محکوم ہے۔ اور خدا حاکم ہے[۱]۔ اور محکوم کا کام حاکم کے حکم کو ماننا ہے۔ نہ کہ اسے عبوری اور مشروط کہہ

---

[۱] ۔ نہ صرف یہی بلکہ ایسے حال میں زیادہ سزا ہوگی اسی لئے حدیث میں شادی شدہ زانی کو پتھروں سے چور کر دینے کا حکم ہے۔

كَنُجُوْمِ السَّمَاءِ مَنْ يَشْرَبُ مِنْهَا فَلَا يَظْمَأُ أَبَدًا۔ (مشکوۃ شریف ص۴۸۷)

اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید۔ خوشبو اس کی مشک سے زیادہ خوشبودار۔ اور جام اسکے آسمان کے تاروں کے برابر ہیں۔ جو شخص ایک بار اس کا پانی پی لیگا۔ پھر کبھی وہ پیاسا نہ ہوگا۔

میرے بزرگو! یہ ہے وہ حوض کوثر جو منجملہ دیگر خوبیوں کے حضور کو عطا ہوا۔ حضور اس کے مالک ہیں۔ اور اللہ نے حضور کو اس کا مالک بنایا ہے۔

حشر میں حضور کی تلاش

ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کل قیامت کے دن اس حوض سے اپنے غلاموں کو پانی پلائینگے

اعلیحضرت فرماتے ہیں۔ ؎

ٹھنڈا ٹھنڈا میٹھا میٹھا ❊ پیتے ہم ہیں پلاتے یہ ہیں

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ حضور سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کل میدان حشر میں آپ کو کہاں ڈھونڈوں۔ آپ کہاں ہوں گے؟ حضور نے فرمایا: "سب سے پہلے تو مجھے "پل صراط" پر دیکھنا" حضرت انس نے عرض کیا۔ اور حضور اگر آپ وہاں نہ ہوتے تو؟ تو فرمایا "پھر میزان" کے پاس دیکھنا۔ وہاں ہوں گا" عرض کیا۔ حضور اگر وہاں بھی نہ پا سکوں تو پھر؟ فرمایا:۔

فَاطْلُبْنِي عِنْدَ الْحَوْضِ فَإِنِّي لَا أُخْطِئُ هٰذِهِ الثَّلٰثَ الْمَوَاطِنَ

پھر مجھے حوض کوثر پر تلاش کرنا۔ میں ان تین جگہوں میں سے ایک نہ ایک جگہ ضرور ہوں گا۔ (مشکوٰۃ شریف ص۴۸۵)

سبحان اللہ! لاکھوں درود اور کروڑوں سلام غمخوار امت نبی پر جو اپنے غلاموں کی خاطر یا پل صراط پر تشریف فرما ہوگا۔ اور اپنے غلاموں کو اپنی رحمتوں سے پار گزار رہا ہوگا۔ یا میزان کے پاس تشریف فرما ہوگا۔ اور اپنے گنہگار غلاموں کے نیکیوں کے ہلکے پلے اپنے گراں قدر انعامات و الطاف سے بھاری فرما رہا ہوگا۔ یا حوض کوثر پر تشریف فرما ہوگا۔ اور اپنے پیاسے غلاموں کو جام پلا رہا ہوگا۔ شاعر نے اس حدیث کا ترجمہ کیا ہے اور حضور

صلح و جنگ اور وحی

"کما اخرجک ربک من بیتک بالحق. وان فریقاً من المومنین لکارہون.
یجادلونک فی الحق بعد ما تبین کانما یساقون الی الموت وہم ینظرون.
واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ
تکون لکم ویرید اللہ ان یحق الحق بکلماتہ ویقطع دابر الکافرین۔
جس طرح جنگ بدر میں تیرے پروردگار نے تجھے تیرے گھر سے سچائی
کے ساتھ نکالا تھا۔ اور ایک گروہ اس سے ناخوش تھا۔ وہ تجھ
سے امر حق میں جھگڑ پڑے۔ باوجودیکہ معاملہ واضح ہو چکا تھا۔ گویا اپنی
موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ اور وہ اپنی آنکھوں سے موت دیکھ
رہے ہیں۔ اور جب اللہ نے تم سے وعدہ فرمایا تھا۔ کہ دشمنوں کی دو جماعتوں
میں سے کوئی ایک تمہارے ہاتھ لگیگی۔ اور تم چاہتے تھے کہ جس جماعت
میں لڑائی کی طاقت نہیں وہ تمہارے ہاتھ آ جائے۔ اور خدا چاہتا تھا۔ کہ
حق کو اپنے وعدہ کے ذریعہ ثابت کر دے اور دشمنان دین کی جڑیں
کاٹ کر رکھ دے"۔ ۹ ا ہ

ان آیتوں میں جنگ بدر کی روئداد کا ایک حصہ بیان ہوا ہے۔ اور ان کے چار مقامات
سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن کے علاوہ عام حالات
میں بھی وحی آتی تھی۔ جس کے آپ ہر لحظہ پابند تھے۔
پہلی بات اس بیان میں سر فہرست یہ ہے۔ کہ آنحضور کو معرکہ بدر کے لئے خدا

کا جواب اس طرح لکھا ہے کہ ؎

یا ہوں گا میں کوثر پہ پلاتا ہوا پانی
یا ہونگا ترازو کے میں نزدیک ضروری
یا پُل پہ کھڑا ہونگا حفاظت کو تمہاری
گر گرنے لگے کوئی تو میں اسکو بچالوں

شاعر پھر لکھتا ہے:-

گر حکم جہنم کا مجھے دے گا الٰہی
اور بھیجے پکڑنے کیلئے اس نے سپاہی!
اس وقت میں چلاؤں گا اور دونگا دہائی
ٹھہرو میں ذرا اپنے محمدؐ کو بلالوں

❖

آئینگے شہِ والا مدد کرنے اسی دم
فرمائینگے اے امتی نہ کر تو کوئی غم!
میں آیا ہوں بن کر ترا مونس و ہمدم
آ میرے گنہگار میں کملی میں چھپالوں

اور بھائیو! پھر جسے اس مبارک کملی میں پناہ مل گئی اسے پھر کیا خطرہ ؎

ڈھونڈا ہی کریں صدرِ قیامت کے سپاہی
وہ کس کو ملے جو ترے دامن میں چھپا ہو

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

بزرگو! خدا تعالیٰ نے اِنَّآ اعطیناک الکوثر فرما کر پھر فرمایا۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ تو تم اپنے رب کیلئے نماز پڑھو۔"

امام فخرالدین رازی علیہ الرحمۃ نے اپنی تفسیر کبیر میں اس آیت کے ماتحت ایک بڑی پرلطف بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں۔ امام اعظم رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو تفضلاً کوئی چیز دے۔ یعنی ہبہ کردے تو وہ اپنی دی ہوئی چیز واپس بھی لینا چاہے۔ تو اگرچہ یہ بات مناسب نہیں۔ مگر وہ واپس لے سکتا ہے۔ اور اگر لینے والا بھی اس کے عوض کچھ دیدے۔ چاہے ایک پائی ہی کی چیز کیوں نہ ہو۔ تو پھر اس صورت میں دینے والا اپنا عطیہ واپس نہیں لے سکتا۔ تو بنا بریں حق تعالیٰ نے حضور کو کوثر عطا فرمایا۔ اور شبہ مذکور کو دور فرمانے کے لئے فرما دیا۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ (اس کے عوض میں) تم اپنے رب کے لئے نماز پڑھو۔ اور قربانی دو۔"

تاکہ اس عطا کے بعد آپ کی طرف سے بھی عوض کا ظہور ہو جائے۔

نے حق کے ساتھ گھر سے خود ہی نکالا تھا۔ یہ حق کے ساتھ نکلنا اور نکالنا وحی کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ ورنہ عام حالات میں کسی کے نکل کھڑے ہونے کو حقانیت کا یہ اعزاز کبھی نہیں دیا جاتا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن میں آنحضور کو جنگ بدر کے لئے نکلنے کا کہیں بھی حکم نہیں فرمایا گیا۔ اس لئے یہ حکم غیر قرآنی وحی کا ہی ہو سکتا ہے جو لازم ہونے میں قرآن کے حکم کے برابر تھا۔ اور اسکی پابندی اسقدر ضروری تھی کہ اس میں کسی کی مخالف یا موافق رائے کا لحاظ نہ رکھا گیا۔ اور نہ ہی کسی کو اس معاملہ میں مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو لیڈر اپنی بات کو وحی کے مرتبہ میں رکھ کر پیش نہ کر رہا ہو وہ اس کے پیش کرنے میں ڈگمگائے بغیر نہیں رہتا۔ اور جماعت کے افراد کو اسے مطمئن کرنا ہوتا ہے۔ نہ صرف اتنے بڑے جنگی اقدام میں بلکہ ہر معاملہ میں یہ حالات اور رجحانات کے بلا لحاظ جنگی اقدام کر گذرنا تو اسی لیڈر کا کام ہو سکتا ہے جو نہ حالات کا پابند ہو اور نہ جماعت کے افراد کا۔ بلکہ صرف خدا کے حکم کا پابند ہو۔

دوسری بات اس میں اجازت جنگ ہے اور اس کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان آیتوں میں جس جنگ کی حالت بیان کی گئی ہے۔ وہ نہ مدافعانہ جنگ ہے اور نہ جارحانہ۔ مدافعانہ جنگ تو دشمن کے حملہ کا جواب ہوتا ہے۔ اور اس جنگ میں دشمنوں کی طرف سے مسلمانوں پر کسی بھی حملہ کی ابتدا نہیں ہوئی۔ جس کی مدافعت کرنا ان پر ضروری ہوتا۔ اور جارحانہ جنگ میں ضروری ہوتا ہے کہ اگر حالت جنگ موجود نہ ہو۔ تو جنگی کارروائی کا اعلان کیا جائے۔ یہاں اگر حالات ہجرت کو حالت جنگ نہ سمجھ لیا جائے۔ تو اس جنگ بدر کو جارحانہ جنگ کا نام دینا

اور کوثر ہمیشہ کے لئے آپ ہی کا رہے۔ (تفسیر کبیر ص۱۹۶ ج ۸)

اخلاص عمل

حضرات! فَصَلِّ لِرَبِّكَ میں حرف "ل" قابل غور ہے، خدا فرماتا ہے۔ "اپنے رب کے لئے نماز پڑھو" مفسرین کرام نے یہاں سے اخلاصِ عمل کا درس مستنبط فرمایا ہے۔ کہ گویا خدا کا ارشاد ہے۔ کہ نماز پڑھو تو خاص اپنے رب کیلئے یعنے ریاکاری کے لئے نہ پڑھو۔ بلکہ بڑے حسن خلوص کے ساتھ اور صرف اللہ کے لئے پڑھو۔ مسلمانو! اخلاص عمل جانِ عمل ہے۔ اگر یہ اخلاص نہ رہا تو سمجھ لو کہ وہ عمل بیکار ہوگیا حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات کے مطابق جیسی نیت ہوگی: ویسا ہی اثر مرتب ہوگا۔ چنانچہ امام غزالی علیہ الرحمۃ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے:۔

ایک عابد کی حکایت

کہ ایک عابد کو جو عرصہ دراز سے عبادتِ الٰہی میں معروف تھا۔ لوگوں نے کہا کہ یہاں ایک قوم ہے جو ایک درخت کی پوجا کرتی ہے۔ عابد سن کر بڑا غصے میں آیا۔ اور اسی وقت کلہاڑا لے کر اٹھا۔ اور اس درخت کو کاٹنے کے لئے چل پڑا۔ راستے میں اسے شیطان ایک شیخ کی صورت میں ملا۔ اور پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ عابد نے بتایا کہ وہ درخت جسے لوگ پوجتے ہیں۔ کاٹنے جا رہا ہوں۔ شیطان نے کہا۔ تو ایک درویش آدمی ہے۔ تجھے اس جھگڑے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ خواہ مخواہ اپنی عبادت کا وقت ضائع کروگے۔ جاؤ گھر جاکر اللہ اللہ کرو۔ عابد نے کہا۔ تو میری راہ چھوڑ۔ میں اس کام سے باز نہ رہوں گا۔ میرے لئے یہ کام بھی عبادت ہی ہے۔ شیطان نے کہا۔ مگر میں تجھے ہرگز جانے نہ دوں گا۔ عابد نے کہا۔ دیکھوں تو، تو میری راہ کیسے روکتا ہے بس پھر کیا تھا۔ عابد و شیطان دونوں کی لڑائی شروع ہوگئی۔ اور دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد عابد نے شیطان کو نیچے گرا لیا۔ اور اس کی چھاتی پر سوار ہوگیا۔ شیطان نے کہا۔ مجھے چھوڑ دے۔ اگر چھوڑ دے گا۔ تو میں تجھے ایک ایسی بات بتاؤں گا۔ کہ تو خوش ہو جائے گا۔ چنانچہ عابد نے اسے چھوڑ دیا۔ اور شیطان نے اٹھ کر کہا۔

بھی مشکل ہے۔ پھر بھی اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ لڑائی جارحانہ تھی تو پھر یہ کہنا اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ اس کی اجازت وحی کے ذریعہ خدا کی طرف سے ہوئی تو وہ جنگ لڑی جانی جائز ہوتی۔ کجا یہ بات کہ نہ وہ وحی کا حکم ہو اور نہ اس کے حق میں جماعت کی رائے کچھ ہو۔ اور پھر بھی لیڈر اپنی مرضی سے اس کا اقدام کر دے۔ ان وجوہ سے جنگ بدر کے اقدام کو جائز کہنے کی سوائے اس کے اور کوئی بنیاد موجود نہیں کہ اسے وحی کا حکم مانا جائے۔ بعد میں جب ان آیتوں سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ تو یہ دلیل ہے اس امر کی کہ وہ اقدام وحی کے حکم سے واقع ہوا۔

ادھر مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ وہ کچھ تو مکہ سے لُٹ پِٹ کر آئے تھے اور کچھ مدینہ کے نو مسلم تھے۔ اور ہرگز اپنے آپ کو اس قابل نہ پاتے تھے۔ کہ کسی طرح بھی جنگ کا آغاز کریں۔ سوائے اس کے کہ اگر ان کے گھر پر کوئی حملہ آور ہو تو وہ اس کے تدارک کے لئے کچھ سوچیں۔ ایسے حالات میں وحی کے بلا حکم انہیں اپنے لیڈر کے ذاتی فیصلہ پر جنگ کے لئے مستعد مان لینے کا مطلب تو یہ ہے کہ اس ساری جماعت کو مسلمان صحابہ کی بجائے بیوقوفوں کی جماعت کا نام دیا جائے۔ جو نہ تو اپنی بے سر و سامانی پر غور کرتی ہو اور نہ اسباب جنگ کے متعلق سوچا فرمانا سمجھتی ہو۔ اور لیڈر کی بات پر اندھا دھند عمل کرتی ہو۔

تیسری بات اس بیان کے اندر دو میں سے ایک جماعت کا وعدہ ہے۔ مفسرین صاحب کہتے ہیں کہ ان دونوں جماعتوں کی خبر مدینہ میں پہنچ گئی تھی۔ جن میں سے ایک قریش مکہ کا تجارتی قافلہ تھا۔ اور ایک ان کا جنگی دستہ جو اسی قافلہ کی حفاظت

کہ دیکھ تجھے اس درخت سے کیا مطلب۔ لوگ پوجتے ہیں تو پوجنے دو۔ اگر اللہ کو یہ درخت کٹوانا ہی منظور ہوا۔ تو کسی نبی کو بھیج کر کٹوا لے گا۔ تو واپس چلا جا۔ اور اللہ اللہ کر! میری بات مان کر اگر تو واپس چلا گیا۔ تو میں ہر روز صبح تیرے تکیے کے نیچے دو دینار رکھ دیا کروں گا۔ تو فقیر آدمی ہے اس طرح تو نان و نفقہ سے بے نیاز ہو جائے گا۔ درخت کے قصے کو چھوڑ اور واپس چلا جا۔

عابد نے جب دو دینار ہر روز ملنے کا سنا۔ تو سوچنے لگا۔ کہ بات تو ٹھیک ہے۔ میں کوئی نبی تو ہوں نہیں۔ کہ درخت کا کاٹنا مجھ پر ضروری ہو۔ نہ خدا نے مجھے اس کے کاٹنے کا حکم ہی دیا ہے۔ کہ میں نہ کاٹنے سے گنہ گار ہو جاؤں گا۔ یہ شیخ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ یہی ٹھیک ہے۔ یہ سوچا اور کہا اچھا تو میں واپس جاتا ہوں۔ اب تم بھی اپنا وعدہ پورا کرنا۔

چنانچہ رات کو سویا اور صبح اٹھا۔ تو واقعی اس کے تکیہ کے نیچے دو دینار پڑے ہوئے تھے۔ بڑا خوش ہوا۔ دوسرے دن بھی اٹھا۔ تو دو دینار مل گئے۔ مگر جب تیسرے دن اٹھا۔ تو دینار ونیار کچھ بھی نظر نہ آئے۔ اب تو عابد صاحب بڑے غصے میں آئے۔ اور پھر کلہاڑا لیا۔ اور درخت کاٹنے چل پڑے راستے میں پھر شیطان اسی شکل میں ملا۔ اور پوچھا۔ خیر تو ہے؟ آج پھر اسی طرف جا رہے ہو۔ عابد نے کہا۔ آج میں پھر اسی درخت کے کاٹنے کو جا رہا ہوں۔ شیطان نے کہا۔ میں آج بھی نہ جانے دوں گا۔ عابد نے کہا۔ آج تو میں ضرور ہی جاؤں گا۔ اس جھگڑے میں پھر لڑائی شروع ہو گئی۔ اور تھوڑی دیر میں پہلے دن کے خلاف شیطان نے عابد کو گرا لیا۔ اور عابد کی چھاتی پر سوار ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ اگر درخت کاٹنے سے باز آ جاتے تو بہتر ورنہ ابھی ذبح کر دوں گا۔ عابد نے محسوس کیا کہ آج مجھ میں اسکے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے۔ کہنے لگا۔ یہ تو بتا دو۔ کہ اس دن تو میں نے تجھے گرا لیا تھا۔ مگر آج یہ کیا بات ہوئی۔ کہ تو مجھ پر غالب آ گیا ہے شیطان کہنے لگا۔ کہ اس دن تو تو خالص اللہ کے لیے درخت کاٹنے

کو آیا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بھی روایت موجود نہیں جس میں کسی ایسی خبر کے مدینہ میں پہنچنے کا بیان ہو۔ اور اگر ہوتی بھی تو ایسی خبر اس قابل کب تھی کہ اس کے سنتے ہی جنگ کا سامان کرنا مسلمانوں پر ضروری ہو جاتا۔ اور خبر پہنچانے والوں کے بس میں یہ کب تھا کہ وہ ایک جماعت کے مال غنیمت کا وعدہ دلاتے اور وعدہ بھی ایسا جو شک و شبہ سے بالا ہوتا۔ ادھر قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ وعدہ مسلمانوں کو صرف اللہ کی طرف سے دلایا گیا۔ جسے یقینی اور صحیح ماننا ان کے ایمان کا تقاضا تھا۔ یہ وعدہ اللہ کی طرف سے رسول نے بذریعہ وحی حاصل کر کے مسلمانوں کو پہنچایا ورنہ اڑتی افواہوں کو کبھی اللہ کے وعدہ کے طور پر نہیں مانا گیا۔ جنگ کا اقدام کرنے میں اللہ کا حکم آنے کے ساتھ یہ مال غنیمت کا وعدہ ایک دوسرا سبب تھا مسلمانوں کے آمادہ جنگ ہونے کا۔

چوتھی بات اس میں فتح و نصرت کا وعدہ ہے۔ آیت میں کافروں کی جڑیں کاٹنے کے الفاظ ہیں۔ ان میں جہاں ایک طرف جنگ کا حکم ہے وہاں دوسری طرف فتح کی بشارت اور پیشین گوئی بھی موجود ہے۔ اور ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے جنگ کرو بھی ضرور اور جب کرو گے تو اس جنگ میں فتح بھی تمہاری ہی ہوگی۔ اور یہ تیسری وجہ ہوئی بے سرو سامان مہاجرین و انصار کے آمادہ جنگ ہونے کی۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عام امیروں جیسے امیر ہوتے جو خود اپنی موت و حیات کے آنے والے حالات سے بھی دوسرے لوگوں کی طرح یا ان سے بڑھ کر اندھیرے میں ہوتے ہیں۔ تو آپ کا یہ منصب کبھی نہ تھا۔ کہ اپنے جان نثار ساتھیوں کو جنگ کا حکم دینے کے ساتھ فتح اور کامیابی کا مژدہ بھی سناتے

جارہا تھا۔ اور تیری نیت میں خلوص تھا۔ اور آج تجھے دو دینار کے نہ ملنے کا غصہ ہے۔ اور نیت میں وہ اس دن والا خلوص نہیں

(نزہتہ المجالس صد ج ۱)

دیکھا میرے دوستو! اہل خلوص حضرات پر شیطان کا قابو نہیں چلتا۔ وہ تو پہلے دن ہی خدا کے سامنے شیطان نے اقرار کر لیا تھا۔ کہ

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ۔

یعنے تیرے مخلص بندوں پر میرا قابو نہ چلے گا۔ اور سنیئے اس نیت کا بدل جانا کیا کیا گل کھلاتا ہے۔ علامہ دمیری علیہ الرحمۃ حیوٰۃ الحیوان میں لکھتے ہیں۔

ایک بادشاہ اور دہقانی کی حکایت

کہ ایک بادشاہ کو اپنی مملکت کی سیر کرتے ہوئے کسی گاؤں میں ایک دہقانی کے ہاں رات بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ دہقانی کو علم نہ تھا کہ یہ بادشاہ ہے۔ اس نے عام مہمان سمجھ کر بڑی خدمت کی۔ اور رات کو جب دہقانی اپنی گائے کا دودھ دوہنے لگا۔ تو بادشاہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ اس ایک گائے نے تین گائے کے دودھ کے برابر دودھ دیا ہے۔ بادشاہ نے اسی وقت دل میں ارادہ کر لیا۔ کہ واپس جاتے ہی شاہی حکم سے اس گائے کو اپنے قبضے میں کر لوں گا۔ دوسرا دن بھی بادشاہ وہیں رہا۔ اور دوسرے دن اس گائے کا دودھ دوہا گیا۔ تو بادشاہ نے دیکھا۔ کہ دودھ آدھا رہ گیا ہے۔ بادشاہ نے دہقانی سے پوچھا۔ کہ آج گائے نے دودھ کم کیوں دیا؟ تو دہقانی کہنے لگا۔ میرے خیال میں آج ہمارے بادشاہ کی نیت میں کوئی فتور آگیا ہے اور اس نے اپنی رعایا کے کسی فرد پر ظلم کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ پس یہ اس کی بدنیتی کی نحوست ہے۔ جو سارے ملک پر اثر انداز ہو گئی ہے اور میری گائے کے دودھ سے بھی برکت اڑ گئی ہے۔ بادشاہ یہ سن کر دل ہی دل میں بڑا شرمندہ ہوا۔ اور اسی وقت اپنا ارادہ بدل ڈالا اور سچے دل سے عہد کر لیا۔ کہ میں ہرگز ایسا ظلم نہ کروں گا۔ تیسرا دن بھی

کیونکہ ایسا مژدہ سنانے کے لیے کوئی بنیاد موجود نہ تھی. مگر چونکہ آپ کو وحی کے ذریعہ اس فتح کا وعدہ دلایا گیا تھا. اس لئے آپ نے اسے پوری یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش فرما دیا۔ اور مسلمانوں نے بھی اسے وحی کا وعدہ سمجھ کر قبول کیا اور مان لیا۔

اس کے علاوہ اس بیان میں آنحضور کیساتھ مسلمانوں کے کچھ جھگڑے کا ذکر ہے. پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اگر آنحضور کا حکم وحی ہوتا تو اس کے صادر ہونے پر ایسے جھگڑے کی بلکہ ایسے سوال کی نوبت بھی پیش نہ آتی. کہ یہ وحی ہے یا نہیں ہم پوچھتے ہیں کہ اگر آپ کے بقول آنحضور نے سب کچھ قرآن ہی سے کہا اور کیا تو پھر آپ سے ایک قرآن کا حکم بتانے پر اختلاف کیوں کیا گیا. بلکہ سرے سے قرآن کے ہوتے ہوئے آپ کو اپنے طور پر کچھ بتانا کیوں پڑا. اس کے ساتھ ہی یہاں جھگڑے اور مجادلے کے الفاظ صرف اختلافِ رائے اور دریافتِ حقیقت کے طور پر وارد ہوئے ہیں. بالکل اسی طرح جیسے قرآن میں ہے. کہ حضرت لوط کی قوم پر عذاب نازل ہونے کی پیشگوئی سنکر حضرت ابراہیم نے خدا سے جھگڑا اور مجادلہ شروع کر دیا کہ یہ عذاب کیوں بھیجا جا رہا ہے.

یہاں پرویز صاحب کی دیانتداری کا یہ حال ہے کہ اپنی تمام کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف جہاں ہر غلط سے غلط اور جھوٹی سے جھوٹی روایت کا استفادہ کر دینے سے بھی آپ نے دریغ نہیں کیا. وہاں واقعات بدر میں وہ مشہور اور صحیح حدیث نہ لا سکے. جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو میدانِ بدر کے وہ مقامات ایک ایک کر کے دکھائے

ملے اگر آپ کا ہر لفظ وحی تھا تو اس قسم کے استفسارات کی ضرورت ہی نہ پڑتی. ص ۷۸۹

بادشاہ وہیں رہا۔ اور دیکھا کہ تیسرے دن گائے نے پھر پورا دودھ دیا ہے۔ کم نہیں ہوا۔ دہقانی آیا اور کہنے لگا۔ الحمدُ للہ! ہمارے بادشاہ کی نیت درست ہوگئی ہے۔ (حیوٰۃ الحیوان صفحہ ۱۳۵ ج ۱)

میرے بھائیو! اس حکایت سے اندازہ لگالو۔ کہ آج دنیا بھر میں جو نحوست ہی نحوست نظر آرہی ہے۔ اور کسی چیز میں برکت نہیں رہی۔ اسکی وجہ دراصل یہی ظلم وستم کا عام ہونا ہے۔ آج اس ظلم و ستم نے ہر شخص کو بدحال و پریشان کر رکھا ہے۔ اور یہ جس قدر بھی مصیبتیں اور تنگیاں ہمارے سامنے آرہی ہیں۔ یہ ہمارے اپنے ہی اعمال و افعال اور بری نیتوں کا پھل ہیں ؎

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ مرا احوال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک حکایت

مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے مثنوی شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ ایک جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک کافر پر قابو پا لیا۔ اور اسے گرا کر اس پر تلوار چلانے لگے۔ کہ اس کافر نے حضرت کے منہ پر تھوک دیا۔ حضرت علی نے فوراً تلوار میان میں کر لی۔ اور پیچھے ہٹ گئے۔ کافر بڑا حیران ہوا۔ کہ علی نے مجھ پر پورا قابو پا لیا تھا۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ کیوں دیا۔ چنانچہ حضرت علی سے اس نے اس کی وجہ دریافت کی۔ تو فرمایا ؎

گفت من تیغ از پئے حق مے زنم ❊ بندۂ حقم نہ مامورِ تنم
شیرِ حقم نیستم شیرِ ہوا ❊ فعل من بر دین من باشد گواہ

یعنے میں حق کا شیر ہوں۔ خواہش کا غلام نہیں ہوں۔ تلوار میں نے محض رضائے حق کے لئے پکڑی ہے۔ میں حکم خدا کا بندہ ہوں۔ اپنے نفس کا بدلہ لینے کے لئے مامور نہیں ہوں۔ میں خدا کے لئے تجھ سے لڑ رہا تھا۔ اور اسی کے لئے تجھے مارنے والا تھا۔ کہ تو نے مجھ پر تھوک دیا۔ تو مجھے اس پر غصہ آگیا۔ اور میں نے دیکھا۔ کہ اب اس خالص لوجہ اللہ جنگ میں اپنے

جہاں جہاں سردارانِ مکہ کو قتل ہو کر گرنا تھا۔ اور مقام جس کا بتایا اس سے وہ انچ بھر بھی کہیں اِدھر اُدھر کو نہ گرا۔ گر ایسی سرداور گرا بھی دیں۔ جہاں آپ نے فرمایا تھا۔ کیا کرتے۔ آخر وحی کا انکار کر کے ہی جوشانِ رسول کو محض چکنی چپڑی باتوں سے بڑھانا مقصود تھا۔ ان خاشک ہو الایتہ۔

" اذ تقول للمومنین الن یکفیکم ۔ ان یمدکم ربکم بثلاثۃ الاف من الملائکۃ منزلین

جب تم میدانِ جنگ میں ایمانداروں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لئے

یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار نازل ہونے والے فرشتوں سے تمہاری

مدد فرمائے" ۵۲۰

اس آیت میں آنحضور کی اس بشارت اور فرشتوں کی حمایت کی پیشین گوئی کا بیان ہے جو آپ نے میدانِ بدر میں مسلمانوں سے فرمائی تھی۔ اور واقعات کے گذر جانے کے کہیں بعد قرآن میں اس کا تذکرہ آیا بعینہٖ کی آیت میں ہے کہ یہ فرشتوں کی مدد کا وعدہ اللہ کی طرف سے تھا۔ اور جب تھا تو وحی کا حکم ہی تھا نہ کہ کچھ اور پھر یہ تذکرہ لایا۔ ان لوگوں کے سامنے گیا جو پہلے ہی سے اس کے عمل وقوع سے واقف تھے۔ کیا اس لئے کہ انہیں ایک معلوم واقعہ یاد کرایا جائے یا اس لئے کہ وہ رسول کی بات اور پیشین گوئی کو وحی کے طور پر مانا کریں۔ پہلی بات تو لاحاصل محض تھی اس لئے دوسری ہی ماننے کے قابل ہے۔

" اذ یریکھم اللہ فی منامک قلیلاً۔ ولو اراکھم کثیراً لفشلتم ولتنازعتم فی الامر ولکن اللہ سلّم۔

اے پیغمبر یہ وہ دن تھا کہ اللہ نے تجھے خواب میں انکی تعداد تھوڑی کر کے

نفس کا غصہ بھی شامل ہو گیا ہے۔ اور خلوص جاتا رہا ہے۔ تو میں اس ڈر سے پیچھے ہٹ گیا۔ کہ میرا یہ کام اخلاص سے خالی شمار نہ ہو۔ کافر نے یہ ایمان افروز ارشاد سنا۔ تو قدموں میں گر کر مسلمان ہو گیا۔

سبحان اللہ! کیا لوگ تھے کہ جن کا ہر عمل محض لوجہ اللہ ہوتا تھا اور ریا کاری یا خواہش نفس کا نام تک نہ ہوتا تھا۔

مسلمانو! ہمیں بھی لازم ہے کہ ہم بھی ہر عمل محض خدا کیلئے کریں اور ریا کاری کو کبھی نزدیک تک نہ آنے دیں۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ حضرات! اس سورت کے آخر میں اللہ نے فرمایا ہے۔ کہ یہ آپ کو "ابتر" کہنے والے دشمن خود ہی "ابتر" ہیں۔ ان بے ایمانوں کا اپنا ہی نام و نشان مٹ جائے گا۔ اور آپ کا نام پاک ہمیشہ کے لئے قائم و دائم رہے گا۔ چنانچہ دشمنانِ رسول کا دیکھ لیجئے۔ نام و نشان مٹ چکا ہے۔ اور سرکار کا ذکر و نام دن بدن ترقی و عروج پر ہے۔ اور قیامت تک اسی طرح دن بدن بڑھتا ہی رہے گا۔

دشمنانِ رسول تھے۔ اور مٹ گئے ہیں۔ اور مٹ رہے ہیں۔ ہونگے اور مٹ جائیں گے۔ اور ــ ذکر رسول تھا اور رہا۔ ہے اور باقی ہے، ہوگا اور رہے گا۔ مٹانے والے خود مٹ گئے۔ مٹ رہے ہیں اور مٹ جائیں گے۔ مگر ذکر مصطفیٰ نہ مٹا ہے نہ مٹے گا۔ اور نہ مٹ سکتا ہے۔ سہ

مٹ گئے مٹتے ہیں مٹ جائیں گے اعداء تیرے
نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا!!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دکھائی۔ اور اگر انہیں بہت کر کے دکھاتا۔ تو اے مسلمانو تم ضرور ہمت ہار دیتے۔ اور جھگڑا کرنے لگتے۔ اللہ نے تمہیں اس صورت حال سے بچا لیا۔" ص ۵۲۳

اس آیت میں واضح ہے کہ آنحضور کی نیند اور حالت خواب بھی آپکی حالت وحی کے برابر ہوتی تھی۔ اور جب ہوتی تھی تو بہت زیادہ ضروری اور لازم ٹھہرتا ہے کہ آپ کی حالت شعور و بیداری کو بھی حالت وحی سمجھا جائے۔ اس کی تائید تین طرح سے ہوتی ہے ایک اس طرح کہ اس میں بیان ہے کہ خود اللہ نے آپ کو اس کیفیت کی یہ خواب دکھائی تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی اور رسول کی خواب اللہ کی طرف سے واقع ہوتی ہے۔ ادھر پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کو جو بیٹے کی قربانی کی خواب آئی وہ نہ اللہ کی طرف سے تھی اور نہ وحی تھی اور انہوں نے غلطی[۱] سے اسے لازم اور پیروی کے قابل سمجھ لیا۔ اور پھر مزید غلطی یہ کی کہ اس کا مفہوم بھی غلط سمجھا۔ اور جو کچھ خواب میں دیکھا تھا اسے نظارہ اور نمود کی بجائے حکم سمجھ بیٹھے۔ یہ تو تھا انکی فراست کا حال۔ آگے اللہ نے بھی انہیں خواب کو

---

[۱] اس قربانی کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اپنی محبت اور شیفتگی کے جوش میں خواب کو حقیقت سمجھکر بیٹے کی جسمانی قربانی کے لئے آمادہ ہو گئے۔ مشیت ایزدی نے بھی آخری منزل تک انہیں اسی راہ میں چلنے دیا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ جسے نوع انسانی کی امامت کے لئے منتخب کیا جا رہا تھا۔ وہ کن خصوصیات کا پیکر تھا۔ بجوئے نور۔ ص ۱۵۵

چھٹا وعظ

نورِ مجسّم صلّی اللہ علیہ وسلم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ہ

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ہ (پ ۶ ع ۷)

"بے شک اللہ کی طرف سے ایک نور آیا۔ اور روشن کتاب۔"

حضرات! آج میں حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے نور ہونے کا بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اور بتانا چاہتا ہوں۔ کہ وہ اللہ جو خود نور ہے۔ اس نے اس ظلمت کدۂ عالم میں اپنے محبوب کو بھی نور ہی بنا کر بھیجا ہے چنانچہ یہ جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو "نور" فرمایا ہے۔ اور جملہ مفسرین کرام علیہم الرحمۃ نے یہاں "نور" سے مراد حضور ہی کی ذات لکھی ہے۔ چنانچہ علامہ اسمٰعیل حقی علیہ الرحمۃ روح البیان میں لکھتے ہیں:-

وَقِیْلَ الْمُرَادُ بِالْاَوَّلِ ھُوَ الرَّسُوْلُ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ

غلط سمجھ کر اس کی پیروی میں بیٹے کو سچ مچ ذبح کرنے کے خیال سے باز رکھا۔ بلکہ اس نے بھی اس لئے انہیں اس سے منع نہ فرمایا۔ کہ چلئے! خواب تو میں نے دکھایا تھا مگر پھر بھی اس کی پیروی سے ابراہیم کی اطاعت اور وفاداری کا اندازہ تو دنیا کو ہو سکیگا۔ یہ اس نے بھی نہ سوچا کہ دنیا جہاں ان کی اس فدائیت پر ریجھیگی وہاں ان کی عقلمندی کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی۔ بہر حال خدا ان کا کام دیکھتا رہا۔ اور جب وہ حضرت اسماعیل کی گردن پر چھری پھیرنے لگے تو اسوقت خدا سے بھی نہ رہا گیا۔ اور اس نے کسی اور قربانی کو چھری کے نیچے دیتے ہوئے حضرت اسماعیل کو ایک طرف سرکا لیا تاکہ اس کارروائی سے اگر کوئی دین کا حکم اور سنت دائمی ثابت نہ بھی ہو تو کم از کم چھری کا وار تو خالی نہ جائے۔ اس کے بعد پھر خدا نے روشن عنوانات کے ساتھ اسی خواب کو قرآن میں بیان فرما دیا۔ جو حضرت ابراہیم نے غلط دیکھا اور غلط سمجھا اور خدا نے مفت کو اس کی تعمیل ہونے دی۔ اس سے تو گویا غلطی کا ریکارڈ قائم ہو گیا۔

اس آیت میں جو ہے کہ اللہ نے آنحضورؐ کو خاص طور پر خاص مقاصد کیلئے یہ خواب دکھایا۔ تو اس سے پرویز صاحب کے وہ سب اوہام باطل ہوتے ہیں جنہیں آپ نے نبی کے خیال اور اس کے خواب وغیرہ کے متعلق قائم کر رکھا ہے اس میں واضح ہے کہ نبی اور رسول کا خواب وحی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

دوسرے اس طرح اس خواب کو وحی ثابت کیا گیا کہ اس میں مسلمانوں کے متعلق واضح ہے کہ انہوں نے بھی اس خواب کو وحی کے درجہ میں سمجھا۔ اس پر

بِالثَّانِیْ الْقُرْاٰن - (روح البیان صفحہ ۵۴۸ ج ۱) یعنی کہا گیا ہے، کہ اول یعنی نور سے مراد حضور صلے اللہ علیہ و سلم ہیں۔ اور کتاب مبین سے مراد قرآن ہے"

علامہ اسمٰعیل حقی علیہ الرحمۃ نے پھر آگے چل کر لکھا ہے، کہ :-
سَمَّی الرَّسُوْلَ نُوْرًا لِاَنَّ اَوَّلَ شَیْئٍ اَظْھَرَہُ الْحَقُّ بِنُوْرِ قُدْرَتِہٖ مِنْ ظُلْمَۃِ الْعَدَمِ کَانَ نُوْرُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَمَا قَالَ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ --- یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نور رکھا۔ اس لئے کہ اللہ نے اپنے نورِ قدرت سے جو چیز سب سے پہلے پیدا فرمائی۔ وہ حضور ہی کا نور ہے۔ جیسے کہ حضور نے خود فرمایا۔ کہ سب سے پہلے اللہ نے میرے نور کو پیدا فرمایا - (روح البیان صفحہ ۵۴۸ ج ۱)

معلوم ہوا کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے نور بنایا ہے، اور نور فرمایا ہے۔ اور ہمارے پاس جو نور آیا ہے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

تاریکی و ظلمت

میرے بھائیو! تاریکی و ظلمت ایک ایسی چیز ہے۔ جس سے انسان طبعًا خائف رہتا ہے۔ چنانچہ کسی شخص کو اگر کوئی رات تاریکی میں بسر کرنی پڑے۔ تو جو حال اس کا ہوتا ہے۔ سب جانتے ہیں۔ اسی واسطے انسان نے اس تاریکی و ظلمت کے ازالہ کیلئے مختلف قسم کی بتیاں تیار کرلی ہیں۔ یہ چراغ۔ لالٹین۔ ہنڈیاں۔ گیس اور بجلی کے ہنڈے سب اسی تاریکی و ظلمت کے ازالہ کے لئے ہیں۔ تو اسی طرح یاد رکھیئے۔ کہ ایک روحانی تاریکی و ظلمت بھی ہے۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و سلم کے تشریف لانے سے قبل نہ صرف عرب بلکہ ساری دنیا میں اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی اس حالت پر رحم فرمایا۔ اور اس تاریکی و ظلمت کے ازالہ کے لئے ذاتِ با برکات حضور منبع النور سید الانبیاء جناب احمد مجتبٰے محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں مبعوث فرمایا۔ حضور کی تشریف آوری سے اس جہانِ تیرہ

یقین کیا۔ اور اس یقین کے ذریعہ انتشار فکر سے بچ گئے۔ اب اگر یہ خواب آسمانی وحی کی بجائے کسی مجذوب اللہ والے کے دماغ کی لہر ہوتی تو اسے ذریعہ اطمینان بنانے والے صحابہ رسول کو ایسا کرنے اور سمجھنے سے باز رکھا جاتا کیونکہ یہ محض اوہام پرستی تھی۔ آخر خوابوں کے متوالوں کا جذبہ جوانمردی کب اس قابل ہو پاری کہ اس کی قدر کی جاتی۔ اور اسے پروان چڑھایا جاتا۔ ان کے اجتماعی نظم کا جڑنا اور بکھرنا جب کسی خواب پر آکر موقوف ہو تو یہ محال ہوتا ہے کہ ہر موقعہ پر ان کے سامنے کوئی ان کے مذاق کے مطابق نیا خواب گھڑ کر لائے جو انکی طمانیت قلب کا موجب بنے۔ اور ان کا بکھرنے والا شیرازہ قائم رہ سکے۔

قرآن کا منصب جب یہ ٹھیرا کہ وہ اوہام اور غلط رواج کو مٹائے تو یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ صحابہ کو خوابوں کی دنیا سے نکال کر وحی کی روشنی دینے کی بجائے انہیں اس نے پھر اسی دلدل میں ڈالدیا۔ اس لئے یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ صحابہ نے جو رسول کے خواب کو وحی اور ذریعہ اطمینان پایا تو قرآن نے اس پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی۔

تیسرے اس طرح کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے اس خوابی نظارہ کو وحی کے درجہ میں سمجھا۔ اور اسی حیثیت سے اسے اپنے صحابہ کے سامنے کسی شک اور تردد کے بغیر پیش فرمایا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اپنے خواب کا مرتبہ سمجھنا سب سے پہلے اور اولین منصب رسول کا اپنا تھا وہ اگر اپنے خواب کو وحی کے مرتبہ میں سمجھے تو کسی دوسرے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ خود ہی اپنی طرف سے فیصلہ صادر کر دے کہ رسول اپنے خواب

وتاریک میں چاروں طرف نور ہی نور پھیل گیا۔ اور دنیا نے تاریکی وظلمت سے نجات حاصل کرلی سے

جہاں تاریک تھا ظلمت کدہ تھا سخت کالا تھا!
کوئی پردے سے کیا نکلا کہ گھر گھر میں اجالا تھا!

نور دافع البلا ہوتا ہے

میرے بزرگو! یہ تاریکی وظلمت کئی ایک بلاؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ اور اندھیرے میں انسان کے لئے کئی قسم کے خطرات ہوتے ہیں۔ انسان اگر اندھیرے میں چل رہا ہو۔ تو اُسے کیا خبر کہ راستے میں کوئی سانپ بیٹھا ہے یا کوئی دوسرا موذی جانور راستے میں ہے۔ اور اگر راستے میں کوئی گڑھا ہو۔ اس سے بچنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ الغرض ہزارہا قسم کی مشکلات اور بلاؤں سے بچنے کے لئے مختلف بتیاں تیار کی ہیں۔ دیکھ لیجئے! اندھیرے میں جب لالٹین یا بیٹری روشن ہوجائے۔ تو اندھیرا کافور ہوجاتا ہے۔ اور اندھیرے میں جو جو خطرات اور بلائیں ہوں۔ لالٹین یا بیٹری کا نور اُن سے بچا لیتا ہے۔ گویا ہماری اپنی تیار کردہ لالٹین اور بیٹری کا یہ نور بھی خطرات اور بلاؤں کا دور کرنے والا ہوتا ہے۔ تو میرے دوستو! اب آپ خود ہی فیصلہ کرلیں۔ کہ جو اللہ کا نور ہوگا۔ وہ کیوں نہ دافع البلاء ہوگا۔ درود شریف پڑھیئے۔ سے

دافع ہمّ وکاشفِ ہر غم — صلے اللہ علیہ وسلم
باعث عفو ورحمتِ آدم — صلے اللہ علیہ وسلم
عظمتِ کعبہ ماہ مدینہ! — رونق عرش و طور سینا
نور وضیائے ہژدہ عالم — صلے اللہ علیہ وسلم
آنکھ کا تارا، درد کا چارا — سب کا سہارا سب کا ہے پیارا
آقا ہمارا مونس وہمدم — صلے اللہ علیہ وسلم

یارانِ ظلمت

میرے دوستو! یہ بات بھی سب جانتے ہیں۔ کہ چور ہمیشہ تاریکی پسند اور ظلمت کا طرف دار ہوتا ہے۔ اس کی منشا یہی ہوتی ہے۔ کہ شمع گل ہو۔ اور میرا کام چلے۔ مگر جو سادھ ہے۔ وہ روشنی پسند

کو غلط سمجھا۔ چنانچہ پرویز صاحب کا یہی حد سے تجاوز ہے کہ آپ خود ہی حضرت ابراہیم کے اس خواب کو ان کی غلط فہمی کا مظہر بتاتے ہیں۔ جو انہیں بیٹے کی قربانی کے متعلق آیا تھا۔ حالانکہ قرآن میں ایسا کہیں بھی موجود نہیں۔ کہ انہیں اس بارہ میں دھوکہ لگ گیا تھا اور حقیقت میں ان کا خواب وحی نہ تھا جسے وہ وحی سمجھے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خواب بھی اگر وحی نہ ہوتا تو قرآن میں یہ بتایا جانا ضروری تھا کہ ایسے وحی ماننے کی غلطی نہ کی جائے۔ اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ یہ خواب رسول کو اللہ نے دکھائی تھی۔

"ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونہم باذنہ"

یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے اپنا وعدہ نصرت پورا کر دکھایا تھا جبکہ تم اس کے حکم سے دشمنوں کو تہ تیغ کر رہے تھے۔" ص ۱۳۵

اس آیت میں اللہ کے جس وعدہ کی صداقت کا تذکرہ ہے وہ قرآن میں کہیں اور موجود نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وعدہ خدا کی طرف جس وحی کے ذریعہ دلایا گیا۔ وہ غیر قرآنی وحی تھی۔ اور نہ صرف وحی تھی۔ بلکہ اس قدر لازم تھی کہ اسی کی اس آیت میں اللہ نے خود تصدیق فرمائی اور اسکی تصدیق کا حکم بھی فرمایا۔ اور یہ کہ اسکی صداقت میں کسی کو تردد نہیں ہونا چاہیئے۔

"ثم انزل علیکم من بعد الغم امنۃ نعاسا یغشیٰ طائفۃ منکم وطائفۃ قد اہمتہم انفسہم یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاہلیۃ یقولون ہل لنا من الامر من شیء قل ان الامر کلہ للہ"

اور نور کا طرفدار ہوتا ہے۔ تو بھائیو! اب خود ہی سمجھ لو۔ کہ جو لوگ ہمارے حضور کو نور نہیں تسلیم کرتے۔ اس کی وجہ ہی یہ ہے۔ کہ وہ لوگ ظلمت پسند اور یارانِ ظلمت میں سے ہیں۔ اور ان کی خواہش ہی یہ ہے۔ کہ شمعِ حق بجھے — اور ہمارا کام چلے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ جب کہ خدا نے خود فرما دیا۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَ اللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَ لَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ — (پ۲۸ ع ۹) — اور چاہتے ہیں۔ کہ اللہ کا نور مونہوں سے بجھا دیں۔ اور اللہ کو اپنا نور پورا کرنا ہے۔ اگرچہ کافر برا منائیں۔"

تو بھائیو! جب نور کا روشن کرنے والا اور اس کا حافظ خود خدا ہو اسے کون بجھا سکتا ہے۔ ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ایک پنجابی شاعر لکھتا ہے ؎

پھوکاں مار بجھایا لوڑن نورِ محمّد والا
نور محمد کدے نہ بجھسی وعدہ حق تعالےٰ

ہر شے سے پہلے نورِ محمّد صلے اللہ علیہ وسلم

مسلمانو! آیت کریمہ میں خدا نے جس نور کا ذکر فرمایا ہے یہ وہ نورِ پاک ہے۔ جسے اللہ نے ہر شے سے پہلے پیدا فرمایا ہے۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا۔ یارسول اللہ یہ تو فرمائیے! کہ اللہ نے ہر شے سے پہلے کیا پیدا فرمایا۔ تو حضور نے فرمایا۔

یَا جَابِرُ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ قَبْلَ کُلِّ الْاَشْیَاءِ نُوْرَ نَبِیِّکَ مِنْ نُوْرِہٖ — وَ لَمْ یَکُنْ فِیْ ذٰلِکَ الْوَقْتِ لَوْحٌ وَ لَا قَلَمٌ وَ لَا جَنَّۃٌ وَ لَا نَارٌ وَ لَا مَلَکٌ وَ لَا سَمَاءٌ وَ لَا اَرْضٌ وَ لَا شَمْسٌ وَ لَا قَمَرٌ وَ لَا جِنٌّ وَ لَا اِنْسٌ — (رحمۃ اللہ علی العلمین صفحہ ۲۸)

اے جابر اللہ تعالیٰ نے ہر شے سے پہلے تمہارے نبی کے نور کو

پھر اللہ نے تم پر بے خوفی کی غنودگی طاری کر دی۔ یہ حالت
ایک گروہ پر چھا گئی لیکن تم میں سے ایک دوسرا گروہ تھا جسے
اس وقت بھی اپنی جانوں کی پڑی تھی۔ اور اللہ کی جناب میں عہد
جاہلیت کے ظنون و اوہام رکھتا تھا۔ اس گروہ کے لوگ کہتے
تھے کہ جو کچھ ہوا اس میں ہمیں کچھ دخل نہ تھا۔ ان سے کہو
ساری باتیں اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔" ص ۵۳۳۔

اس آیت میں واضح ہے کہ جنگ احد کی کارروائی میں جو لوگ مطمئن
نہ تھے ان کا اعتراض یہ تھا کہ جنگ کی ابتدائی سکیم ان کی رائے کے بغیر
انجام پائی۔ اور خدا نے ان کے اعتراض کا جواب یہ فرمایا کہ جنگی سکیم ہو
یا کچھ اور۔ اسلام میں تو سب کام اللہ کی رضا کے لئے اور اسی کے اختیار
کے تحت انجام پاتے ہیں۔ اور خدا کے فیصلہ سے نکل کر یہاں کوئی کام
بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ آیت کی اس وضاحت سے
جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنگ احد کی لشکر کشی اور اس کے ہر منصوبے
کا آغاز وحی کے تحت ہوا تھا۔ وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم صرف خدا کے فیصلہ اور حکم کے پابند تھے نہ کہ لوگوں
کے مشورہ کے۔ اور قرآن میں جہاں آپکو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا
گیا ہے وہاں ان کے مشورہ کا پابند نہیں بنایا گیا۔ ورنہ جنگ احد کی لشکر
کشی پر مخالفین کے اعتراض کا جواب یہ ہوتا کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم میں سے ایک
ایک آدمی کے مشورہ کا اس اقدام جنگ میں دخل ہے۔ اور رسول سب کیلئے

اپنے نور سے پیدا فرمایا۔ اور اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم، نہ جنت، نہ دوزخ، نہ آسمان، نہ کوئی فرشتہ، نہ زمین، نہ سورج نہ چاند تھا۔ اور نہ کوئی جن تھا۔ نہ انسان "

اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا نورِ پاک ہر شے سے پہلے پیدا کیا گیا ہے۔ اور حضور سے پہلے کسی کو پیدا نہیں کیا گیا۔

اللہ کے نور سے

حضرات! حدیث میں جو "من نورہٖ" کا جملہ ہے۔ یعنی حضور کا نور "اللہ کے نور سے" پیدا کیا گیا ہے تو اس پر منکرینِ نور یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اس طرح تو پھر اللہ کا نور کم ہو گیا کیونکہ اس میں سے کچھ حصے کا محمدی نور بنا دیا گیا۔ منکرینِ نور کا یہ جاہلانہ اعتراض ان کی عداوتِ نور کا پردہ فاش کرنے والا ہے۔ ان جاہلوں نے اہل سنت پر یہ محض بہتان باندھ رکھا ہے۔ کہ ہم اہل سنت یہ کہتے ہیں۔ کہ اللہ کا نور معاذ اللہ کوئی قابلِ تقسیم چیز ہے۔ جس سے کچھ حصہ الگ کر کے اس کا نور محمد بنا دیا گیا ہے۔ توبہ! توبہ!! ایسا تو کوئی بھی نہیں کہتا۔ ہمارا تو یہ ایمان ہے۔ کہ خدا کا نور ازلی و ابدی ہے۔ اور یہ تقسیم و تجزی ہرگز ہرگز اس کے لائق نہیں۔ اور حضور کے نور کا اس کے نور سے ہونے کا مطلب یہ ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا نورِ پاک اللہ کے نور کا پرتو اور اسی کی روشنی ہے۔ دیکھئے ایک مثال عرض کروں۔

گیس کی مثال

ایک روشن گیس ہے۔ اور ایک اس کی روشنی ہے۔ اب فرمایئے۔ کہ اس روشنی کو سب یہی کہتے ہیں یا نہیں؟ کہ یہ روشنی اس "گیس سے" ہے تو گویا اس کا معنے یہ ہوتا ہے۔ کہ گیس کے ٹکڑے کر کے اس میں سے ایک ٹکڑا لے لیا گیا ہے۔ اور اُسے پیس کر سارے کمرے میں پھیلا دیا گیا ہے۔ اور یہ ساری روشنی اسی ٹکڑے کی ہے ــــ بھلا یوں یہ معنی کوئی بھی نہیں لیتا۔ حالانکہ کہتے سب یہی ہیں کہ یہ روشنی اس "گیس سے" ہے۔ تو حضور کا نور "اللہ کے نور سے" ہے۔ اس کا معنی بھی

جائز نہیں کہ وہ بلا مشورہ کوئی کام کرے۔

پرویز صاحب کو یہاں دو طرح کا اختلاف ہے ایک یہ کہ جن امور کی وضاحت قرآن میں ہے۔ ان کے علاوہ آنحضور کسی کام اور کسی بات میں بھی وحی کے پابند نہ تھے۔ اور نہ کوئی اور ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ عام لوگوں اور حکمرانوں کی طرح مشورہ کے محتاج تھے اور جب تھے تو ہم پوچھتے ہیں کہ آنحضور نے قرآنی احکام کے جن جزئیات کو لوگوں کے مشورہ سے[1] ترتیب دیا ان کی فہرست کا طول و عرض کیا ہے۔ اگر وہ یہی کہیں[2] کہ آنحضور نے ایک لونڈی کو مشورہ دیا جو اس نے نہ مانا اور مجھوروں

---

[1] جو اصول قرآن میں دیئے گئے ہیں۔ انکی عملی جزئیات متعین کرنے کیلئے رسول اللہ صلعم صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ جزئیات ربانی نہ تھیں۔ مزاج شناس رسول ص ۲۲۷

[2] کتب حدیث کا یہ واقعہ اس قدر صحیح ہے کہ اسے پرویز صاحب بھی صحیح مانتے ہیں اور آپ نے اپنی کتابوں کے کئی بابوں میں اسے درج کیا ہے۔ اصل میں اس لونڈی کو حضرت عائشہ نے خرید کر آزاد فرمایا تھا اور اسے اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے نکاح میں بھی آزاد ہے آنحضور نے اسے پہلے ہی نکاح پر رہنے کا مشورہ فرمایا جو اس نے نہ مانا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی جسکے پرویز صاحب قائل نہیں۔ اور جب نہیں تو ہم پوچھتے ہیں کہ قرآن میں ان کے خرید و فروخت کی ممانعت کیوں نہ آئی اور قرآن میں یہ کہاں ہے کہ ایک آزاد شدہ عورت کا نکاح بھی باقی نہیں رہتا یا کلام رواست میں یہ کہاں ہے کہ آنحضور نے مشورہ کیسا ایسے نکاح کی تنسیخ فرمائی تھی۔

یہی ہے۔ کہ حضور کا نور اللہ کے نور کی تجلی و روشنی ہے۔ اور اسی نور کا عکس و پرتو ہے۔

نہ خدا ہیں نہ جدا ہیں

یہاں ایک اور بات بھی حل ہو گئی۔ اور وہ یہ کہ ہمارا ایمان ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدا ہیں اور نہ خدا سے جدا ہیں۔ جو خدا کہے وہ مشرک۔ اور جو جدا کہے وہ بے ایمان۔ آپ کہیں گے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ نہ خدا ہیں اور نہ خدا سے جدا ہیں میں کہتا ہوں۔ کہ یہی گیس اور اس کی روشنی والی مثال لے لو۔ دیکھ لو یہ اسکی روشنی نہ خود گیس ہے۔ اور نہ ہی گیس سے جدا ہے۔ اگر اس روشنی کو کہا جائے۔ کہ یہی گیس ہے تو چاہیئے یہ کہ ہم اس روشنی پر پتھر ماریں۔ تو گیس ٹوٹ جائے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہ روشنی عین گیس نہیں اور کیا پھر گیس سے جدا ہے؟ یہ بات بھی نہیں۔ کیونکہ اگر یہ روشنی گیس سے جدا مانی جائے تو ہونا یہ چاہیئے۔ کہ گیس کو اندر لے جایا جائے۔ تو روشنی باہر ہی رہے۔ یا گیس کو باہر لایا جائے۔ تو روشنی اندر ہی رہے۔ حالانکہ یہ بات بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ جہاں گیس ہو وہیں روشنی بھی ہوتی ہے۔ جہاں گیس۔ وہاں روشنی اور جہاں روشنی وہاں گیس۔ تو اسی طرح یاد رکھیئے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نہ تو عین خدا ہیں اور نہ ہی اس سے جدا ہیں۔ بلکہ جہاں خدا وہاں مصطفٰے اور جہاں مصطفٰے وہاں خدا۔ ؎

تم ذات خدا سے نہ جدا ہو نہ خدا ہو
اللہ ہی کو معلوم ہے کیا جانئے کیا ہو

خدا کی پہچان حضور کے وسیلہ سے

میرے بھائیو! یہیں سے ایک اور بات بھی معلوم ہو گئی۔ اور وہ یہ کہ روشنی کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ یہاں گیس موجود ہے۔ دیکھئے یہ دھوپ سورج کی روشنی ہے۔ ہم دھوپ کو دیکھ کر جان جاتے ہیں۔ کہ سورج کا طلوع ہو چکا ہے۔ اگر دھوپ نہیں ہے تو سورج کا طلوع بھی نہیں ہے۔ بلا تشبیہہ اسی طرح حضور کو دیکھ کر ہی خدا کی پہچان حاصل ہوتی ہے۔ اگر حضور ہیں

والوں کو آپ نے ایک باغبانی کا گر نہ بتایا جوان کے راس نہ آیا۔ اور اذان جاری کرنے کے لئے میں کچھ لوگوں کے خیالات معلوم کئے۔ تو کیا یہ اس کا ثبوت ہے کہ نماز روزہ زکوٰۃ حج۔ نکاح طلاق اور حلال و حرام کے جملہ احکام کی شکلیں سب انسانی دماغ کی ایجاد ہیں اور ان کے اندر وحی کا کچھ بھی حصہ نہیں۔ پر وہ انسان انہیں بنانے اور بنا کر بگاڑ دینے کے کلی اختیارات رکھتا ہے جس کے سر قرآنی نظام حکومت کا تاج ہو۔ پر اگر صحیح ہو سکتا ہے تو پھر یہ کہنے میں کیا جرم ہے کہ خدا تعالیٰ بھی مشوروں کا پابند ہے۔ اور اس نے اسی لئے حضرت موسیٰ کی سفارش کو قبول کر کے حضرت ہارون کو ان کے ہمراہ نبی بنا کر بھیجدیا۔ اور خود اس نے قرآن کے متواتر مقامات پر جملہ امور میں بندوں کو دعا مانگنے کا حکم اور قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دعاؤں پر عمل بھی ہوتا ہے اور ایک انسان کی دعا خدا کے پورے نظام کارکردگی کو بدل کر رکھدینے کا باعث ہو سکے رہتی ہے

ولما رای المومنون الاحزاب قالوا ھذا ما وعدنا اللہ ورسولہ وصدق اللہ ورسولہ وما زادھم الا ایمانا وتسلیما۔

اور جب جماعت مومنین نے لشکروں کی طرف دیکھا تو کہنے لگے یہ وہی وقت د توقعہ ہے جسکی خبر ہم کو اللہ اور رسول نے دی تھی۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا۔ اور اس سے یہی ہوا کہ ان کے ایمان و اطاعت میں اور ترقی ہو گئی"۔ ص۵۴۷

اس آیت میں جس وعدہ کو یاد دلایا گیا ہے وہ بھی قرآن میں اس سے پہلے

تو خدا کی بھی پہچان ہے۔ اور اگر حضور نہ ہوتے تو خدا کی پہچان بھی حاصل نہ ہوتی

اے رضاؔ فیض ہے احمد پاک کا
ورنہ تم کیا سمجھتے، خدا کون ہے

حضرات! میرے خیال میں اب آپ سمجھ گئے ہونگے۔ کہ حضور کے نور کا "اللہ کے نور سے" ہونے کا کیا مطلب ہے۔ ان معترضین و منکرین نور کا یہ کہنا کہ حضور کا نور" اللہ کے نور سے" مانا جائے تو اللہ کا نور کم ہو جائیگا۔ آپ خود ہی فیصلہ فرمالیں۔ کہ کس قدر جہالت کی بات ہے۔

لطیفہ: یہاں مجھے ایک دیہقانی کی بات یاد آگئی۔ یہ سادہ لوح حضرات بھی بعض اوقات بڑی مزے کی بات کر دیتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ ایک مرتبہ میں جہلم گیا۔ تو وہاں کے احباب نے یہ بات سنائی۔ کہ یہاں ایک منکرِ نور مولوی آیا۔ اور اس نے اپنے وعظ میں لوگوں کو یوں بہکانا شروع کیا۔ کہ مسلمانو! دیکھو روپے کے سولہ آنے ہوتے ہیں۔ اور اگر اس میں سے چار آنہ نکال لئے جائیں۔ تو بتاؤ روپیہ پورا رہا یا کم ہو گیا؟ تو حاضرین نے جواب دیا۔ کم ہو گیا۔ مولوی نے کہا۔ تو مسلمانو! اسی طرح اگر حضور کو اللہ کے نور سے مانا جائے۔ تو پھر اللہ بھی پورا نہیں رہتا۔ بلکہ کم ہو جاتا ہے۔ (معاذ اللہ) لوگوں نے بتایا۔ کہ مجمع میں سے ایک دیہقانی اٹھا۔ اور کہنے لگا مولوی گپیں نہ ہانک! دیکھ میرا ایک کنواں ہے۔ جو تیس سال سے برابر دن رات چل رہا ہے۔ اور سینکڑوں کنال زمین اور سینکڑوں کھیتیاں اس نے سیراب کی ہیں۔ مگر اتنے طویل عرصہ میں میرے کنوئیں کا پانی تو چلّو بھر بھی کم نہیں ہوا۔ تو کیا خدا کا نور تم نے میرے کنوئیں سے بھی کم سمجھ رکھا ہے۔ جو ایک محمد کے بن جانے سے کم ہو گیا۔ صلے اللہ علیہ وسلم۔

لوگوں نے بتایا۔ کہ اس بات سے وہ مولوی چپ ہو گیا۔ اور اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ بھائیو! اس دیہقانی نے یہ بات اپنی سمجھ کے مطابق خوب کہی۔ مگر اصل بات وہی ہے۔ جو میں کہہ چکا۔ کہ ہم جو حضور کو "اللہ کے نور" سے مانتے ہیں۔ اس کا مطلب وہ نہیں۔ جو یہ لوگ بیان کرتے

کہیں نہیں دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور نے صحابہ کو آنے والے جنگی خطرات سے آگاہ فرمایا تھا اور پھر جب وہ خطرات اسی بیان شدہ نقشہ کے مطابق ان کے سامنے آئے تو انہوں نے آپکے وعدہ کی تصدیق کی۔ اس لحاظ سے وعدہ کی یہ وحی بھی غیر قرآنی ہوئی۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اللہ اور رسول کا مفہوم ہے اسلامی حکومت یہ اگر صحیح ہو تو پھر حکومت کے فرائض میں دین اسلام کی جزئیات تراشتے رہنے کے ساتھ یہ کام بھی شامل ہوگا۔ کہ وہ پیشین گوئیاں نشر کرے اور ہر نئے سال کی گزٹ جنتری میں اسے ثبت کرتا ہوگا۔ کہ اس سال فلاں جنگی اور دوسرے حادثات رونما ہوں گے اور پھر ان حادثات کے واقعہ نہ ہونے پر لوگ کہہ سکیں گے کہ اللہ اور رسول نے بالکل جھوٹا وعدہ دلایا تھا۔ اور اس سے ان کے ایمان و اطاعت میں ترقی کی بجائے متنزل ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا یہ خانہ ساز کلیہ اپنے حدود میں کسقدر باطل اور تاریخ کے لحاظ سے کتنا گمراہ کن ہے کہ اللہ اور رسول کا مطلب ہے حکومت۔

"انا فتحنا لک فتحاً مبیناً

اے پیغمبر اسلام! بلاشبہ ہم نے تمہیں صلح حدیبیہ کے ذریعہ ایک کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی" ص ۵۵۲

صلح حدیبیہ نہ تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم میں ایک بالکل اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ہے اس کے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں ابتدائی حکم اذن یا ہدایت کا اہتمام نہیں فرمایا گیا۔ اور نہ قرآن میں خاص طور پر اسلام

ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ کے نور کی حضور تجلی ہیں۔

سراج منیر حضرات! خداوند کریم نے ایک دوسرے مقام پر حضور صلے اللہ علیہ و سلم کو سراج منیر یعنے چمکتا ہوا چراغ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ (پ۲۲ ع۳) اے پیارے نبی! ہم نے آپ کو گواہ بنا کر اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والا اور چمکتا ہوا چراغ بنا کر بھیجا "

مفسرین کرام علیہم الرحمۃ نے لکھا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے حضور صلے اللہ علیہ و سلم کو جو سراج منیر فرمایا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ:۔

اِنَّ السِّرَاجَ الْوَاحِدَ یُوْقَدُ مِنْهُ اَلْفُ سِرَاجٍ وَلَا یَنْقُصُ مِنْ نُوْرِهٖ شَیْءٌ وَ قَدِ اتَّفَقَ اَهْلُ الظَّاهِرِ وَالشُّهُوْدِ عَلٰی اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی خَلَقَ جَمِیْعَ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ نُّوْرِ مُحَمَّدٍ وَّ لَمْ یَنْقُصْ مِنْ نُّوْرِهٖ شَیْءٌ۔ (روح البیان ص۱۲۹ ج ۳) ایک چراغ سے ہزار چراغ بھی روشن کر لئے جائیں۔ تو پہلے چراغ میں نور کی کچھ بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اور تمام اہل ظاہر و شہود اس بات پر متفق ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے سارے نبیوں کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نور سے پیدا کیا ہے۔ اور حضور کے نور میں کچھ بھی کمی واقع نہیں ہوتی"

حضرت مولانا رومی علیہ الرحمۃ اس موقعہ پر ارشاد فرماتے ہیں:۔ ؎

گفت طوبیٰ من رآنی مصطفےٰ
والذی یبصر لمن وجهی رایٔ

یعنی حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا ہے۔ کہ خوشخبری ہو اُسے جس نے مجھے دیکھا اور اُسے بھی جس نے میرے دیکھنے والے کو دیکھا۔

اور نبوت محمدی کے اس بے مثال کارنامہ کا ذکر ہی موجود ہے۔ اس صلح کے واقع ہو جانے کے بعد اس میں انجام پانے والے واقعات کو خدا نے پوری سورۃ فتح میں ریکارڈ فرمایا۔ اور ایک نصف سورہ میں مزید اس سے پیدا ہونے والے مسائل جو مہاجر عورتوں کے متعلق ضروری تھے انہیں بیان فرمایا۔ سورہ فتح کے اندر جو بیعت رضوان کا اور قربانی کے جانوروں کا تذکرہ اور دوسرے بہت سے واقعات درج ہیں۔ ان کا صحیح موقعہ و محل اور زمانہ وقوع بھی ہمیں تاریخ و حدیث کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اگر تاریخ کو مشکوک ٹھہراتے ہوئے صلح حدیبیہ کے ان سارے واقعات کی اصلیت سے انکار کر دے جو سورۃ فتح اور ممتحنہ میں ہیں تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کو اس کا پابند بنائینگے کہ وہ تاریخ کو جھٹلانے ہوئے اس کے وہ واقعات مان لیں جو قرآن کے موافق ہوں۔ یہ بالکل زندہ انسان کو جلانے کی بجائے اسے پھانسی کے ذریعہ مار دینے کی رعایت کے برابر ہے۔ کہ انسان پہلے تو واقعات کو قرآن کے مطابق فرض کرے۔ اور پھر انہیں صحیح مان لے مثلاً یہ مان لے کہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر بیعت رضوان ہوئی ہوگی۔ اور یہ نہ مانے کہ اس موقعہ پر حاضر ہونے والے ہر مسلمان کے ساتھ قربانی کا ایک ایک جانور تھا۔ یا کہ بی مسلمانوں نے مشرکین مکہ سے دب کر صلح قائم کی تھی۔ پھر یہ سوچئے کہ کلیات اور جزئیات کی یہ تقسیم کہاں تک معقول ہے۔ کہ قرآن میں جو واقعہ بنائے اسے اصولی حکم نہ مانا جائے۔ اور اس طرح صلح حدیبیہ کے اندر طے پانے والے ان اصول و شرائط کو وحی کی ہدایت ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ جن کا ایک ناساز ماحول میں

چوں چراغے نور شمع را کشید!
ہر کہ دید آں را یقیں آں شمع دید

جس طرح ایک چراغ دوسری شمع سے روشن کرنے پر اس شمع کے نور سے مستفید ہوتا ہے۔ اور جو شخص اس چراغ کو دیکھے گا۔ وہ یقیناً اس شمع ہی کو دیکھے گا۔ ؎

ہمچنیں تا صد چراغ از نقل شد
دیدن آخر لقائے اصل شد

اسی طرح یکے بعد دیگرے سو چراغ روشن کر دیئے جائیں۔ تو آخری چراغ کا نور بھی اسی شمع کا نور ہے۔

مسلمانو! حضرت مولانا رومی علیہ الرحمۃ کا مطلب یہ ہے۔ کہ تمام انبیاء کرام، اور اولیاء عظام اسی شمع محمدی سے مستفید ہیں۔ اور یہی وہ نور پاک ہے۔ جس سے تمام چراغ روشن ہوئے۔ پڑھئے درود شریف!

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ وَسَلَّمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ وَسَلَّمْ یَا حَبِیْبَ اللّٰہ

اندھے

میرے بھائیو! یہ حقیقت ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نور ہیں اور نورٌ علےٰ نور ہیں۔ مگر جو لوگ حضور کو محض اپنے ہی جیسا سمجھتے ہیں۔ وہ اندھے ہیں۔ انہوں نے حضور کو محض سطحی نظروں سے دیکھا ہے ان نظروں سے جن نظروں سے ابوجہل نے دیکھا تھا۔ اور یہ دیکھنا نہ دیکھنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے:۔

وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ۔ (پ۹ ع ۱۴)

اور آپ انہیں دیکھتے ہیں۔ کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں مگر انہیں کچھ نہیں دکھتا۔

محمود غزنوی کی حکایت

مفسرین کرام نے سلطان محمود غزنوی علیہ الرحمۃ کی ایک حکایت لکھی ہے۔ کہ وہ ایک روز حضرت ابوالحسن خرقانی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو وہاں حضرت بایزید

انجام پانا اور آنے والے فوائد کا حاصل ہونا تاریخ انسانی کا وہ بے نظیر واقعہ ہے جس کی مثال تو وہ بھی دنیا کیا پیش کریگی۔ مجرد اس کے اندر کارفرما ہونے والی حکمتوں کا اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد کا احاطہ کر پانا دانایانِ عالم کیلئے محال سے کچھ کم نہیں۔

ایک طرف ایسے نادان دشمنوں کے غالب فریق سے واسطہ ہے جو مسلسل سترہ اٹھارہ برس سے ستا رہے ہیں۔ اور اس صلح کے موقعہ پر انکی چیرہ دستی کا یہ عالم ہے کہ وہ فریقِ معاہدہ کا معروف نام بھی لکھوانا روک دیتے ہیں۔ اور جو بات زبان سے نکالتے ہیں اُس سے کم کسی پر بھی رضامند نہیں ہوتے اور اپنی بات منوانے میں آخر دم تک کامیاب رہتے ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کی جو کچھ بھی جمعیت ہے وہ قریب قریب ساری ان دشمنوں سے ایسے موقعہ پر اس قسم کی صلح کرنے میں کسی طرح بھی راضی نہیں۔ اور اسکی بجائے مر مٹنے پر راضی ہے۔ یہانتک

---

۱ پرویز صاحب نے غیر قرآنی وحی سے فرار کرتے ہوئے واقعاتِ صلح کو سامنے لانے سے پرہیز کیا ہے۔ کتب سیرۃ میں ہے کہ صحابہ صلحنامہ کے مضمون سے بہت پریشان ہوئے یہانتک کہ جب آنحضورؐ نے قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنیکا حکم فرمایا تو وہ جو آپکے اشاروں پر چلکر شراب کے مٹکے توڑ ڈالتے تھے اور انہوں سے کٹنے اور لڑنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس حکم کو سنکر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ چنانچہ بعض امہات المومنین کے توجہ دلانے پر آنحضورؐ نے اپنی قربانی کو ذبح کرنا شروع فرمایا تو دوسرے بھی اس پر متوجہ ہوئے۔ آخر حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا۔ اور انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے عرض کی کہ فرمایئے تو!

بسطامی علیہ الرحمۃ کا ذکر ہو رہا تھا۔ سلطان محمود نے پوچھا۔ حضور! بایزید کس شان کے بزرگ تھے؟ حضرت ابوالحسن نے فرمایا:۔

هُوَ رَجُلٌ مَنْ رَاٰهُ اِهْتَدٰی — وہ ایسا وجود ہے۔ کہ جس نے انہیں دیکھا۔ ہدایت پا گیا۔

سلطان محمود نے عرض کیا۔ لیکن حضور! ابوجہل نے حضور صلے اللہ علیہ و سلم کو کئی بار دیکھا۔ مگر وہ ہدایت نہ پا سکا۔ حضرت ابوالحسن خرقانی نے جواب دیا۔

اِنَّہٗ مَا رَاٰی رَسُوْلَ اللّٰہِ وَ اِنَّمَا رَاٰی مُحَمَّدَ بْنَ عَبْدِ اللّٰہِ یَتِیْمَ اَبِیْ طَالِبٍ (روح البیان ص۱۲۹ ج ۳) — ابوجہل نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ و سلم کو نہیں دیکھا۔ اس نے محمد بن عبد اللہ یتیم ابی طالب کو دیکھا تھا۔"

یعنی اس بے ایمان نے سطحی نظروں سے دیکھا۔ اور محض محمد بن عبد اللہ کو دیکھا۔ اور اپنے جیسا ایک بشر دیکھا۔ اگر وہ بے دین واقعی دیکھتا۔ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و سلم کو دیکھتا۔ تو نور نظر آتا۔ اور اسکا دل نورِ ایمان سے منور ہو جاتا۔ لیکن ؎

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے!
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

جبریل کی عمر

حضرات! آپ سن چکے کہ ہمارے حضور کے نور کو اللہ نے ہر چیز سے پہلے پیدا فرمایا۔ اور اس وقت ساری مخلوق میں سے کوئی چیز بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ نہ یہ زمین تھی نہ آسمان، نہ لوح و قلم، نہ عرش و کرسی، نہ جن و انس اور نہ کوئی فرشتہ۔ اسی واسطے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے ایک مرتبہ جبریل سے دریافت فرمایا۔ اے جبریل! تمہاری عمر کتنی ہے؟ تو جبریل نے عرض کیا۔ حضور مجھے کچھ خبر نہیں۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ

اِنَّ فِی الْحِجَابِ الرَّابِعِ نَجْمًا یَطْلَعُ فِیْ کُلِّ سَبْعِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ

کہ خود کاتب بھی وہ کچھ لکھنے کو تیار نہیں جو اسے لکھوایا جاتا ہے۔ شدائد کے اس ہجوم میں نوع انسانی کا وہ واحد لیڈر یکا و تنہا حالات کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور اپنی ایک ہی بات پر قائم رہتا ہے۔ نہ دشمنوں سے مرعوب ہوتا ہے اور نہ اپنوں کی مخالفت سے اپنی بات پر نظر ثانی کرتا ہے۔ اور فقط اپنے مولا کے بھروسہ پر وہ سب کچھ کر گذرتا ہے۔ جس کے صحیح اور مفید ہونے پر اسے روز روشن کی طرح یقین ہے۔ یہ سب کچھ اگر وحی کی ہدایت کے بغیر ہو گیا تو آخر معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اس میں کس کا قیمتی دماغ اور قیمتی مشورہ کارفرما رہا۔ اگر آنحضور نے اپنے دماغ سے یہ سب کچھ سوچا تو جو مشورہ لینا آپ کے لئے پرویز صاحب کے بقول لازم تھا وہ کہاں عمل میں آیا۔ اور ویسے بھی مشورہ کے حکم کے بلالحاظ اگر آپ نے ذاتی خیال پر بغیر کسی انسانی مشورہ کے اتنے بڑے عمل کا اقدام فرما دیا۔ تو یہ آپ کونسی عقلمندی کی دلیل ہے اور ایسے مسلمانوں میں آپ کس طرح مقبول بنا سکتے ہیں اور اگر انہوں نے بھی اس میں توجہ نہ دی تو یہ ان کی دینی اور جماعتی امور میں دلچسپی کا کچھ بھی اچھا ثبوت نہیں۔

کیا ہم حق پر نہیں اور دشمن باطل پر ہیں۔ انہوں نے کہا بیشک ایسا ہی ہے۔ حضرت عمر نے کہا۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس ذلت کی صلح میں کیا حاصل ہو گا۔ انہوں نے کہا عمر! دیکھو ہمارے رہنما اللہ کے رسول ہیں اور حکم کے پابند ہیں۔ اس کے بعد دونوں نے آنحضور سے آکر پوچھا تو آپ نے بھی یہی جواب دیا نیز شرائط صلح کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ان کے مطابق اگر کوئی ہمارا آدمی مرتد ہو کر دشمنوں سے جا ملا تو ہماری خواہش ہو گی کہ خدا اسے ہم سے دور ہی رکھے۔ اور جو ان کی طرف سے مسلمان ہو کر ہمارے ہاں آیا تو ہم اسے واپس بھیج دینگے۔ اور خدا اس کے لئے راستہ کھول دیگا طواف بیت اللہ کی پیشنگوئی کے متعلق آپ نے فرمایا کہ وہ آئندہ سال میں کریں گے۔ باقی صحابہ پر خاموشی طاری رہی۔

مَرَّۃً رَأَیْتُہٗ اِثْنَیْنِ وَ سَبْعِیْنَ اَلْفَ مَرَّۃٍ ـ چوتھے حجاب میں ایک تارہ ستر ہزار برس کے بعد چمکتا تھا۔ میں نے اُسے بہتر ہزار دفعہ چمکتے دیکھا ہے۔

حضور علیہ السلام نے یہ سن کر جبریل کو جواب دیا:۔

وَعِزَّۃِ رَبِّیْ اَنَا ذٰلِکَ الْکَوْکَبُ ـ مجھے میرے رب کی عزت کی قسم! میں ہی وہ تارا ہوں۔" (روح البیان ص۹۷۴ ج۱)

دیکھا آپ نے! جبریل نے اپنے گمان میں اپنی بڑی لمبی عمر بیان کی تھی۔ مگر یہ جواب سن کر اُسے بھی معلوم ہو گیا۔ کہ حضور تو مجھ سے بھی پہلے کے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کا مشاہدہ

حضرت آدم علیہ السلام جو سارے انسانوں کے باپ ہیں۔ اور جو بظاہر آدمی سے پہلے پیدا فرمائے گئے۔ ان کے متعلق حضرت امام قسطلانی علیہ الرحمۃ مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا فرما کر فرمایا۔ کہ اے آدم اپنا سر اٹھاؤ۔ فَرَفَعَ رَأْسَہٗ فَرَاٰی نُوْرَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ سَرَادِقِ الْعَرْشِ فَقَالَ یَا رَبِّ مَا ھٰذَا النُّوْرُ۔ قَالَ ھٰذَا نُوْرُ نَبِیٍّ مِنْ ذُرِّیَّتِکَ اِسْمُہٗ فِی السَّمَاءِ اَحْمَدُ وَفِی الْاَرْضِ مُحَمَّدٌ۔ لَوْلَاہُ مَا خَلَقْتُکَ وَلَا خَلَقْتُ سَمَاءً وَّ لَا اَرْضًا ـ (مواہب لدنیہ ص۹ ج۱) آدم علیہ السلام نے اپنا سر اٹھایا تو عرش کے پردوں میں ایک نور دیکھا۔ عرض کی اے رب یہ نور کیا ہے؟ فرمایا۔ یہ نور ایک نبی کا ہے۔ جو تمہاری اولاد میں سے ہونگے۔ ان کا نام آسمان میں احمد ہے۔ اور زمین میں محمد اگر وہ نہ ہوتے۔ تو میں نہ تمہیں پیدا کرتا۔ اور نہ زمین و آسمان کو۔"

دوستو! پھر اسی نور سے حضرت آدم علیہ السلام مشرف فرمائے گئے۔ اور یہ نورِ پاک آدم علیہ السلام میں منتقل ہوا۔ معالم التنزیل میں ہے۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی پیشانی کے خطوط سے ایک باریک آواز سننے لگے۔

"لقد صدق اللہ رسولہ الرویا بالحق۔
بے شک اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا جو بالکل مطابق واقعہ ہے" ج

اس آیت کے سارے بیان سے خواب کا مضمون یہ کچھ واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھائی دیا کہ آپ اپنے صحابہ کے ہمراہ کعبۃ اللہ کا طواف فرما رہے ہیں جن میں سر منڈاتے اور ترشنے والے موجود ہیں۔ آپ نے اس خواب کا جو کچھ اظہار فرمایا۔ بظاہر صلح حدیبیہ میں پیش آنے والے واقعات اس کے موافق نہ نکلے جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کو خواب کی اس پیشین گوئی کے موقعہ و محل میں کچھ تردد سا لاحق ہوا۔ اللہ نے اس پورے رکوع میں اسی تردد کا ازالہ فرمایا جس کا عنوان یہ آیت ہے۔

یہاں سوچا جا سکتا ہے کہ اگر آپ کا خواب کچھ بھی وحی نہ تھا تو اسے صحیح منوانے کے لئے قرآن کا اتنا بیان کیوں صرف کر ڈالا گیا۔ کیا قرآن عالم بیداری اور حقائق سے ہٹ کر خوابوں کی دنیا بسانے کو نازل ہوا تھا۔ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ آپ کا خواب وحی تھا۔ اور جب تھا تو پھر یہ کیسے معقول ہو سکتا ہے کہ جو وحی خواب میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑتی ہو وہ بیداری میں آپ کا ساتھ نہ دے۔

وحی اور صرف وحی

"وما ینطق عن الھویٰ۔ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔
اور رسول قرآن میں اپنی خواہش اور ارادہ سے کچھ نہیں کہتے بلکہ وہ تو پوری

اور آپ نے خدا سے پوچھا۔ کہ الٰہی! یہ کیسی آواز ہے۔ تو خدا نے جواب دیا۔ ھٰذَا تَسْبِیْحُ مُحَمَّدٍ وَلَدِکَ ــــ یہ تمہارے فرزند محمد کی آواز ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

میرے بزرگو! سب جانتے ہیں۔ کہ آدم علیہ السلام کو سارے فرشتوں نے سجدہ کیا۔ اور آپ سارے فرشتوں کے مسجود بن گئے۔ یاد رکھئے اسی نور پاک کی برکت سے حضرت آدم علیہ السلام مسجود ملائکہ بن گئے۔ اور شیطان لعین بھی اسی لئے مردود ہوا۔ کہ اس بے ایمان کو آدم علیہ السلام محض مٹی کا جسم نظر آئے۔ اور اُسے نور محمد نظر نہ آیا۔ چنانچہ مولانا رومی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں۔ ؎

گر دوید ابلیس گفت ایں فرع طیں!
چوں فزاید بر من آتش جبیں

یعنی ابلیس کو مٹی نظر آئی۔ اور اس نے کہا۔ کہ میں تو آگ ہوں پھر یہ مٹی کیسے بڑھ سکتی ہے؟

مردود کو مٹی نظر آئی اور "بشریت" تک ہی اس کی نگاہ رُک گئی۔ اور نور کو وہ دیکھ نہ سکا۔ اس لئے مردود ہو گیا۔ حضرات! آج بھی بے ادب اور گستاخ لوگ حضور منبع النور صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے جیسا ایک بشر ہی خیال کرتے ہیں۔ اور نور مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم تک ان کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ مولانا رومی علیہ الرحمۃ انہیں گستاخوں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔ ؎

گرنہ فرزندِ بلیسی اے عنید! پس تو میراثِ آں سگ کے رسید

یعنی اے گستاخ رسول اگر تو ابلیس کا فرزند نہیں تو پھر تجھے یہ ابلیس کی وراثت (یعنی انبیاء کو اپنی مثل بشر سمجھنا) کیسے مل گئی؟

لطیفہ دوستو! گستاخانِ رسالت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے جیسا بشر کہتے ہیں۔ اور حضور کو نور تسلیم نہیں کرتے۔ اس موقعہ پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک سُنی اسی قسم کے ایک گستاخ سے حضور کے نور ہونے پہ بحث کر رہا تھا۔ سنی کہہ رہا تھا۔ کہ ہمارے حضور

وحی ہے جو خدا کیطرف سے ان پر اتاری جاتی ہے"۔ ص ۶۰۸
آیت آپ کے سامنے ہے۔ اور پرویز صاحب کا ترجمہ بھی موجود ہے۔ ترجمہ میں غور کر کے بتائیے کہ یہاں خط کشیدہ الفاظ آیت کے کس لفظ کے معنی ہیں۔ اگر کسی کے بھی نہیں تو یہ ثبوت ہے۔ اس بات کا کہ قرآن کو چوروں کا مال قرض کر لیا گیا ہے اور صرف اس لئے تاکہ رسول کی بات کو وحی ماننا لازم نہ آئے۔ گویا نطق کے معنی ہیں قرآن پڑھنا۔ مثلاً حضرت سلیمان کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہیں پرندوں کی منطق سکھائی گئی تھی۔ تو اس کا مطلب ہو گا کہ انہیں پرندوں کا قرآن سکھایا گیا۔ حضرت ابراہیم کی قوم نے کہا تھا کہ ہمارے بت نطق نہیں کرتے۔ اس کا بھی مطلب ہو گا کہ وہ قرآن نہیں پڑھتے۔ پھر قرآن میں لوگوں سے کہا گیا کہ وعدہ قیامت ایسا ہی حق ہے جیسے تم نطق کرتے ہو۔ تو اس کا مفہوم بھی یہی ہو گا۔ کہ منکرین کو کہا جا رہا ہے کہ جیسے تم قرآن پڑھتے ہو اسی طرح قیامت حق ہے۔ ذرا کھوج لگائیے کہ دنیا کی کس لغت میں نطق کے معنی قرآن پڑھنا ہے۔

پرویز صاحب کے تضاد فکر کا یہ عالم ہے کہ آپ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دلیل وہ دیتے ہیں جو اس کا بہترین رد ہو۔ چنانچہ اس آیت کو آپ اپنے اس مفروضہ کی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ کہ رسول کی بات وحی نہیں اور وحی صرف قرآن ہے۔ یہ جب آپ کے دعویٰ کی دلیل ٹھہری تو سننے والا اس کے رد کے لئے میدان خالی نہ پائے۔ تو اور کیا کرے۔ بالکل اسیطرح جیسے اگر کوئی کہے کہ سورج اس لئے موجود نہیں کہ دھوپ لگ رہی ہے تو اس کا دعویٰ قابل رد نہیں ہوتا۔

اللہ کے نور ہیں۔ اور گستاخ کہہ رہا تھا۔ نہیں وہ تو ہمارے ہی جیسے ایک بشر تھے۔ دو ہاتھ ان کے تھے۔ دو ہمارے۔ دو آنکھیں ان کی تھیں۔ دو ہماری دو کان ان کے تھے۔ دو ہمارے۔ پھر فرق کیا رہا۔ اتنے میں وہاں ایک خوش پوش بھنگی آگیا۔ وہ یہ بحث سن کر گستاخ سے کہنے لگا۔ کہ اس مسئلہ پر مجھ سے گفتگو کر لو۔ گستاخ نے کہا۔ اچھا تم ہی گفتگو کر لو۔ وہ بھنگی کہنے لگا۔ کہ کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اور ہوٹل وہ سامنے ہی ہے۔ چلئے پہلے کھانا کھا لیں۔ پھر گفتگو کریں گے۔ گستاخ نے کہا۔ اچھی بات ہے یہ کہہ کر دونوں ہوٹل میں گئے۔ گستاخ کو علم نہ تھا۔ کہ یہ بھنگی ہے۔ اس بھنگی نے کھانا منگوایا اور دونوں مل کر کھانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد بھنگی بولا۔ قبلہ آپ جو میرے ساتھ مل کر کھانا کھا رہے ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہو جانا چاہیئے۔ کہ میں بھنگی ہوں۔ گستاخ یہ بات سنتے ہی بولا۔" لاحول ولا قوۃ" اور ایک دم اٹھ بیٹھا۔ بھنگی بولا۔ قبلہ! یہ کیا؟ گستاخ بولا! کم بخت تو نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ کہ تو بھنگی ہے۔ بھنگی نے جواب دیا۔ مگر جناب! کچھ بھی سہی! آخر میں بھی تو تمہاری مثل ایک بشر ہی ہوں۔ دو ہاتھ تمہارے دو میرے۔ دو کان تمہارے دو میرے۔ دو آنکھیں تمہاری دو میری۔ پھر فرق کیا رہا۔ گستاخ نے کہا۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر تو بھنگی ہے اور میں مسلمان۔ بھنگی نے کہا اور اسی طرح محمد نور اور تو سور۔ وہ گستاخ یہ جواب سن کر بڑا شرمندہ ہوا۔

میرے بھائیو! اپنا ایمان رکھو کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نور ہیں۔ اور انہیں اپنی مثل کہنا بڑی گستاخی ہے۔ دیکھ لو ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے بھی نور فرمایا۔ اور خود حضور نے بھی اپنے نور ہونے کا اعلان فرمایا اور یہ بھی آپ نے سن لیا۔ کہ ہر شے سے پہلے اسی نور کو پیدا کیا گیا تو پھر کیوں نہ کہا جائے۔ کہ حضور نور ہیں۔ اور سارے عالم کے لئے موجب ظہور ہیں۔ اسی نور کے فیض سے سب کچھ بنا اور اسی نور کے واسطے سب کچھ بنا۔ ؎

آیت کا یہ کچھ ترجمہ کرنے کے بعد پھر اس کے قابل تسلیم ہونے میں جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ جاتی ہے اسے آپ ایک طول طویل[1] اگر مگر کے سلسلہ سے پورا کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر رسول کی بات وحی ہوتی تو وہ اور یہ اور یہ کرتا۔ اپنی باتوں کا ریکارڈ کرتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ لوگوں کا فرض بھی اسی کو ادا کرنا تھا۔ یہاں اس ساری لمبی چوڑی بحث کے گرداب میں غوطے لگانے کی بجائے صرف اس قدر سوال کرنا ہوگا کہ اس آیت میں قرآن کا لفظ کیوں نہیں لایا گیا۔ کیا اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ یا اطاعت رسول کا سد باب کرنا کچھ ضروری نہ تھا۔ جب رسول کی بات کو وحی ماننا ممنوع تھا تو کس حکمت کا تقاضا تھا کہ اس کی ممانعت کی بجائے اسکی بول چال کو وحی کہا گیا۔ پرویز صاحب اور آپ کے مرشد اول چیراغ علی صاحب کہتے ہیں کہ منکرین کا اعتراض ہی قرآن کے متعلق تھا کہ وہ وحی نہیں ہم کہتے ہیں کہ اس صورت میں تو یہاں قرآن کا نام لایا جانا اور زیادہ ضروری تھا۔ اور جب تھا تو پھر قرآن کے رسول کی بات کو وحی کہہ کر سوال گندم اور جواب چینا کا مظاہرہ کیوں کیا گیا۔ ایک طرف قرآن کے بیسیوں مقامات پر اطاعت رسول کا حکم دینا اور پھر اس کی بات کو بھی وحی کہنا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ رسول کا حکم نہ وحی ہے اور نہ لازم۔ ایسے معنے تو اس عبارت کا مفہوم ہو سکتا ہے کہ رسول کی اطاعت نہ کرو۔ اور اسکی بات وحی نہیں مگر افسوس کہ ایسی عبارت قرآن میں کہیں بھی موجود نہیں۔

---

[1] دیکھو معراج انسانیت ص ۶۸۸، ص ۶۸۹۔ قرآن سے روایات کی کشتی کا مظاہرہ

وہی نورِ حق وہی ظلِ رب ہے انہیں سے سب ہے انہیں کا سب
نہیں ان کی ملک میں آسماں کہ زمیں نہیں کہ زماں نہیں

ظہورِ نور

مسلمانو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور بھی دیکھئے۔ سراپا نور ہی نور ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا نورِ پاک ابھی حضور کے والد ماجد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی پشت انور ہی میں ہے۔ اور آپ کی پیشانی اس نور کی تنویر سے چمک رہی ہے۔ کہ ایک دفعہ مکے کی ایک جاننے بوجھنے والی عورت نے آپ کو دیکھا۔ تو آپ سے کہنے لگی۔ کہ آپ مجھ سے شادی کر لیں۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا۔ میں والدین کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر اس کے بعد جب حضرت عبداللہ کا نکاح حضرت آمنہ سے ہو گیا۔ اور یہ نور پاک حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے بطنِ انور میں منتقل ہو گیا۔ تو کچھ دنوں کے بعد آپ اسی راستے سے گزرے۔ تو اس عورت نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور منہ پھیر لیا۔ حضرت عبداللہ نے اس سے منہ پھیر لینے کی وجہ پوچھی۔ تو وہ بولی:-

لَقَدْ رَأَيْتُ بَيْنَ عَيْنَيْكَ نُوْرًا مَا اَرَاهُ الْآنَ (خصائص کبریٰ ص۴۲ ج۱)

"میں نے آپکی پیشانی میں جو نور دیکھا تھا۔ وہ اب مجھے نظر نہیں آتا"

سے

وہ جس کے نور سے تیری چمکتی تھی یہ پیشانی!
اسی کی تھی میں طالب اور اسی کی تھی میں دیوانی!
مگر میں رہ گئی محروم قسمت میری پھوٹی ہے!
سنا ہے کہ وہ نعمت آمنہ نے تجھ سے لوٹی ہے!

یہ نور پاک ابھی بطن مادر ہی میں ہے کہ والد محترم حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔ حضور کے دادا جان حضرت عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ کے انتقال کے بعد یہ معمول بنا لیا۔ کہ رات کو اٹھتے اور خانہ کعبہ کا طواف کرتے اور رو کر یہ دعا کرتے سے

دعا یہ تھی کہ یارب نعمتِ موعود مل جائے!
بنی ہاشم کا مرجھایا ہوا گلزار کھل جائے!

"ان اتبع الا یوحی الی.
میری حیثیت تو فقط یہ ہے کہ اسی بات کی اطاعت کرتا ہوں جو خدا نے مجھ پر وحی کر دی"۔ ۶:۵۰

اس آیت میں آنحضور کو اپنی طرف سے یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ میرا کام صرف یہ ہے کہ وحی کی پیروی کر دوں۔ اور یہی کچھ میں کر رہا ہوں۔

قرآن کے اس فیصلہ اور ارشاد کے تحت جب ہم غور کرتے ہیں تو امور زندگی کی تقسیم دو طرح پر ہے۔ ایک وہ جن کا فیصلہ قرآن میں ہے۔ اور دوسرے وہ جن کے متعلق قرآن کا کوئی فیصلہ موجود نہیں۔ یہ دونوں طرح کے امور ویسے تو ہر حالت میں ضروری ہے کہ خدا کی منشا کے مطابق انجام پائیں۔ مگر یہاں آپ صرف رسول کی ذات تک ہی بحث کو محدود رکھتے ہوئے آیت کے الفاظ پر غور کیجئے اس میں صریح طور پر موجود ہے کہ رسول کا ہر کام وحی کی پیروی میں ہوتا ہے وہ بھی جو قرآن میں ہے۔ اور وہ بھی جو قرآن میں نہیں۔ اور دونوں کے لئے قرآن کے خارج وحی کا ماننا لازم ہے۔ یہ امور کے لئے یوں سمجھئے کہ ایک انسان کو قتل کرنے کا حکم قرآن میں ہے اور اس کی کئی اقسام ہیں۔ یہ بھی قتل ہے کہ اسے کوئیں میں پھینکا یا سمندر میں ڈبو یا جائے یہ بھی قتل ہے کہ اسے پہاڑ سے گرا دیا جائے۔ اس پر دیوار گرائی جائے۔ اسے آگ میں جلا یا جائے۔ یا پھانسی دیا جائے۔ اور یہ بھی قتل ہے کہ اسے تلوار سے مار دیا جائے۔ قرآن کہتا ہے

ے بعض باتیں جو مشورہ کی رو سے اختیار کی گئیں۔ اللہ کی منشا کے مطابق نہ نکلیں اسلئے خدا کی وحی نے ان پر تنبیہ کی۔ مزاج شناس رسول۔ ص ۱۸۹

حضرت آمنہ فرماتی ہیں۔ کہ ولادت کی شب میں نے ایک نورانی گروہ آسمان سے اترتے دیکھا۔ جن کے پاس تین نورانی جھنڈے تھے۔ انہوں نے ایک جھنڈا تو کعبے پر گاڑ دیا۔ اور ایک بیت المقدس پر ایک میرے مکان کی چھت پر گاڑ دیا پھر میں نے دیکھا۔ کہ آسمان کے ستارے بھی میرے مکان کی طرف جھکے پڑتے ہیں۔ وَاسْتَلَأَتِ الدُّنْیَا نُوْرًا۔ (نزہتہ المجالس صـ۸۳ ج ۲)

اور ساری دنیا نور کے ساتھ بھر گئی۔

حضرت عبدالمطلب حسب معمول طواف کعبہ میں مشغول تھے۔ اور دعا مانگ رہے تھے ؎

اچانک صبح کی پہلی کرن ہنستی ہوئی آئی!
مبارکباد کہہ کر یہ خبر دادا کو پہنچائی!
ملا ہے آمنہ کو فضلِ باری سے یتیم ایسا
نہیں ہے بحر ہستی میں کوئی دُرِّ یتیم ایسا

آپ نے یہ بشارت سنی تو آپ دوڑ کر گھر آئے۔ اور مقدس پوتے کو گود میں اٹھا لیا۔ ؎

زمیں پر عرش بالا کے نشاں معلوم ہوتے تھے
کہ ان کی گود میں دونوں جہاں معلوم ہوتے تھے
مئے روحانیت کے جام سے مخمور بیٹھا تھا
چھپا کر آج پہلو میں خدا کا نور بیٹھا تھا
کہا دادا نے اے بیٹی میرا پوتا محمد ہے
جو دنیا بھر کے انسانوں سے اعلیٰ اور امجد ہے

مسلمانو! حضور صلے اللہ علیہ وسلم جب اس عالم میں تشریف لائے ہیں۔ تو حضور کی والدہ محترمہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا نے ایک ایسا نور دیکھا جس کی روشنی میں حضرت آمنہ کو ملک شام کے محلات نظر آنے لگے۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں۔ کہ جب میں پیدا ہوا۔ تو:۔

قَدْ خَرَجَ لَهَا نُوْرًا اَضَاءَ لَهَا مِنْهُ قُصُوْرُ الشَّامِ۔ (مشکوٰۃ شریف صـ۵۰۵)

کہ ان مختلف صورتوں میں سے وحی کے مطابق عمل صرف وہی ہے جو رسول کرے یا اس کے کہنے کے مطابق کیا جائے۔ باقی کسی عمل کے مطابق وحی ہونے کی سند قرآن کے ہاں نہیں پائی جاتی۔ یہ حال جب ان امور کا ہے جو قرآن میں موجود ہیں کہ ان کا وحی کے مطابق رسول کی رہنمائی کے بغیر انجام پانا ممکن نہیں تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو امور قرآن میں موجود نہیں انہیں جب انسان اپنے خیال سے یا رسول کی بجائے کسی مرکز ملت کے فیصلے پر انجام دے تو وہ وحی کے مطابق ہوں گے۔ اور ایسا خیال اگر آپ کریں بھی تو اس کے لئے قرآن میں کونسی بنیاد موجود ہے۔ رسول کے ایسے کاموں کے مطابق وحی ہونے کا فیصلہ تو اس آیت میں اور اس کے علاوہ قرآن کی متواتر آیات میں موجود ہے مگر کسی اور کے لئے قرآن کا ایسا کچھ فیصلہ تو قرآن میں آپکو نہیں ملیگا سوا اس کے کہ آپ رسول کے معنی پرویز صاحب کے بقول مرکز ملت اور حاکم وقت کریں۔ اس کے بعد اگر الفاظ قرآن کے معنوں میں اس طرح گڑبڑ کر گزرنا جائز ہو جائے تو پھر یہ کہنے میں کیا خرابی ہے کہ قرآن کے معنی ہیں الف لیلیٰ۔ اور کلمہ توحید میں جو محمد ہے اس کا مفہوم ہے نبی قادیانی۔

پھر اگر قرآن کے خارج وحی موجود نہ ہو تو سرے سے رسول کیلئے ایسا کوئی کام کرنا جائز نہیں جو قرآن میں نہ ہو۔ آگے اس کے مطابق وحی ہونے کا دعویٰ تو دور کی بات ہے اگر وہ اپنی عقل کے مطابق ان امور کو انجام دے جو قرآن میں نہیں تو خدا نے کب اسے یہ اجازت دی ہے کہ وہ وحی کی بجائے عقل کی پیروی میں لگ جائے اور یہ دعویٰ قرآن کا ہے کہاں

میری والدہ کے لئے ایک ایسا نور ظاہر ہوا۔ جس سے ان کے
سامنے ملک شام کے محلات روشن ہو گئے۔

اور حضور کی والدہ محترمہ رضی اللہ عنہا خود فرماتی ہیں :-

انہ خرج منی نور اضاءت لی قصور الشام (خصائص کبریٰ ص۱ ج۱)

بوقت ولادت شریفہ میرے لئے ایک ایسا نور ظاہر ہوا۔ جس سے
میرے لئے ملک شام کے محلات روشن ہو گئے۔

(صاحب اکرام محمدی) اس موقعہ پر لکھتا ہے ؎

وقت تولد صبح دے اندر آیا نبی سوہرا !
چانن نور نبی دے کولوں نکل گیا چمکارا !
شام ملک سب نظری آیا حضرت آمنہ تائیں
ہر ہر شہر جو شام زمینے ہر روشنی ہر جائیں

دیکھا آپ نے کہ ولادتِ طیبہ سرتا پا نور ہی نور ہے۔

جیسا دیس ویسا بھیس

میرے بزرگو ! ہمارے آقا و مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم نور ہیں اور یقیناً نور ہیں۔ اور اس عالم میں جو آپ لباسِ بشریت میں تشریف لائے۔ تو یہ محض لباس ہے۔ اور لباس کے بدل جانے سے حقیقت نہیں بدلا کرتی۔ دیکھئے ! زید نے یورپ میں جاکر کوٹ پتلون پہنی۔ اور پاکستان میں آکر شیروانی و شلوار پہن لی۔ پنجاب میں آکر سر پر عمامہ باندھا۔ اور یو۔پی میں جاکر ہلکی پھلکی ٹوپی پہن لی اور بنگال پہنچ کر ننگے سر ہی پھرنے لگے۔ تو ان سب صورتوں میں جیسا دیس ویسا بھیس کے مطابق لباس بدلتا رہے گا۔ مگر زید وہی زید کا زید ہی رہیگا۔ تو اسی طرح بلا تشبیہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نور ہیں۔ آپ کا نور ساری مخلوق سے پہلے پیدا فرمایا گیا۔ اور جب آپ اس عالم میں تشریف لائے۔ تو آپ نے اس عالم کا لباس۔ لباس بشریت زیب تن فرمایا۔ تو اس لباس بشریت کے زیب تن فرمانے سے حضور کے نور ہونے میں کچھ فرق نہیں آیا۔ بلکہ آپ پہلے بھی نور تھے اور اب بھی نور ہی ہیں۔

کہ رسول کچھ امور میں اپنی سمجھ پر چلتا ہے۔ جہاں اسے وحی کی ہدایت نہیں پہنچتی۔ قرآن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ اسے ہر معاملہ میں ہدایت ملتی ہے اور وہ اسی پر چلتا ہے

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیرا"

"تم میں سے ان لوگوں کے لئے خدا کے رسول کے کردار و صفات میں ایک عمدہ نمونہ موجود ہے جو اللہ کے حضور جوابدہی اور آخرت کے دن کی امید رکھتے اور خدا کو کثرت سے یاد کرتے ہوں" ۵۹۷ ف

خدا سے ڈرنا اور آخرت کی فکر کرنا اور خدا کو کثرت سے یاد کرنا ہر زمانہ کے مسلمانوں پر جسطرح لازم اور ضروری ہے اسیطرح رسول کی ذات میں بھی ہر مسلمان کے لئے نمونہ ہے۔ خواہ وہ کسی بھی زمانہ کا مسلمان ہو۔

پرویز صاحب قرآن کی اس صریح ہدایت کے مقابل کچھ روایات کا اور زیادہ تر اپنے مفروضات کا ایک اچھا خاصا انبار لگاکر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول کا ہر عمل مسلمانوں کے لئے عمدہ نمونہ نہیں۔ اور ہر عمل کا مطلب آپکی ہاں یہ ہے کہ کوئی عمل بھی نمونہ نہیں۔ ورنہ ضروری تھا کہ جو پہلو آپ نے پیش کئے ہیں ان کے ماسوا اسوہ رسول کو لازم مانتے۔ چنانچہ ان نصوص قاطعہ میں سے ایک یہ ۔ ۔ ۔ مفروضہ ہے۔ کہ آنحضور نے جو مشرکین لڑکوں سے اپنی بیٹیوں کا نکاح فرمایا تھا تو وہ عمل ہمارے لئے کچھ بھی اسوہ نہیں۔ چلئے! یوں ہی سہی ہم اپنی بیٹیوں کا نکاح مشرکین سے نہیں کریں گے۔ مگر یہاں دو طرح کی چوک موجود ہے۔ ایک خود آپکی طرف سے یہ چوک ہوئی ہے کہ آپ

نورانی بشریت

میرے بزرگو اور عزیزو! حضور صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ نور ہیں۔ اس لئے آپ کا لباس بھی نورانی لباس ہے، اور آپ کی بشریت بھی نورانی بشریت ہے۔ حضور کی بشریت ما و شما کی سی بشریت نہیں۔ بلکہ وہ ایک بے مثل و بے نظیر اور نورانی بشریت ہے رُخ انور مظہر نورِ حق ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ مَنْ رَانِیْ فَقَدْ رَاَی الحق۔ جسم انور مشک و عنبر کی خوشبوؤں کا معدن ہے۔ چنانچہ دور و نزدیک کے شیدائی و فدائی اسی خوشبوِ دلآویز کے پتہ و نشان سے اور کسی سے پوچھے بغیر خوشبو کی راہنمائی میں ہی حضور کی خدمت میں پہنچ جاتے۔ اور دولت دیدار سے مشرف ہو جایا کرتے تھے ؎

نعمتیں بانٹتا جس سمت وہ ذی شان گیا
ساتھ ہی منشیِ رحمت کا قلمدان گیا

اور اب تک مدینہ منورہ کے در و دیوار کو ایک خوشبوِ خاص حاصل ہے۔ جو مشک و عنبر میں بھی نہیں ہے۔ کسی شاعر نے کیا اچھا لکھا ہے کہ ؎

زلفِ نبی کی خوشبو لے جائے گر صبا واں
شرمندہ مشک ہو کر ملکِ ختن سے نکلے

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو جس طرح سامنے دکھائی دیتا تھا۔ اسی طرح پیچھے سے بھی دکھائی دیتا تھا۔ اہل لطائف نے لکھا ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایک شمع ہدایت ہیں اور شمع ؟ ؎

نور عالم ہی کہاں اس کا نہیں بتلاؤ؟
پشت و رُو شمع کا ہوتا ہے کہیں بتلاؤ؟

چشم انور بظاہر خواب میں ہوتی مگر دل مشاہدۂ انوار و اسرار میں بیدار ہوتا۔ چنانچہ فرمایا یَنَامُ عَیْنِیْ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ۔ یعنی میری آنکھ سوتی ہے دل نہیں سوتا۔ ؎

بادشاہِ شہرِ یٰسین آپ ہیں ؛ گوہر دریائے طٰسین آپ ہیں
ہے اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ آسا وہاں ؛ لَا یَنَامُ قَلْبِیْ ہے خوابِ گراں

جسم انور کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا۔ اس لئے کہ آپ نور ہیں اور آپ کی

بیٹیوں کے دامن عصمت کو ہاتھ ڈالتے ہیں۔ حالانکہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ قابل بحث آنحضور کا اپنا ذاتی نکاح ہے جسے آپ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کیا اس لئے کہ حضرت ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کی بت پرستی کے متعلق قرآن میں کچھ موجود نہیں۔ اگر نہیں تو قرآن میں یہ کہاں ہے کہ آنحضور کے داماد بت پرست تھے۔ قرآن میں جب یہ دونوں چیزیں موجود نہیں تو آپ کس منہ سے اپنی ذاتی مقصد فہ روایات کی بناء پر قرآن کے ایک واضح حکم کو مجروح کرتے ہیں جبکہ آپ کے ہاں اول اور آخر قرآن ہے۔ اور یہ کونسا اصول ہے کہ باپ کے مسئلہ سے آنکھیں بند کر کے بیٹیوں کے مسئلہ کو سر کتاب کے کئی مضامین میں اچھال کر ان کے دامن عصمت کو تار تار کیا جائے۔ کیا یہ بھی قرآن دوستی کی کوئی قسم ہے

دوسری چیز کہ معاذاللہ! خدا تعالیٰ سے یہ واقعہ ہوئی ہے کہ اس نے حضرت ابراہیم کے اسوہ کا درس دیتے ہوئے تو یہ واضح فرما دیا کہ انکی اس دعا میں پیروی نہ کیجائے۔ جو انہوں نے اپنے باپ کے حق میں مانگی تھی۔ باقی ہر طرح ان کے اسوہ کو مانا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کا حکم دیتے وقت خدا یہ نکتہ بتانا چھوڑ گیا۔ کہ خبردار! بیٹیوں کے نکاح میں کہیں ان کے اسوہ کی پیروی نہ کرنے لگ جانا۔ اور جب چھوڑ گیا تو ہم یہی سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔ کہ اسوہ محمدی کا کچھ حصہ بھی قابل ترک نہیں اور آپ کی بیٹیوں کی جو تشہیر کی جا رہی ہے اس کی حقیقت ایک نہایت ناپاک بہتان سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ اور یہ بہتان سے زیادہ بے شرمی ہے

ذات کا نور آفتاب کے نور پر غالب تھا۔ مولانا جامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

سایہ ندیدست بر زمیں ہیچ کس — نور بود سایۂ خورشید و بس
جانش ز آلائش تن پاک بود — سایہ ہمیں انداختن بریں خاک دود
عکسِ جمال تو نمود آفتاب — سایہ ز نور آمدہ زاں در حجاب

ان اشعار کا اردو ترجمہ یہ ہے :۔

تھا نہ سایہ اس کا یہ مشہور ہے — سایۂ خورشید کیا ہے نور ہے
جان تھے آلائشِ تن سے وہ پاک — اس لئے سایہ نہ تھا بالائے خاک
نورِ خور اس نور سے مغلوب تھا — سایہ اس کا اس لئے محجوب تھا

حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہر شخص سے اونچے معلوم ہوتے تھے اگرچہ وہ کتنا ہی بلند قامت ہوتا۔ ؎

جس کے آگے سرِ سروراں خم رہیں!
اس سرِ تاجِ رفعت پہ لاکھوں سلام

حضور کے بدن پر مکھی نہ بیٹھتی تھی۔ آپ کا سایہ نہ تھا۔ حضرت امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ مواہب لدنیہ میں لکھتے ہیں۔

وَكَانَ عَرَقُهُ اَطْيَبُ مِنَ الْمِسْكِ۔ (رواہ ابونعیم) وَاِذَا مَشٰى مَعَ الطَّوِيْلِ طَالَهُ (رواہ البیہقی)۔ وَلَمْ يَقَعْ لَهُ ظِلٌّ عَلَى الْاَرْضِ وَلَا رُئِىَ لَهُ ظِلٌّ فِى شَمْسٍ وَلَا قَمَرٍ ××× وَلَا يَقَعُ عَلٰى ثِيَابِهٖ ذُبَابٌ قَطُّ وَلَا يَمْتَصُّ دَمَهُ الْبَعُوْضُ وَمَا اٰذَاهُ الْقَمْلُ۔ (مواہب لدنیہ ص۲۹۸ ج ۱)

حضور کا پسینہ مشک سے بھی زیادہ خوشبودار تھا۔ اور حضور جب کسی لمبے آدمی کے ساتھ چلتے۔ تو حضور ہی اس سے لمبے نظر آتے اور حضور کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا۔ اور نہ آپ کا سایہ چاند اور سورج کی روشنی میں نظر آتا تھا۔ اور آپ کے کپڑوں پر مکھیاں نہ بیٹھتی تھیں۔ اور مچھر بھی آپ کو نہیں کاٹتا تھا۔ اور جوئیں بھی اذیت نہیں دیتی تھیں"

الغرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بشریت مقدسہ ایک بےمثل بشریت ہے۔

اور بے شرمی سے زیادہ بہتان ہے۔
دوسری نص صریح آپ قرآن کے اس حکم کے مقابل یہ پیش کرتے ہیں جو آنحضور کی رائے کے غلط ہونے کا آپ کے نزدیک ایک زندہ ثبوت ہے۔[1] اس میں ہے کہ رسول نے اپنی رائے سے کھجور کا گابھا نہ لگانے کا جو حکم مدینہ کے باغبانوں کو فرمایا تھا وہ آپ کا حکم پیروی کے "قابل نہ تھا۔ اس لئے آپ کے اسوہ پر نہ چلا گیا۔ کیونکہ جب انصار نے گابھا لگانا چھوڑ دیا تو کھجوروں کا پھل تھوڑا آیا تھا جب انہوں نے اس کی شکایت کی تو آنحضور نے انہیں پہلے ہی طریقہ پر کاربند رہنے کی اجازت دیدی۔ اس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ اگر رسول کے حکم کے منشا کو نہ سمجھتے ہوئے اس پر عمل کرنے سے نقصان واقعہ ہو۔ تو اس کی اجازت سے اس عمل کو چھوڑا جا سکتا ہے معلوم نہیں قرآن میں کوئی چیز اس کے خلاف کہاں ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں باطل وجہ سے دوسروں کا مال کھانے کی جب ممانعت وارد ہوئی تو صحابہ نے ایک دوسرے کی دعوت کو قبول کر کے اس کے ہاں کھانا کھانا بھی چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ قرآن میں انہیں پھر اس کی اجازت دی گئی۔ اس سے کوئی عقل کا اندھا ہی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ پہلی ممانعت پیروی کے قابل نہ تھی۔ اور باطل طریقہ پر دوسروں کا مال کھانا جائز ہے۔
اس واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آنحضور نے اپنی رائے کے متعلق اسی غلطی کو دور فرما دیا جو اسے سمجھنے میں لوگوں کو لگ گئی۔ اس پر سوچا جا سکتا

---

[1] سبحان اللہ کہاں حدیث مؤیادیح کا خرافات ہونا اور کہاں اسکا قرآن کے مقابل زندہ ثبوت ہونا۔

ے ترے خُلق کو حق نے عظیم کہا تری خَلق کو حق نے جمیل کیا
کوئی تجھ سا ہوا ہے نہ ہوگا شہا ترے خالقِ حسن و ادا کی قسم

ارشادِ رومیؒ

آج کل کے بے ادب اور گستاخ یہ کہتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ کہ ہم بھی کھاتے ہیں۔ حضور بھی کھاتے تھے۔ ہم بھی پیتے ہیں۔ حضور بھی پیتے تھے۔ پھر وہ ہمارے جیسے بشر نہ ہوئے تو کیا ہوئے؟ ___ میرے دوستو! اس کا جواب مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے ایک شعر میں یہی دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ے

ایں خورد گردد پلیدی زیں جدا ٭ واں خورد گردد ہمہ نورِ خدا

یعنی یہ جو کچھ کھاتے پیتے ہیں۔ دیکھ لو اس کی نجاست بن جاتی ہے روٹی کھائیں۔ تو اس کا پاخانہ بن جائے۔ پانی پئیں۔ تو اس کا پیشاب بن جائے۔ مگر وہ یعنی حضور صلے اللہ علیہ وسلم جو کچھ تناول فرماتے ہیں۔ اس کا نورِ خدا بن جاتا ہے۔ پھر یہ کس منہ سے ان کی ہمسری کا دعوےٰ کرتے ہیں!

حضور کا بول مبارک

میرے بھائیو! ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کو رات کے وقت پیاس معلوم ہوئی۔ تو انہوں نے ایک برتن میں پڑا ہوا پانی پی لیا۔ صبح پتہ چلا۔ کہ وہ جسے امّ ایمن نے پانی سمجھ کر پی لیا تھا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بول مبارک تھا۔ جو حضور نے اس رات ایک جانب خانہ میں کسی برتن میں فرمایا تھا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ معلوم کرکے امّ ایمن سے فرمایا:۔

اَمَا وَاللّٰهِ لَا یَیْجَعَنَّ بَطْنُكِ اَبَدًا۔ (کنزالعمال صلا جلد ۲) (خصائص کبریٰ صلا جلد ۱) بخدا آج سے تیرا پیٹ کبھی درد نہ کرے گا۔"

دیکھا آپ نے میرے بھائیو!۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بول مبارک ہے۔ جو پیٹ کی بیماریاں گنوا رہا ہے۔ گویا میرے آقا و مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کا بول مبارک بھی دفع بلا فرماتا ہے۔ اور ہمارے لئے شفا ہے۔ اور ایک یہ ہیں جن کے تھوک کے لئے بھی ریل گاڑیوں میں لکھا ہوتا ہے۔ کہ تھوکو مت! اس

ہے کہ کیا یہ طرزِ عمل قرآن کے مطابق نہیں کہ جب آدمی دیکھے کہ اسکی رائے خواہ کسی درست ہی ہی کسی نقصان کا باعث بن رہی ہے۔ تو وہ اس نقصان کی تلافی کردے۔ اور اپنی بات اور رائے کی بلندی کا درس دینے ہی ہی نہ مصروف رہے کیا آنحضور کا یہ کردار کچھ بھی اسوہ کے قابل نہیں اور اسوہ کے قابل بات یہ ہے کہ اپنی بات پر ہر حال میں اڑا جائے۔

"واذ اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثا فلما نبأت بہ واظہرہ اللہ علیہ عرف بعضہ واعرض عن بعض فلما نبأہا بہ قالت من انبأک ہذا قال نبأنی العلیم الخبیر"

اور جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے کوئی بات پوشیدہ کی ہے کہی پھر جب اس بیوی نے وہ بات دوسری کسی بیوی پر ظاہر کر دی۔ تو اللہ نے پیغمبر کو اس واقعہ کی خبر کر دی۔ چنانچہ نبی نے ظاہر کرنے والی بیوی پر کچھ بات تو جتلا دی۔ اور کچھ سے اعراض برتا[1] چنانچہ جب آپ نے اس بیوی کو وہ بات بتلا دی۔ تو اس نے پوچھا آپ کو کس نے یہ بتایا تو نبی نے کہا مجھ کو تو سب سے بڑے جاننے والے اور سب سے بڑے خبر رکھنے والے نے خبر کی ہے" صـ ۷۵۱

اس آیت میں بیان ہونے والے واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضور نے

---

[1] یہ خط کشیدہ الفاظ پرویز صاحب کے ترجمہ میں موجود نہیں غالباً غیر قرآنی وحی کے ڈر سے آپ نے آیت کے ترجمہ میں یہ تصرف کیا ہے۔

سے بیماری پھیلتی ہے۔ گویا حضور کا بول مبارک بھی شفاء اور ان کا لعاب دہن بھی دواء۔ پھر ان کی ہمسری کا دعوٰی کیا اس شعر کا مصداق نہیں۔ کہ ؎

خدا کی شان تو دیکھو کہ گلچڑی گنجی!
حضور بلبلِ بستاں کرے نواسنجی!

حسن و جمالِ نور میرے بزرگو! صحابہ کرام علیہم الرضوان سے پوچھئے کہ وہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نورانی حسن و جمال کا کس انداز میں ذکر فرماتے ہیں۔ حضرت ابو ہند بن ابی ہالہ فرماتے ہیں۔

یَتَلَأْلَؤُ وَجْهُهٗ تَلَأْلُؤَ الْقَمَرِ ۔۔۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا تھا" (شمائل ترمذی ص۳)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے ایک روشن رات میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ حضور ایک سرخ رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے تشریف فرما تھے۔ میں ایک نظر آسمان پر چودھویں کے چاند کی طرف کرتا۔ اور ایک حضور کے چہرۂ انور کی طرف۔

فَاِذَا هُوَ اَحْسَنُ عِنْدِیْ مِنَ الْقَمَرِ۔ تو حضور کا چہرۂ انور مجھے چودھویں کے چاند سے زیادہ حسین و جمیل نظر آتا تھا۔ (مشکوٰۃ شریف ص۵۱۸)

دیکھا آپ نے حسن و جمال نور صلے اللہ علیہ وسلم کہ چاند بھی ماند ہے ؎

چاند سے تشبیہہ دینا کیا ہی انصاف ہے!
اس کے منہ پر چھائیاں حضرت کا چہرہ صاف ہے

اس حسن و جمالِ نور کی تنویر نے عالم کا ذرہ ذرہ چمکا دیا ؎

نور اندر نور باہر کوچہ کوچہ نور ہے!
بلکہ یوں کہئے کہ سب دنیا کی دنیا نور ہے!

تنویرِ نور میرے بھائیو! ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فیض نور ہے کہ جس پر نظر کرم پڑ گئی۔ اُسے بھی روشن کر دیا۔ چنانچہ ایک شب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور کی مجلس سے اٹھے۔ اور اپنے اپنے گھر جانے لگے۔ تو اندھیری رات تھی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اعجاز سے ان کی

اپنی ایک بیوی کو راز کی بات بتائی۔ مثلاً یہ کہ میں آئندہ شہد نہ استعمال کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ اس نے یہ بات اپنی ساتھی سوکن کو بتا دی۔ اس پر اللہ نے آنحضور کو اطلاع دی کہ آپ کا راز نکل چکا ہے۔ یہ معلوم ہونے پر آپ نے راز نکالنے والی بیوی کے سامنے اس کا کچھ اظہار فرمایا اور کچھ بات گول کر دی اس پر ان بیوی صاحبہ نے پوچھا کہ آپ کو اس کا حال کس نے بتایا اور اس کی صحت کا کیا اعتبار ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے خدا نے اس کی اطلاع فرمائی ہے

اس بیان کے خط کشیدہ چار مقامات سے غیر قرآنی وحی کا ثبوت ملتا ہے

پہلے مقام پر جو اللہ نے آپ کو بیوی کے افشائے راز کی اطلاع فرمائی۔ وہ قرآن میں کہیں موجود نہیں مگر ہے وحی۔ اور قرآن میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ آنحضور کی بیوی نے آپ کا کونسا راز نکالا تھا معلوم یہ ہوا کہ کچھ وحی قرآن کے خارج بھی ہے جس سے آپ وقتاً فوقتاً خدا کی طرف سے مشرف ہوتے رہتے تھے۔ دوسرے مقام پر جب اللہ نے آپ کو اس واقعہ سے مطلع فرمایا تو آپ نے اپنی بیوی سے بھی اس کا کچھ اظہار فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ قرآن نہ تھا ورنہ آپ وہ کچھ کی بجائے سارا ظاہر فرماتے۔ اور وہ جو کچھ آپ نے وہاں ظاہر فرمایا اس سے بھی ہم تو واقف نہیں۔ حالانکہ ہم قرآن سے واقف ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ وحی کا علم آپ کی ذاتیات سے متعلق تھا۔ اور اس کے ساتھ قرآن سے بھی خارج تھا۔

تیسرے مقام پر راز دار بیوی نے جو آپ سے پوچھا کہ آپ کو میرے متعلق اسبات کی اطلاع کیسے ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کی طرف سے

لاٹھیاں چمکنے لگیں۔ اور وہ اُن لاٹھیوں کی روشنی میں اپنے اپنے گھروں میں پہنچ گئے۔ یہ حدیث خصائص کبریٰ کے صفحہ جلد ۲ پر دیکھ لیجئے۔ معلوم ہوا۔ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نور ہیں۔ اور وہ جس کو چاہیں۔ اپنے اس فیضِ نور سے مستنیر و روشن فرما دیتے ہیں۔ اور جو یہاں آتا ہے۔ اس فیضِ نور سے حصہ لے کر جاتا ہے۔ سبحان اللہ! اعلیٰ حضرت نے اپنے قصیدۂ نور میں کیا اچھا لکھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

جو گدا دیکھو لئے جاتا ہے توڑا نور کا
نور کی سرکار ہے کیا اس میں توڑا نور کا

اس شعر میں لفظ "توڑا" قابلِ داد ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اس لفظ کو ہر دو مصرعوں میں مختلف معنوں میں استعمال فرمایا ہے۔ پہلے "توڑا" سے مراد "حصہ" ہے۔ اور دوسرے "توڑا" سے مراد "نقصان" ہے۔ ان دونو معنوں کو پیشِ نظر رکھ کر پھر یہ شعر پڑھئے ؎

جو گدا دیکھو لئے جاتا ہے توڑا نور کا!
نور کی سرکار ہے کیا اس میں توڑا نور کا

الغرض ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نور ہیں۔ اور آپکے فیضِ نور سے دنیا کا ہر صاحبِ کمال مستفید و مستنیر ہے۔ اور آپ کا حسن و جمال اس قدر بے مثل و بےنظیر ہے۔ کہ چودھویں کا چاند بھی اسکے سامنے ماند ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال مشہور ہے۔ مگر ؎

اے صَلِّ عَلٰے گرمیٔ بازارِ محمدؐ!
یوسف بھی ہے سو جاں سے خریدارِ محمدؐ

حسنِ مستور ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا جو حسن و جمال ہے۔ حق تعالیٰ نے اسے کئی پردوں میں مستور فرمایا ہے۔ ورنہ کس کی مجال تھی۔ کہ وہ اس حسنِ نور کی تاب لا سکتا؟ باوجود حسنِ مستور ہونے کے اس حسنِ نور کا یہ عالم ہے کہ ؎

نگاہیں برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں ٭ وہ آدمی ہیں مگر دیکھنے کی تاب نہیں

ہوئی۔ اگر آپ کے پاس خدا کی طرف سے صرف قرآن ہی ذریعہ اطلاع ہوتا تو سرے سے اس سوال اور جواب کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ اور وہ بیوی اور ہر دوسرا آدمی قرآن ہی سے اصل واقعات کا علم حاصل کر لیتا۔

چوتھی وجہ اس میں غیر قرآنی وحی کی یہ ہے۔ کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے اس افشائے راز کی خبر فرمائی ہے۔ اور جب یہ مضمون قرآن میں نہیں تو معلوم ہوا کہ وحی کا کچھ حصہ قرآن کے باہر بھی ہے۔ وہ وحی باطل ہے کہ اللہ کی طرف سے ہے اور قرآن میں اس لئے نہیں کہ اس میں اسکا کہیں سراغ نہیں ملتا۔

یہاں پرویز صاحب کا یہ خانہ ساز اصول بری طرح مجروح ہوتا ہے کہ قرآن میں صرف اصولی احکام ہیں۔ اور جزئیات نہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ قرآن میں مسائل نکاح اور اصول خانہ داری کو اس شرح و بسط کیساتھ کہیں بھی بیان نہیں کیا گیا۔ جتنا کچھ اس میاں بیوی کے بالکل ذاتیاتی قسم کے ایک وقتی واقعہ کو قصہ کا رنگ دیکر پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح بھی صحیح نہیں کہ دستور و آئین کی کتاب میں صرف میاں بیوی کی راز داری کے متعلق دفعات رکھی جائیں۔ اور شادی نکاح کے مسائل کو بالکل نہ لایا جائے۔ اس بنا پر اصول و جزئیات کی یہ تقسیم باطل ہے۔

اس واقعہ کا ایک دوسرا پہلو بھی خاصا غور طلب ہے۔ جس سورۃ میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس کا زیادہ تر حصہ رسول کی بیویوں کی فہمائش و نصیحت پر مشتمل ہے۔ اور اس میں خوشدلی کا پہلو سامنے آتا ہے۔ اس سے معلوم

اور اگر وہ حسنِ نورِ حسن مستور نہ ہوتا۔ تو کیا ہوتا؟ سنیئے! حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ایک واقعہ سنیئے! یہ واقعہ مغنی الواعظین میں درج ہے۔ اور اسے میں پنجابی شعروں میں پیش کرتا ہوں۔ سنیئے ؎

اک دن صدیقہ نے کہیا نال ادب یا حضرت!
برکت نور تساڈے تھیں رب کیتی ساری خلقت
کہیہ موجب ہے دسو مینوں ہے اک مطلب میرا
حسن تساڈے تھیں یوسف دا کیوں سی حسن ودھیرا
ایہہ گل سُن حضرت فرمایا بی بی خیر نساء نوں
سن میں اَج ہاں ظاہر کردا مخفی راز خدا نوں
چہرے انور میرے اُتے خالق پاک الٰہی!
پردے پا ہفتاد ہزاراں اصلی شکل چھپائی
جے اک پردہ رُخ مرے تھیں خالق پاک اٹھادے
تابش جھل نہ سکے کوئی چن سورج چھپ جاوے
بی بی کہندی حضرت رب تھیں پردہ اک اٹھواؤ
مینوں اوہ نورانی چہرہ اصلی آپ دکھاؤ
جبرئیل فرشتہ فوراً خدمت اندر آیا!!
حضرت دے رخ انور تھیں اک پردہ آن اٹھایا
اچن چیتی منہ تھیں ایسا شعلہ ہو یا ظاہر
تابش جھل نہ سکی بی بی نس بھج نکلی باہر
جاں پھر پردہ جیوں اگے سی صورت اپر آیا
صدیقہ نوں سدیاں حضرت نے فرمایا
میری صورت وچوں دستیں جدوں پیا لشکارا
کیوں حجرے تھیں باہر ہویوں اکو دیکھ نظارا
بی بی کہندی یا حضرت جی جدوں پیا لشکارا
میں جاتا حجرے اگ لگی سڑدا عالم سارا

ایسا ہوتا ہے کہ بیویوں کے کیس میں رسول کی خدا تعالیٰ وکالت فرما رہا ہے۔ ادھر جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس میں بڑے بڑے حکمرانوں اور عدالت کے عہدہ داروں تک کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دن میں لوگوں کی جان ومال کے فیصلے کرتے جب رات کو گھر جاتے ہیں تو وہاں بیوی کی عدالت میں ناکردہ گناہ مجرم ہوتے ہیں۔ ان کی اور دوسرے لوگوں کی بیویوں کے لئے بھی قرآن میں ہدایات موجود ہیں۔ لیکن رسول کی بیویوں کو وفا شعار بنانے کا بیڑا جب خود اللہ نے اٹھایا۔ تو اس سے بجا طور پر یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ آپ کا ہر عمل لوگوں کے لئے اسوہ ہے۔ دوسرے عام امیر اور عالم وقت خواہ بیوی کے ہاتھوں مار کھائیں یا وقت بے وقت انہیں ڈانٹیں۔ ان کا یہ بیوی کو پیٹنا یا اس کے ہاتھوں پٹنا چونکہ لوگوں کے لئے کچھ بھی اسوہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ان میں سے کسی کی بیوی کی اصلاح پر خدا نے یہ کچھ توجہ نہیں دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی پبلک زندگی خانگی زندگی سے زیادہ ستھری ہے۔ اور خانگی زندگی پبلک زندگی سے زیادہ قابل رشک ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

"فلما قضیٰ زید منہا وطراً زوجنٰکہا لکیلا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیاءہم اذا قضوا منہن وطراً۔

پھر جب زید کی طبیعت اپنی بیوی کی طرف سے سیر ہو گئی تو ہم نے آپ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مومنین پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے نکاح کے بارہ میں کچھ تنگی نہ رہے۔" ۳۷۵

تو میرے بھائیو! حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا حسن نور حسن مستور ہے اور اس حسن مستور کے جلووں کا بھی یہ عالم ہے کہ ؎

حسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشت زناں
سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب

حضرت یوسف علیہ السلام اور قحط سالی

حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر کے بادشاہ ہوئے تو ایک مرتبہ ملک میں قحط پڑ گیا۔ یوسف علیہ السلام نے اعلانِ عام فرما دیا۔ کہ جس کسی کو گندم کی ضرورت ہو۔ وہ سرکاری خزانے سے آکر گندم لے جائے۔ چنانچہ ہر ضرورت مند سرکاری خزانے میں آنے لگا۔ اور حسب ضرورت وہاں سے گندم پانے لگا۔ اتفاق دیکھیے۔ کہ اگلی فصل کو ابھی تین مہینے باقی تھے۔ کہ سرکاری خزانے میں بھی گندم ختم ہو گئی۔ اب حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی فکر پیدا ہوئی۔ کہ یہ تین مہینے کیسے نکلیں گے؟ اسی فکر میں تھے کہ ؎

اوسے وقت جناب الاہوں وحی پیام لیاندا!
یا نبی اللہ حکم تسانوں پاک خدا فرماندا!
برقعہ کھول زیارت بخشو جو بھکھا بھی آوے
ویکھ جمال مبارک تیرا بھُک تمامی جاوے

سبحان اللہ! ایک یہ نبی کا چہرہ ہے۔ کہ بھوکا دیکھے تو بھوک جاتی رہے۔ اور ایک ان اپنی مثل کہنے والوں کا منحوس چہرہ بھی ہے۔ کہ اگر شومئ تقدیر سے نظر آ جائے۔ تو سارا دن روٹی ہی نہ ملے۔ ہاں تو شاعر لکھتا ہے۔ کہ لوگ تین مہینے تک حضرت یوسف علیہ السلام کی زیارت کرتے رہے۔ اور اسی زیارت سے سیر ہوتے رہے۔ شاعر نے یہ واقعہ لکھنے کے بعد جو آخری مصرعہ لکھا ہے۔ وہ قابلِ داد ہے۔ لکھتا ہے ؎

ترن مہینے رجی خلقت دیکھ یوسف کنعانی
جنہاں محمد عربی ڈٹھا رجّے دو ہیں جہانی

اس آیت میں اس واقعہ کا بیان ہے کہ حضرت زید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ جن کے نکاح میں آنحضور کی پھوپھی زاد بی بی حضرت زینب تھیں۔ انہوں نے انہیں طلاق دے دی۔ تو اللہ نے ان کا نکاح خود آنحضور سے فرما دیا۔ کیونکہ زید آپ کے منہ بولے بیٹے بھی تھے اور ان کی مطلقہ بیوی کا آپ کے نکاح میں آنا یہ معنی رکھتا تھا کہ منہ بولے بیٹے کی جورو سے نکاح ہو سکتا ہے۔ اور یہ چونکہ عرب رواج کے خلاف ایک اہم اقدام تھا۔ اور ان کے دوسرے غلط رواجوں کی طرح اس رواج کو مٹانا بھی ضروری تھا۔ اس لئے قرآن میں اس نکاح کا تذکرہ انہیں الفاظ میں وارد ہوا کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے اپنے منہ بولے بیٹوں کی جوروؤں سے نکاح کی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ قرآن میں آنحضور کو اس کے متعلق کوئی احکام دیئے گئے اور نہ یہ فرمایا گیا کہ آپ ان سے نکاح کر لیں۔ اور پھر بھی قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے تجھ سے اس کا نکاح قائم کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ نے جو یہ نکاح قائم فرمایا تو یہ وحی کے ذریعہ ہوا اور اس وحی کے ذریعہ انجام پایا جو قرآن میں نہیں۔ چنانچہ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ آپ کا ہر عمل وحی کے مطابق ہوتا تھا۔ اور مسلمانوں کے لئے اسوہ اور نمونہ بھی۔

"حاطب ایک معزز صحابی تھے۔ انہوں نے ایک مخفی خط کے ذریعہ قریش کو اس تیاری کی اطلاع دینی چاہی۔ نبی اکرم کو اس واقعہ کا پتہ چل گیا۔ اور قاصد کو راستہ ہی میں روک لیا گیا"۔ ص ۵۷۳

سُبحَانَ اللہ ! سُبحَانَ اللہ !! کیا اچھا لکھا ہے۔ کہ جنہوں نے حضور کے رُخِ انور کو دیکھ لیا۔ بس وہ دو جہاں سے بے نیاز ہو گئے الٰہی! ہمیں اسی رُخِ انور کا فدائی و شیدائی رکھ۔ اور جب دم نکلے۔ تو یہی چہرۂ نور ہمارے سامنے ہو۔ آمین !

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○

اس واقعہ کو پرویز صاحب نے داخل کتاب تو کر لیا مگر بالکل بے جان بنا کر
اس بیان سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضور اپنے صحابہ پر روسی کمیونسٹ
حکومت کیطرح کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ اور ان کی خط و کتابت پر آپ نے
سنسر کا پہرا قائم کر رکھا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید ان میں سے اکثر
جاسوس یا دشمن کے ایجنٹ ہیں۔ بہر حال آنحضور کو فتح مکہ کے سفر میں
اپنے ایک ایسے صحابی کا پتہ چلگیا۔ بس ویسے ہی چل گیا۔ جیسے ایک دہریہ کہہ دیتا
ہے کہ مادہ میں ویسے ہی روح داخل ہو جاتا ہے اور وہ زندہ جسم بن جاتا ہے
پھر کچھ مدت بعد اس سے روح نکل کر ویسے ہی کہیں چلا جاتا ہے۔ اس لئے
کسی خالق کو نہ مانا جائے یہ مفروضہ اس کے نزدیک بڑا معقول ہے اور اگر
کہا جائے کہ خدا ہر جاندار کو پیدا کرتا ہے اور وہی مارتا ہے تو یہ بات اس کے ہاں
کچھ بھی عقل کی بات نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح یہاں اگر آپ کہیں کہ رسول کو
وحی کے ذریعہ اس خفیہ پیام رسانی کا علم ہو گیا۔ تو پرویز صاحب کے ہاں یہ ٹھیک
نہیں اور ٹھیک یہ کہنا ہے کہ رسول کو ویسے ہی اس خط کا کسی نہ کسی طرح
پتہ چل گیا۔ اور اس پتہ چل جانے پر ہی آپ نے اس خط کی ریسرچ شروع
کر دی۔

آپ کی اس دھاندلی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کتب حدیث
میں جو روایت اس واقعہ کی بنیاد ہے اس کی تفصیلات میں کہیں بھی
یہ موجود نہیں کہ آنحضور کو اس خط کا سراغ کسی انسانی ذریعہ معلومات سے
مل گیا تھا۔ بلکہ وہاں صرف یہ ہے کہ آنحضور نے حضرت علی کو دو اور آدمیوں

ساتواں وعظ

معراج شریف

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۝

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (پ ۱۵ ع ۱)

پاکی ہے اُسے جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا مسجد حرام سے مسجد اقصٰی تک۔ جس کے گرداگرد ہم نے برکت رکھی

کے ہمراہ فتح مکہ کے سفر کے دوران ایک کھجوروں کے جھنڈ میں اس غرض کیلئے بھیجا کہ وہاں ایک شتر سوار عورت کے پاس ایک خط ہے اور وہ اس سے لیا جائے چنانچہ وہ گئے اور عورت کو وہاں بالکل اسی شکل و ہیئت میں پایا۔ اور اسے خط نکالنے کو کہا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس کوئی خط وغیرہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر ننگا ہونے کا خطرہ مول نہ لینا ہو تو اس خط کو خود ہی نکال باہر کرو۔ یہ سنکر اس نے فوراً اپنے گیسوؤں کے نیچے باندھا ہوا خط نکال کر دے دیا۔ اور وہ اسے لیکر حاضر ہو گئے۔

واقعہ کی اس ساری تفصیل کو تو آپ مانتے نہیں اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ رسول کو اپنے ایک ساتھی کے خفیہ خط کا پتہ چل گیا اور کہیں سے چل گیا اس موقعہ پر اگر آپ کہیں کہ وحی کے ذریعہ رسول کو اس کا علم ہو گیا۔ تو یہ ماننا لازم آتا ہے کہ قرآن کے خارج بھی وحی ہے۔ کیونکہ قرآن میں تو یہ واقعہ ہے نہیں۔ اور اس طرح حدیث اور سیرۃ رسول کیخلاف وہ مقدس جہاد ختم ہو جاتا ہے جو آپ نے بہت بڑے عرصہ سے جاری کر رکھا ہے۔ اس لحاظ سے بہتر یہ تھا کہ ایسے واقعات کو معراج الانسانیت میں آپ سرے سے بیان نہ کرتے۔ پھر اگر بیان کرنا تھا تو دریا میں غوطے لگانا اور کپڑے بچانا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

کہ ہم اسے اپنی عظیم نشانیاں دکھائیں۔بیشک وہ سُنتا دیکھتا ہے۔"

حضرات! آج میرے وعظ کا عنوان ہے "معراج شریف" ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بے شمار معجزات میں سے ایک بہت بڑا معجزہ یہ معراج شریف بھی ہے۔شب معراج حضور صلے اللہ علیہ و سلم کا جاگتے ہوئے جسم شریف کے ساتھ آسمانوں پر تشریف لے جانا۔اور اپنے خالق کا دیدار پانا۔اور ماکان و مایکون کے علوم و اسرار پاکر آن کی آن میں واپس آجانا بیشک ہماری حدِ عقل سے باہر ہے۔اور یہ عقل حیران ہے۔کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے مگر یہ ہمارے ایمان میں ضرور داخل ہے۔اور ہمارا ایمان ہے۔کہ بیشک حضور صلے اللہ علیہ و سلم جاگتے ہوئے جسم شریف کے ساتھ مسجد حرام سے مسجد اقصلےٰ تک، اور پھر وہاں سے آسمان پر، اور پھر عرش پر تشریف لے گئے۔اور دیدار و اسرار پاکر آن کی آن میں واپس بھی اس طرح تشریف لے آئے کہ، سے

زنجیر بھی ہلتی رہی بستر بھی رہا گرم
اِک دم میں سرِ عرش گئے آئے محمدؐ

مُعجزہ معجزہ کہتے ہی اُسے ہیں جو عقل کو عاجز کردے۔جو بات عقل میں آجائے۔وہ معجزہ ہی نہیں۔من بھر دودھ وہی ہے جو پاؤ بھر پیالی میں نہ سما سکے۔اور جو دودھ پاؤ بھر پیالی میں آگیا۔وہ دودھ من بھر ہے ہی نہیں۔معجزہ وہی ہے۔جو ہماری محدود عقلوں میں نہ آسکے۔انبیاء کرام علیہم السلام کے جس قدر بھی معجزات ہیں۔وہ اگرچہ ہماری محدود عقلوں میں نہیں آسکتے۔مگر ہمارا ان پر ایمان ضرور ہے۔اور ہم جملہ انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات کو تسلیم کرتے ہیں۔تو جس خدا نے طور کی چوٹی پر حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کو شرفِ ہم کلامی بخشا۔اسی نے ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو عرش کی بلندی پر شرفِ دید و کلام سے نوازا۔جس خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ایک دریائے عظیم کو پھاڑ کر اس میں

ذاتی رائے اور وحی

"وہ فوراً دریافت کر لیتے تھے کہ یہ وحی کا فیصلہ ہے یا حضور کی ذاتی رائے
وحی کے فیصلے کے بعد کسی کو حق بحث و تمحیص باقی نہیں رہتا تھا۔" ص۴۲۲

یہاں پرویز صاحب کتاب پڑھنے والے کی توجہ اصل مسئلہ سے ہٹا کر ایسے عجیب الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ رسول کے پاس قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی یا نہیں۔ اسکا جواب دینے کی بجائے آپ کہتے ہیں کہ صحابہ رسول سے ہر بات میں پوچھتے تھے کہ وہ وحی ہے یا آپکی ذاتی رائے۔ حالانکہ اگر صرف قرآن میں وحی ہوتی تو انہیں پوچھنا یہ چاہیئے تھا۔ کہ آپ قرآن کا حکم دے رہے ہیں یا اپنی طرف سے اپنا حکم چلا رہے ہیں۔

اس کے بعد یہاں ایک الجھن اور بھی ہے اور وہ یہ کہ جب قرآن میں اطاعت رسول کے ساتھ یہ فیصلہ بھی موجود ہے کہ رسول وحی کے بغیر کچھ بھی نہیں کرتا۔ تو صحابہ کو اس کے بعد یہ دریافت کرنے کا کیا موقعہ باقی رہا۔ کہ آپ کی ہدایت میں سے کیا کچھ وحی ہے اور کیا کچھ آپ کی ذاتی رائے۔ اسی خیال کو جب کچھ لوگوں نے بے جا اہمیت دی اور قرآن میں اور احادیث میں آنحضور کے متعلق کچھ باتیں ایسی ظاہر کیں جو بعض پہلوؤں سے مفید یا ضروری نہ سمجھی گئیں۔ تو وہ اس فیصلہ پر پہنچے کہ وحی صرف قرآن ہے اور قرآن میں جو ہے کہ رسول وحی کے بغیر کوئی بات نہیں کرتا تو اس سے مراد تلاوت قرآن ہے۔ اور کچھ دوسروں نے جو قرآن میں اطاعت رسول کے تاکیدی حکم اور حدیث کے مفید عمل

خشک راستہ بنا دیا۔ اسی خدا نے ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے فرش سے عرش تک کے جملہ موانع کو ہٹا کر ایک ایسا نورانی راستہ تیار فرما دیا۔ جس راستے سے حضور اوپر تشریف لے بھی گئے۔ اور آ بھی گئے۔ جس قادرِ مطلق کی قدرت نے حضرت خلیل علیہ السلام کے لئے بھڑکتے ہوئے شعلوں، اور دہکتے ہوئے انگاروں کو چمنستان بنا دیا۔ اسی خدا نے ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے سارے ناری کرّوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ اور حضور ان میں سے گزر گئے۔ ایک مومن جب جبریل علیہ السلام کا آسمانوں کی بلندیوں سے زمین پر آ جانا تسلیم کر لیتا ہے۔ تو خود مہبطِ جبریل حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا زمین سے بلندیوں پر تشریف لیجانا کیوں تسلیم نہ کریگا؟ میرے بھائیو! مسلمان کی عقل اس کے ایمان کی تابع ہے۔ یعنی مسلمان کی عقل بھی مومن ہے۔ لہٰذا عقلِ سلیم کا تو یہی اعلان ہے کہ ؎

سرکار نے کیں منزلیں طے معہ جسد پاک ٭ سرکار نے ہر چیز کو دیکھا شبِ معراج
جس کی کسی انسان نے پائی نہ ہوا بھی ٭ وہ مرتبہ سرکار نے پایا شبِ معراج

جو طالب و مطلوب میں تھے اٹھ گئے پردے
جو راز تھے سب ہو گئے ہیں وا شبِ معراج

بیوقوف عقلمند آجکل کے مدعیانِ عقل و فراست معجزہ کے باب میں آکر عجیب بیوقوفی کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ حضور اوپر کیسے چلے گئے۔ پھر آن کی آن میں واپس کیسے آ گئے۔ کہ بستر بھی گرم پایا۔ اور زنجیر بھی ہلتی پائی۔ آسمان میں کوئی راستہ نہیں۔ آپ آسمانوں میں سے کیسے گزرے؟ راستے میں آگ کے کرّے آتے ہیں۔ ان میں سے کیسے نکل گئے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ خدا کی قدرت سے گئے اور آئے۔ اور خدا جس نے اپنے محبوب کو بلایا تھا۔ وہی راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرنے والا تھا۔ اب جو واقعی عقلمند ہے وہ تو ایمان لے آئے گا۔ اور جو بے وقوف عقلمند ہے۔ وہ اپنی عاجز عقل ہی کی دم پکڑے رہے گا۔

ہونے کے پہلو کو سامنے رکھا تو یہ کہا کہ آنحضور کا بولنا وحی ہے۔ اور اس میں جو چیز وحی نہیں اس کا تعین کرنا آپ کا اپنا منصب ہے نہ کہ کسی دوسرے کا یہ خیال اگرچہ پہلے خیال کی بنسبت تھوڑا غلط ہے مگر ہے غلط ہی۔ کیونکہ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ آپ صرف قرآن بولتے تھے۔ یا کچھ وحی کے خلاف بھی بولتے تھے۔ بلکہ وہاں بالکل دوٹوک فیصلہ یہ ہے کہ آپکا ہر جو بول وحی ہے اور صرف وحی۔ پھر آپ کی اطاعت کا بالکل خدا کی طاعت کے پہلو بہ پہلو تکرار اور تاکید کے ساتھ جو حکم دیا گیا اور آپ کے فیصلہ کے خلاف کچھ سوچنا بھی ایمان کے منافی ٹھیرایا گیا اور آپ کی آواز کے برابر آواز اٹھانے سے اعمال ضائع ہو جانے کا خطرہ دلایا گیا۔ تو کیا یہ سب کچھ یہ بتانے کے لئے ہوا کہ آپکی بات وحی نہیں۔ اگر آپ کی بات وحی نہ تھی تو اس کی یہ قدر و قیمت کبھی نہ ہونی چاہئے تھی۔ محض یہ بات کہ آپ وقت کے امیر یا حاکم تھے اس کا باعث کیسے ہو گئی۔ کہ آپ کے کسی غلط فیصلہ کے خلاف بھی کچھ کہا اور سوچا نہ جائے۔ اور اس کے خلاف کچھ کہنے اور سوچنے سے انسان مسلمان نہ رہے۔ حالانکہ غلط فیصلہ کی اصلاح کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہوتا ہے۔ جس فیصلہ کے خلاف کچھ سوچنا بھی ایمان کے منافی ہو۔ ایسا فیصلہ تو صرف وہی ہو سکتا ہے جو وحی کا فیصلہ ہو نہ کہ ہر امیر وقت کا فیصلہ۔

اب اس پر آئیے کہ اگر رسول کی بعض باتوں کا بعض اوقات مفید نہ ہونا تسلیم کر لیا جائے۔ تو اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ آپکی بات وحی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ وحی کا

ہمالیہ کی چوٹی

ابھی کل کی بات ہے۔ کہ جن سنگھ ایک نیپالی آدمی جو مسلمان بھی نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ کہ میں ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی پر چڑھ گیا ہوں۔ تو ان "عقلمندوں" نے بغیر کسی حیل وحجت کے فوراً اس کی بات مان لی۔ اور تقریروں میں، اخباروں میں، اسکے اس کارنامے کا چرچا کرنے لگے۔ یہاں کسی کی بھی تو عقل آڑے نہ آئی۔ کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ دنیا کی بلند ترین چوٹی پر جن سنگھ چڑھ جائے۔ اس جن سنگھ نے یہ بھی کہا تھا۔ کہ میں اس چوٹی پر چڑھتے ہوئے ایک جگہ ۳۶ گھنٹے بھوکا پیاسا کھڑا رہا۔ اس پر بھی کسی "عقلمند" کی عقل نے اعتراض نہ کیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہاں اس عقل کو ان "عقلمندوں" نے معجزات انبیاء کے انکار کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ جن سنگھ کا کہنا کہ میں دنیا کی بلند ترین چوٹی ہمالیہ پر چڑھ گیا ہوں۔ یہ تو فوراً تسلیم کرلیتے ہیں۔ اور سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ میں عرش کی بلندیوں پر تشریف لے گیا۔ ان کی عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔ تو پھر کیوں نہ ایسی عقل والوں کو "بے وقوف عقلمند" کہا جائے۔

چاند تک

میرے دوستو! اس دور میں یہ لوگ ہمارے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج پاک کا انکار کرتے ہوئے شرماتے بھی نہیں۔ حالانکہ آجکل یہ لوگ خود اس بات کا پراپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ کہ عنقریب ایک ایسا راکٹ تیار ہونے والا ہے۔ جس پر سوار ہو کر ہم چاند تک پہنچ جائینگے حتےٰ کہ اخبارات میں یہ خبریں بھی آنے لگیں۔ کہ امریکہ و یورپ میں بعض لوگ چاند میں اپنے اپنے نام زمینیں الاٹ کرا رہے ہیں۔ ایک اخبار میں میں نے پڑھا۔ کہ امریکہ کے ایک پادری صاحب نے چاند میں ایک قطعہ زمین خرید کی ہے۔ اور اعلان کیا ہے۔ کہ میں اس قطعہ میں گرجا بناؤں گا۔ اور یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ زمین سے چاند تک کے راستے میں کئی سٹیشن بنائے جائینگے ویٹنگ روم بھی تعمیر کئے جائیں گے۔ ہوٹل۔ سیرگاہیں اور عیش و عشرت کے سارے سامان مہیا کئے جائیں گے۔ تو کیوں بھا یو! ان خبروں پر بھی

کچھ حصہ کسی ایک وقت کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتا۔ یا قابل فہم نہیں۔ اس میں کوئی بھی خرابی کا پہلو نہیں۔ اور یہ ہو جاتا ہے کہ ایک زمانہ کے لوگ وحی کے ایک حکم کو سمجھ نہیں پاتے۔ لیکن جہاں حالت یہ ہو کہ خدا کی طرف سے ایک حکم نازل ہوا اور جس پر نازل ہو وہ اس کے فہم میں دوسروں کے برابر ہو۔ اور اس حکم کو جلدی یا بدیر عمل میں لانے اور اسکی شکل بنانے میں دوسرے بھی اس کے ساتھ برابر کے شریک ہوں۔ اور فیصلہ کا مالک کوئی ایک بھی نہ ہو۔ تو اسطرح کسی حکم کی تعمیل کبھی ممکن نہیں۔ اس کے بعد اگر صاحبِ کتاب کو اس کے صاحب کتاب ہونے کی بنا پر فیصلہ کا مالک بنایا جائے تو یہ چیز اس کے ہر فیصلہ کے صحیح ہونے کی کچھ بھی دلیل نہیں۔ اور جہاں مطلق سمجھ کو معیار بنایا گیا ہو وہاں یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص واحد کی رائے ہر معاملہ میں سند ہو۔ اگرچہ واقعہ میں اس کی اکثر باتیں صحیح ہوتی ہوں۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے اس کی ایک غلطی اسکی تمام خوبیوں پر اور پوری جماعت کی محنت پر پانی پھیر دے۔ اس کے بعد خدا کے حکم کی تعمیل صرف اسی طرح ممکن ہے کہ رسول کی سرکردگی میں اس کی تعمیل ہو۔ اور ہو بھی اس لئے کہ اسکی رائے صحیح اور حق ہے۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اسکی بات کو وحی مانا جائے۔ اور جب مانا جائے تو اس سے اسی کے ایسا ماننے میں کچھ فرق نہیں لگتا۔ کہ اس کی بعض باتیں بعض حالات میں ضروری نہیں۔ اس لئے کہ اس کی باتوں کے وحی ہونے کا حکم ان کے مجموعہ کے پیش نظر لگایا جاتا ہے۔ نہ کہ ان کے کسی ایک جزو پر

کسی بے وقوف عقلمند کی رگِ سائنس پھڑکی ؟ نہیں ! بلکہ ان خبروں کی تائید و امکان میں یہ لوگ مضمون لکھتے ہیں۔ تو کیا یہ ساری خبریں، یہ ان کے سارے مضامین اور یہ ان کے ارادے میرے آقا و مولیٰ حضور سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کی اس حقیقی و واقعی سیر معراج کے موید نہیں ہیں ؟ یہ تو کوئی ایسا راکٹ بناتے ہی بنائیں گے۔ مگر خداوند تعالیٰ نے اپنے محبوب کے لئے یقیناً ایک ایسا براق پیدا فرما دیا تھا۔ جو ہمارے آقا و مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو آن کی آن میں چاند سے بھی کہیں دور آگے لے گیا۔ اور ہمارے حضور اس چاند کے بھی خالق تک جا پہنچے۔ مومن کی عقل کا تو یہی فتویٰ ہے۔ کہ اگر سائنس کا راکٹ تمہیں چاند میں لے جا سکتا ہے۔ تو خدا کی قدرت کا راکٹ حضور کو چاند سے بھی آگے لے جا سکتا ہے۔ اور یہ چاند اور سورج راستے ہی میں رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے ایک شاعر نے لکھا ہے کہ

ماہ و انجم نے سرِ راہ بچھا دیں آنکھیں ✽ کیونکہ ہے ناقۂ اسریٰ کا سفر آج کی رات
کہکشاں جلوہ فشاں ہے اسی رستے سے ✽ ہونے والا ہے محمد کا گذر آج کی رات

اوپر جانا

"بیوقوف عقلمندوں" کا یہ اعتراض کہ حضور کا مع الجسم اوپر تشریف لے جانا خلافِ عقل ہے۔ بجائے خود خلاف عقل ہے۔ اسلئے کہ عقل ہی نے بتایا ہے۔ کہ حرکت کی دو قسمیں ہیں۔ حرکت طبعی، اور حرکت قسری۔ طبعی تو وہ ہے۔ جو طبیعت کے اقتضار سے واقع ہو۔ جیسے گیند کی طبیعت کا اقتضار یہ ہے کہ وہ اوپر سے نیچے کو آئے۔ اور قسری یہ ہے کہ کسی مانع کی تحریک سے خلاف طبیعت حرکت کرے۔ جیسے وہی گیند بلّے کی ٹھوکر سے بجائے اوپر سے نیچے کی طرف آنے کے نیچے سے اوپر کی طرف حرکت کرنے لگتی ہے۔ تو جب ایک گیند کا اوپر جانا خلاف عقل نہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر تشریف لے جانے میں کیا استحالہ ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ گیند اوپر جا کر ٹھہرتی نہیں ہے۔ فوراً نیچے آ جاتی ہے۔ تو حضور کے متعلق ہم کب کہتے ہیں۔ کہ آپ وہاں ٹھہر گئے۔ آپ تو اس قدر جلد واپس تشریف لے آئے کہ زنجیر در بھی بدستور ہل رہی تھی۔ اور بستر بھی اسی طرح گرم تھا۔

مثلاً قرآن کے کئی ایک مقامات پر کئی دفعہ آیا ہے۔ کہ وہ آسان ہے مگر اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ اتنی صدیوں میں اس کے حروف مقطعات اور متشابہات وغیرہ کو نہیں سمجھا جا سکا۔ ذوالقرنین اور سد سکندری اور روح کا کچھ تعین نہیں ہو سکا۔ جب ایسا ہے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکال لینا درست ہوگا کہ قرآن آسان نہیں بلکہ مشکل ہے معاذ اللہ۔

وحی کے تفاوت کے متعلق یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ ایک ہے بات کا وحی ہونا۔ اور ایک ہے اس کا وحی کے تحت ہونا۔ پہلی بات کا دائرہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے رسول کو حکم آتا ہے کہ آپ لوگوں کو یہ اور یہ حکم دیں۔ اور دوسری بات کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کو ایک معاملہ کے متعلق خدا کی طرف سے حکم ہوتا ہے کہ آپ اس میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار کر دیں۔ پہلی بات کو وحی کہیں گے۔ اور دوسری کو وحی کے تحت آئی رائے۔ اور اس طرح یہ دریافت کرنے کا موقعہ پیدا ہوگا کہ یہ وحی ہے یا آپکی ذاتی رائے۔ یہی کچھ ہے طول و عرض ان استفسارات کا جو وحی کے بارہ میں صحابہ کی طرف سے آنحضور کے سامنے واقع ہوئے اور پرویز صاحب کے کام آئے۔ اسلئے کہ قرآن جہاں سراپا ہدایت اور حق ہے وہاں اس میں اسکی وضاحت کے مطابق فتنہ پسند گروہوں کے لئے فتنہ کا سامان بھی موجود ہے اور یہ حال جب قرآن کا ہے تو حدیث میں اس فتنہ کے نہ ہونے کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے چنانچہ یہ فتنہ یہی ہوتا ہے جسے قرآن اور حدیث میں اس قسم کے لوگ اپنا پھندا سمجھنے کی بجائے اسے مرغوب شکار سمجھ کر اس پر لپکتے ہیں اور پھر وہیں کے ہو رہتے ہیں۔

رہا یہ کہ گیند کا کم بلندی پر جا کر واپس آ جانا۔ تو یہ پھینکنے والے کی طاقت پر منحصر ہے۔ ایک چھ سال کا بچہ اگر اوپر کی طرف کوئی چیز پھینکے۔ تو وہ بہ نسبت ایک جوان آدمی کے پھینکنے کے کم بلند جائیگی۔ یا یوں سمجھئے۔ کہ ایک شخص نے بانس کی غلیل سے ایک غلہ اوپر پھینکا۔ اور اسی مقابلہ پر دوسرے نے بندوق سے گولی چلائی اور اس کے ساتھ ہی ایک شخص نے توپ کا دہانہ آسمان کی طرف کر کے گولہ چلایا۔ تو غلہ سے گولی اور گولی سے گولہ بہت آگے نکل جائے گا۔ اور یہ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ بہ نسبت غلیل کے بندوق، اور بہ نسبت بندوق کے توپ زیادہ طاقت ور ہے۔

بنابریں چونکہ اللہ تعالیٰ تمام طاقتوں سے زیادہ قوت کا مالک ہے۔ اسلئے اس نے حضور کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا۔ کہ حضور عرشِ اعظم پر پہنچ گئے۔ اور پھر آج تو ہوائی جہازوں کا زمانہ ہے۔ جو ٹنوں وزن کے ساتھ سینکڑوں فٹ بلندی پر اڑتے پھرتے ہیں۔ ان کی یہ حرکت طبعی نہیں ہے۔ بلکہ یہ سٹیم اور کلوں کے زور سے اوپر چلے جاتے ہیں۔ اور یہ اللہ کے ادنیٰ بندوں کی کاریگری ہے تو کیا وہ خدا جس نے اپنے ادنیٰ بندوں کو اتنی قدرت دیدی ہے۔ کہ وہ اپنی عقل سے ہوائی جہاز بنائیں۔ جو اڑ کر چند منٹ میں کہاں سے کہاں پہنچ جائیں۔ ایسا براق پیدا نہیں فرما سکتا۔ جو ایک نور مجسم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی نورانی پشت پر بٹھا کر پل کی پل میں فرش سے عرش تک پہنچا دے؟ عقل والے اپنی عقل سے پوچھ کر جواب دیں سہ

ہمارا امتحاں کرتے ہو لیکن ؂ تمہارا بھی اسی میں امتحاں ہے

برقی رفتاری

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سرعت سیر پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے۔ کہ اس قدر طویل سفر اتنی سرعت سے کہ بستر استراحت ویسے کا ویسے ہی گرم کا گرم رہا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ ہم کہتے ہیں۔ کہ ہمارے ہی ملک میں پہلے سواری بہلی گاڑی تھی۔ جس پر تھوڑا سفر بھی زمانہ دراز میں ہوتا تھا۔ اور آج ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز موجود ہیں۔ جو دنوں کا سفر گھنٹوں میں اور گھنٹوں کا منٹوں میں طے کر لیتی ہیں۔ اور دن بدن

کیا رسول ملزم ہو سکتا ہے

"کوئی ایسا قول و عمل جو قرآن کے مخالف ہو گا رسول اللہ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا خواہ اسکا راوی کوئی ہو" صفحہ ۶۹۵

ایک ہوتا ہے ایک بات کا قرآن کے مخالف ہونا۔ اور ایک ہوتا ہے اُسے قرآن کے مخالف سمجھنا۔ اور ایسا فرض کر لینا۔ ان دونوں صورتوں میں ایک حکم کو انسان کے خاص کر حکم رسول کو رد کرنے میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ کسی دوسرے کے حکم کا انسان کو قرآن نے پابند نہیں بنایا اور جس رسول کی اطاعت کا انسان کو قرآن نے پابند بنایا ہے۔ اس کے حکم کو قرآن کے خلاف کہنا اور ثابت کرنا کافی غور کا کام ہوتا ہے۔ بغاوت کی بات دوسری ہے۔ اور عناد کی دنیا کے لیل و نہار کچھ اور ہوتے ہیں۔ بغاوت اور عناد کا مادہ اگر تسلیم کیا جائے تو سرے سے انبیاء اور رسولوں کے جھٹلانے کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہ جاتی۔ اور قرآن کا جو ایک بہت بڑا حصہ اس بیان پر صرف ہوا ہے کہ انبیاء کو ان کی قوموں نے جھٹلایا تو سوائے عناد کے اسکی کوئی توجیہہ کرنا مشکل ہے۔ اور جھٹلانے والوں کی صفائی میں یہ کہنا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اور نہ یہ قرآن کے موافق ہے کہ ان لوگوں کے ہاں خدا اور خدا کے احکام کا جو تصور موجود تھا۔ اس کے خلاف انبیاء کی دعوت کو پاکر انہیں رد کر دیا۔ اور کہا کہ ایسی دعوت خدا کی طرف سے ہو نہیں سکتی۔ جو یہ لوگ پیش کر رہے ہیں۔ انکی طرف سے ایسا عذر اگرچہ کچھ معنی نہیں رکھتا۔ مگر اس کے باوجود یہ شگفتہ ہے۔ کہ انہوں نے خدا کے رسولوں کو تمام تر اپنے

لیسے ایسے ہوائی جہاز تیار ہو رہے ہیں۔ جو چند منٹوں میں کئی کئی سو میل کا سفر طے کر لیتے ہیں۔ اور پھر اس سے بھی زیادہ ترقی کرنا ممکن ہے اور یہ سب کچھ اس امر پر شاہد ہے۔ کہ رات کے تھوڑے سے حصہ میں ہزاروں میل کا سفر طے کر لینا ممکن ہے۔

سورج کو دیکھئے۔ جغرافیہ دان بتلاتے ہیں۔ کہ زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے۔ اور سورج کا قطر زمین کے قطر سے سو گنا سے بھی زیادہ ہے۔ مگر پھر بھی ہم دیکھتے ہیں۔ کہ صبح کو جب سورج کا بالائی کنارہ ظاہر ہوتا ہے۔ تو اس کے بعد بہت جلد اس کا کنارہ زیریں بھی نمودار ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرعت سیر کا جسد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم میں پایا جانا از روئے عقل ناممکن نہیں ہے۔

روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ بتائی جاتی ہے حالانکہ تمام نور حضور ہی کے نور کے پر تو ہیں۔ تو پھر اس منبع نور وجودِ مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم میں ایسی سرعت کیوں ممکن نہیں؟

حضور کی سواری

براق برق سے ہے۔ اور برق بجلی کو کہتے ہیں۔ اور یہ بجلی تو آج کل لوازماتِ زندگی سے بن چکی ہے۔ اس کی تیز رفتاری سب کے سامنے ہے۔ ریلوں۔ موٹروں اور ہوائی جہازوں کی تیز رفتاری کو جانے دو۔ گھروں کی بجلیوں۔ ٹیلیفونوں۔ ٹیلی گراموں اور وائرلیسوں کو دیکھو۔ یہ کتنے تیز رفتار ہیں۔ ان سب چیزوں کی محرک بجلی ہے۔ ہزاروں میل دور بیٹھکر ٹیلیفون میں بات کرتے ہیں۔ آپ کی اور آپ کے مخاطب کی گفتگو اتنی مسافت سیکنڈ بھر میں طے کر کے آتی اور جاتی ہے۔ یہ کیا بات ہے؟ یہی نا کہ آپ کی باتوں کو بجلی ایک سیکنڈ سے بھی کم مدت میں ہزاروں میل دور پہنچا دیتی ہے۔ ٹیلیفون میں تو پھر برقی تاروں کا واسطہ ہے۔ وائرلیس میں یہ بھی نہیں۔ کراچی میں بیٹھ کر آپ لندن اور نیویارک میں بھی اپنی آواز دم بھر میں پہنچا سکتے ہیں۔ کس طرح؟ بجلی کی طاقت سے! اور اب تو یہ بجلی متکلم کی تصویر بھی مخاطب تک پہنچانے لگی ہے۔ جیسے

تصورات کی بنا پر جھٹلایا۔ ایسا کچھ جھٹلانا جب رسول کے سامنے موجود ہوتے
ہوئے ممتنع نہیں تو بعد میں اس کی بات کو اپنے تصورات کے تحت جھٹلانا کونسا
مشکل کام ہے۔ اسی طرح یہ بھی بغاوت کا کرشمہ تھا کہ حضرت داؤد کے
ساتھیوں نے کہہ دیا تھا کہ آپ کی بات کچھ بھی قابل توجہ نہیں۔ اپنے خدا کو
سامنے لائیے تاکہ ہم اس سے بات کریں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کے بعد
جو نبی تھے انہوں نے جب قوم کو خدا کی طرف سے حکم دیا۔ کہ طالوت تمہارا
سردار ہے تو انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارا سردار ہو جس
میں یہ اور یہ خرابیاں ہیں۔

اس مسئلہ کا ایک بہت عجیب پہلو یہ سامنے آتا ہے۔ کہ اگر رسول پر
چوری اور زنا کا الزام قائم کیا جائے۔ تو وہ قرآن کے خلاف ہوگا یا نہیں۔
اس طرح کا الزام بیگم عزیز اور برادران یوسف نے حضرت یوسف پر قائم
کیا تھا۔ اب الزام اگر کوئی رسول پر لگائے تو وہ کیسے خلاف قرآن ہوگا۔
اگر آپ کہیں کہ ایسا الزام اس لئے غلط ہوگا کہ قرآن میں ایسے اعمال کی ممانعت
ہے اور رسول قرآن کا پابند ہوتا ہے۔ تو پھر کسی مسلمان پر بھی ایسا الزام
نہیں لگنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ بھی شرعاً قرآن کا پابند ہوتا ہے۔ ادھر قرآن
میں چوری اور زنا کی سزا موجود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ مسلمان
شرعاً قرآن کا پابند ہوتا ہے مگر واقعۃً اس کا ایسا ہونا ضروری نہیں اور وہ
قرآن کا معتقد ہونے ہوئے بھی چوری اور زنا کر گذرتا ہے۔ اور جب کرتا
ہے تو سزا کا سزا وار ہوتا ہے پھر اگر رسول بھی اسی قرآن کا پابند ہے

ٹیلی وژن کہتے ہیں۔ تو یہ آپ کی بجلی ہے۔ اور براق تو خالقِ بجلی کی اپنے محبوب کے بلانے کے لئے بھیجی ہوئی سواری تھی۔ پھر وہ اگر لحظہ بھر میں حضور کو سیر معراج کرا دے۔ تو اس میں کیا تعجب کی بات ہے؟

ہمارے نورِ نظر کی ذرا سرعتِ سیر دیکھئے۔ کہ ابھی تو ہماری نظر زمین پر تھی۔ اوپر دیکھتے ہی یہ نظر فوراً آسمان پر پہنچ گئی۔ تو جب ہماری نظر کی سرعت سیر کا یہ عالم ہے۔ تو حضور جو خدا تعالیٰ کی خاص نظرِ رحمت ہیں۔ وہ آن کی آن میں زمین پر سے عرشِ اعظم پر کیوں نہیں پہنچ سکتے۔ ہماری نظر آسمان تک رک کر رہ گئی۔ اور خدا کی نظرِ رحمت آسمانوں کو بھی عبور کر کے وہاں تک جا پہنچی۔ جہاں کوئی دوسرا نہ پہنچ سکے ؎

تھا براق ہی یا کہ نورِ نظر٭ یہ گیا وہ گیا وہ نہاں ہو گیا

کرۂ نار سے کیسے گزر گئے ایک عقلی شبہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ کہ حضور اگر اوپر گئے۔ تو زمین سے بلند اوپر کی جانب جو آگ کا کرہ ہے۔ اس میں سے آپ بھلے چلے سالم کیسے گزر گئے۔ ہم کہتے ہیں کہ جس نے حضور کو اوپر بلایا۔ اسی خدا نے اس کرہ سے گزر جانے کا انتظام بھی فرمایا۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ دیکھئے سمندل کیڑا آگ میں رہتا ہے۔ نہ جلتا ہے نہ مرتا ہے۔ اور علامہ دمیری رحمۃ اللہ علیہ نے حیوٰۃ الحیوان کے صفحہ ۲۹ جلد ۲ میں شتر مرغ کے متعلق لکھا ہے۔ کہ شتر مرغ آگ کا چنگاڑا نگل جاتا ہے۔ اس کا پیٹ اس آگ کے چنگارے کو بجھا دیتا ہے۔ اور وہ چنگارا اسے نہیں جلاتا۔ اسی طرح سمندل کے متعلق علامہ قزوینی نے عجائب المخلوقات میں لکھا ہے۔ کہ وہ ایک ایسا جانور ہے۔ جو شکل میں چوہے سے ملتا جلتا ہے۔ مگر چوہا نہیں ہے۔ اس کے بالوں، چمڑے، اور گوشت کو آگ ضرر نہیں پہنچاتی۔ چنانچہ ماہ طیبہ شمارہ ستمبر ۱۹۵۳ء کے دلچسپ صفحہ میں بھی اس کا ذکر آ چکا ہے۔ کہ یہ جانور آگ میں رہ کر لذت پاتا ہے۔ جب اس کا جسم میلا ہو جائے۔ تو آگ میں گھس جاتا ہے۔ اور اس کا جسم صاف ہو جاتا ہے۔ اس پرندے کے پروں سے اگر رومال تیار کیا جائے۔ تو وہ رومال میلا ہو جانے پر

مسلمانوں کو چوری اور زنا سے باز نہیں رکھتی۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ رسول پر ایسے الزام کو محض خلاف قرآن ہونے کی وجہ سے رد کیا جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مسلمان پر چوری اور زنا کا الزام لگانا قرآن کے خلاف نہیں ہوتا۔ اور نا قابل سماعت۔

جو لوگ رسول کے حق میں غیر قرآنی اور خصوصی وحی کے قائل ہیں وہ چار وجوہ سے اس قسم کے الزام کو باطل ٹھہراتے ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن میں جن امور کا پابند بنایا گیا ہے انکی خلاف ورزی پر ان کیلئے سزائیں مقرر ہیں۔ اس لئے انہیں چوری یا زنا کا ملزم کہا جا سکتا ہے۔ بخلاف اس کے رسول کے لئے جہاں خصوصی احکام موجود ہیں وہاں ان کی خلاف ورزی پر اس کے لئے کوئی سزا مقرر نہیں۔ مثلاً یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اگر رسول وحی کی پیروی نہ کرے تو اسے اتنے تھپڑ یا گھونسے لگائے جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا وحی کے خلاف چلنا ممتنع اور محال ہے۔

دوسری وجہ رسول کے خلاف ایسے الزام کے باطل ہونے کی یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی اطاعت کا جو خدا نے حکم نہیں فرمایا تو اسی لئے کہ ان کا ملزم اور ملزم سے بڑھ کر مجرم ہونا ممکن ہے۔ اب اگر رسول کا ملزم ہونا بھی ممکن ہوتا تو خدا کبھی اس کی اطاعت کا حکم نہ فرماتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ غلطی نام ہے قابل فہم ہدایت پا لینے کے بعد اس کے خلاف چلنے کا۔ اور رسول کیلئے ایسا موقعہ کبھی پیش نہیں آسکتا جہاں وہ ہدایت سے محروم ہو یا اسے سمجھ نہ سکے یا سمجھ کر اس کے خلاف چلے۔ ادھر جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کے

آگ میں ڈال دیجئے۔ تو آگ اس کی میل کھا جاتی ہے۔ اور رومال نہیں جلتا سلطان حلب کو دو ہاتھ لمبا اور ایک ہاتھ چوڑا ایک رومال پیش کیا گیا۔ جو سمندل کے پروں سے تیار کیا گیا تھا۔ سلطان کے حکم سے یہ رومال تیل میں بھگو کر آگ میں ڈالا گیا۔ نتیجہ یہی نکلا۔ کہ آگ نے تیل کو جلا ڈالا۔ اور جب تیل ختم ہو گیا۔ تو آگ بجھ گئی۔ اور رومال ویسے کا ویسے ہی رہا۔

آپ زمانہ حال کی ایجادات کو دیکھ لیجئے۔ گیس کے مینٹل جو سوتی جالی سے بنے ہوتے ہیں۔ اس قدر تیز آگ میں رہ کر بھی نہیں جلتے — ولائتی آتش بازی کی پھلجھڑیاں جلانے سے ان میں سے آگ نکلتی ہے۔ مگر اس کے آتشی پھول کپڑوں پر گرتے ہیں۔ تو اس سے کپڑے نہیں جلتے۔

تو میرے دوستو! جس خدا نے سمندل پرندے کو آگ میں جلنے سے محفوظ رکھا۔ شتر مرغ کے پیٹ کو آگ کے چنگارہ سے نہ جلنے دیا۔ اور پھلجھڑیوں کی آگ سے جلا دینے کی طاقت سلب کر کے ہمارے کپڑوں کو آگ سے بچا لیا۔ اسی خدا نے اپنے محبوب کو آگ کے کرہ سے بن جلے سلامتی سے گزار لیا۔ بتاؤ اس میں کونسی مشکل بات ہے؟

بھائیو! یہ تو حضور کی ذات گرامی ہے۔ خدا کی قسم حضور کے نام میں بھی وہ تاثیر ہے۔ کہ جہنم کی آگ کو بھی سرد کر دے ؎

سرد کر دیں گے عاصی جہنم کی آگ!
مصطفےٰ کہہ کے جس وقت چلّا ئینگے

آسمانوں سے عبور

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے۔ کہ حضور آسمانوں میں سے کیسے گزر گئے۔ جب کہ آسمانوں کا کوئی دروازہ نہیں ہے۔ مومن کا جواب یہ ہے۔ کہ آسمانوں کے دروازے ہیں۔ جو حضور کے لئے اس رات کھل گئے تھے۔ اور ان لوگوں کو اپنی تسلی کے لئے اپنی ایکس ریز لائٹ کو دیکھنا چاہیئے: جو مریض کے کپڑوں اور اس کے جسم کو بغیر کسی چیر پھاڑ کے عبور کر جاتی ہے۔ اور اندرونی مرض کا فوٹو باہر لے آتی ہے۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ حضور جو منبع الانوار ہیں۔ ان آسمانوں سے خدا کی

ہوتے ہوئے بعض اوقات اپنی سمجھ پر انسان کو چلنا ہوتا ہے۔ اور ضروری نہیں کہ ہر حالت میں اس کی سمجھ صحیح ہو۔ اور کبھی قرآن کی ہدایت کے ہوتے ہوئے آدمی انکی پرواہ نہیں کرتا۔ اور نہ دونوں طرح غلطی میں پڑتا ہے۔ ورنہ کوئی واقف قرآن انسان کبھی غلطی نہ کرتا۔ اور جب کرتا ہے اور رسول ان سب غلطیوں سے محفوظ رہتا ہے جن میں دوسرے پیروان قرآن مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ رسول کے پاس ایک ایسا خصوصی ذریعہ ہدایت ہے جو دوسرے واقفان قرآن کو میسر نہیں۔ اور وہ ہے اس کا ہر حال میں وحی سے مشرف ہونا اور اس کی نگرانی میں رہنا۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی غلطی نہیں کرتا۔ اور نہ وحی کے خلاف چلتا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو جن امور کا پابند بنایا گیا ان کی پابندی میں انہیں بار بار کہنا اور سمجھانا پڑا اور مشکل سے وہ کہیں جا کر پابند ہوئے اور جب ہوئے تو کئی بار ان پابندیوں کو چھوڑ بھاگے۔ مگر رسول کو جو ہدایت ایک بار دی گئی وہ اس کے لیے کافی ہو کر رہی۔ جو ثبوت ہے اس بات کا کہ ایسے جملہ الزامات سے پاک ہونا چاہیئے۔ پھر اسے ایک ہی بار کا حکم کافی ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے لوگوں کی انسانی اور نفسانی خواہشات سے آشنا نہیں بلکہ اس کی وجہ ہے اس کا خدا کی خصوصی تعلیم اور وحی سے مشرف ہونا جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

اس معاملہ میں پرویز صاحب کی حالت حد درجہ قابل رحم ہے آپ نہ تو یہ کہتے ہیں کہ رسول خود ہی اور زنا کر گذرتا ہے۔ کیونکہ یہ خلاف ادب ہے

قدرتِ کاملہ سے عبور کر جائیں؟

اگر ہماری نظر عینک کے شیشہ سے بغیر توڑ پھوڑ کے پار ہو سکتی ہے۔ تو حضور جو خدا کی نظرِ رحمت ہیں۔ ان آسمانوں سے کیوں پار نہیں جا سکتے؟ ؎

مخالف کہتے ہیں کیوں کر نبی افلاک پر پہنچے!
فلک کو در نہیں کیسے وہ عرشِ پاک پر پہنچے
یہ کہہ دو نور کو حائل نہیں دیوار ہوتی ہے
نظر شیشے پہ جب پڑتی ہے فوراً پار ہوتی ہے

بستر کا گرم رہنا

اس بات پر بھی عقلی شبہ پیش کیا جاتا ہے۔ کہ اتنا طویل سفر طے فرمانے کے بعد واپسی پر بستر مبارک کا گرم ہی پانا عقل نہیں مانتی۔ حالانکہ انہی لوگوں نے ایک بوتل جسے تھرموس کہتے ہیں۔ تیار کر دی ہے۔ جس میں گرم چائے ڈالو۔ تو چوبیس گھنٹے تک وہ گرم کی گرم ہی رہتی ہے۔ تو کیا ربِّ کائنات اپنے محبوب کے بستر استراحت کو گرم کا گرم نہ رکھ سکتا تھا؟ سچ ہے۔ ع

خدا جب دین لیتا ہے حماقت آ ہی جاتی ہے

لطیفہ

میرے بزرگو! یہ "بیوقوف عقلمند" یورپ کی تو ہر بات چاہے عقل میں نہ بھی آئے۔ مان لیتے ہیں۔ مگر دین کی ہر بات ان کیلئے ناقابل تسلیم ہوتی ہے۔ ان کی مثال اس جنٹلمین جیسی ہے۔ جس کے پاس اس کے گاؤں کا ایک نائی آیا۔ جنٹلمین نے اس نائی سے پوچھا۔ سناؤ میرے گھر کا کیا حال ہے۔ نائی نے جواب دیا۔ بابو جی! کیا بتاؤں۔ آپ کی بیوی صاحبہ بیوہ ہو گئی ہیں۔ بابو جی نے یہ سنا۔ تو لگے رونے اور چلانے، محلے والے آئے اور پوچھا۔ کہ کیا ہوا۔ تو بولے کیا بتاؤں۔ یہ نائی میرے گاؤں سے آیا ہے۔ اور اس نے بتایا ہے۔ کہ میری بیوی بیوہ ہو گئی ہے۔ محلے والوں نے یہ سن کر کہا۔ کہ کچھ عقل سے بھی کام لو۔ تمہارے جیتے جی تمہاری بیوی بیوہ کیسے ہو سکتی ہے۔ تو بولے: "یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ نائی بڑا معتبر ہے"۔

بھائیو! اسی طرح ان بیوقوف عقلمندوں کے لئے یورپ کا نائی بڑا معتبر

اور نہ ہی یہ مانتے ہیں کہ رسول کی ذات اور اس کی تعلیم اور سمجھ ہر پہلو سے کامل و اکمل
اور غلطی سے بالکل مبرّا ہے۔ یہ اس لئے کہ اگر آپ ایسا کہیں تو پھر رسول
کی ہر بات اور ادا کا اتباع یا کم از کم احترام لازم آتا ہے۔ جس کے لئے آپ
کسی حالت میں تیار نہیں۔ اس لئے ناچار درمیانی راہ نکال لیتے ہیں۔ اور رسول
کو مجموعہ اضداد ماننے میں اپنی سلامتی دیکھتے ہیں۔ جو ایک طرف غلطیوں سے پاک
اور دوسری طرف غلطیوں اور خطاؤں کا مجسمہ ہے۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں
کہ اگر آپ حدیث رسول کا ایک حصہ بھی صحیح سمجھتے تو اس کے خلاف یہ کچھ مہم نہ چلاتے
جو آپ چلا رکھی ہے۔ مگر آپ کی گوناگوں لفاظی اور بیان بازی سے یہ کسی طرح بھی صفائی
کے ساتھ نہیں سمجھا جا سکتا کہ آخر رسول پر چوری اور زنا جیسے جرائم کا الزام لگانے
میں کیا مانع ہے۔ کیا اس کا امیر اور حاکم وقت ہونا اس کے مانع ہے یا اسکا صاحب
وحی ہونا۔ اگر پہلی بات ہے تو پھر ہر امیر کو غلطیوں سے پاک اور معصوم ماننا چاہئے
اور اگر دوسری بات ہے تو پھر آپ کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ رسول کی ہر بات اور
ہر عمل وحی کے بغیر کچھ نہ تھا۔ اسطرح یہ تضاد باقی نہیں رہیگا۔ جو ایک طرف
آپ کہتے ہیں کہ رسول نے قرآن کے خلاف کچھ نہیں کیا۔ اور دوسری طرف یہ ہی
کہہ دیتے ہیں۔ کہ رسول سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ مگر کیوں ہوتیں۔ کیا اس لئے
کہ قرآن میں غلطیاں ہیں۔ یا وہ قرآن کو سمجھ نہ سکا۔ یا سمجھنے کے باوجود غلطیاں
کرتا رہا۔ آخر کوئی اس کی غلطیوں کیلئے وجہ تو موجود ہونی چاہیئے۔ یہ اسی تضاد
فکر کا ثمرہ ہے کہ ایک طرف آپ رسول کو غلطیوں سے پاک نہیں مانتے اور
دوسری طرف اس کی حدیثیں پیش کرنے والے محدثین کو اس لئے گالیاں

ہے۔ وہ کچھ بھی ہانک دے یہ مان لینگے۔ ہاں اگر انکار کریں گے۔ تو دین کی باتوں کا۔

سه ملحدوں کی بات کو ہنس ہنس کے کر لینا قبول
اور ہنسی دیں کی اڑانا آجکل فیشن میں ہے

سُبحَانَ حضرات! ابتدار وعظ میں جو میں نے آیت پڑھی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے سُبحَانَ فرمایا ہے۔ خدا کو علم تھا کہ اس کے محبوب کے اس سفرِ عالی کا سن کر پرستارانِ عقل شور مچا ئینگے۔ اس واقعہ کو غلط بتا ئینگے۔ اس واسطے خدا نے اس بے عقلی کا سدِباب کرنے کو سب سے پہلے لفظ "سبحان" اختیار فرمایا۔ اور فرمایا "پاکی ہے اُسے" کس چیز سے؟ ہر عجز و بے چارگی سے، اور ہر نقص سے، کہ یوں کہا جا سکے۔ کہ لاکھوں برس اور کروڑوں میل کا سفر حضور نے ایک لمحہ میں کیسے طے کر لیا؟ اور ایک جسم زمین سے اوپر کیسے چلا گیا؟ اور اگر گیا۔ تو آگ کے کرہ سے بچ کر کیسے گزر گیا۔ اور گزر بھی گیا۔ تو آسمانوں میں سے کیسے نکل گیا؟ جب لے جانے والی ذات ہر عجز و بے چارگی سے پاک ٹھہری۔ تو پھر ان شکوک و شبہات کا کیا معنیٰ؟

اَسرٰی اس کے بعد اللہ نے پھر "اسریٰ" فرمایا ہے۔ یعنی پاکی ہے اسے جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا۔ "جو لے گیا" یہ جملہ معراج جسمانی کے انکار کرنے والوں کا منہ توڑ رہا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے معراج جسمانی کے انکار کی کوئی وجہ ہی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے کہ اگر ایک چھ سالہ بچہ ایک بھرے مجمع میں یوں کہے۔ کہ میں خود یورپ اور امریکہ کی سیر کر کے آیا ہوں۔ تو اس بچہ کے اس دعویٰ کو تسلیم کرنا مشکل ہے۔ مگر جب اس بچہ کا جہاندیدہ رئیس و امیر باپ اس امر کا اعلان کرے۔ کہ میں اپنے بچے کو یورپ و امریکہ لے گیا۔ اور اسے لندن و پیرس۔ اور نیویارک وغیرہ کی سیر کرائی۔ اور سب کچھ دکھایا تو اب کون بے عقل ہے۔ جو اس بچے کی سیر کا انکار کرے؟ قرآنِ پاک کی فصاحت بھی کیا قابلِ دادِ فصاحت ہے۔ کہ یوں نہ فرمایا۔ کہ میرا بندہ خود گیا تاکہ عقل کے بیچاریوں کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے۔ کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بلکہ یوں فرمایا۔ کہ ہم خود لے گئے۔ اور ہم نے سیر کرائی۔ تو اب عقل کے لئے بشرطیکہ

نکالتے ہیں کہ انہوں نے سیرتِ رسول کو داغدار بنا کر پیش کیا۔ حالانکہ سیرۃ رسول کو بے داغ جاننے کا ادنیٰ اور کم از کم تقاضا تو یہ ہے کہ اسے وحی کا پابند اور معصوم عن الخطا مانا جائے۔ ویسے ایک اچھا انسان تو اسے ہر کافر اور منکر بھی مانتا ہے۔ اور خود وہ بھی مانتے تھے جنہوں نے اس کے ساتھ جنگیں کیں اور لڑائیاں لڑیں۔

اس کے ساتھ ہی آپ کا ایک عجیب اصول یہ بھی ہے کہ قرآن کے اصولی احکام سے وقتی ضروریات کے لئے جزئیات کو بنانا اسلامی مرکز حکومت کا منصب ہے۔ جس میں وہ رائے عامہ کا کچھ بھی پابند نہیں۔ اس کلیہ سے چار باتیں لازم آتی ہیں۔ اول یہ کہ حکومت کو ایسے امور طے کرنے کی اجازت ہے جو قرآن میں موجود نہیں۔ دوم یہ کہ حکومت کے طے شدہ مسائل کو قرآن کے مطابق بنانا اور پرکھنا ضروری نہیں۔ اس لئے کہ جو چیز قرآن میں ہو نہیں اس کے مطابق قرآن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوم یہ کہ اگر لوگوں کی رائے حکومت کے خلاف ہو تو انہیں اپنی رائے پر مُصِر نہ ہونا چاہیئے۔ چہارم یہ کہ جب انہیں اس کے خلاف رائے رکھنے کا حق نہیں تو اور زیادہ ضروری بلکہ لازم ہے کہ وہ اس کے جزئیات کی بےحرمتی نہ کریں۔ اور نہ ان کا تمسخر اڑائیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ان چار پہلوؤں کے پیش نظر حدیث رسول کے خلاف کچھ کہنے اور لکھنے کی گنجائش کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ کیا آپ رسول کو اور اس کے امور جزئیات کو وہ مرتبہ دینے پر بھی تیار نہیں جو ایک حاکم وقت کا اور اس کے فیصلوں کا آپکے ہاں ہے۔ تلک اذاً قسمۃ ضیزیٰ یہ تو بڑی بے ڈھنگی تقسیم ہے۔

عقلِ سلیم ہو بجز تسلیم کے چارہ نہیں۔ کہ خدائے برتر و توانا لے جا سکتا ہے لہٰذا لے گیا اور حضور یقیناً گئے۔

بِعَبْدِہٖ پھر فرمایا۔ پاکی ہے اُسے جو راتوں رات لے گیا۔" اپنے بندے کو" یہ لفظ "عبد" (بندہ) بھی اعلان کر رہا ہے۔ کہ محبوبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم مع الجسم تشریف لے گئے۔ اس لئے کہ "عبد" کا اطلاق روح اور جسم دونوں پر ہوتا ہے۔ دیکھ لیجئے۔ قرآن میں جہاں انسان کے لئے "عبد" استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں روح و جسم دونوں مراد ہیں۔ مثلاً سورۃ مریم میں ہے۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا۔" یہ ذکر اس رحمت کا ہے۔ جو تیرے رب نے اپنے بندہ زکریا پر کی تھی۔"

یہاں "عبد" سے یقیناً زکریا علیہ السلام مع روح و جسم کے مراد ہیں۔ سورۂ جن میں ہے:۔ وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ ۔۔۔" یعنی جب اللہ کا بندہ (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام) عبادت کے لئے کھڑا ہوا۔"

یہاں "عبد" سے مراد روح اقدس مع جسم انور ہے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا:۔

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا ۔۔۔"یہاں بھی عبد سے مراد روح مع الجسم ہے۔"

تو جب محاورۂ قرآن میں کلمہ "عبد" سے ہر جگہ جسم و روح مراد ہے۔ تو کیا وجہ ہے۔ کہ اس موقعہ اسراء و معراج میں اس کلمہ "عبد" سے حضور کی روح انور مع جسم اقدس مراد نہ ہو۔

لَيْلًا پاکی ہے اُسے جو اپنے بندے کو لے گیا۔" راتوں رات" یہ" راتوں رات" کی تعیین بھی جسم شریف کی سیر کا اعلان کر رہی ہے۔ کہ روح کی سیر کے لئے کوئی وقت مقرر کرنا موزوں نہیں۔ اور پھر سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح تو ہر وقت ہی انتہائی تقرب خداوندی کے درجہ پر فائز ہے۔ پھر" راتوں رات" کی تخصیص کیسی؟ ہاں جسم شریف کے لئے اس کی تعیین موزوں ہو سکتی ہے۔ کہ اس جسم پاک کو بھی رات کے ایک حصہ میں انتہائی تقرب خداوندی حاصل ہو گیا۔

"آپ کے جن فیصلوں پر خود قرآن میں تادیب نازل ہوئی اور آپ سے کہا گیا ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اس سے کیا مفہوم لیا جائے۔ کیا یہ کہ وحی خود وحی کی تردید کیا کرتی تھی" - ص ۲۸۸

یہ سوال جو آپ حدیث پر وارد کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی سوال قرآن کی وحی پر وارد ہوتا ہے پرویز صاحب کے بقول اور خود قرآن کے فیصلے کے مطابق رسول قرآن کے خلاف عمل نہیں کرتا تھا۔ اور جب نہیں کرتا تھا تو پھر اس کی کارروائیوں پر خدا کی طرف سے ایسے تادیب کیوں ہوتی۔ کیا اس لئے کہ وہ قرآن کے مطابق کیوں چلا۔ اور کیا اس سے یہی مفہوم لیا جائیگا کہ قرآن خود قرآن کی تردید کرتا ہے۔ پھر تادیب کا یہ ڈھنڈورا کیوں پیٹ رہا ہے۔ صرف اس لئے کہ حدیث کو نہ مانا جائے۔ اور اس لئے نہ مانا جائے کہ رسول کی باتوں پر خدا کی طرف سے تادیب ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی بات وحی نہیں۔ اور اس وجہ سے ماننے کے قابل نہیں اور نہ صرف وہی ماننے کے قابل نہیں جس پر ایسے تادیب ہوئی بلکہ وہ بھی اسکی بات نہ مانی جائے جس پر ایسے تادیب کی بجائے۔ خدا کی طرف سے آفرین اور شاباش دی گئی ہے۔ اسے کہتے ہیں ہوا پرستی۔ اور یہ ہے ایک تھپیڑ کے الزام پر پھانسی کی سزا کا مظاہرہ۔

ہر حکومت کے قانون میں یہ گنجائش ہوتی ہے کہ اس کے ابتدائی عدالت کے فیصلہ کو بڑی عدالت میں چیلنج کیا جائے۔ اور بڑی عدالت چھوٹی عدالت کے فیصلوں کو رد بھی کرتی ہے مگر اس قانونی گنجائش اور تردید فیصلہ کے اس امر واقعہ سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکالا گیا کہ چونکہ ابتدائی عدالت کا فیصلہ قابل رد ہوتا ہے اس لئے

مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى

پاکی ہے اسے جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا "مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ تک" یہ جملہ بھی سیر جسمانی کا اعلان کر رہا ہے۔ کہ روح کے لئے طول زمان و بعد مکان یکساں ہے! اور اس کے لئے "اِدھر سے اُدھر پہنچی" اور یہاں سے چل کر وہاں تک گئی"۔ کے کلمات ہرگز موزوں نہیں۔ یہ محل و مقام اور زمان و مکان کی تحدید و تعیین تو جسم کے لئے ہی ہے۔ تو اس مِنْ اور اِلیٰ سے بھی ثابت ہوا۔ کہ حضور نے معہ الجسم سیر فرمائی۔

معراج کی حکمت

میرے بزرگو! ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم معراج پاک کی بزرگوں نے بہت سی حکمتیں لکھی ہیں۔ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ حضرت موسٰے علیہ السلام کو جب کوہ طور پر معجزہ عطا ہوا۔ تو خدا نے اسی وقت فرمایا۔ "اَلْقِ عَصَاكَ" اپنے عصا کو پھینکو چنانچہ موسٰے علیہ السلام نے پھینکا۔ اور وہ پھینکتے ہی سانپ بن گیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے۔خدا نے فرمایا۔ "خُذْهَا وَلَا تَخَفْ"۔ اسے پکڑ لو اور ڈرو مت! چنانچہ آپ نے پکڑ لیا وہ پھر عصا بن گیا۔

میرے دوستو! حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر اس عصا کا سانپ بن جانا پہلے ہی نہ دیکھ لیتے۔ تو پھر فرعون اور اس کی قوم کے مقابلہ میں جب یہ عصا ڈالتے اور وہ سانپ بن جاتا۔ تو آپ وہاں ڈر جاتے۔ تو معجزہ کی غرض فوت ہو جاتی اسی لئے اللہ نے حضرت موسٰے علیہ السلام کو پہلے ہی اس عصا کا سانپ بن جانا دکھا دیا۔ اور آپ کا ڈر اتار دیا۔ تاکہ وقت پر جب فرعون کا مقابلہ ہو تو آپ یہ معجزہ بے خوف ہو کر دکھائیں۔ اسی طرح چونکہ کل قیامت کا دن بڑا ہولناک ہوگا۔ اور سب نفسی نفسی پکارتے ہونگے۔ اور اس دن صرف ہمارے حضور ہی امتی امتی کا نعرہ لگا رہے ہونگے۔ اور آپ ہی گنہگاروں کی شفاعت فرمائینگے اس لئے اللہ نے پہلے ہی شبِ معراج حضور کو اپنے پاس بلا کر جنت و دوزخ و دیگر امور غیبیہ کا مشاہدہ کرا دیا۔ تاکہ آپ کل قیامت کے دن

اپنے مقدمات کو عدالت میں لانے کی بجائے عوام خود سر جوڑ کر بیٹھیں اور اپنے مقدمات کا فیصلہ غور و خوض سے چلانے لگ جائیں۔ اور پھر جو فیصلہ وہ خود اپنے جرم کے خلاف کریں وہ لازم ہونے میں قانون کے برابر اور صحیح ہونے میں وحی کا ہم مرتبہ ہو یہ کھیل دنیا بھر کے کسی آئین حکومت کے ساتھ کبھی نہیں کھیلا گیا۔ یہ ظلم عظیم آپ صرف ذات رسول پر روا رکھتے ہیں۔ کہ جب اس کی کسی بات پر آپ کے خیال کے مطابق خدا نے تادیب فرمائی۔ تو اس کے بعد اس کا فیصلہ فیصلہ نہ رہا اور اس کی عدالت عدالت نہ رہی۔ وہ فیصلہ اور وہ عدالت جس کے خلاف کچھ سوچنا بھی قرآن میں ایمان کے منافی ٹھیرایا گیا ہے۔ یہ حال کبھی کسی مردود الشہادہ گواہ کا بھی نہیں ہوا۔ کہ جب عدالت اسکی شہادت کو ایک دفعہ رد کر دے تو آئندہ کبھی اس کی کوئی بات بھی تصدیق کے قابل نہ رہے۔

"ماکان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الآخرۃ واللہ عزیز حکیم"

نبی کے لئے سزاوار نہیں کہ اس کے قبضہ میں قیدی ہوں جب تک کہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کرے۔ مسلمانو! تم دنیا کی متاع چاہتے ہو اور اللہ چاہتا ہے تمہیں آخرت کا اجر دے۔ اور وہ غالب ہے حکمت والا۔" ٨/٦٧

اس آیت کو آپ جنگ بدر میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کے متعلق بتلاتے ہیں۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس میں نبی کے خلاف تادیب کا پہلو کہاں ہے۔ کیا اس لئے کہ اس کے اندر اس کا نام لایا گیا۔ اسطرح اگر اس کا نام آ جانا ہی اس کی تادیب کا ثبوت ہے تو ایسی تادیبوں سے تو قرآن بھرا پڑا ہے

بے خوف ہو کر گنہگاروں کی شفاعت فرمائیں۔

واقعہ معراج

میرے دوستو! معراج کی شب جبریل امین کو حکم ہوا کہ :-

اے جبریل! اس رات آسمانوں کو سجا دو۔ نور کی چادریں بچھا دو۔ سب کے سب صف بصف دست بستہ کھڑے ہو جاؤ اور تم خادمانہ لباس پہن لو اور ستر ہزار فرشتوں کو ساتھ لے لو۔"

جبریل نے عرض کی۔ الٰہی کیا قیامت قریب آگئی؟ ارشاد باری ہوا :-

لَا وَلٰكِنْ حَبِيْبٌ اُرِيْدُ اَنْ اُقَرِّبَهٗ ـــ نہیں! بلکہ اپنے حبیب کو قریب بلانے کا ارادہ ہے" (روض الفائق ص۹۱)

یہ رات کیا ہی عجیب رات تھی۔ اس مبارک رات کی نورانیت وعظمت کو کون بیان کرے۔ سبحان اللہ! ہر طرف نور ہی نور اور ہر طرف سرور ہی سرور۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں ؎

وہاں فلک پر یہاں زمیں میں رچی تھی شادی مچی تھیں دھومیں
اُدھر سے انوار ہنستے آتے اِدھر سے نفحات اٹھ رہے تھے
یہ چھوٹ پڑتی تھی ان کے رخ کی کہ عرش تک چاندنی تھی چھٹکی
وہ رات کیا جگمگا رہی تھی جگہ جگہ نصب آئینے تھے

بخاری ومسلم۔ خصائص کبریٰ اور مواہب شریف ودیگر کتب احادیث میں جو تفصیل واقعہ معراج کی مذکور ہے۔ اس کے مطابق نبوت کے بارھویں سال رجب شریف کی ۲۷ ویں شب کو یہ مرتبہ حضور کو عطا ہوا۔ اس رات حضور صلے اللہ علیہ وسلم کعبہ کے شمالی جانب ام ہانی کے حجرہ میں آرام فرما تھے۔ کہ اچانک حضرت جبریل پچاس ہزار فرشتوں کے ساتھ معہ ایک براق برق رفتار کے حاضر ہوئے۔ فرشتوں کی تسبیح سے حرم شریف گونج اٹھا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب ناز میں دیکھ کر جبریل نے دفعتًا جگانا خلافِ ادب جانا۔ اس لئے اپنی کافوری آنکھیں سرکار کے پائے مبارک کے نوری تلووں سے ملنے لگے۔ اور آہستگی سے یوں عرض کرنے لگے ؎

اے رسولِ عربی شافعِ محشر جاگو آیا جبریل ہے لینے کو ہمیر جاگو!

مثلاً ایک مقام پر ہے کہ نبی کے لیے لائق نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ اس سے فرض کیا جا سکتا ہے کہ شاید اللہ نے آنحضور کو خیانت کرنے پر تادیب فرمائی۔ اور خیانت کی اس حرکت سے باز رہنے کی تاکید اور جہنم کی وعید سنائی۔ ایک اور جگہ پر ہے کہ نبی کے لائق نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے دعائے مغفرت مانگے۔ اس سے ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ آنحضور مسلمانوں کی بجائے کافروں کے خیر خواہ تھے اور ان کے لیے دعا مانگتے تھے۔ اور اس پر خدا نے تادیب فرمائی ایک اور جگہ آیا ہے کہ رسول کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ خدا کے بلا اذن معجز دکھائے۔ اس سے دکھایا جا سکتا ہے کہ شاید رسول نے اللہ کے بلا اذن معجزات کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اور خدا نے اس پر تادیب فرمائی۔ ایک اور مقام پر ہے کہ رسول کا یہ کام نہیں کہ وہ خدا کی طرف سے کتاب اور نبوت حاصل ہو جانے کے بعد اپنی خداوندی کا تخت بچھا کر لوگوں سے اپنی بندگی کرانے لگ جائے۔ اس سے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رسول نے کبھی تاؤ میں آکر خدائی کا دعویٰ بھی کر دیا تھا۔ اور اس پر خدا نے اس کی تادیب فرمائی تھی۔

ذرا غور فرمائیے آیت میں لوگوں کو خطاب میں فرمایا گیا کہ تم دنیا کو پسند کرتے ہو اور اللہ کو آخرت پسند ہے۔ آخر یہاں درمیان میں بلا وجہ اور خواہ مخواہ تادیب کی زد نبی پر کیسے جا پڑی۔ کیا اس لئے کہ اس نے دشمنوں کو قیدی بنایا۔ اور خود ان کی قید و بند سے بچ نکلا۔ ادھر جس روایت پر اس مفروضہ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس میں یہ کہیں نہیں کہ اس معاملہ میں رسول معتوب ہے۔

صدقے ان نرگسی آنکھوں کے گل تر جاگو بخت بر آپکے قربان سکندر جاگو
جاگو جاگو مرے آقا مرے سرور جاگو

حضور صلے اللہ علیہ وسلم بیدار ہوتے تو حضرت جبریل نے خدا کے وصال کی بشارت سنائی اور عرض کی ؎

مژدۂ وصلِ خدا تم کو مبارک ہووے ؛ طلعتِ قربِ سدا تم کو مبارک ہووے
جو کسی کو نہ ملا تم کو مبارک ہووے ؛ رتبۂ صدق وصفا تم کو مبارک ہووے
شبِ معراج شہا تم کو مبارک ہووے

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا آرام فرما ہونا۔ اور جبریل امین کا دیدار حق کا پیغام لے کر حضور کو لے چلنے کے لئے حاضر ہونا: اس واقعہ کو اعلیٰ حضرت بریلوی نے اس شعر میں بیان فرمایا ہے ؎

یہی سماں تھا کہ پیکِ رحمت خبر یہ لایا کہ لیئے حضرت
تمہاری خاطر کشادہ ہیں جو کلیم پر بند راستے تھے!

حضور موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے۔ اور عرض کی۔ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ۔ اے رب! مجھے اپنے دیدار سے مشرف فرما۔ تو جواب ملا تھا۔

لَنْ تَرَانِیْ ..... تم مجھے نہیں دیکھ سکتے!

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں۔ کہ جبریل نے اس وقت حاضر ہو کر عرض کی۔ کہ حضور وہ راستے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بند تھے۔ یعنی دیدار کے راستے۔ اس رات وہ آپ کے لئے کھل گئے ہیں۔ اور وہی ربّ دو عالم جس نے حضرت موسےٰ علیہ السلام کو لَنْ تَرَانِیْ فرمایا تھا۔ آپ کو اپنے پاس بلا رہا ہے۔ اور دعوتِ دیدار دے رہا ہے ؎

تبارک اللہ ہے شان تیری تجھی کو زیبا ہے بے نیازی
کہیں تو وہ جوش لن ترانی کہیں تقاضے وصال کے تھے

الغرض تو! حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو جگا کر جبرائیل امین نے پھر سینۂ پُر نور حضور کا چاک کر کے قلب انور کو تین مرتبہ آب زمزم سے دھویا۔ اور لاکھوں قسم کے انوار و تجلیات سے معمور کر کے بدستور اپنی جگہ رکھ کر سی دیا۔

"عفا اللہ عنک لم اذنت لھم حتیٰ یتبین لک الذین صدقوا و تعلم الکاذبین۔
اللہ تجھے معاف کرے۔ تو نے انہیں پیچھے رہ جانے کی رخصت کیوں دیدی اسوقت تک کہ تجھ پر کھل جاتا کون سچے ہیں اور تو معلوم کر لیتا کون جھوٹے ہیں" صفحہ ۶۷

اس آیت سے تادیب کا پہلو یہ سامنے لایا جاتا ہے کہ آنحضور نے جنگ سے جان چرانے والے منافقین کو پیچھے رہنے کی رخصت کیوں دی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تادیب کی اصل زد حدیث اور غیر قرآنی وحی کی بجائے قرآن پر پڑتی ہے۔ فرض کیجئے کہ وحی صرف قرآن میں ہے تو اب دیکھنا ہوگا کہ قرآنی احکام کا دائرہ اثر کہاں تک ہے۔ کیا اس میں پہلے حکم آتا ہے یا حکم آنے سے پہلے ہی اسکی خلاف ورزی کی تنبیہ اور تادیب کر دی جاتی ہے۔ اگر تادیب سے پہلے حکم کا موجود ہونا ضروری ہے تو یہاں ایسی صورت نہیں۔ بلکہ جنگ سے جان چرانے والوں کو رخصت دینے کی ممانعت کے بغیر ہی اس رخصت کی تادیب واقع ہوتی۔ اس لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اگر یہ تادیب ہے تو اسکا محل رسول کی ذات کس لئے اور کیوں ہے۔ منافقین اگر اسکی زد میں آتیں تو بھی سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ جہاد کا حکم پہلے سے موجود تھا۔ اور اس میں حاضر نہ ہونے والوں کو بجا طور پر ملامت کا مستحق ہونا ہی چاہیئے تھا۔ مگر یہ بات کسی طرح بھی سمجھ میں آنے والی نہیں کہ جب انہیں رخصت دینے کی ممانعت ہی نہیں تو اس رخصت کے دینے پر رسول کو تادیب کیوں کیگئی جبکہ اس سے کسی ہدایت کی خلاف ورزی ہوئی نہیں۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ تنبیہ اس لئے ہوئی اور رسول کو ہوئی کہ اس نے

نورٌ ہی نور

حضرات! یہ مبارک رات کیسی مبارک رات ہے۔ محب سے محبوب کے وصال کی رات! طالب کی مطلوب سے ملاقات کی رات زمین و آسمان پر نور ہی نور ہے۔ ہر طرف سرور ہی سرور ہے۔ اعلیحضرت فرماتے ہیں۔ ؎

وہاں فلک پر یہاں زمین میں رچی تھی شادی مچی تھی دھومیں
اُدھر سے انوار ہنستے آتے اِدھر سے نفحات اٹھ رہے تھے

اور یہ حرم شریف؟ اس رات یہ کس عالم میں ہے۔ فرماتے ہیں ؎

خوشی کے بادل امنڈ کے آئے دلوں کے طاؤس رنگ لائے
وہ نغمۂ نعت کا سماں تھا حرم کو خود وجد آ رہے تھے

جنت کے دُولہا

تو اسی عالم صد سرور و نور میں پچاس ہزار فرشتوں کے جھرمٹ میں جبریلِ امین حضور کو جنت کا دولہا بنا رہے ہیں۔ ؎

خدا ہی دے صبر جان پر غم دکھاؤں کیونکر تجھے وہ عالم
جب اُنکو جھرمٹ میں لے کے قدسی جناں کا دولہا بنا رہے تھے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نورانی جھرمٹ میں جبریل امین نے پھر آبِ کوثر سے غسل دیا۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز کی قبر انور پر رحمت کے پھول نچھاور ہوں۔ اس موقعہ پر کیا ایمان افروز شعر ارشاد فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

اتار کر ان کے رخ کا صدقہ یہ نور کا بٹ رہا تھا باڑہ
کہ چاند سورج مچل مچل کر جبیں کی خیرات مانگتے تھے

لیجئے یہ چاند اور سورج کا سارا نور شب معراج کے اس نورانی غسل میں جبینِ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے گرے ہوتے پانی کا صدقہ ہے۔

اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک تلووں کا جو دھوون تھا۔ اس سے کیا بنا؟ فرماتے ہیں۔ ؎

بچا جو تلووں کا ان کے دھوون بنا وہ جنت کا رنگ و روغن
جنہوں نے دولہا کی پائی اترن وہ پھول گلزارِ نور کے تھے

وضو کا پانی

اس غسل شریف میں حضور نے جو وضو فرمایا۔ جبریل کو حکم ہوا

ایک ایسے معاملہ میں اپنی عقل سے غلط کام کیا جہاں قرآن کی رہنمائی موجود نہ تھی۔
اس پر پھر وہی سوال وارد ہوگا کہ جو کام انکی سمجھ سے باہر تھا اس میں ایسے قرآن
کی رہنمائی کیوں نہ ہوئی۔ نماز روزہ وغیرہ احکام شریعت اسی لئے تو قرآن
میں دیئے گئے۔ کہ پہلے رسول ان پر کاربند نہ تھا۔ اور انکی وجہ سے ایسے ان کا کار
بند بنایا گیا۔ پھر اگر جنگ کی رخصت دینے یا نہ دینے میں بھی آپکی عقل قاصر تھی
تو ضروری تھا کہ آپ کو اس کے لئے ہدایت بھیجی جاتی اور آپ کو اس ہدایت
کا پابند بنایا جاتا۔ اور اس کے بعد پھر دیکھا جاتا کہ اس کی پابندی ہوتی ہے یا نہیں
پرویز صاحب کہتے ہیں کہ یہ کام کوئی ایسا بڑا مشکل نہ تھا۔ کہ قرآن کی ہدایت کے بغیر
سمجھ میں آنے والا نہ ہوتا۔ اس مقام پر پہنچکر پھر رسول کے علم وعقل سے نکل خدا
کے علم پر بحث کا آغاز کرنا ہوگا۔ اور ہم کہیں گے کہ یہ عجیب بات ہے۔ کہ خدا نے ایک
کام میں اس لئے ہدایت نازل نہ فرمائی کہ وہ اس کے نزدیک رسول کی سمجھ
میں آنے والا کام تھا مگر ہوا یہ کہ خدا کا اندازہ غلط نکلا۔ اور رسول اس میں غلطی کر
گیا۔ یہ فیصلہ اب اپنی قرآنی بصیرت کے تحت پرویز صاحب کریں کہ اس میں غلطی
پہلے کی ہے یا دوسرے کی یا دونوں کی۔ اس لئے کہ ایسے نادر فیصلوں کے
آپ ہی اہل ہیں۔ ورنہ جو آدمی خدا سے ڈرتا ہو وہ تو ایسی بحث میں نہیں پڑا کرتا۔

ہماری دانست میں رسول کا منصب اول اور آخر احکام حق کی پیروی کرنا
ہے اور بس نہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ اسے حکم غلط دیا جائے اور نہ یہ ممکن ہے
کہ وہ حکم کو غلط سمجھے۔ یا ٹھیک سمجھتے ہوئے اس کی غلط پیروی کرے۔ اور
نہ ہی یہ مانا جا سکتا ہے کہ جب ایسے کام کرتا ہو اس وقت تو اسے ہدایت

کہ جبریل یہ وضو کا پانی لے لو۔ اور میکائیل کے سپرد کردو۔ اور پھر یہ پانی رضوان جنت تک پہنچا دیا جائے۔ تاکہ رضوانِ جنت اس پانی کو حوران جنت میں تقسیم کردیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا۔ اور پھر حورانِ جنت کو حکم ہوا۔ کہ یہ پانی اپنے اپنے منہ پر مل لو۔ انہوں نے مل لیا۔ اور ان کا نور وحسن بڑھ گیا۔

ہاں تو بھائیو! غسل شریف کے بعد پھر حضور کو حلہ بہشتی پہنایا گیا اور سر اقدس پر وہ عمامہ باندھا گیا۔ جو آپ ہی کے لئے اس شب کو باندھنے کے لئے حضرت آدم علیہ السلام سے بھی پہلے تیار کیا گیا تھا۔ اور ایک نورانی چادر حضور کو اوڑھائی گئی۔ اور پچاس ہزار فرشتوں کے نورانی انبوہ میں حضور نے تیاری فرمائی ؎

تجلیٔ حق کا سہرا سر پر صلوٰۃ و تسلیم کی نچھاور!
دو رویہ قدسی پرے جما کر کھڑے سلامی کیواسطے تھے

براق

اس کے بعد جبریل نے پھر ایک تیز رفتار جنتی مرکب براق نامی خدمت عالی میں پیش کیا۔ اور عرض کی۔ حضور اس پر سواری فرمائیں حضور نے یہ سن کر اس پر سواری کا قصد فرمایا۔ تو براق کچھ شوخی کرنے لگا۔ اس پر جبریل نے براق سے خطاب کرکے کہا۔ اے براق ٹھہر جا شوخی نہ کر اس وقت تجھ پر وہ سوار ہوتا ہے۔ جو اللہ کا محبوب ہے۔ اور نبی آخر الزمان ہے۔ براق یہ سن کر شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ پھر حضور سوار ہوئے ؎

ابھی نہ آئے تھے پشتِ زیں تک کہ سر ہوئی مغفرت کی اشلک
صدا شفاعت نے دی مبارک گناہ مستانہ جھومتے تھے!

جبریل نے رکاب تھامی۔ میکائیل نے لگام پکڑی اور گروہ ملائکہ سمیت بیت المقدس کو روانہ ہوئے۔ یہ مبارک سواری کس شان سے روانہ ہوئی؟ کس میں طاقت ہے۔ کہ بیان کر سکے۔ آج کوئی افسر کسی شہر میں آتا ہے۔ تو اس کی راہ میں ریشمی چادریں بچھا دی جاتی ہیں۔ مگر اس رات کو سرور عالم کی یہ سواری جس راہ سے گذرنے والی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ اس راہ میں کیا بچھ رہا تھا؟ ؎

غبار بن کر نثار جائیں کہاں اب اس رہگذر کو پائیں!
ہمارے دل حوریوں کی آنکھیں فرشتوں کے پر جہاں بچھے تھے

نہ میسر ہو. اور جب وہ کام بگاڑ بیٹھے. تو اس کے بعد اسے سمجھایا جائے کہ تمہیں اس کی بجائے کچھ اور کرنا تھا. یہ جب حقیقت ہے تو پھر رسول کبھی بھی تنبیہ اور تادیب کا مورد نہیں ہو سکتا. کیونکہ رسول کے ایک غلط کام کر گزرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ خدا نے اسے معاذ اللہ غلط حکم دیا. یا اگر وہ حکم کو غلط سمجھا تو خدا اسے سمجھا نہ سکا. اور اگر اس نے سمجھ بوجھ کے غلطی کی تو اس کے معنی ہوں گے کہ اس کے ہاں خدا کے احکام کی کچھ اہمیت نہ تھی. ان میں سے کوئی بات بھی ایمان اور عقل کے موافق نہیں. بلکہ ایمان اور عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ خدا اور رسول کے احکام میں غلطی کا پہلو تلاش کرنے کی بجائے ان پر عمل کیا جائے. اور عمل کرنے والا کبھی ایسے لاحاصل شغل میں نہیں پڑتا. ایسی بحث تو انہیں لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جو عمل کے لئے کبھی تیار نہ ہوں اور اپنی بے عملی کو بحثوں میں چھپائیں اور دوسروں کو نکما بنائیں.

مثال کے لئے اسی واقعہ کو لیجئے. اس آیت میں اللہ نے آنحضور کو فرمایا ہے کہ تم نے منافقوں کو جہاد سے رخصت کیوں دی؟ اس سے ایک مومن قرآن ہی سبق لے گا کہ وہ خدا کے حکم کو مانے اور منافقین کی طرح نہ ہو. بخلاف اس کے ایک اُلٹے دماغ کا مالک اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ دیکھا رسول کو غلطی لگ گئی. اس پر وہ پھر حدیث کی ساری تعلیم کو غلط اور خلاف وحی ٹھہرا کر صرف قرآن کو لے گا. اور اسے بھی اپنی عقل پر ڈھال کر بہت بڑے احکام کے حصہ سے اپنے آپکو بچا لیگا. کیونکہ اگر ایک مزدور کو خود ہی اپنی ڈیوٹی کا تعین کرنا ہو تو پھر اسکی ڈیوٹی یہی ہوتی ہے کہ وہ نکما رہے.

جہاں تک اس تادیب کی حقیقت ہے. قرآن مجید کے اس مقام نے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بایں شان و شوکت بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں نخلستان طیبہ جو اس وقت یثرب کہلاتا تھا۔ اور جہاں کچھ عرصہ کے بعد حضور ہجرت فرماکر تشریف لانے والے تھے۔ اور طور سینا پہاڑ کہ جس پر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے باتیں کی تھیں۔ اور بیت اللحم جہاں حضرت عیسےٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ کی سیر کرتے اور ہر متبرک مقام پر دو رکعت نماز نفل ادا کرتے ہوئے آپ آگے تشریف لے چلے۔

دنیا و شیطان

یکایک ایک حسین عورت بناؤ سنگار کرکے اور خوب بن ٹھن کر حضور کے سامنے آگئی۔ مگر حضور نے اسکی طرف مطلق التفات نہ فرمایا۔ اس کے بعد ایک بوڑھے مرد نے آپ کو پکارا۔ مگر حضور نے اس کی طرف بھی التفات نہیں فرمایا۔ نہ جواب دیا۔ اس موقعہ پر جبریل نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! وہ جو حسین عورت تھی وہ دنیا تھی۔ اگر حضور اس کی طرف التفات فرمالیتے۔ تو حضور کی ساری امت دین چھوڑ کر دنیا کی طرف راغب ہو جاتی۔ اور جس بڈھے نے آپ کو پکارا تھا۔ وہ شیطان تھا۔ اگر آپ اسکی آواز پر جواب دیتے تو آپکی ساری امت اس کے دامِ فریب میں پھنس کر گمراہ ہوجاتی

قبر سے خوشبو

اس کے بعد آپ آگے بڑھے تو مصر کی سرزمین سے گزرتے ہوئے آپ کو ایک جگہ سے بڑی خوشبو آئی۔ جبریل نے عرض کیا حضور! فرعون کی دختر کی ایک خادمہ تھی۔ جو مسلمان ہوگئی تھی اور فرعون نے بڑی بے دردی سے مروا ڈالا تھا۔ یہ خوشبو اس کی قبر سے آرہی ہے۔

بیت المقدس

غرضیکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اسی قسم کے بہت سے عجائب و غرائب ملاحظہ فرماتے ہوئے بیت المقدس تک پہنچ گئے۔ یہاں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسےٰ علیہ السلام تک سارے پیغمبر علیہم السلام سب کے سب آپکی انتظار میں چشم براہ اور گوش برآواز تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی فوراً استقبال کو آگے بڑھے۔ آپ نے براق سے اتر کر بعد السلام علیکم کے سب سے ملاقات فرمائی۔ جبریل نے تعارف فرمایا۔ اور براق آپ کا بیت المقدس کے اس دروازہ سے باندھا گیا۔ جو آج

معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہاں اصل موضوع بحث منافقین کی رسوائی ہے۔ خدا نے واضح فرمایا ہے کہ وہ جنگ میں جانے کو بالکل تیار نہ تھے۔ اور نہ اس کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور اگر جاتے تو بنانے کی بجائے کچھ بگاڑ کر آتے۔ ایسی صورت میں اصل سوال یہ نہیں تھا کہ انہیں رخصت کیوں دی گئی۔ بلکہ یہ تھا کہ وہ تمام کے مسلمان اور اندر کے دشمن جو تھے انکی اسلام پر فدائیت کا حال کھل کر اور ان کا کردار ننگا ہو کر کیسے سامنے آئے اگر آنحضور انہیں رخصت کی بجائے جنگ میں شامل ہونے کا حکم فرماتے اور وہ انکار کر دیتے تو دیکھنے والے لوگ بھی یہی کہتے کہ کیا ہوا جو ایک لڑائی میں شامل نہ ہوئے اور بعد والوں کے علم میں تو سرے سے ان کا حال آہی نہ سکتا۔ اب جو انہیں آنحضور نے رخصت فرما دی تو خدا نے ایسا کیا کہ اسی رخصت کو عنوان بنا کر اس کے تحت ان کا کچا چٹھا جو کھولنا شروع کیا تو آخر سورۃ تک اسی موضوع کو جاری رکھا قرآن کے ذریعہ ان کا ظاہر و باطن بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ اور انکا کردار بالکل چوراہے میں لا کر چھوڑ دیا۔ اور اس کا کوئی گوشہ بھی غبار میں نہ رہنے پایا۔ خدا نے واضح فرما دیا۔ کہ میدان جہاد سے گریز کرنا دراصل اسلام سے بھاگنا ہے۔ اور یہ شریر عنصر اگرچہ عین موقعہ پر تو رخصت کا بہانہ اڑ بیٹھا۔ مگر جنگ میں شامل ہونے کے لئے آغاز امر میں ہی تیار نہ تھا۔ ان کے عمل سے بھلائی کی توقع ہوتی ہی نہیں چاہیئے۔ نہ ان کے گذشتہ واقعات کے پیش نظر اور نہ انکی موجودہ حرکات اور آئندہ منصوبوں کے تحت چنانچہ دیکھنے والوں کی نظروں میں بھی اس طرح ان کے یہ سب الخبر ایک ایک کر کے تازہ اور واضح ہو گئے اور بعد والوں کے سامنے بھی سارا نقشہ پوری طرح آ گیا۔

بھی باب محمد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد جبریل نے اذان کہی۔ اس اذان کو سن کر آسمانوں سے دیگر فرشتے بھی نازل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ساری مسجد اور جنگل زمین سے آسمان تک بھر گیا۔ جبریل نے تکبیر کہی صفیں درست ہوئیں۔ تمام انبیاء اور فرشتے پیچھے کھڑے ہوئے۔ اور امام الکل سرور رسل سب کے امام بنے۔ اور نماز پڑھائی۔ سارے نبیوں کے بعد تشریف لانے والے آج سارے نبیوں کے آگے تشریف فرما تھے ؂

نماز اقصیٰ میں تھا یہی سرّ عیاں ہوں معنیٔ اول آخر
کہ دست بستہ ہیں پیچھے حاضر جو سلطنت آگے کر گئے تھے

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں۔ کہ بیت المقدس کی اس نماز میں یہی راز تھا۔ کہ حضور کے اول و آخر ہونے کا مظاہرہ ہو جائے۔ دیکھ لیجئے۔ جتنے انبیاء کرام حضور سے پہلے گزر چکے تھے۔ وہ سب کے سب آج حضور کے پیچھے کھڑے ہیں اور حضور سب سے آگے ہیں۔ گویا سب سے پیچھے آنے والے نبی آج سب سے آگے ہیں۔ حضور کا سب سے پیچھے تشریف لانا یہ حضور کا "آخر" ہونا اور سب سے آگے کھڑے ہونا اور سب کا امام بننا یہ حضور کا "اول" ہونا ہے

آسمانوں پر

بیت المقدس تک پہنچنے کے بعد پھر حضور سے جبریل نے عرض کی یا رسول اللہ! آسمان والے آپ کی اشتیاق میں سراپا انتظار ہیں۔ اب آیئے آپ اوپر تشریف لے چلئے۔ چنانچہ پھر حضور نے آسمان کی طرف رخ فرمایا۔ پہلے آسمان تک آپ پہنچے۔ تو جبریل نے دروازہ کھلوایا، اس دروازے کے محافظ اسماعیل نامی فرشتے نے دروازہ کھولا۔ تو حضور اندر داخل ہوئے پہلے آسمان کے جملہ فرشتے استقبال و زیارت کو بڑھے اور مرحبا مرحبا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ حضور فرماتے ہیں۔ میں نے پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام کو تشریف فرما دیکھا۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب سلام دیا۔ پھر حضور دوسرے آسمان تک پہنچے۔ جبریل نے دروازہ کھلوایا۔ آپ اندر داخل ہوئے۔ آپ فرماتے ہیں۔ میں نے دوسرے آسمان یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ سلام کیا۔ انہوں نے جواب

عفو فرمایئے۔ منافقین کی رسوائی اس طرح زیادہ ہوئی یا اگر آپ انہیں رخصت نہ دیتے تو زیادہ ہوتی۔ مجرد یہ بات رسول کی تادیب نہیں کہ منافقین کی ملامت کے عنوان میں ایسے کہا گیا کہ خدا تجھے معاف کرے تو نے انہیں رخصت کیوں دی۔ ہم اگر انہیں رخصت دیتے تو اس کے بعد انہیں ملامت کرتے وقت ہم بھی بالکل یہی عنوان بناتے کہ اللہ ہمیں معاف کرے۔ ہم نے ایسے شر پر گردہ کو رخصت کیوں دی۔ اس وقت ہماری ایسی ذاتی المناکی کے روئے سخن کا نشانہ بھی وہی منافق ہوتے نہ کہ ہم خود اور جتنا ہم اپنے آپ کو کچھ کہتے اسی قدر ان کی ملامت کا پہلو نمایاں سے نمایاں تر ہوتا۔ جیسے کسی مجرم کی سزا کے وقت کہہ دیا جاتا ہے کہ دیکھنا اسے معافی دینے کی غلطی نہ کرنا۔ ایسی بات سے اصل مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کا جرم نمایاں ہو۔ نہ یہ کہ معافی دینے والے کو غلط کار ظاہر کیا جائے۔

"یا ایہا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک۔ واللہ غفور رحیم۔

اے پیغمبر اسلام جو چیز اللہ نے حلال کر رکھی ہے اس کو خود پر حرام کیوں کرتے ہو۔ کیا اپنی بیوی کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے۔ اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے" ص ۶۷

اس آیت میں پرویز صاحب رسول کی غلطی کی اس طرح ٹوہ لگاتے ہیں کہ اگر یہ مان لیا جائے۔ کہ آنحضور کا ہر عمل وحی کے مطابق تھا تو جب آپ نے اپنی بیویوں کی رضامندی کے لئے ایک چیز ترک کر دی تھی۔ تو اس پر خدا کی طرف

دیا۔ مسلمانو! یہاں ایک عام غلطی کی تصحیح کر لیجئے۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام کے متعلق عام مشہور ہے۔ کہ آپ چوتھے آسمان پر ہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ حدیث معراج سے حضرت عیسٰے علیہ السلام کا دوسرے آسمان پر ہونا ثابت ہے حضور علیہ السلام پھر اسی طرح تیسرے آسمان پر پہنچے اور پھر چوتھے۔ اور پانچویں اور چھٹے آسمان پر تشریف لے گئے۔ تیسرے آسمان پر آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات فرمائی۔ چوتھے پر حضرت ادریس۔ پانچویں پر حضرت ہارون اور چھٹے پر حضرت موسٰی علیہم السلام سے ملاقات فرمائی۔ ساتویں آسمان پر حضور جب پہنچے۔ تو بیت المعمور سے تکیہ لگائے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ حضرت خلیل نے جوابِ سلام دیا اور فرمایا۔ نیک نبی، اور نیک فرزند کو یہ رتبہ مبارک ہو۔ الغرض حضور کی سواری ساتوں آسمانوں کے فرشتوں کے انبوہ میں سے۔ اور انبیاء کرام کی مجالس میں سے بڑی شان و شوکت کے ساتھ گزری۔ اور آگے بڑھی۔

تعظیم رسول

یہاں ایک فرشتے کا واقعہ بھی سن لیجئے۔ یہ روایت جامع المعجزات فی سیر خیر البریات مطبوعہ مصر صلا پر علامہ محمد رہاوی نے درج فرمائی ہے۔ اور میں نے اسے جامۂ نظم بھی پہنایا ہے۔ چنانچہ اس روایت کو سنیئے اور سر دھنیئے۔

اس روایت میں آتا ہے کہ واقعہ معراج شریف کے کچھ عرصہ بعد ایک مرتبہ جبریل امین حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کی۔ یا رسول اللہ آج ایک عجیب بات عرض کرنے حاضر ہوا ہوں۔ یا رسول اللہ! آپ کے معراج کو جانے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ کہ آسمان پر میں نے ایک بہت بڑا عزت و وقار کا مالک فرشتہ دیکھا۔ حضور! یہ فرشتہ ؎

اک مرصّع تخت پر بیٹھا ہوا تھا ذی وقار
اور فرشتے تخت کے ماحول تھے ستّر ہزار
وہ فرشتے مقتدی تھے اور یہ ان کا امام
کر رہے تھے ذکرِ حق مل کر یہی تھا ان کا کام

یے تنبیہ کے کچھ معنی نہ تھے۔ معلوم ہوا کہ آپ کا ایسا کرنا وحی کے مطابق نہ تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ ممانعت کب تھی۔ کہ آپ ایسا نہ کریں اور جب نہ تھی اور نہ آپ نے قرآن کے خلاف کچھ کیا تو اس تنبیہ کا مصرف کیا ہوا۔ جہاں تک بیویوں کی رضامندی کا تعلق ہے اس کا قرآن میں آپکو حکم دیا گیا تھا۔ جس پر عمل کرنا کچھ بھی معیوب نہ تھا۔

اصل میں یہاں تنبیہ وغیرہ کچھ بھی نہیں۔ معاملہ صرف اتنا ہے کہ آپکو اپنی ذاتی پرہیزگاری اور پابندی احکام میں تنگی کی بجائے ڈھیل اور کشادگی دی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ احکام کو آپ جس شدت احتیاط کیساتھ انجام دے رہے ہیں۔ وہ کچھ لازم اور ضروری نہیں بلکہ اس سے کم احتیاط بھی کافی ہے۔ اور آپ بے شک رخصت سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آنحضور کو منکرین دین کے غم واندوہ میں دُبلا پتلا اور نڈھال ہونے سے روکا گیا۔ اس قسم کی دلجوئی کو بھی کوئی بے وقوف ہو جو تنبیہ اور جھڑک سمجھ بیٹھے۔ اور کہے کہ لوگوں کے شوق ہدایت سے آپکو منع کیا گیا ہے اس لئے تبلیغ دین کا شوق رکھنا بھی گناہ ہے اور خلاف وحی

واقعہ یہ ہے کہ بیویوں کی رضامندی کا اور ان کے درمیان انصاف قائم رکھنے کا قرآن میں آپکو حکم دیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض نے چاہا کہ آپ شہد کو استعمال نہ کریں۔ یا ان کے ہاں استعمال نہ کریں۔ جہاں پہلے کرتے ہیں۔ اس پر آپ نے ارادہ ظاہر فرمایا کہ کوئی بات نہیں۔ میں ایک چیز کو تم سب کی دلجوئی کے لئے ترک کر دونگا۔ اس میں کیا مضائقہ ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے فرمایا

یا رسول اللہ! وہ فرشتہ بڑی عزت کا مالک تھا۔ اور خدا نے اُسے بہت عروج و وقار عطا فرما رکھا تھا۔ مگر اب جو میں ایک دن قاف کے پہاڑوں سے گزرا ہوں۔ تو ایک دردناک آواز سنی۔ یہ آواز سن کر میں جہاں سے آواز آرہی تھی۔ وہاں گیا۔ تو حضور کیا بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا اور کیسے دیکھا؟ ؎

اللہ اللہ رب کے بھی کیا بے نیازی کے ہیں کام
یا نبی یہ تھا وہی جو تھا فرشتوں کا امام
تخت پر دیکھا تھا اس کو ایک دن افلاک پر
اور اس دن دیکھتا ہوں رو رہا ہے خاک پر
اس کے خادم تھے فرشتے ایک دن ستر ہزار
آج یاں تنہا پڑا ہے، کوئی حامی ہے نہ یار

یا رسول اللہ! میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ یہ وہی معزز و معظم فرشتہ جو ستر ہزار فرشتوں کا امام تھا۔ آج بے کس و تنہا یہاں پہاڑوں میں پڑا ہُوا ہے۔ اور کوئی پرسانِ حال نہیں۔ رو رہا ہے۔ اور رو رو کر حق سے معافی مانگ رہا ہے۔ حضور جب میں اس کے پاس پہنچا۔ اور اس سے انقلاب کی وجہ دریافت کی۔ اور اس زوالِ رتبہ کا سبب پوچھا۔ تو وہ بولا ؎

لیلۃ المعراج کو بیٹھا تھا اپنے تخت پر
ذکرِ حق میں محو تھا اور ماسوئی سے بے خبر
سرورِ دو کون محبوبِ خدائے بحر و بر
میرے آگے سے ہُوا ان کی سواری کا گزر
محو ذکرِ حق میں ہو کر لے رہا تھا رب کا نام
بہر تعظیم محمدؐ رہ گیا مجھ سے قیام
بس یہی لغزش ہوئی میرے لئے وجہِ وبال
آگیا اپنی جلالیت میں ربِّ ذوالجلال

بس اے جبریل! مجھ سے جو یہ لغزش واقع ہوئی۔ تو خدا تعالیٰ اس بات پر اپنے جلال میں آگیا۔ اور میری ساری عبادت کی عدمِ قبولیت کا اعلان

کہ ان کی دلجوئی کے لئے یہ کچھ بھی لازم نہیں کہ آپ اپنی دلجوئی کو ان کی دلجوئی پر قربان کرنے لگ جائیں۔ وہ اگر ایک جائز اور حلال چیز کے استعمال کرنے میں آپ سے ناخوش ہوں تو پرواہ نہیں۔ آپ شوق سے حلال چیزوں کو استعمال میں لائیے اور اپنے طبعی تقاضے کو پامال نہ کیجئے۔ یہ کچھ ہے یہاں اس تادیب کا طول و عرض جسے پرویز صاحب بڑی کاوش سے اپنے مطلب کے موافق پاکر اچھال رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ آنحضور کی دلجوئی اور آپکی بیویوں کی تادیب ہے کہ وہ آپکو مشقت میں ڈالنے کا باعث نہ ہوں۔ اور آپ کے کھانے پینے کے طبعی ذوق کے آڑے نہ آئیں۔ اور آپ کی بردباری اور نازبرداری کو آپ کے لئے اور خود اپنے لئے فتنہ نہ بنائیں۔ اور ایسے مطالبات منوانا شروع نہ کردیں کہ ایکدن آپ کو کھانا پینا بھی چھوڑنا پڑجائے۔ اور ان کے مطالبات پھر بھی باقی رہیں۔

اس واقعہ کا ایک قابل غور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ایک عام حاکم یا امیر وقت اپنی بیوی کی خواہش پر کوئی کھانے پینے کی چیز چھوڑ دے تو اس کی حکومت یا امارت میں کوئی بھی خرابی نہیں آتی اور نہ ہی حکومت وامارت کا کوئی شعبہ ایسا ہوتا ہے جو بیوی کی خوشنودی کے بغیر معطل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہر بیوی یا ہر حکمران کی بیوی کی ہر بات ماننے یا نہ ماننے کے احکام خدا نے نہیں دیئے پھر دوسرے ہر خاوند کی اور ہر حکمران کی زندگی اور تندرستی اس کی اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے نہ خاوند کمیاب ہوتے ہیں اور نہ حکمران۔ لیکن رسول کی زندگی اور تندرستی کی ضرورت تمام امت کو اور پوری نوع انسانی کو ہوتی ہے جس کے اندر ذراسی گڑبڑ پیدا ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پورا نظام

فرما دیا۔ اور ؎

حکم فرمایا نکل جا اے فرشتے پر غرور
کیوں نہ کی تعظیم آیا سامنے جب میرا نور
یہ عبادت رات دن کی مجھ کو نامنظور ہے
دور ہے جو میرے احمد سے وہ مجھ سے دور ہے
وہ عبادت ہی نہیں جس میں نہ ہو حبِّ رسول
جن میں بو پاتی نہیں جاتی وہ ہیں کاغذ کے پھول

اے جبریل! اسی دن سے خدا نے معتوب فرما کر مجھے میرے تختِ عزت سے اتار کر یہاں پھینک دیا ہے۔ اب ہر وقت اس سے معافی مانگ رہا ہوں۔ مگر تاحال میری توبہ منظور نہیں ہوتی۔ اے جبریل! تو ہی میرے لئے دعا کر! کہ خدا مجھے معاف کر دے۔ یا رسول اللہ! مجھے بڑا رحم آیا۔ اور میں نے اللہ سے بصد عجز و نیاز اس کی معافی کے لئے دعا کی۔ حضور! آپ کے صدقہ میں خدا کا دریائے رحم و کرم جوش میں آیا۔ اور میری دعا قبول ہوئی۔ اور مجھ سے ارشاد ہوا۔ کہ اس معتوب فرشتے سے کہو۔ کہ اگر تم معافی لینا چاہتے ہو اور ؎

تم اگر یہ چاہتے ہو رحمتوں کا ہو ورود
تو مرے محبوب پر اک بار پڑھ ڈالو درود

یا رسول اللہ! میں نے اس سے کہا کہ حضور پر درود شریف پڑھو۔ تا کہ تیری معافی ہو جائے۔ چنانچہ اس نے بڑے ذوق و شوق سے حضور پر درود پڑھنا شروع کیا۔ اور اللہ نے اس کو معاف فرما دیا۔ اور حضور ؎

آج میں نے پھر اسے دیکھا ہے اپنے تخت پر
پڑھتا رہتا ہے درود اب آپ پر وہ بیشتر

میرے بزرگو! یہ سارا واقعہ نظم میں لکھ کر پھر میں نے مقطع یہ لکھا ہے کہ ؎

اے بشیر اس واقعہ میں یہ سبق موجود ہے
کہ بجز حبِّ نبی ذکرِ خدا مردود ہے

سارے واقعہ کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ جب تک حبِّ نبی اور تعظیم رسول

دین وشریعت خراب ہو۔ اور ایک بالنسان کے مزاج کو اعتدال پر رکھنے کے لئے
اس کے خانگی ماحول کا اچھا ہونا جتنا کچھ ضروری ہے وہ بالکل ظاہر ہے یہ
اسباب ہوئے ان مسائل کو قرآن میں لانے کے۔ ورنہ رسول اور اس کی بیویوں
کے بالکل خانگی اور ذاتیاتی قسم کی باتوں میں خدا کا ثالث بن کر ان کا جھگڑا چکانا
تو بچوں کی باتوں میں پڑنے کے برابر لا حاصل تھا۔ علاوہ ازیں یہ کتنی زبردست
دلیل ہے اس بات کی کہ آنحضور کی رائے اور قول وعمل کیطرح آپکا طبعی
ذوق اور قلبی رجحان بھی معیاری درجے کا صحیح تھا۔

" عبس وتولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ۔
پیغمبر چیں بجبیں ہو گیا اور متوجہ نہ ہوا۔ اس لئے کہ اس کے پاس ایک
اندھا آیا " ص۶۷

اس آیت میں پرویز صاحب کے بقول تادیب کا پہلو یہ ہے کہ اگر ایک
نابینا کا مجلس میں آنا آنحضور کو وحی کے مطابق ہی ناگوار گذرا۔ تو اس پر
قرآن میں آپکو تنبیہہ کیوں آئی۔ اس کا جواب اسی کتاب میں یہ موجود ہے
" سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھئے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے
کہ اس تہدید وسرزنش کا اصلی رخ ان منکرین ومعاندین کی طرف
ہے جب آپ کسی عزیز دوست سے کہتے ہیں کہ چھوڑیئے
صاحب! آپ کسے سمجھا رہے ہیں۔ تو آپکی یہ تعریض وتنقید
آپ کے دوست کے طرز عمل کے خلاف نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی نشتر
کی اصلی زد ایک شریاں پر ہوتی ہے جسے آپکا دوست سمجھا رہا تھا" ص۲۲۶

نہ ہو۔ ساری عبادت بیکار ہے۔ اسی لئے اعلیٰ حضرت نے لکھا ہے۔ ؎

ثابت ہوا کہ جملہ فرائض فروع ہیں
اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے

سدرۃ المنتہیٰ

حضرات! حضور صلے اللہ علیہ وسلم جب ساتویں آسمان سے بھی آگے بڑھے تو آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گئے۔ یہ سدرۃ المنتہیٰ ایک بیری کا درخت ہے۔ جو مکان کی سرحد پر واقع ہے۔ اس سے آگے پھر لامکان شروع ہو جاتا ہے۔ گویا سدرۃ المنتہیٰ یہ مکان کا باڈر ہے۔ اور یہ باڈر آج تک نہ کسی فرشتے، نہ کسی نبی و رسول نے کسی نے بھی پار نہیں کیا۔ کسی کے پاس یہ باڈر پار کرنے کا پرمٹ ہی نہیں۔ ہاں صرف ایک ہی ذات بابرکات سید الکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جو اس رات یہ باڈر پار فرما گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جبریل جب سدرۃ المنتہیٰ کے پاس پہنچے۔ تو یہاں پہنچکر جبریل رہ گئے۔ اور انہوں نے آخر رہنا ہی تھا۔ اس لئے کہ باڈر کو کون عبور کرے؟ چنانچہ عرض کی حضور! اب یہاں سے آگے بڑھنا میرے بس کی بات نہیں کہ ؎

بڑھوں گا جو آگے میں اک بال بھر
تجلی سے جل جائیں گے بال و پر

مگر کیا حضور بھی یہیں رک گئے؟ ..... نہیں نہیں ؎

چلا وہ سرو چمن خراماں نہ رک سکا سدرہ سے بھی داماں
پلک جھپکنے رہے وہ کب کے سب این و آں سے گزر چکے تھے

حضور نے فرمایا! اچھا اے جبریل! اب ہم آگے تنہا تشریف لے جائیں گے چنانچہ حضور پھر آگے تنہا بڑھے۔ میرے بھائیو! یہیں سے یہ بات بھی سمجھ لو کہ جہاں جبریل جیسا فرشتہ بھی نہ جا سکے۔ وہاں میرے اور تمہارے جیسا بشر کب جا سکتا ہے؟ حاشا و کلا ہرگز نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہماری مثل بشر نہیں۔ بشر ہیں۔ لیکن نہ ایسے جیسے ما و شما۔ بلکہ

حیرت ہے کہ یہاں آپ نے یہ ثابت کرنے میں سارا زور صرف کیا کہ آیت میں شدتِ بیان کا رخ رسول کی طرف نہیں بلکہ منکرین کی طرف ہے۔ اور آگے چل کر پھر اسی آیت کے اسی واقعہ کو آپ تادیبِ رسول کے عنوان کی زینت بنانے سے بھی باز نہ رہ سکے۔ ایسے کہتے ہیں سمجھائی کا ذوق! اس کے ساتھ آپ غور کیجئے کہ جو خدا آنحضور کو ایسی معمولی باتوں پر بقول پرویز صاحب کے تنبیہ کر ڈالتا تھا کہ آپ نے ایک کھانے کی چیز کیوں ترک کر دی یا ایک نابینا کے آنے پر کیوں ملول ہوئے۔ کیا اس سخت گیر خدا کا آپ کی باتوں پر کوئی کنٹرول نہ تھا۔ اور آپ کو وحی کے بغیر غلط سلط بولنے میں اس نے آزاد کر رکھا تھا۔ ایک عقلمند آدمی تو یہاں اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جہاں تیوری چڑھانے پر پابندی ہو وہاں گفتگو پر زیادہ سخت قسم کی پابندی ہوتی ہے اور جہاں والدین کو اف کرنا ممنوع ہے وہاں انہیں گالیاں دینا اور مارنا پیٹنا اف کرنے سے زیادہ گناہ اور برائی ہے۔

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ رسول کی بات اور اس کا عمل کچھ بھی وحی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس نابینا کے آنے پر آنحضور کی پیشانی پر بل پڑنے اور خدا کو یہ ناگوار گذرا ایسے اگر آپ سخت سست کہتے یا دھکے مار کر باہر نکالتے تو خدا کو اس پر کچھ بھی اعتراض نہ ہوتا۔ اور نہ وہ وحی کے ذریعہ آپ کا راستہ روکتا۔

جزئیات اور کلیات کا پہلو بھی یہاں لطف سے خالی نہیں اور وہ پرویز صاحب کے بقول یہاں تین طرح قابلِ غور ہے۔ ایک یہ کہ قرآن

وہ نوری بشر ہیں۔ خدا نہیں، خدا نما ہیں۔ نہ خدا ہیں نہ اس سے جدا ہیں۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ حضور کیا ہیں۔ اور حق یہ ہے۔ کہ حضور ایک بشر خدا ہیں۔ اللہ ہی حضور کی حقیقت کو بہتر جانتا ہے۔

ہاں تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو لامکاں سے آواز آئی۔ اے حبیب اب جبریل کو رخصت کرو۔ اور خلیل کی طرف قدم بڑھاؤ۔ چنانچہ حضور آگے بڑھے مگر اب براق بھی رہ گیا۔ تو آپ کے لئے ایک نورانی مرکب رفرف آیا۔

رفرف

حضور پر نور اس مرکب نور پر سوار ہوئے تو ؎

پھر چرخ اطلس کی طرف رفرف ہوا فرفر رواں

رفتار تھی لمح بھر یا جنبشِ چشمِ یقیں

الغرض یہ رفرف بھی بہت سے مقامات و حجابات نورانی طے کرا کے غائب ہو گیا۔ اب یہ وہ وقت تھا۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کسی دربار عالی میں اکیلے جانے والے تھے۔ بظاہر کوئی رہبر و ساتھی نہ تھا ؎

سراغ این و متیٰ کہاں تھا نشان کیف و الیٰ کہاں تھا!

نہ کوئی راہی نہ کوئی ساتھی نہ سنگِ منزل نہ مرحلے تھے

اب یہ جانے اور پہچانے والا ہی جانے کہ کس قدر مقامات طے کر کے حضور عرشِ الٰہی کے قریب پہنچے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب اقدس پر عظمت و جلال کبریا کے وہ آثار جو احکم الحاکمین کے حضور میں حاضر ہوتے وقت اس کے پاک اور مقرب بندے کے لئے بے عیب دل پر ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ ظاہر ہو رہے تھے کہ آواز آنے لگی۔

اُدن یا خیر البریہ اُدن یا احمد اُدن یا محمد — نزدیک آیئے اے بہترین خلائق! نزدیک آیئے اے احمد، نزدیک آیئے اے محمد! ؎

بڑھ اے محمد قریں ہو احمد قریب آ سرورِ ممجد

نثار جاؤں یہ کیا ندا تھی یہ کیا سماں تھا یہ کیا مزے تھے

حضور کے لئے یہ ندائے پر کیف موجب انبساط و سرور ثابت ہوئی اور

میں صرف اصولی احکام ہیں۔ دوم یہ کہ جو جزئیات قرآن میں ہیں وہ بھی بالکل اصولوں کی طرح اس قابل نہیں کہ انہیں کبھی بدلا[1] جائے۔ بلکہ وہ بھی اپنی شکل میں دائمی ہیں۔ سوم یہ کہ حاکم وقت کی طرف سے جو جزئیات[2] مرتب ہو کر پیش آئیں وہ ہر حال میں اٹل ہیں۔ چاہے انہیں کسی اور کی تائید حاصل نہ ہو۔ ان آیتوں کے تحت یہ تینوں اصول باطل ہوتے ہیں۔

پہلی بات اگر صحیح ہوتی اور قرآن میں صرف اصول لائے جاتے تو اس کے اندر ایسی باتوں کا کوئی مقام نہ تھا۔ کہ ایک اندھا اگر مجلس میں آئے تو کسطرح اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ یا ایک خاوند اپنی بیوی کی کونسی بات مانے یا نہ مانے۔ قرآن کا مقام تو بہت بلند ہے ایک انسانی حکومت کے عام قانون بلکہ ایک انجمن کے اصول و ضوابط میں بھی ایسی چیزوں کو بحث میں لانے کی بجائے انہیں افراد کی اپنی سمجھ بوجھ پر چھوڑا جاتا ہے۔ مگر قرآن میں نہ صرف انہیں بحث میں لایا گیا بلکہ اس شان کے ساتھ لایا گیا کہ گویا بیویوں اور اندھوں کا معاملہ "قانون و آئین" کی نہایت ہی اہم دفعہ ہے۔ ایسے حال میں پھر یہ مفروضہ کسقدر غلط ہے کہ قرآن میں صرف اصولی احکام کو لایا گیا ہے۔ اور جزئیات کے بنانے اور نہ بنانے یا حسب خواہش بنانے میں انسان آزاد ہے یہ اگر صحیح ہو تو پھر ایسے مسائل قرآن

---

[1] کس لئے اصول کے آپ اسطرح پابند ہیں کہ قرآن میں اطاعت رسول کے حکم کو وقتی ٹھہراتے ہیں۔

[2] مرکز ملت اکثریت کے فیصلوں پر مجبور نہیں ہو سکتا۔ واعلموا ان فیکم رسول اللہ۔ ص ۱۶۵

آپ کا قدم مبارک بڑھتا گیا۔ حتٰی کہ ہمارے آقا و مولیٰ وہاں پہنچ گئے۔ جہاں کسی کا وہم و گمان بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اور یہ وہ مقام ہے۔ جو نہ کسی نبی و رسول کو حاصل ہوا۔ نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی اور کو۔ تمام تجلیات جمالی و جلالی نے حضور صلے اللہ علیہ و سلم کو آغوش میں لے لیا۔ اور محبوب نے اپنے محب اور طالب نے اپنے مطلوب کو سر اقدس کی چشمانِ مبارک سے دیکھا اور آپ شنید سے منزلِ دید تک پہنچ گئے۔ اور جو دیکھا، سو دیکھا، اور جو سنا سو سنا۔ ؎

حجاب اٹھتے ہیں لاکھوں پڑے ہر ایک پردے میں لاکھوں جلوے
عجب گھڑی تھی کہ وصل و فرقت جنم کے بچھڑے گلے ملے تھے

رازونیاز اب خدا نے اپنے محبوب سے پوچھا۔ کہ اے حبیب یہ عام قاعدہ ہے۔ کہ جب کوئی دوست اپنے دوست سے ملنے جاتا ہے۔ تو اس کے لئے تحفے لے کر جاتا ہے۔ آپ میرے لئے کیا لائے ؟ حضور نے عرض کیا:۔

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوتُ وَ الطَّیِّبَاتُ —— میری تمام بدنی زبانی اور مالی عبادتیں صرف اللہ ہی کے لئے ہیں۔"

حضورؐ کا یہ تحفہ اللہ نے قبول فرمایا۔ اور جواب دیا:۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ —— ہر قسم کی سلامتی۔ اللہ کی رحمت، اور اس کی برکتیں ہوں آپ پر اے نبی "

اس موقعہ پر حضور نے اپنی گنہگار امت کو یاد فرمایا اور اسکو ساتھ ملا کر، یوں عرض کیا۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَ عَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ —— اللہ کی سلامتی ہم پر یعنی ہمارے ساتھ ہماری گنہگار امت پر بھی اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی "

جب فرشتوں نے یہ اخلاق کریمانہ کا مظاہرہ دیکھا۔ کہ اس نبیؐ رؤف و

ہیں نہ ہوتے اور انسانوں کے لئے چھوڑ جاتے۔

دوسری بات اس وجہ سے باطل ہے کہ یہ مسائل جو ان آیتوں میں وارد ہیں ہر چند قرآنی مسائل ہیں. مگر ایسے نہیں کہ انہیں بدلا نہ جا سکے. یہ اصول اپنی حدود میں کسی طرح بھی دائمی نہیں کہ ایک اندھا جب بھی چاہے کسی مجلس میں بلا نوٹس جا دھمکے. اور اس کے ایسا کرنے پر کوئی اسے برا نہ منائے. اسی طرح یہ بھی کوئی دائمی اور ابدی حکم نہیں. کہ ایک آدمی اپنے کھانے پینے میں بیوی کی بات نہ مانے اور جس کام سے اسے بیوی منع کرے اسی کے لئے خدا کا ایسے حکم ہو اور یہ بھی کوئی دائمی اصول نہیں کہ جنگ سے جان چرانے والوں کو کسی موقعہ پر بھی رخصت نہ دی جائے. خواہ ان کے متعلق یہ خطرہ بھی موجود ہو کہ وہ جا کر دشمن کے کام آئیں گے. اور انتشار کے بغیر کوئی فائدہ نہیں کریں گے۔

تیسری بات اسطرح باطل ہے کہ آنحضور خود ہی حاکم ملت تھے اور آپکے فیصلے کو خدا نے اس شکل میں نہیں چلنے دیا جو آپکی بیویوں کو مرغوب تھی. اگر چہ وہ قرآن کے کسی حکم کے خلاف نہ تھی تا ہم قرآن میں یہ کہاں ہے کہ کسی قابل استعمال چیز کو ترک نہ کیا جائے. بہر حال ایک ایسے فیصلہ کا ہوا جو نہ کثرت رائے کے خلاف تھا. اور نہ قرآن کے. اب جو فیصلہ کثرت رائے کے بھی خلاف ہو اس کے صحیح ہونے کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے. خصوصاً اس صورت میں جبکہ انفرادیت کا مظاہرہ کرنا ملوکیت کا خاصہ ہے۔

رحیم و کریم نے اپنی امت کے گنہگاروں کو فراموش نہ فرمایا۔ تو بیک زبان سب بول اٹھے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ ۔۔ ہم سب فرشتے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اور محمد اللہ کے سچے بندے اور رسول ہیں۔

حضور نے پھر عرض کی کہ مولا میرے لئے اور میری امت کے لئے تیری بارگاہ سے کیا تحفہ ہے؟ فرمایا! اے حبیب! تیرا ذکر ہمیشہ میرے ذکر کے ساتھ رہے گا۔ نمازوں میں ہمیشہ آپ پر صلوٰۃ و سلام پڑھا جایا کرے گا۔ حوض کوثر آپ کو عطا کیا۔ اسلام جہاد۔ نماز۔ صدقہ۔ روزے امر بالمعروف نہی عن المنکر یہ تمام باتیں عطا کیں۔ اور میں نے آپ کو فاتح و خاتم بنایا حضور نے فرمایا۔ الہٰی! یہ تحفہ تو خاص میرے لئے ہوا۔ لیکن میری امت کے واسطے کیا تحفہ ہے۔ فرمایا یہ نماز تمہاری امت کے لئے تحفہ ہے۔ اور جاؤ۔ اب جنت میں جاکر دیکھ لو۔ کہ تمہارے غلاموں کے لئے میں نے کیا کیا باغات اور محلات تیار کر رکھے ہیں۔

جنت کی سیر

حضور پھر جنت کے ملاحظہ فرمانے کو تشریف لے چلے ؎

غل ہوا سیر کو فردوس کی آتے ہیں حبیب
بولا رضواں کہ بھلا ایسے کہاں میرے نصیب
پیشکش کیا میں کروں اس شاہِ زمن کے ہیں غریب
صدقہ ہے آپ کا جو خلد میں ہے چیز عجیب

حضور جنت کے اندر داخل ہو کر اور اس کی نزاکت و نفاست طرح طرح کے قصر و ایوان ملاحظہ فرما کر بہت خوش ہوئے۔ اور باہر تشریف لائے الغرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جملہ عروج و بلندیاں حاصل فرما کر عجائب و غرائب کو ملاحظہ فرما کر اور اسرار و غیوب پر مطلع ہو کر آسمانوں سے واپس زمین بیت المقدس پر نزول فرمایا۔ اور براق پر سوار ہو کر پھر وہاں سے

خود سری کی انتہا

"ہمیں تو فقط اتنا دیکھنا ہے کہ جو کچھ ہم آج سمجھ رہے ہیں وہ قرآن کے مطابق ہے یا نہیں"۔ ص ۶۹

دیکھنے اور سمجھنے کا یہ اصول ہم نے اندھوں کے ہاتھی کے متعلق تو سن رکھا تھا۔ جن میں سے ہر ایک کی تحقیق کا ضابطہ یہ تھا کہ جو کچھ اسے معلوم کرنا ہے وہ یہ ہے کہ جس چیز کے مشابہ وہ ہاتھی کو سمجھ رہا ہے۔ اس کے مشابہ ہاتھی ہے یا نہیں۔ مگر قرآنی تحقیق کا یہ ڈھنگ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ ہر آدمی کی تحقیق کا دائرہ دنیا بھر کے انسانوں سے الگ ہو۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کسی ایک چیز کو اپنے زمانہ اور اپنے حالات کے ساتھ مخصوص سمجھ بیٹھتا ہے۔ اور اس طرح دھوکہ میں پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ سرمایہ پرستوں نے جب سودی کاروبار کی ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھا تو اس کی برکات پر جھوم کر رہ گئے۔ اور فیصلہ دے دیا کہ آج کے حالات میں تو سود نہ صرف یہ کہ حرام نہیں بلکہ ضروری اور لازم ہے۔ حالات کی یہی غلط تفریق پرویز صاحب کے اس مفروضہ کا باعث ہوئی جو اس عبارۃ میں موجود ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں حدیث و تاریخ کا اعتبار کرنا قرآن کے خلاف ہے اور جب سے تو ہمیں یہ سوچنا کچھ بھی ضروری نہیں کہ پہلے کیوں ایسا نہیں سمجھا اور مانا گیا۔ پھر ہم سمجھتے ہیں کہ حدیث کا رواج غلط طور پر مسلمانوں میں پڑ گیا۔ اب اس بحث میں پڑنا ہمارا فرض نہیں کہ یہ رواج ان کے اندر کیسے اور کیوں پڑ گیا۔ اس طرح یہ انداز فکر سننے

کہ معظمہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اور صبح صادق سے پہلے اسی مقام پر واپس تشریف لے آئے۔ جہاں سے آپ نے یہ مقدس سفر شروع فرمایا تھا۔ آکر جو ملاحظہ فرمایا۔ تو بستر مبارک گرم تھا۔ اور زنجیر در ہل رہی تھی۔ ؎

زنجیر بھی ہلتی رہی بستر بھی رہا گرم
اک دم میں سیر عرش گئے آئے محمد

اعلیحضرت فرماتے ہیں:۔ ؎

قصر دنیٰ تک ان کی رسائی
جاتے یہ ہیں، آتے یہ ہیں!

اس پیاری رات کی صبح کو بعد نماز فجر کے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس عجیب وغریب اور سچے واقعہ کا ذکر فرمایا۔ ابوجہل لعین نے جب حضور کی زبانی یہ بات سنی۔ تو خبیث تمسخر سے کہنے لگا۔ کیا خوب! اب تم آسمان پر بھی پہنچنے لگے۔ بھلا اس خلاف عقل قصہ کو کون تسلیم کرے گا۔ ملعون نے جا بجا اس واقعہ کو تمسخر کے ساتھ بیان کرنا شروع کیا۔ خدا کی شان دیکھئے کہ اپنے محبوب کی شان کا اعلان دشمن سے کرانے لگا معراج شریف کی تشہیر ابوجہل نے اس طرح کی۔ کہ حضور کے اس سیر مقدس کی خبر سب کو ہو گئی۔ ابوجہل اس خیال سے کہ اس واقعہ کو کون مانے گا۔ خوشی خوشی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا۔ اور کہا۔ لو سنو! تمہارا دوست تو اب آسمانوں پر پہنچنے کا دعویٰ کرنے لگا ہے۔ پھر سارا واقعہ جو حضور کی زبانی سن گیا تھا۔ سنایا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے۔ اگر اللہ کے رسول نے یہ فرمایا ہے۔ تو میں اس پر ایمان لاتا ہوں اور تصدیق کرتا ہوں کہ یہ واقعات بالکل سچے ہیں۔ صحیح اور ممکنات سے ہیں۔ اس کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خود حضور کی خدمت میں پہنچے اور واقعہ معراج حضور کی زبان حق ترجمان سے سن کر عرض کی۔ "صدقت یا رسول اللہ" اس کے بعد اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ اور امتحاناً کہنے لگے۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے عرش و کرسی کو تو دیکھا نہیں۔ البتہ ہم بیت المقدس

والے کے حواس کو باطل معطل بنائے بغیر نہیں رہتا۔ نہ وہ اس کے معقولات اور امکانات پر غور کرتا ہے۔ اور نہ وہ گذشتہ زمانہ کے حالات کا اس مفروضہ کے ساتھ موازنہ کرتا ہے۔ اور اندھا دھند اس صدائے بے ہنگام پر مرحبا کہدیتا ہے "تغیر" حالات کا یہ اثر اور فرق تو مانا جا سکتا ہے۔ کہ آج کے زمانہ میں مسلمان پہلے سے زیادہ جھوٹ بولتے ہیں۔ پہلے سے زیادہ قتل و غارت اور چوری ڈکیتی کے مجرم ہیں۔ اور پہلے سے زیادہ احترام شریعت سے ان کے دل خالی ہو گئے ہیں۔ مگر حالات کا یہ تغیر کسی طرح بھی ماننے میں نہیں آتا کہ پہلے زمانہ کے مسلمان خدا اور رسول کے خلاف جھوٹ گھڑنے میں آج کے مسلمانوں سے زیادہ دلیر اور بے باک تھے۔ اور زیادہ خدا کے خوف سے خالی تھے۔ اور سارے کے سارے اتنے بڑے پیمانہ پر اتنا بڑا جھوٹ گھڑنے اور پھیلانے کے لئے متفق ہو گئے۔ کہ اس قدر حدیثیں بنا ڈالیں۔ اور اس بات کی صداقت پر ان کا رتی بھر بھی ایمان نہ رہا۔ کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔ اور رسول کے خلاف جھوٹ گھڑنے والے کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ جب انسان اپنے حواس کو پہلے ہی معطل کر ڈالے تو یہ پہلو اس کے غور میں کب آ سکتے ہیں۔

پرویز صاحب اس سوال سے جب پریشان ہوتے ہیں کہ آج تک کیوں صدیوں سے علمائے سلف و خلف حدیث کو دین کے اندر قرآن کے ساتھ برابر کی حجت اور دین کا ماخذ مانتے اور منواتے چلے آئے تو آپ اس کے کئی ایک جواب دے ڈالتے ہیں جو خود آپ کو بھی مطمئن نہیں کرتے۔ کبھی کہتے ہیں کہ لوگوں نے ملوکیت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور اسے مان بیٹھے۔ پھر جب

کو دیکھ چکے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ تم کبھی وہاں نہیں گئے۔ لہٰذا وہاں کی کیفیت بیان کرو۔ حضور فرماتے ہیں۔ اسی وقت اللہ نے بیت المقدس کو اٹھا کر میرے سامنے کر دیا۔ میں اس کو دیکھنے لگا۔ اب جو کچھ وہ لوگ مجھ سے پوچھتے تھے۔ میں بے تکلف بتا دیتا تھا۔ اس پر صدیق اکبر نے پھر کہا۔ صدقت یا رسول اللہ۔ چنانچہ اس تصدیق کے انعام میں ان کو صدیق کا خطاب ملا۔ اور ابوجہل مردود نے جھٹلایا۔ اور واقعہ معراج کا انکار کر کے ہمیشہ کے لئے زندیق بن گیا۔

اس کے علاوہ اور جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ وہ اس واقعہ پر ایمان لا کر صدق دل سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ اور جن کے نصیب میں دائمی کفر اور عذاب جہنم لکھا ہوا تھا وہ کہنے لگے۔ ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ۔ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ آج بھی جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے۔ اور نقش صدیق پر چلنے کی توفیق دی ہے وہ حضور کے اس واقعہ معراج پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جو ابوجہل کے پیروکار ہیں۔ وہ حضور کے اس واقعہ کا انکار کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ مسلمانوں کو ایسی گمراہی سے محفوظ رکھے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

ملوکیت نے روایات کو جنم دیا۔ تو محدثین اس کے آگے دم نہ مار سکے۔ کبھی کہتے ہیں کہ ان کی آنکھوں کی پتلی[1] بند ہو گئی۔ اور کبھی یہ کہ قرآن کا صرف ایک نکتہ[2] ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کبھی کہتے ہیں کہ محدثین نے سمجھا قرآنی نظام تو ہے ہی لیکن جو جزئیات کو صحیح طور پر بنائے اس لئے بجائے اس کے کہ یہ جزئیات یا ذہنا ہو سے بنوائی جائیں۔ بہتر یہی ہے کہ پہلی جزئیات جو وقتی ضرورت کے لئے رسولؐ نے خود بنائی تھیں انہیں کو وحی کا نام دے کر لوگوں میں[3] رواج دیا جائے اور ایسے معمولی جھوٹ سے کام لینے میں غلطی ہی کیا ہے۔ اس سے بہر حال ملت کا شیرازہ تو منتشر ہونے سے بچے گا ہی۔ اگرچہ[4] اس میں وہ بدنیت نہ تھے۔ یہ حقائق ایسے ہی قطعی ہیں جیسے ایک آدمی خواب کی کیفیت کو بیان کر رہا ہوتا

---

۱ وہی نکتہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا جس طرح آنکھ کی پتلی پر ذرا سی سفیدی آ جانے سے سب کچھ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ص ۶۹۳

۲ قرآن کے ایک اصولی نکتہ کے نگاہوں سے اوجھل کر لینے سے امت کتنی پیچیدگیوں میں الجھ گئی۔ مقام حدیث۔ ص ۲۹۵

۳ ملت کو کسی آئین پر پابند رکھنے کا یہی طریقہ تھا۔ کہ وقت کے مروجہ جزئیات کو غیر متبدل قرار دے کر کہہ دیا جاتا کہ حضور نے انہیں بذریعہ وحی متعین فرمایا تھا۔ سلیم کے نام ص ۹۴

۴ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان حضرات نے ایسا کچھ کسی خود غرضی یا بدنیتی سے کیا۔ ان کے سامنے مشکل ہی ایسی آگئی تھی جس کا انہیں صحیح حل نہیں ملتا تھا ان کی یہ تمام کوششیں اس حسن کی تلاش میں تھیں۔
ص ۶۹۳

آٹھواں وعظ

وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ۔ وَالۡعَاقِبَۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ۔ وَ
الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ ط

اَمَّا بَعۡدُ

فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ط بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

وَلَا تَہِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ
الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۵ (پ ۴ ع ۵)

" اور سستی نہ کرو۔ اور نہ غم کھاؤ۔ تمہیں
غالب آؤ گے۔ اگر ایمان رکھتے ہو۔"

حضرات! آج کے وعظ میں مجھے یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں کیلئے ترقی وعروج کا کونسا ذریعہ ہے؟ اور یہ کس طرح کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں؟ خداوند کریم نے اس آیت کریمہ میں جو میں نے اس وقت آپ کے سامنے پڑھی ہے۔ یہ ارشاد فرمایا ہے۔ کہ اگر تم سربلندی و غلبہ اور عروج و وقار پانا چاہتے

ہے۔ اور نہیں سوچا کہ خواب کے واقعات اور ممکنات کے اندر مطابقت پیدا کرنا کہاں تک ضروری ہے۔ ان مختلف توجیہات پر جب آپ بذات خود مطمئن نہیں ہوتے تو انہیں لایعنی ٹھہراتے ہوئے پُرفریب کا راستہ لیتے ہیں کہ جو کچھ ہوا اور جیسے کچھ ہوا اسے دیکھنے کی بجائے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ جو کچھ آج ہم سمجھ رہے ہیں۔ وہ قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ جیسے ایک چور کہے کہ مجھے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ جس مال کو میں اپنا سمجھ رہا ہوں وہ میرے خیال کے مطابق میرا ہے یا نہیں ایسی صورت میں پھر اس کا دعویٰ کب کسی ثبوت کا محتاج ہوتا ہے وہ یہ تو ماننے سے رہا کہ ملکیت مال کے لیے کبھی وراثت اور خریداری وغیرہ جیسے اسباب کا اثبات کرنا بھی ضروری ہوتا ہے

جہاں تک آپ کے ان روشن حقائق کے معقولات کا تعلق ہے ان کی ایک ایک شق پر عقل اور سچائی ماتم کر رہے ہیں۔ ملوکیت بھی آئی اور ٹالی بھی نہ جا سکی۔ مگر اس کا مطلب یہ کب ہے کہ اس نے سب لوگوں کو بے حمیت اور بے ضمیر بنا کر چھوڑا۔ اور سب کو بھی نہیں صرف محافظین قرآن کو اس نے کسی کام کا نہ چھوڑا۔ وہ ملوکیت کی بدولت ایسے بے حال ہوئے کہ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنے سے ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ ملوکیت کی یہ بے پناہ قوتیں چوروں کو چوری سے اور ڈاکوؤں کو ڈاکہ زنی سے اور بدمعاشوں کو بدمعاشی سے اور باغیوں کو بغاوت سے تو باز نہ رکھ سکیں مگر حاملان قرآن کا انہوں نے ایسا ناک میں دم کر دیا کہ وہ سب کے سب یہ ظاہر کرنے سے رہ گئے کہ قرآن کے ہوتے ہوئے حدیث کی ضرورت نہیں اور سب کے

ہو۔ تو سچے مومن بن جاؤ اور ایمان کو کسی حالت میں بھی نہ چھوڑو۔

چار چیزیں

میرے بھائیو! پہلے میں چند تمہیدی کلمات عرض کروں یہ واقعہ ہے کہ خدا نے ہر انسان کے دل میں چار چیزوں کی محبت پیدا فرما دی ہے۔ ہر آدمی چاہے کسی ملک کا ہو۔ کسی مذہب کا ہو۔ چھوٹا ہو یا بڑا۔ امیر ہو یا غریب۔ ان چار چیزوں سے طبعًا اُسے پیار ہو گا۔ وہ چار چیزیں کونسی ہیں؟ سنئے! وہ چار چیزیں یہ ہیں۔ وطن۔ مال۔ اولاد اور جان کون ایسا ہے۔ جسے وطن سے پیار نہ ہو۔ مال سے الفت نہ ہو۔ اولاد سے محبت نہ ہو۔ اور جسے اپنی جان عزیز نہ ہو۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان چاروں کی محبت میں کچھ فرق بھی ہے۔ بعض دفعہ وطن کی محبت کو مال کی محبت پر قربان کرنا پڑتا ہے۔ دیکھ لیجئے۔ مال کی محبت میں انسان اپنا وطن چھوڑ کر دور دراز ملکوں میں چلا جاتا ہے۔ گویا وطن کی محبت کو مال کی محبت پر قربان کرتا ہوا صرف مال کے لئے وطن چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح اس مال کی محبت کو اولاد کی محبت پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً بچہ بیمار ہو جائے تو باپ اپنا مال خرچ کر کے بچے کو بچانا چاہتا ہے۔ گویا مال کی محبت کو بچے کی محبت پر قربان کر دیتا ہے۔ اور پھر اسی طرح اولاد کی محبت جان کی محبت پر قربان کر دی جاتی ہے۔ دیکھ لیجئے۔ جب جان پر بن آئے تو اولاد کی محبت بھی بھول جاتی ہے۔ اور انسان چاہتا ہے۔ کہ کچھ بھی ہو جائے مگر میری جان بچ جائے!

مسلمان کی شانِ امتیاز

حضرات! یہ چار چیزیں وہ ہیں۔ جن کی محبت میں سب برابر ہیں۔ اور اس میں امیر یا غریب یا مسلم و غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں۔ مگر خوب یاد رکھیئے۔ کہ مسلمان ایک امتیازی شان کا مالک ہے۔ دنیا بھر کے انسانوں میں اس کا مقام ایک خاص مقام ہے۔ عام انسانوں کی غذا اور ہے اور اس کی غذا اور۔ عام انسانوں کا لباس اور ہے اور مسلمان کا لباس اور۔ مثلاً خنزیر و شراب یہ عام انسانوں کی غذا ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہود و نصاریٰ۔ اور دیگر کفار اسے کھاتے پیتے ہیں۔

سب درباری اور جی حضوری بن گئے۔ غور فرمائیے کس قدر گھناؤنی تصویر ہے یہ محدثین و علمائے امت کی۔ جسے وہ شخص پیش کر رہا ہے جو اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ تاج برطانیہ کا ذلیل ترین مہرہ بن کر رہنے میں اپنا فخر سمجھتا رہا! دراصل ایسی نادر روزگار تحقیق پیش کرنا آپ کا ایک اہم موضوع ہے جسے ظاہر کرنے والے دنیا بھر میں آپ واحد شخص ہیں۔ ورنہ ہر تاریخ سے واقفیت رکھنے والا آدمی یہ جانتا ہے کہ ملوکیت کے اس خانہ جنگی کے دور میں جہاں ایک گھنٹہ کا سفر مہینوں میں طے ہوتا تھا مسلم دنیا کے تمام علما کا کسی وقت میں ایک جگہ جمع ہو جانا ممکن نہ تھا۔ کجا یہ کہ وہ ایک لگے بندھے طریقہ پر اشاعت حدیث کو اپنے مقصود زندگی کی حیثیت سے متواتر دس بارہ صدیاں اختیار کئے رہے اور ہر علاقہ کی ملوکیت نے اپنے اندرونی اختلافات کو بھلا کر دوسرے علاقوں کی ملوکیت کے تعاون سے علمائے شریعت کو اشاعت حدیث کے کام کے لئے وقف رکھا۔ اور ہر علاقہ میں ایسے دنیا کے بندے ملوکیت کو میسر آتے چلے گئے اور انہوں نے اپنی ان تھک محنتوں سے حدیث کو دینی حجت بنا کر چھوڑا۔

آپ کہتے ہیں کہ ہمیں تو فقط یہ دیکھنا ہے کہ ہم کیا سمجھے۔ قرآن میں بکثرت واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ گردوپیش کے حالات سے ایک حقیقت کو پانے کے لئے مدد لینا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے طور پر تشریف لے جانے کے بعد جب سامری نے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا تو حضرت ہارون نے ان لوگوں کو فرمایا کہ لوگو یہ ایک فتنہ ہے جس میں تمہیں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا ہمیں تو یہی کچھ دیکھنا ہے کہ ہم حق کو حق

مگر مسلمان کی یہ غذا ہرگز نہیں۔ ریشم و سونا یہ دوسرے انسانوں کا تو لباس ہو سکتا ہے۔ مگر مسلمان (۔باستثنائے مستورات) کا یہ لباس ہرگز نہیں۔

ریشم و سونا

مسلمانو! ریشم و سونا یہ چیزیں زیب و زینت کے لئے ہیں۔ اور اس امر کے لئے عورت موزوں ہے۔ جسے گھر رہنا۔ اور مرد کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے۔ مرد مومن چونکہ دنیا میں اللہ کا سپاہی بن کر آیا ہے۔ بقول شاعر ؎

مقامی بن کے آیا تو نہ راہی بن کے آیا ہے
یہ دنیا رزم گاہ ہے تو سپاہی بن کے آیا ہے

اس لئے اسے زیب و زینت سے کیا کام؟ اور ان فیشنوں سے کیا غرض؟ ریشم اور سونے کے استعمال سے تو اس کے دل میں بجائے مجاہدانہ عزائم کے عیش و عشرت کے خیالات پیدا ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز نے مسلمان کو اس غیر شرعی لباس میں ملبوس کر کے اور مغربی فیشن کا دلدادہ بنا کر اس کے جذبہ جہاد کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ غور تو فرمایئے۔ آج ایک جنٹلمین جس نے اپنے سر پر انگریزی بال رکھے ہوں۔ بسا اوقات آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ وہ راہ چلتے ہوئے ان انگریزی بالوں کو جب کہ وہ آنکھوں کے آگے لٹک آتے ہوں۔ سر کا ایک جھٹکا دے کر پیچھے ہٹاتا ہے۔ تاکہ راہ نظر آ سکے۔ تو ایسا شخص میدان جہاد میں تلوار کیا چلائے گا؟ تلوار چلائیگا۔ یا بال سنبھالیگا؟ انگریزی خیالات کا پروردہ انسان خود ہی انصاف سے کہے۔ کیا وہی جذبات اور جوش و ہمت رکھتا ہے۔ جو اسلام نے پیدا فرمائی؟ اس نئی تہذیب نے ہمارے مجاہدانہ عزائم، اور مردانہ اوصاف چھین لئے۔ دیکھ لیجئے۔ اقبال کیا کہتا ہے۔ مولوی تو مسٹر کی نظر میں معتوب ہے۔ اس لئے اقبال ہی کا یہ شعر ذرا یہ لوگ پڑھیں۔ اور دیکھیں کہ خود اقبال بھی کیا رونا روتا ہے۔ ؎

از حیا بیگانہ پیرانِ کہن!
نوجوانان چوں زنان مشغول تن!

یعنی آجکل کے بڈھے بھی شرم و حیا کا دامن چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اور جو

سمجھ رہے ہیں یا نہیں ہمیں اس سے کیا مطلب کہ حضرت موسیٰ نے آج تک کیا اور کیا کہا۔ یہ اپنی سمجھ پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ ہی بالآخر انکی گمراہی اور تباہی کا باعث بن کر رہا۔

اسی طرح ایک بستی لب دریا واقع تھی اور اس بستی والوں کو ہفتہ کے روز شکار بازی کی ممانعت تھی۔ اور یہ ان کا جمعہ کی طرح چھٹی کا دن تھا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اسی چھٹی کے روز ہی مچھلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ اور باقی دنوں میں نایاب ہونے لگیں۔ اس پر انہوں نے ایک تجویز پاس کی کہ مچھلیاں بھی حاصل کی جائیں اور چھٹی کی پابندی بھی برقرار رہے۔ مگر یہ سراسر خام خیالی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ہفتہ کی حرمت کو ختم کر دیا۔ اور اپنی اس تجویز کے تحت یہ سمجھے کہ چھٹی کی حرمت بدستور موجود ہے کچھ بھلے لوگوں نے انہیں سمجھایا کہ یہ تم کیا فریب کاری سے کام لے رہے ہو۔ یہ تو صریح حکم عدولی ہے۔ انہوں نے کہا ہمیں تو فقط یہ دیکھنا ہے کہ ہماری اپنی سمجھ کے مطابق یہ حکم عدولی ہے یا نہیں۔ اور ہمارے اپنے خیال میں یہ کسی طرح بھی حکم عدولی نہیں۔ آخر کار جب عذاب آیا تو انہیں اپنے انوکھے اجتہاد کا غلط نتیجہ معلوم ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی وحال کے واقعات سے آنکھیں بند کر کے ایک بات پر اڑ جانا کبھی اچھا نہیں ہوا۔ ورنہ انہیں غور کرنا تھا۔ کہ پہلے جو آجتک ہفتہ کا شکار ہر طرح ممنوع سمجھا گیا اور ہر صورت میں ممنوع سمجھا گیا تو آخر ایسا سمجھنے والے سب لوگوں کے دماغ میں کونسا فتور تھا۔ اور وہ کیا اپنے مفاد کے دشمن تھے۔ اور نہ ہی وہ لوگ کچھ پاگل ہیں۔ جو آج ہمیں سمجھا رہے ہیں۔

اس طرح حالات سے رہنمائی حاصل کرنے میں یہ بات بھی قابل غور ہے

نوجوان ہیں۔ وہ عورتوں کی طرح حنا و سنگار میں لگ گئے ہیں۔ دیکھ لیجئے۔ یہ بات کوئی مولوی نہیں کہہ رہا۔ بلکہ اقبال کہہ رہا ہے۔ اور سچ کہہ رہا ہے۔ کہ بڈھا کھوسٹ ہے۔ مگر بٹیر ہاتھ میں لئے پھرتا ہے۔ اسی سال کا بابا ہے۔ مگر کنکوے اڑا رہا ہے۔ اور نوجوان طبقہ بالکل عورتوں کی طرح بن ٹھن کے نکل رہا ہے۔ ناخنوں پر میں نے خود کئی جنٹلمینوں کو سرخ پالش لگائے دیکھا ہے اور سر پر جالی بھی بندھی دیکھی ہے۔ داڑھی مونچھوں کا تو پہلے ہی صفایا تھا۔ اب صرف دوپٹے کی کسر رہ گئی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں کہ ایک کالجئیٹ لڑکا داڑھی مونچھ کا صفایا کرکے ناخنوں پر سرخ پالش لگا کر اور سر پر جالی باندھ کر آئینے کے سامنے بیٹھا تھا۔ کہ باپ نے اپنے فیشن ایبل صاحبزادے کو دیکھا۔ اور بے ساختہ پکار اٹھا ؎

واہ میرے نصیب ایسے قسمت بھی ہری نکلی
سمجھا تھا یہ لڑکا ہے پر یہ تو پری نکلی

میرے مسلمان بھائیو! خوب یاد رکھو۔ مسلمان مرد مجاہد اور اللہ کا سپاہی ہے۔ اسے ان زنانہ باتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان فیشنوں سے آدمی محبوب و دلربا تو بن جاتا ہے۔ مگر رعب و دبدبہ حاصل نہیں ہوتا۔ مصنوعی جمال تو ملتا ہے۔ مگر جلال نہیں ملتا۔ حالانکہ مسلمان کے لئے رعب و جلال دبدبہ و ہیبت ضروری ہے۔ ؎

جباری و قہاری و قدوسی و جبروت!
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

پانچویں چیز

میں کہہ رہا تھا۔ کہ مسلمان ایک امتیازی شان کا مالک ہے۔ بنا بریں دنیا بھر کے انسانوں کو مذکورہ بالا چار چیزوں یعنے وطن، مال، اولاد، اور جان سے محبت ہوتی ہے۔ اور ایک دوسرے کی محبت پر ان کی محبت قربان کر دی جاتی ہے۔ مگر ایک پانچویں چیز بھی ہے۔ جو صرف مسلمان ہی کو حاصل ہے۔ اور مسلمان ان چاروں چیزوں کی محبت کو اس پانچویں چیز کی محبت پر قربان کر دیتا ہے اور وہ ہے "ایمان"۔

کہ خدا نے اڑتی خبر کو نشر کرنے سے منع فرمایا ہے. خواہ وہ اچھی ہو یا بُری. جبتک کہ اسے صاحب امر لوگوں کے اور رسول کے پاس نہ لایا جائے. اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ جب سفارت اور دوسرے ملکی و غیر ملکی معاملات کا تعلق اور واسطہ براہ راست انہیں لوگوں کو پڑتا تھا. تو ان کے حالات کی خبروں کا ادراک کرنا بھی انہیں کا کام ہو سکتا تھا. نہ کہ دیہات میں رہنے والوں کا قرآن کی اس ہدایت کے ہوتے ہوئے اس پر ان دیہاتیوں کا یہ کہنا بالکل بے جا تھا کہ ہم تو خبر کے نشر کرنے اور نہ کرنے میں یہ دیکھیں گے کہ ہم کیا سمجھ رہے ہیں پھر علم حدیث جو بہت صدیوں پہلے ظہور میں آکر دنیا میں پھیل گیا اس کی حقیقت و ماہیت کو ایک شخص محض اپنے آج کے ماحول میں مصروف تحقیق رہ کر کیسے پا سکتا ہے جبکہ ایک زمانہ کے لوگ اپنے زمانہ کی غیر علاقائی خبر کی حقیقت کو نہیں پا سکتے. کیا ایک خبر کی نسبت ایک ہزار ہا کتابوں کے اندر پھیلے ہوئے علم و فن کو پالینا آسان ہے جس کے شعبے اور فروع آن گنت ہیں.

یہ امر بھی اس بارہ میں رہنمائی کا باعث ہو سکتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین مکہ نے پوری بے شرمی اور ہٹ دھرمی کے ساتھ جھٹلا دیا تو آپ کو اللہ کی طرف سے یہ اعلان فرما دینے کا حکم آیا.

"فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ افلا تعقلون"

پھر دیکھو! یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تو لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں. کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں.

میں نے تمہارے درمیان اپنی پوری عمر بسر کی ہے. کیا تم میری سابقہ

جانِ ایمان

مسلمانو! اب یہ اصولی بات بھی ذہن میں رکھئے۔ کہ ہمارے لئے ایمان کیا ہے؟ سنئے! ایمان نام ہے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و اطاعت کا۔ ان کو ماننے اور جاننے کا۔ ہمارے لئے حضور ہی سب کچھ ہیں۔ نہ صرف ایمان بلکہ جانِ ایمان۔ اعلیحضرت نے کیا خوب لکھا ہے۔ ؎

اللہ کی سرتا بقدم شان ہیں یہ ٭ ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں ٭ اور ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے:۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ (رواہ البخاری مواہب لدنیہ صفحہ ۹۲ ج۲) یعنی تم میں سے کوئی صاحب ایمان نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اُسے اس کے باپ اور اس کی اولاد سے میں زیادہ پیارا نہ ہوں۔"

اسی لئے شاعر نے لکھا ہے کہ ؎

محمد ہے متاعِ عالم و ایجاد سے پیارا!!
پدر، مادر، برادر، جان و مال اولاد سے پیارا

تو میرے بھائیو! میں نے جو آیت کریمہ تلاوت کی ہے۔ اس میں اللہ تعالےٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ کہ تم اگر سربلند اور اعلیٰ بننا چاہتے ہو تو صاحب ایمان بن جاؤ۔ ایمان کو اپنا لو۔ گویا ایمان کو اپنا محبوب بنا کر وطن مال۔ اولاد اور جان۔ دنیا کی ہر چیز کی محبت کو اپنے ایمان کی محبت پر قربان کر دو۔

صحابہ کرام

چنانچہ آپ اپنے بزرگوں حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کی طرف دیکھئے۔ ان پاک لوگوں نے اپنی جملہ محبتیں ایمان پر قربان کر دیں۔ چنانچہ سب سے پہلی محبوب چیز وطن کو دیکھئے۔ ان پاک لوگوں نے ایمان کی خاطر اپنا وطن چھوڑا۔ جس وقت کفار نے مکہ معظمہ میں مسلمانوں کو بیحد ستانا شروع کیا۔ تو حضور صلی اللہ

زندگی سے اس امر کا اندازہ نہیں کر سکے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا. کیا میری زندگی میری صداقت کی زندہ شاہد نہیں کیا تم میری اس چالیس سالہ زندگی میں جس کا ایک ایک لمحہ تمہارے اندر بسر ہوا ہے کوئی ایک واقعہ بھی پیش کر سکتے ہو جس سے میری صداقت کے متعلق ذرا سا شبہ بھی گذرے کیا میری اس تمام زندگی میں کہیں حرف گیری کی کوئی گنجائش ہے؟

یہ چیلنج پوری قوم کو دیا گیا. اور اس کے خلاف کسی نے ایک لفظ تک نہ کہا کسی کی زندگی کے آئینہ صفت ہونے کی اس سے بڑھ کر شہادت اور کیا ہو سکتی ہے. کہ دشمنوں کے ہجوم میں اس کی زندگی کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کر دیا جائے. اور اس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جائیں یہ شہادت صرف اس زمانہ کے قریش کے سامنے ہی پیش نہیں کی گئی. بلکہ چودہ سو سال سے ساری دنیا کے سامنے ہے اور اس کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ آج تک کسی طرف سے بھی اس کو جھٹلایا نہیں گیا. بلکہ دشمنوں تک کو اس زندگی کی پاکیزگی کا اعتراف کرنا پڑا. چنانچہ سر ولیم میور جیسا متعصب مصنف بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ:-

"ہماری تمام تصنیفات محمد صلعم کے بارے میں انکی عصمت اخلاق اور پاکیزگی اطوار پر متفق ہیں. جو اہل مکہ میں کمیاب تھی." ص ۱۸۲

اس شہادت میں خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ جس محمد کو تم اپنی عمر ایک بہترین انسان کی حیثیت سے جانتے تھے اس کے متعلق اپنے تمام پرانے تصورات

علیہ وسلم نے صحابہ کو اجازت دے دی۔ کہ جو کوئی چاہے، وہ اپنی جان و ایمان کے بچاؤ کے لئے حبش کے عیسائی بادشاہ کے ملک میں چلا جائے۔ چنانچہ صحابہ کرام کا ایک قافلہ ۱۲ مرد اور ۴ عورتوں کا رات کی تاریکی میں نکلا۔ اور بندرگاہ شعیبہ سے جہاز میں سوار ہو کر حبش کو روانہ ہو گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ معہ اپنی بیوی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے جو حضور کی صاحبزادی تھیں۔ اس قافلہ کے سالار تھے۔

ہجرت حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے وطن مکہ شریف کو چھوڑا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ توحید نے جب دنیائے کفر و شرک میں تھلکہ مچا دیا۔ اور کفار و مشرکین نے اپنے قصرِ کفر و شرک کو گرتے دیکھا۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے شہید کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ چنانچہ بڑے بڑے کافر ایک رات ایک بند مکان میں جمع ہوئے۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف سکیمیں سوچنے لگے۔ رات کا وقت ہے، ایک طرف یہ کافر جاگ رہے ہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے شہید کرنے کی فکر میں، اور دوسری طرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنے دولت کدہ پر اس خیال مبارک میں ہیں کہ یہ ناسمجھ سمجھ جائیں۔ اور میری مخالفت ترک کر کے جہنم سے بچ جائیں۔ ؎

سکیمیں اس طرف سرکار کی ایذا کی ہوتی تھیں
اِدھر چشمانِ احمد عاصیوں کے غم میں روتی تھیں
اُدھر تو یہ ارادے تھے محمد کو مٹا ڈالیں
اِدھر یہ فکر تھی دنیا کو دوزخ سے بچا ڈالیں

یہ لوگ بند مکان میں جمع تھے۔ اور اسی سوچ بچار میں تھے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا صورت اختیار کی جائے۔ کہ شیطان لعین نے اس موقعہ کو غنیمت جانا۔ اور فوراً ایک بزرگ شخص کی صورت بنا کر آیا۔ اور دروازہ پر آواز دی۔ کہ لوگو! دروازہ کھولو! ابوجہل نے

کو دل سے محو کر کے اب اس کے بارہ میں غور کر کے فیصلہ کرو کہ وہ سچا ہے یا نہیں اس سے معلوم ہوا کہ حالات اور واقعات کے شواہد سے ایک حقیقت میں شہادت لینا ضروری اور لازم ہوتا ہے۔ ورنہ منکرین تو سالہا گذشتہ صدا قتوں اور شہادتوں کا خون کر رہے تھے۔ اس گذشتہ ریکارڈ کی شہادت ایسی کارگر واقع ہوئی کہ اس سے منکرین و معاندین کے حواس درست ہو گئے۔ اور دماغ ٹھکانے آ گئے۔ اور اس کے خلاف دم نہ مار سکے۔ بہر ان پر ہُو کا عالم طاری ہوتے دیکھ کر سر ولیم میور کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ اور وہ بھی آنحضور کے حق میں کلمہ خیر کہنے پر مجبور ہو گیا۔

فرض کیجئے کہ اگر اب ایک شخص کہے کہ ہمارے ہاں نہ منکرین کی شہادت کچھ معتبر ہے اور نہ چودہ سو سالہ تاریخی شہادت کے ہم پابند ہیں۔ اور نہ سر ولیم میور کی امانت کو ہم مانتے ہیں۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ان تمام واقعاتی شہادتوں سے صرف نظر کر کے محمد کے بارہ میں ہمارے اپنے جو تصورات ہیں ان کے مطابق وہ ماننے کے قابل ہے یا نہیں۔ تو کیا ایسے شخص کو محقق کی بجائے احمق کا نام دینا موزوں نہیں ہو گا؟

پرویز صاحب کا ایک عجیب دعویٰ یہ بھی ہے کہ آنحضور صرف قرآن ہی کے پابند تھے۔ اور بس۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب آپ چالیس سال کی عمر تک نزول قرآن سے پہلے پاکباز اور فرشتہ سیرت رہے تو کس قرآن کے پابند ہو کر ایسے رہے۔ اور جب رہے اور پھر آپکو قرآن حاصل ہوا۔ وہ قرآن جس نے ناانسانوں کو انسان بنا دیا تو کیا اس قرآن کی بدولت آپکی حالت کچھ بھی پہلے سے اچھی نہ ہوئی۔ اگر ہوئی تو ضروری تھا کہ آپ پہلے سے زیادہ پاک اور پاک تر ہو جاتے

پوچھا کہ تم کون ہو۔ اور کہاں سے آئے ہو۔ اور کیوں آئے ہو؟ شیطان لعین نے کہا۔ کہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اور پرانا تجربہ کار ہوں۔ نجد کا رہنے والا نجدی ہوں۔ اور تمہارے اس مبارک مشورہ میں شریک ہو کر سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

شیخ نجدی مسلمانو! خوب یاد رکھو! کہ شیطان کا ایک نام شیخ نجدی بھی ہے۔ اور یہ نام اسی راستہ سے اس کا مشہور ہوا ہے۔ چنانچہ غیاث اللغات میں لکھا ہے:۔

"شیخ نجدی لقب شیطان است۔ زیرا کہ چوں قریش برائے قتل رسالت پناہ صلے اللہ علیہ وسلم جمع شدند۔ ناگاہ شیطان بصورت پیرے در آمد۔ چوں پرسیدند کہ کیستی؟ گفت کہ من شیخم از ملک نجد ایم و دریں مشورہ باشما شریکیم" (غیاث اللغات ص۳۹۳)

شیخ نجدی شیطان کا لقب ہے۔ اس لئے کہ قریش جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قتل کے مشورہ کے لئے جمع ہوئے تو اچانک شیطان ایک بوڑھے آدمی کی شکل میں نمودار ہوا۔ قریش نے پوچھا۔ کہ تم کون ہو۔ تو بولا۔ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں جو ملک نجد سے آیا ہوں، اور اس (حضور صلے اللہ علیہ وسلم) کے قتل کے مشورہ میں میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہوں"

اس عبارت سے معلوم ہوا۔ کہ شیطان کا ایک نام شیخ نجدی بھی ہے۔ اور شیطان "نجدی" بن کر اس لیے آیا تھا۔ کہ نجدیوں کی عداوت رسول مسلّم و مشہور تھی۔ ورنہ بتاؤ کہ شیطان نجدی بن کر کیوں آیا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ شیطان شیخ نجدی بنکر ان کافروں کے اجتماع میں شریک ہوا۔ اور سب مل کر اپنی اپنی رائے ظاہر کرنے لگے۔ چنانچہ ایک کافر ابو البختری کہنے لگا۔ کہ اس شخص یعنے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک تنگ و تاریک مکان میں بند کر دیا جائے۔ صرف چھوٹا سا ایک روشندان باقی رہنے دیا جائے۔ اس روشندان سے کچھ روز قلیل کھانا دیا جائے چند روز

پھر آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے بعد آپ کی باتیں وحی نہ تھیں اور آپ کے فیصلے غلط ہوتے تھے۔ کیا قرآن نے یہی کچھ سکھایا تھا کہ آپ وحی کے خلاف بولیں اور فیصلے غلط کیا کریں۔

پھر آپ کہتے ہیں کہ قرآنی نظامِ حکومت کے خاتمہ پر علمائے اسلام نے سوچا کہ اب قرآن کے جزئیات بنا کر دینے والا نظامِ حکومت تو ہے نہیں بہتر یہی ہے کہ انہیں پرانے جزئیات کو وحی کا نام دیکر انہیں سے کام چلایا جائے۔ جیسے کوئی آدمی نیا کپڑا بنانے کی بجائے پرانے پر ہی قناعت کرتا ہے۔ اس مفروضہ سے جہاں قرآنی نظام کی ضرورت واہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہاں یہ بھی ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ جزئیات کا صحیح بنیادوں پر طے پانا کس قدر ضروری ہے گویا قرآنی نظام اگر ضروری تھا۔ تو صرف جزئیات بنانے کے لئے۔ وہ جزئیات جن کے نہ ہونے سے آج تک اور اتنی ہی صدیاں بعد تک بھی نظام شمسی میں کسی گڑبڑ کا کچھ اندیشہ نہیں۔ بخلاف اس کے ایک عام عقل کا مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ جزئیات کیلئے قرآنی نظام کی نہ پہلے کوئی ضرورت تھی اور نہ آج ہے قرآنی نظامِ حکومت اگر وجود میں آتا تو اس کے ذریعہ دنیا سے کفر وشرک اور ظلم کا خاتمہ کیا جاتا۔ نہ کہ ایسے جزئیات کے کام پر لگایا جاتا۔

ایک اندھا مقلد تو ایسے مفروضات پر بھی ایمان لا سکتا ہے کہ خلافت کے مسئلہ میں سب کے سب اور مالیات کے معاملہ میں ابوذر غفاری کے سوا سارے صحابہ گمراہ ہو گئے تھے۔ اور قرآن کی ترتیب گڑبڑ ہے اور صحیح ترتیب کا قرآن کہیں دفن ہے۔ جو قیامت کے قریب کبھی ظاہر ہو گا۔

نکے بعد بیٹے مارے خود ہی نہ رہے گا۔ (معاذ اللہ روحی فداہ) شیخ نجدی شیطان نے اس سکیم پر اعتراض کیا کہ اے ابا البختری! تمہیں یہ معلوم نہیں۔ کہ یہ (رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم) وہ شخص ہے کہ اگر اسے سات قفلوں میں بھی بند کر کے رکھو گے۔ تو بھی اس کی خوشبو باہر نکل آئیگی۔ اور پھر اس کے ماننے والے اس کی خوشبو پاکر، مکان توڑ کر بھی اسے نکال لینگے۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!! دشمن کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شرافت۔ لطافت و نفاست کا اقرار ہے سچ ہے!

سہ
ان کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیئے ہیں!
جس راہ چل دیئے ہیں کوچے بسا دیئے ہیں

حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ مُبارک کی خوشبو

اعلیحضرت کا یہ شعر جو میں نے پڑھا ہے۔ یہ در اصل ترجمہ ہے اس حدیث کا جو دارمی شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:۔ كَانَ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خِصَالٌ لَمْ يَكُنْ فِيْ طَرِيْقٍ فَيَتْبَعُهُ اَحَدٌ اِلَّا عَرَفَ اِنَّهٗ قَدْ سَلَكَهٗ مِنْ طِيْبِ عَرَقِهٖ (حجۃ اللہ علی العالمین ص۶۸۵) یعنے حضور صلے اللہ علیہ وسلم میں خاص اوصاف تھے (ایک ان میں سے یہ بھی تھا۔ کہ) اگر حضور کی تلاش میں کوئی نکلتا۔ تو حضور جس راستے تشریف لے جاتے تو صرف حضور کے پسینہ کی خوشبو سے جو اس راستے مہکی ہوتی پہچان لیتا۔ کہ حضور اس راستے سے گزرے ہیں"

دیکھا آپ نے! حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی لطافت و نظافت کو۔

سہ
نورِ عین لطافت پہ الطف درُود!
زیب و زینِ نظافت پہ لاکھوں سلام
عرش کی زیب و زینت پہ عرشی درود
فرش کی طیب و نزہت پہ لاکھوں سلام
بھینی بھینی مہک پر مہکتی درُود!

اس لئے ان حالات میں موجودہ قرآن جیسا کچھ بھی ہے اسی کام لینا چاہیئے۔ ایسا ہی امامت و رہنمائی کا منصب امام معصوم کو حاصل ہے۔ جو زمین کہیں چھپ کر کچھ دن رہنے کے بعد کہیں مستقل طور پر لوگوں کی ہماہمی سے روپوش ہے۔ اور وہ بھی صحیح قرآن کی طرح کبھی قیامت سے پہلے پہلے دنیا میں ظاہر ہوگا۔ اب اس کے آنے تک غلط قسم کے لوگوں کی اور غیر معصوم مجتہدین کی رہنمائی سے ہی کام چلانا ہے۔ اور انہیں غیر معصوم اور غیر اہلبیت لوگوں کی رائے اور روایت کو امام معصوم کی رائے کا مقام دلانا ہے۔

اندھی تقلید کے کرشمے بالکل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور اس سے انسان ہر اُڑائی ہوئی بات کو حقیقت کے درجے میں مان لیتا ہے۔ مگر جہاں ایک شخص کے دعویٰ اور نعرے کے مطابق اس کا منصب قرآن کی دعوت ہو اور لوگوں کو غلط قسم کے مفروضات سے نکالنا وہ اپنا فرض ٹھہرائے۔ تو کم از کم اسے تو ایسی بے سروپا مہملات کو زبان پر لانے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ کہ جب قرآنی نظام کا کاغذی سفینہ غرق ہوا۔ اور ملوکیت آگئی تو علمائے اسلام نے اس کے آگے اپنی گردنیں جھکاتے ہوئے سب نے سوچا کہ اب قرآنی نظام تو کہیں ہے نہیں اور نہ اسے قائم کرنے کے ہم کچھ مکلف ہیں۔ اس لئے غلط سلط جیسی کچھ بھی پائی جاتی ہیں انہیں پرانی جزئیات کو لوگوں میں دین اور وحی کی حیثیت سے پھیلایا جائے۔ اور اس کام کو فرض اور ڈیوٹی کے طور پر اس طرح انجام دیا جانے۔ کہ یہ معلوم نہ ہونے پائے۔ کہ یہ پرانی جزئیات غلط یا وقتی یا اضطراری اور قابل ترک ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ظاہر ہوگیا تو پھر ہمارا کاروبار منعدا ہوکر

پیاری پیاری نفاست پہ لاکھوں سلام!

میرے دوستو! شیطان نے ابوالبختری کی سکیم کو رد کر دیا۔ اور حاضرین نے شیطان کے اس اعتراض کی تائید کی۔ پھر عمرو بن ہشام نامی کافر نے اپنی ایک سکیم بیان کی۔ شیطان نے وہ بھی رد کر دی۔ پھر ابوجہل نے یہ سکیم پیش کی کہ :-

"اس وقت مکہ میں پندرہ بیس خاندان ہیں۔ جو محمد سے سخت نالاں ہیں۔ صرف بنی ہاشم اس کے طرفدار ہیں۔ ہر ایک خاندان میں سے ایک ایک آدمی لیا جائے۔ اور سب کے سب دفعتہً وار کریں۔ اور آپ کو شہید کر کے اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔ جب صبح کو بنی ہاشم کو خبر ہو گی۔ تب ایک گھر اتنے گھرانوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اور ہم کامیاب ہو جائیں گے"

شیطان نے اس سکیم کو منظور کر لیا۔ اور یہی بات مقرر ہو کر مجلس برخواست ہوئی۔

ادھر جبریل امین نے حاضر ہو کر ساری کیفیت بارگاہِ رسالت میں عرض کر دی۔ اور حضور نے اس حملہ والی رات کو اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لٹا دیا۔ اور خود حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ہمراہ لے کر مکہ معظمہ سے ہجرت فرمانے کا ارادہ فرما لیا۔

حسب سکیم جب کافر رات کو حضور کے مکان پر پہنچے اور سارے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی محاصرہ کے دوران اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا الخ تلاوت فرماتے ہوئے تھوڑی سی خاک پر دم کر کے ان کافروں کی طرف پھینک دی۔ ایک مٹھی خاک سنتر آدمیوں کے مونہوں۔ سروں۔ آنکھوں میں بھر گئی۔ اور عجب طرفہ یہ تھا کہ بجائے تکلیف ہونے کے سب کو نیند آ گئی۔ اور اللہ نے سب کو اندھا کر دیا۔ اور حضور ان میں سے صحیح و سلامت نکل گئے۔ اور صدیق اکبر کے گھر پہنچ کر صدیق اکبر (جو حضور کے ارشاد کے مطابق پہلے ہی سے

رہے گا۔ یہ ان میں سے کبھی کسی نے نہ سوچا اور نہ کسی نے ان سے پوچھا کہ آخر قرآن اور حدیث میں یہ کہاں ہے کہ اتنے بڑے پیمانہ پر اتنا بڑا جھوٹ بولنے اور گھڑ کر پھیلانے میں کچھ بھی گناہ نہیں۔ اور محض جھوٹ کو وحی کا نام دینے میں کچھ بھی بُرائی نہیں۔

یہ ہے ایک نئی روشنی کے محقق کی تحقیق کا ریکارڈ توڑنے والا نمونہ علم حدیث کے متعلق۔ یعنی دریا کو آگ لگ گئی۔ اور جب دریا پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ تو مچھلیوں نے طے کیا۔ کہ اب ہمیں پانی کی بجائے اسی آگ سے کام لینا چاہیئے۔ اور اپنی بعد والی نسلوں کو بھی یقین دلانا چاہیئے۔ کہ یہ آگ نہیں بلکہ پانی ہے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

سلف ان کے وہ تھے۔ خلف ان کے یہ ہیں۔

گالیاں اور دعائیں

آسمانی فیصلے بجواب قرآنی فیصلے از مصنف ۱۲-۲-۱۰ کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔

کتاب عوام کے لئے بے حد مفید ہے۔ الحادی تحریک کا پس منظر بیان کرنے کے علاوہ اس کے آئندہ پروگرام کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔ جو لوگ قرآنی فیصلے پڑھنے کے بعد الحاد اور بے دینی کا شکار ہونے کے لئے بالکل تیار کھڑے تھے وہ آسمانی فیصلے پڑھنے کے بعد چوکنے ہو گئے۔ کئی ایک احباب نے اعتراف کیا ہے۔

خدا بخش خوشابی سول پولیس لاہور

اس کتاب کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے اندر ان سب مسائل و اعتراضات کا دلائل کے ساتھ مقابلہ کیا گیا ہے۔ جو مخالفین حدیث نے قرآن کے نام سے اٹھائے ہیں ایسے

ہجرت کے لئے تیار تھے) کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ سے ہجرت فرما گئے۔ اور کافر خائب و خاسر رہ گئے۔

صدیق و علی میرے بھائیو! صدیق و علی رضی اللہ عنہما دونوں ہی حضور کے صحابی۔ اور جانثار ہیں۔ حضرت علی کا حضور کے بستر پر لیٹنا یہ اگر ایک ایثار ہے۔ تو اس خطرے کی رات میں اپنا گھر بار چھوڑ کر حضور کے ساتھ ہو جانا بھی ایک ایثار عظیم ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ جبکہ دونوں ہی حضور کے محبت۔ اور حضور کے یار جانثار تھے۔ رضی اللہ تعالے عنہما۔ افسوس ہے ان بے عقلوں کی اس حماقت پر جو یہ کہتے ہیں۔ کہ بستر پر لیٹنا تو قربانی تھی۔ مگر ساتھ جانا کوئی قربانی نہ تھی۔ سچ ہے۔ ع

خدا جب دین لیتا ہے حماقت آ ہی جاتی ہے

میرے دوستو! میں کہہ رہا تھا۔ کہ اس وطن کی محبت کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قربان فرمایا۔ اور مکہ شریف کو چھوڑا۔ اور ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ گویا ہمیں سبق دیا کہ ایمان کے لئے وطن چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دو۔

ایمان مقدم ہے یا وطن حضرات! آپ کو یاد ہوگا۔ پاکستان بننے سے قبل دیوبندی مولویوں نے کانگرس سے تعاون کر کے یہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ کہ وطن پہلے ہے اور مذہب بعد میں۔ چنانچہ مولوی حسین احمد مدنی نے علی الاعلان یہ بات کہی تھی۔ حالانکہ کانگرس اور کانگرسی مولوی جان بوجھ کر یہ بات کہہ رہے تھے۔ جب کہ تاریخ شاہد ہے۔ کہ مسلمانوں نے ہمیشہ دین و محبت اور ایمان کو مقدم رکھا ہے۔ اور وطن کی محبت پر قربان کیا ہے۔ اگر وطن مقدم ہوتا۔ تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی مکہ معظمہ سے ہجرت نہ فرماتے۔ اسی طرح دیگر صحابہ کرام جنہوں نے وطن چھوڑا۔ کبھی وطن نہ چھوڑتے۔ مگر انہوں نے دین و ایمان کے لئے وطن کو چھوڑا۔ ؎

نہ اپنی جان کی خاطر نہ اپنی آن کی خاطر وطن چھوڑا انہوں نے دین اور ایمان کی خاطر

ماحول میں جہاں یہ اعتراضات اور الجھنیں اپنی پوری رفتار کے ساتھ ترقی کر رہی ہیں۔ اور انکی صفائی کے لیے کوئی منظم کوشش نہیں کی جا رہی اور عوام دین سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ان الجھنوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ وہاں منفعت کی یہ کوشش بذات خود قابل تدر ہے کہ اس نے سلسلہ وار ان الجھنوں کو صاف کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اور پڑھنے والوں کو بتایا ہے کہ انہیں جن کانٹوں میں الجھایا جا رہا ہے ان سے نکلنے کی راہ یہ ہے اور قرآن کی نمائندگی کا دم بھرتے والوں کے دلائل بالکل بے وزن ہیں۔ خلیل حامدی لاہور

کتاب ہر پہلو سے قابل قدر اور لائق ستائش ہے۔ افتخار احمد قدوسی۔ لاہور

میاں محمد حافظ صاحب پرویز کے اٹھائے ہوئے فتنہ انکار حدیث کے خلاف ایک علمی مجاہد کے عزم کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور ان کا سر و سامان خالص درویشانہ ہے ان کے پاس نہ کوئی اعلیٰ درجے کا دارالاشاعت ہے۔ نہ سرمایہ یا اثر و رسوخ۔ ان کے پاس امت کے اندر اٹھنے والے فتنوں پر تڑپنے والا ایک دردمند دل ہے جس نے فتنہ انکار حدیث کی تردید میں خصوصی مہارت حاصل کر لی ہے۔

حافظ صاحب ایک سلجھے ہوئے فہیم عالم دین ہیں۔ اور قرآن و حدیث پر ان کی نگاہ گہری ہے۔ مسٹر غلام احمد پرویز صاحب نے اپنی کتابوں میں دین کی جو ترمیم و تنسیخ فرمائی ہے۔ اور اسلام کے اندر تہذیب مغرب کی ساری ماڈرن ضروریات کو داخل کرنے کے لئے دلائل کے جو تیر تکے چلائے ہیں۔ ان کے پائے چوبیں کا بے تمکین ہونا انہوں نے اچھی طرح ثابت کیا ہے۔

پرویز صاحب نے اپنی کتاب قرآنی فیصلے میں جو جو شبہات اور اشکال دین کے بارے میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان ہی کو مصنف نے اپنی کتاب کی ترتیب میں نشان د

غدار

مسلمانو! ایسے افراد آج پاکستان میں بھی موجود ہیں۔ جو تقسیم کے بعد ناچار پاکستان زندہ باد کے نعرے تو لگاتے ہیں۔ مگر درپردہ آج بھی ان کے دلوں میں بھارت کی یاد چٹکیاں لے رہی ہے۔ یہ لوگ بڑے فتنہ پرور ہیں۔ جھوٹی افواہیں اڑانا۔ مسلمانوں کو بات بات پر مشرک بنانا۔ اور انہیں بدعتی کہہ کہہ کر آپس میں لڑانا ان لوگوں کا کام ہے۔ یہ لوگ بظاہر ہمارے خیر خواہ ہیں۔ مگر بباطن ہمارے دشمن ہیں "دیو بندی" کے عنوان سے میں نے ایک نظم لکھی تھی۔ جس کے دو شعر یہ ہیں:۔ ے

ہے اُدھر بھی اور اِدھر بھی چال اس کی دیکھئے
ان کا بھی ہمراز ہے، اور ہم سے بھی ہے ہمکلام
غالباً کوئی اسی کے حق میں ہے یوں کہہ گیا
با مسلماں اللہ اللہ! با برھمن رام رام

صدیق اکبر رضی اللہ تعالٰی عنہ کا ایثارِ مال

حضرات! یہ تو تھی وطن کی محبت۔ جسے صحابہ کرام نے ایمان کی محبت پر قربان کردیا۔ اب آیئے مال کی محبت کو دیکھئے۔ صحابہ کرام نے اسے بھی کس طرح ایمان کی محبت پر قربان کر دیا۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ مشہور واقعہ ہے۔ جو کنز العمال میں موجود ہے۔ اور تاریخ الخلفاء ص۱۳۱ میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔ کہ ایک مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا۔ کہ اللہ کی راہ میں کچھ دو۔ اور میری خدمت میں حاضر کرو۔ حضور کا یہ ارشاد پاک سن کر حضرت عمر فرماتے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا۔ کہ آج اتفاق سے میرے پاس کافی مال ہے۔ اور ابوبکر ہر موقعہ پر محبت و ایثار میں ہم سب سے بڑھ جایا کرتے ہیں۔ آج میں اس قدر مالی قربانی اور ایثار کا مظاہرہ کروں کہ ابوبکر سے بھی بڑھ جاؤں۔ اور اپنے آقا کو راضی کر لوں۔

ہماری ریس

مسلمانو! دیکھا آپ نے ان پاک لوگوں کی ریس کو۔ کہ

کیا ہے ان کا اقتباس درج کیا ہے۔ اس اشکال اور موضوع کو اپنے مضمون کا عنوان مقرر کیا ہے۔ اور پھر پرویزی اشکال کو قرآن و سنت اور عقلی دلائل سے رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ عموماً آپ کی بیشتر کوششیں کامیاب ہیں۔ کہیں کہیں شاذ الجھاؤ ہے لیکن اس کے باوجود اس فتنہ کا جائزہ لینے اور منکرین حدیث کے چھوئے ہوئے کانٹوں کو دلوں میں سے چن چن کر نکالنے کے لیے انتہائی مفید ہے۔ البتہ پرویز کی عبارت کو اس کے اپنے الفاظ میں دراز یا جامعیت کے ساتھ[ل] پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

اسعد گیلانی۔ لائل پور

میاں محمد حافظ صاحب ردِ پرویزیات کے میدان میں ماہر خصوصی ہوتے جا رہے ہیں پہلے انہوں نے قرآنی فیصلے کا توڑ آسمانی فیصلے کے نام سے لکھا۔ اب اس کتاب میں کتاب اسباب زوال امت کے مغالطوں اور الجھنوں کو انہوں نے بے نقاب کیا ہے۔ میاں محمد حافظ صاحب نے گویا بلغم خون اور تھوک کی کیمیادی امتحان گاہ کھول رکھی ہے۔ اور وہ پرویزیات کا تجزیہ کر کے فتنہ کے تمام جراثیم کو سامنے لا رہے ہیں۔ پرویز صاحب نے دین کے بنیادی تصورات اور اصطلاحات کو مسخ کرنے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے اس کے مقابلے میں اس دیہاتی درویش کی مساعی قابل تحسین ہیں۔ چاہیئے کہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

ہفت روزہ ایشیا لاہور۔ شمارہ ۲۹/۳ جلد ۶

کتاب اسباب فساد امت بھی اسی نوعیت کی ہے۔ حافظ صاحب مبارک باد کے

ل چاہتا تو میں بھی یہی ہوں مگر جہاں کتابیں مانگ کر ان سے نوٹ لینا ہو وہاں یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ یہی سبب الجھاؤ کا ہے اور مفصل کتابیں لکھ کر انہیں شائع کرنے کے اخراجات سے موجود نہیں۔

ریس اگر کرتے ہیں تو نیک کاموں ہیں۔ کہ اگر اس نے اللہ کی راہ میں زیادہ خرچ کیا ہے۔ تو میں اس سے بھی زیادہ خرچ کرکے دکھاؤں گا۔ مگر ایک ہماری ریس بھی ہے۔ کہ اگر فلاں شخص نے اپنے لڑکے کی شادی میں آتشبازی اور باجے منگوائے ہیں۔ تو میں اپنے لڑکے کی شادی میں طمنچہ جان کو منگواؤنگا گویا اگر وہ چھوٹا شیطان ہے۔ تو میں بڑا شیطان بن کے دکھاؤں گا۔ استغفر اللہ! کیسی جہالت ہے، خدا تعالےٰ خوشی کا موقعہ دیتا ہے۔ تو بجائے اس کے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے۔ اس کے کفر پر کمر باندھ لیجاتی ہے۔ اور پھر یہ کہ جو شخص اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے وقت تو غریب و مسکین بن جاتا ہے۔ بیاہ شادیوں میں اس قدر شاہ خرچ بن جاتا ہے کہ گویا اس کی کسی بات کی پرواہ ہی نہیں۔ علمار کرام ان فضول خرچیوں سے روکتے ہیں۔ تو کہہ دیتے ہیں۔ مولوی صاحب! آخر برادری میں ناک بھی تو رکھنی ہے۔ گویا ناک رہ جائے۔ مگر چاہے ٹوٹ ہی جائے۔ حالانکہ ایسے وقت میں مسلمان کو اپنے خدا و رسول کے ارشادات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ سارے عزیز بگڑ جائیں تو بگڑ جائیں۔ مگر خبردار! اپنے رسول کو ناراض مت کرنا۔ ایسے وقت مسلمان کا یہ شیوہ ہونا چاہیئے۔ کہ یا رسول اللہ! ؎

مرے عمل سے نہ بھائی خوش ہیں نہ خویش خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں

برادری میں ناک رہے نہ رہے۔ بارگاہ رسالت میں ناک رہنی چاہیئے اور ایسی ناک جیسے رسم و رواج کی سریش سے چمٹایا جائے۔ ہرگز پائیدار ناک نہیں ہے۔

لطیفہ جیسے ایک امیر آدمی کا لڑکا تھا۔ اُسے ناک پر ایک خطرناک پھوڑا نکل آیا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا۔ کہ ناک کاٹ دی جائے۔ ورنہ یہ پھوڑا مہلک ثابت ہوگا۔ چنانچہ اس لڑکے کی ناک کاٹ دی گئی۔ اتفاق دیکھئے۔ کہ چند روز بعد ہی اس لڑکے کی ایک امیر آدمی کے ہاں برات جانے والی تھی۔ لڑکے کے باپ نے سوچا۔ کہ اگر لڑکی

مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی ہمت اور اپنے بل بوتے پر جبکہ ان کی اپنی پونجی ایک دردمند دل اور محنت کرنے والے ہاتھ پاؤں سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ایسا علمی کام شروع کیا ہے۔ آج جبکہ علمی اور دینی لٹریچر کا ذوق کافی کم ہو گیا ہے۔ ایسے پرعزم انداز میں کام کی ابتدا کر کے ہر قسم کے گرم و سرد حالات سے عہدہ برا ہوتے ہوئے کام کرتے چلے جانا واقعی تحسین و ہمت افزائی کا مستحق ہے۔ امید ہے کہ دینی عناصر ان کی ہمت افزائی میں بخل سے کام نہ لیں گے۔ ویسے تو ان کیلئے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ہی کافی ہے۔

اسعد گیلانی۔ لائل پور

نوازش نامہ ملا۔ کتابیں بھی مل گئی ہیں۔ آپ نے غلط عقائد کو پھیلنے سے روکنے کے لئے جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ اسلام کی بہترین خدمت ہے خدا اس میں آپ کو برکت دے آمین

مینجر۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدر آباد۔ دکن

مکرمی۔ سلام مسنون۔ مبلغ پانچ روپیہ کی ناچیز رقم برائے خدمت فن حدیث ارسال ہے اللہ سبحانہ قبول فرمائے۔ آپ کی سعی اللہ تبارک و تعالیٰ کامیاب کرے جزاکم اللہ احسن الجزاء

حکیم نور اللہ مسافر مقام کوٹ بہادر شاہ۔ جھنگ

گالیاں ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور میں کتاب آسمانی فیصلے کا جو تبصرہ شائع ہوا ہے اس میں ہے کہ کتاب کی بعض عبارات میں الجھاؤ ہے۔ مونث و مذکر کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ طرز استدلال مناظرانہ ہے۔ اس کے باوجود بعض مفید معلومات بھی اس میں موجود ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی کتاب کو برے انداز میں پیش کرنے کے لئے شاید ہی ان سے

والوں کو پتہ چل گیا۔ کہ لڑکے کی ناک کٹی ہوئی ہے۔ تو بڑی ندامت کی بات ہے۔ اور ممکن ہے۔ وہ رشتہ توڑ ہی دیں۔ اس لئے کوئی ایسی ترکیب کی جائے۔ جس سے نکاح سے پہلے پہلے یہ راز فاش نہ ہو کہ لڑکے کی ناک نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے کافی روپیہ خرچ کر کے امریکہ سے ربڑ کی ناک منگوائی۔ اور وہ مصنوعی ناک لڑکے کے چہرہ پر فٹ کر دی۔ برات کا دن آیا۔ اور نکاح کے وقت دولھا میاں بیٹھے اور نکاح خواں نے کہا۔ کہ فلاں لڑکی کو تم نے قبول کیا؟ اتفاقاً اسی وقت دولھا میاں کو چھینک آگئی۔ اور آپ زور سے چھینکے۔ تو سب کے سامنے ربڑ کی ناک نیچے آگری۔ سہرے کو ہٹا کر جو دیکھا گیا۔ تو دولھا میاں نکیٹے نظر آئے۔ لڑکی والوں نے اسی وقت جواب دے دیا۔ اور یہ برات بہزار ندامت واپس لوٹی۔

میرے دوستو! جو ناک رسم و رواج کی ربڑ سے بنوا کر آج چسپاں کی جائے گی۔ کل قیامت کے دن جب قہر الٰہی اور غضب الٰہی کا ایک طمانچہ پڑا۔ تو یہ ناک فوراً نیچے گر پڑے گی۔ ہاں وہ ناک جو بارگاہِ رسالت میں قائم رہ گئی۔ دائم رہے گی۔ اور اسے کوئی خطرہ نہیں۔ تو ہمیں اپنی ناک بارگاہِ رسالت میں قائم رکھنی چاہیئے۔

ہاں تو میں بیان کر رہا تھا۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دل میں یہ سوچ کر گھر گئے۔ کہ آج اس قدر راہِ خدا میں دوں گا۔ کہ صدیق سے بھی نمبر لے جاؤں گا۔ چنانچہ آپ گھر گئے۔ اور جس قدر مال تھا۔ سب کے دو حصے کئے اور آدھا گھر رکھا۔ اور آدھا حضور کی خدمت میں لے آئے۔ آپ نے اس قدر ایثار فرما کر یہ سوچا۔ کہ آج صدیق اکبر سے میں بڑھ جاؤں گا۔

مگر ع

اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آگیا
شاہد ہے جس کی مہر و وفا پر حرا کا غار

کیا دیکھتے ہیں کہ افضل الخلق بعد الانبیاء حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی آگئے۔ اور کس شان سے آئے۔ مسلمانو! سنو! جس قدر مال و متاع

گھر میں تھا۔ سارے کا سارا لے کر حاضر ہو گئے۔ سو کا سو فیصدی ہی لے آئے فاروق اعظم نے دیکھا۔ تو دل ہی دل میں کہا۔ کہ صدیق سے بڑھ جانا مشکل ہے حضرت صدیق نے سارا مال حضور کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ حضور اپنے یار غار کا یہ ایثار دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ اور فرمایا۔ ابوبکر! گھر اپنے لئے کیا چھوڑ آئے؟ صدیق نے عرض کیا ؎

پروانے کو چراغ تو بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

خدا کا پیغام صدیق کے نام

مسلمانو! اس موقعہ پر صدیق کی شان کا بیان سنو! حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ جبریل امین حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا یا رسول اللہ! — اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُقْرِءُ عَلَیْہِ السَّلَامَ وَیَقُوْلُ قُلْ لَہٗ اَرَاضٍ اَنْتَ عَنِّیْ فِیْ فَقْرِكَ ھٰذَا اَمْ سَاخِطٌ — اللہ تعالیٰ صدیق اکبر پر سلام فرماتا ہے۔ اور فرماتا ہے یا رسول اللہ آپ صدیق اکبر سے پوچھئے۔ کہ کیا وہ اس عالم فقر میں مجھ (اللہ) سے راضی ہے یا ناراض؟

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے خدا کا یہ پیغام صدیق اکبر کو سنایا۔ تو مسلمانو! اس پیغام کی لذت صدیق اکبر نے ہی پائی۔ آپ عالم وجد میں آ گئے اور عرض کیا۔ اَسْخَطُ عَلٰی رَبِّیْ؟ اَنَا عَنْ رَبِّیْ رَاضٍ اَنَا عَنْ رَبِّیْ رَاضٍ اَنَا عَنْ رَبِّیْ رَاضٍ۔ (تاریخ الخلفاء صـ۳۱) کیا میں اپنے رب سے ناراض ہوں گا؟ میں اپنے رب سے راضی ہوں۔ میں اپنے رب سے راضی ہوں۔ میں اپنے رب سے راضی ہوں۔

سبحان اللہ! سبحان اللہ!! ایک ہم ہیں کہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ہمارا رب ہم سے راضی ہو جائے۔ اور ہمیں کوئی یقین نہیں۔ کہ ہمارا رب ہم سے راضی ہے یا نہیں۔ محض اس کے فضل و کرم پر ہی بھروسہ ہے۔ اور ایک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ کہ خدا دریافت فرما رہا ہے۔ کہ اے صدیق! کیا تم ہم پر

ناراض تو نہیں، اور تم ہم پر راضی تو ہو؟ اللہ اکبر! کیا شان ہے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی۔ جہنم میں جائیں وہ لوگ جو صدیق اکبر کے دشمن ہیں۔ اور اپنے گھر بیٹھے بیٹھے ہی کہتے ہیں۔ کہ ہم صدیق اکبر پر راضی نہیں ہیں۔

مسلمانو! مل کے پڑھو!:-

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ   رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

یار کے نام پر مرنے والا   سب کچھ صدقے کرنے والا

منزل عشق و صدق کا رہبر   رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

حضرت! صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سخاوت کے متعلق قرآن پاک میں یہ خاص آیت موجود ہے۔ خدا فرماتا ہے:-

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰی اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی وَلَسَوْفَ یَرْضٰی۔ (پ۳۰ ع ۱۸)۔

وہ جو اپنا مال دیتا ہے کہ ستھرا ہو۔ اور کسی کا اس پر کچھ احسان نہیں۔ جس کا بدلہ دیا جائے۔ صرف اپنے رب کی رضا چاہتا ہے۔ جو سب سے بلند ہے۔ اور بے شک قریب ہے کہ وہ راضی ہو۔"

یہ آیات کریمہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ چنانچہ تفسیر خزائن العرفان میں لکھا ہے۔

جب حضرت صدیق اکبر نے حضرت بلال کو، بہت گراں قیمت پر خرید کر آزاد کیا۔ تو کفار کو حیرت ہوئی۔ اور انہوں نے کہا۔ کہ حضرت صدیق نے ایسا کیوں کیا۔ شاید بلال کا ان پر کوئی احسان ہو۔ جو انہوں نے اتنی گراں قیمت دے کر خریدا اور آزاد کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ظاہر فرما دیا گیا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل محض اللہ کی رضا کے لئے ہے

کسی کے احسان کا بدلہ نہیں۔ اور نہ ان پر حضرت بلال وغیرہ کا کوئی احسان ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت سے لوگوں کو ان کے اسلام لانے کے سبب خرید کر آزاد کر دیا۔" خزائن العرفان صہ ۸۴۳)

اسی طرح دوسری کتب تفاسیر میں بھی لکھا ہے کہ:۔

اَلْاٰیَۃُ نَزَلَتْ فِیْ حَقِّ اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ حِیْنَ اشْتَرٰی بِلَالًا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ۔ (روح البیان صہ ۶۶ ج ۷) یہ آیت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ جبکہ آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خریدا تھا۔ (اور آزاد کیا تھا)

تو میرے بھائیو! جن کی سخاوت وایثار کی گواہی خود خداوند کریم جل شانہٗ دیتا ہو۔ ان کی کتنی بڑی شان ہوگی ؎

سرِ روشن دلاں صدیق اعظم ⁂ کہ شد اقلیم تصدیقش مسلم
زمہرش روزِ دیں را روشنائی ⁂ بدو اہل یقین را آشنائی

حضرت بلال رضی اللہ عنہ

یہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جنہیں خرید کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آزاد کیا تھا۔ ایک حبشی غلام تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں آکر ہمارے سردار بن گئے۔ یہ امیہ کافر کے غلام تھے۔ اور مسلمان ہوگئے تھے۔ امیہ کو پتہ چلا کہ بلال مسلمان ہوگئے ہیں۔ تو وہ آپکو سخت ایذائیں دینے لگا۔ آپ کو ننگے بدن دوپہر کے وقت گرم گرم ریت پر لٹاتا اور پٹواتا تھا۔ مگر ؎

آنجا کہ منتہائے کمالِ ارادات است
ہر چند جور بیش محبت زیادت است

حضرت بلال رضی اللہ عنہ بیٹھے۔ ایذا سہتے۔ اور احد احد کے نعرے لگاتے تھے۔ اور گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور میں یہ فرماتے تھے ؎

حلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلّاد رہے
لب پہ تیرا نام رہے، دل میں تری یاد رہے

یارسول اللہ! مرجاؤں۔ کٹ جاؤں۔ مٹ جاؤں۔ مگر تیرا دامن چھوڑنا منظور نہیں ؎

توڑ دیں گر ہڈیاں میری سبھی
دامنِ احمد نہ چھوڑونگا کبھی

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ دیکھا۔ کہ بلال پٹ رہے ہیں۔ اور ہنس رہے ہیں۔ صدیق نے یہ منظر دیکھ کر پوچھا۔ بلال یہ کیا؟ پٹتے ہو اور ہنستے ہو؟ بلال نے جواب دیا۔ کہ دیکھ لیجئے یہ واقعہ ہے۔ اور یہ دستور ہے کہ اگر کسی کو ایک مٹی کا پیالہ خریدنا منظور ہو۔ تو وہ خریدار ؎

پہلے تو ٹھونکے بجائے گا اسے وہ بالیقیں
کہ یہ کچا تو نہیں ہے اور ٹوٹا تو نہیں
میں بھی ہوں مٹی کا پتلا عشق کے بازار میں
آگیا ہوں میں پسند اس دم نگاہِ یار میں

اے صدیق! اللہ مجھے اس کافر سے پٹوا کر میرا امتحان لے رہا ہے۔ کہ میں عشق رسول میں کچا تو نہیں ہوں۔ تو میں خوشی سے کیوں نہ ہنسوں کہ میرا مولا مجھے خرید لینے کے لئے تیار ہے۔

امتحانِ عشق پاکرتے کی داستان

اور سنیئے! کسی عاشق نے اپنے محبوب کو کرتہ (قمیص) پہنے ہوئے دیکھا۔ تو کرتے سے کہا۔ اے کرتے۔ مجھ سے تو تُو ہی اچھا ہے۔ جو محبوب کے بدن کیساتھ لگ رہا ہے۔ مجھے دیکھ میں فراق کی آگ میں جل رہا ہوں۔ تو ؎

کہا کرتے نے کر انصاف میری داستاں سن کر
کہ میں کن سختیوں کے بعد پہنچا یار کے تن پر
کساں کے ہاتھ آکر میں نے پہلا دکھ یہ پایا ہے
زمیں میں مجھ کو دابا اور مجھ پر ہل چلایا ہے
زمیں میں دفن ہوکر کچھ نہیں شکوہ کیا میں نے
اور اس مٹی سے چلکر کنوئیں کا پانی پیا میں نے
مٹایا اپنی ہستی کو جو میں نے خاک کے اندر

کیا پھر عشق نے زندہ میں نکلا ایک گُل بن کر
مکمل ہو گیا جس دم میں بن کر روئی کا بوٹا
کساں آیا پھر اس کے ہاتھ سے میرا یہ سر لوٹا
پھر اس کے بعد ایسی امتحان کی اک مشین آئی
کہ جس نے میرے جسم و جان کی تفریق کر ڈالی
اسے سب بیلنا کہتے ہیں میں اس میں پھنسا ایسا
کہ میری ہڈیاں گرنے لگیں ساری الگ اِک جا
میں ہر میدان میں صابر رہا لیکن مرے بھائی
ابھی تک امتحانِ عشق سے چھٹی نہیں پائی
پھر آئے حضرتِ نداف میرا امتحاں لینے
اور اپنی دھنکی سے عاشق کو چوٹیں عشق کی دینے
پھر اس کے بعد چرخہ کاتنے والے چلے آئے
وہ میرے جسم کی رگ رگ کو باہر کھینچ کر لائے
پھر اس کے بعد کپڑا بُننے والے نے مجھے پکڑا
مجھے گھر لے گیا اور پھر مشینوں میں مجھے جکڑا
ملی مجھ کو یہاں پھر دوسری اک زندگی بھائی
یہاں پہنچا تو کپڑے کی مجھے صورت ملی بھائی
مصائب کیا یہی کم تھے، مگر تھی عشق کی مرضی
ملا پھر امتحاں لینے کی خاطر آ گیا درزی
ہوا تیار درزی امتحاں لینے کو جی بھر کے
کیئے قینچی سے ٹکڑے ٹکڑے میرے جسمِ لاغر کے
پھر اس کے بعد سوئیوں سے میرے اس جسم کو چھیدا
سیا مجھ کو تو پایا نام میں نے آج کرتے کا
جو میں نے اس قدر دکھ اپنی ہستی پر اٹھایا ہے
تو پھر جا کر کہیں محبوب نے تن سے لگایا ہے

سنا آپ نے کرتے نے جو اپنی روئداد عشق بیان کی! بھائیو! حضرت بلال یا دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جو مرتبے پائے ہیں۔ وہ کچھ کرکے پائے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنا مال و زر، اور خویش و اقربار اور اپنی جان تک حضور پر قربان کی۔ تو حضور کو دیکھ لیجئے۔ اپنے صدیق کو اپنے آغوش رحمت میں لئے سبز گنبد میں تشریف فرما ہیں۔

ہاں تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بہت بڑی قیمت کا سونا دیکر حضرت بلال کو خرید کر آزاد کر دیا۔ اور بلال حضور کے قدموں میں پہنچ گئے۔ اور صدیق کے حق میں مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

دیکھا آپ نے یہ ہے ایمان والوں کی شان کہ ایمان کے لئے نہ مال کی پروا کی جاتی ہے نہ جان کی۔

لطیفہ ایک تو یہ بزرگ تھے۔ کہ جان و مال سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان فرما گئے۔ ایک ہم ہیں۔ کہ خدا راہ حق میں جو طلب فرماتا ہے۔ ہم اس سے گریز کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ انعام ہمیں وہی ملے جو ان بزرگان دین کو ملا۔ جو اپنا سب کچھ راہِ حق میں لٹا گئے۔

کہتے ہیں۔ ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ یار! میں باہر سفر میں جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری کوئی نشانی میرے پاس رہے تاکہ تم ہر وقت میری یاد میں رہو۔ میرے خیال میں تم اپنی یہ انگوٹھی بطور نشانی مجھے دیدو۔ تاکہ ہر وقت تم میرے پیش نظر رہو۔ اور مجھے یاد آتے رہو دوست نے کہا۔ مگر تمہیں میری یاد ہی تو منظور ہے اور وہ یوں بھی حاصل ہوسکتی ہے۔ کہ اپنی خالی انگلی دیکھ کر یاد کر لیا کرنا کہ میں نے اپنے دوست سے انگوٹھی مانگی تھی۔ مگر اس نے نہ دی۔ جس طرح انگوٹھی کو دیکھ کر میری یاد آئے گی۔ اسی طرح انگلی انگوٹھی سے خالی دیکھ کر بھی میری یاد آسکتی ہے۔ پھر خواہ مخواہ انگوٹھی دینے اور پہننے کی تکلیف کی کیا ضرورت!

تو میرے بھائیو! آج ہمارا بھی خداوند کریم سے کچھ اس قسم کا معاملہ ہے کہ

اے مولا! تو نے پہلے مسلمانوں سے مالی و جانی ایثار طلب فرمایا۔ اور انہوں نے سب کچھ پیش فرما دیا۔ اس طرح تو نے انہیں اپنی یاد میں رکھنے کی سرفرازی عطا فرمائی۔ اور ہمیں بھی تو تو اپنی یاد سے سرفراز فرمانا چاہتا ہے نا؛ تو یہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ہم وہ ہیں کہ تم نے جب بھی کچھ راہِ حق میں طلب فرمایا۔ ہم نے گریز ہی کیا۔ میرے بھائیو! اس قسم کی روش سے پناہ مانگو۔ یہ خدا کی یاد نہیں۔ بلکہ یہ ہماری بہت بڑی بھول ہے۔ اور یاد رکھو۔ اس بھول کا نتیجہ بڑا بھیانک ہے۔ قرآن فرماتا ہے۔ بھول جانے والوں سے کل قیامت کے دن یوں فرمایا جائے گا۔

وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنْسَاكُمْ كَمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ

(پ ۲۵ ع ۲۰) اور فرمایا جائیگا۔ آج ہم تمہیں چھوڑ دینگے۔ جیسے تم اپنے اس دن کے ملنے کو بھولے ہوئے تھے۔ اور تمہارا ٹھکانا آگ ہے"!

دنیا ایک کھیتی ہے

میرے بھائیو! اس دنیا میں جو کروگے کل وہی سامنے آئے گا۔ یہ دنیا گویا ایک کھیتی ہے۔ جو بوؤ گے۔ وہی کاٹو گے۔ ایک پنجابی شاعر لکھتا ہے۔ ؎

دنیا کھیتی آخرت دی ؛ خود حضرت فرماوے
جیہا اس وچ بیجے کوئی ویہا ہی پھل پاوے
جے توں اس نوں محنت کر کے بیجیں اج دہاڑے
پھلکے تیرے نائیں ہوسن بوہل تے کھلواڑے
جے بیجن ویلے کجھ نہ بیجیں موسم پیا گواویں
اگے فصل جو پکی ویکھیں رو رو کے پچھتاویں
تیں تھیں اگے جنگے ہالی، ہل واہ گئے اگیرے!
شوق عشق دی ہل پنجالی توں بھی گھن سویرے!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے ایمان کی محبت پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ جان، مال، اولاد ہر ایک چیز کی محبت کو ایمان پر نچھاور کر دیا۔ اولاد کی محبت ہر صاحبِ اولاد خوب سمجھتا

ہے۔ مگر اللہ رہے محبت ایمان۔ کہ صحابہ کرام نے اس محبت کی بھی کچھ پروا نہ کی۔ اور ایمان کی محبت ہی کو مقدم رکھا۔ چنانچہ۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما اور ان کے دو صاحبزادے

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے۔ اور کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے گھر پہنچے۔ تو آپ کے دو چھوٹے بچوں نے کلمہ طیبہ کو سن کر اپنے والد ماجد سے پوچھا۔ اباجان! یہ کس پیاری ہستی کا نام لے رہے ہو۔ کہ نام تم لیتے ہو۔ اور مزہ ہمیں آرہا ہے۔ حضرت عمار نے جواب دیا ؎

ایہہ اوہ نام مبارک بچیو جس دا کل پسارا
جے نہ ہندا ایہہ ناں والا ہندا نہ عالم سارا

بچوں نے کہا۔ تو پھر یہ کلمہ طیبہ ہمیں بھی پڑھائیے۔ چنانچہ ان بچوں نے بھی کلمہ طیبہ پڑھ لیا۔ اور دونوں مل کر اس پیارے کلمہ کا ورد کرنے لگے۔ اور ورد کرتے کرتے باہر نکلنے لگے۔ حضرت عمار نے فرمایا۔ بیٹو! ابھی اس کلمہ طیبہ کو باہر نکل کر پڑھنے کا وقت نہیں ہے۔ کافر سنیں گے۔ تو ایذا دیں گے۔ اندر ہی رہ کر پڑھو۔ بچوں نے جواب دیا اور سبحان اللہ! کیا ہی ایمان افروز جواب ہے ؎

جد ایہہ نام مبارک اتنا، یوں فیں کیوں ڈریئے
نام مبارک لیندے رہیئے، جو بنیئے سو جریئے

چنانچہ وہ دونوں صاحبزادے کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے باہر نکلے اور اپنی جان سے بے پرواہ ہوکر علی الاعلان اس نام پاک کا اعلان کرنے لگے۔ گویا دونوں بھائیوں کا یہ ترانہ تھا۔ کہ

دل و جان دونوں فدائے محمدؐ
خدا ہم کو کر خاک پائے محمدؐ
کرم ہے ترا ہم پہ احسان خالق!
کہ پیدا ہوئے ہم برائے محمدؐ

نہیں ہم کو غم جان جائے تو جائے
تمہاری محبت نہ جائے محمدؐ!

ناگاہ ایک کافروں کا گروہ ادھر سے گزرا۔ اور یہ پیاری آواز انہوں نے سنی، تو حسد سے جل گئے۔ ایک بے دین نے ان پاک بچوں کو طمانچہ مارا۔ کسی نے حضرت عمار سے جاکر کہا۔ کہ تمہارے بچے نرغے میں گھر گئے ہیں۔ جاؤ اور ان کو نام محمدؐ لینے سے روکو۔ آپ کا جواب یہ تھا ؎

بیشک پُتر ٹھنڈ اکھاں دی گھروچہ کرن اُجالا
پر ایہناں تھیں ودھ کے پیارا مینوں کالی کملی والا

پھر وہ شخص بچوں کی ماں کے پاس گیا۔ اور اسے واقعہ سنایا تو وہ بولی ؎

دل دے ٹکڑے ڈاہڈے ہندے پُت پیارے ماواں
پر نام نبی توں جے لکھ پُتر ہووے گھول گھماواں

تھوڑی دیر کے بعد جب کافروں نے ان بچوں کو بیحد تنگ کیا اور بہت مارا تو حضرت عمار اور ان) کے والد حضرت یاسر نے باہر نکل کر کافروں کو اس جفا سے روکا تو، ان ظالموں نے حضرت عمار اور یاسر کو اور حضرت عمار کی بیوی کو بھی پکڑ لیا۔ اور اس مقدس گھرانے کے سب افراد کو مارنا شروع کردیا۔ اتفاقاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس طرف تشریف لے آئے۔ آپ نے یہ منظر دیکھا۔ تو فرمایا۔

اِصْبِرُوْا یَاآلَ یَاسِر فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃَ۔ یاسر والو! صبر کرو، تمہارا مقام جنت ہے۔"

آخر کفار کی جفا نے ان نفوس قدسیہ کو جنت میں پہنچا دیا۔

حضرات! دیکھا آپ نے یہ ہے ایمان اور خدا نے بھی یہی فرمایا ہے کہ لَا تَھِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ یعنے اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو پھر گھبراؤ مت عروج و سربلندی تمہارے ہی لئے ہے۔"

میرے بزرگو! سب جانتے ہیں۔ کہ آج ہمیں وہ عروج و سربلندی جو پہلے زمانے میں تھی۔ حاصل نہیں۔ پہلے لوگ سربسجود ہوکر بارگاہِ خداوندی میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی عرض کرتے تھے۔ اور خدا اُن کے لئے " وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ " فرماتا تھا۔ آج ہم نے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہنا چھوڑ دیا ہے یعنی نماز کا نام تک نہیں لیتے۔ تو خدا نے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ کا مصداق ہمیں بنانا چھوڑ دیا۔ پہلے لوگ غازی بھی تھے۔ اور نمازی بھی۔ مجاہد بھی اور عابد بھی۔ آج کسی کو نماز کا کہہ کر دیکھئے۔ تو جواب ملتا ہے۔ میاں ہم غازی ہیں غازی۔ گویا جو غازی ہو وہ پکا بے نمازی ہوتا ہے۔ حالانکہ جو غازی ہے۔ میدان جہاد میں بھی اس کے لئے یادِ حق کی تاکید ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہوتا ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (پ۱ ع ۲) اے ایمان والو! جب کسی فوج سے تمہارا مقابلہ ہو۔ تو ثابت قدم رہو۔ اور اللہ کی یاد بہت کرو۔ کہ تم مراد کو پہنچو!"

چنانچہ مسلمانوں کا جب بھی کافروں سے مقابلہ ہوا۔ انہوں نے میدان جہاد میں بھی نمازوں کو نہیں چھوڑا۔ اسی لئے اقبال نے بھی لکھا ہے۔ کہ ؎

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رُو ہوکے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

مگر کس قدر انقلاب ہے۔ کہ آج وہ غازی ہے۔ جو نماز نہ پڑھے۔ مسلمانو! نماز ایک بڑا اہم فریضہ ہے۔ اور افسوس کہ جس قدر یہ اہم ہے اسی قدر اس سے غفلت کی جارہی ہے ـــــ دین و دنیا کے مالک ومختار حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب نماز سے بے اعتنائی نہیں فرمائی۔ تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ پہلے زمانے کے مسلمان اس فریضہ کو بڑا اہم سمجھتے تھے۔ اور اسکا بہرحال خیال رکھتے تھے۔ مگر آج؟

نمازیوں کی قسمیں کہتے ہیں۔ آجکل کے نمازیوں کی چند قسمیں ہیں۔ اصلی وصلی۔ فصلی۔ آٹھ کے، کھاٹ کے، تین سو ساٹھ کے۔ اصلی تو وہ جو باقاعدہ پنجوقت کی نماز ادا کرے۔ فصلی وہ جو فصل کے موسم میں فصل پکنے پر خوشی میں اگر دو دن نماز پڑھ لے۔ وصلی وہ جو کسی کا مہمان بنے۔ تو اس خیال سے کہ میزبان مجھے بے نمازی نہ سمجھے دو دن کے لیئے نماز شروع کر دے۔ آٹھ کے وہ جو آٹھویں دن صرف جمعہ پڑھ لیا کرے۔ کھاٹ چارپائی کو کہتے ہیں، کھاٹ کے وہ جو کسی کا جنازہ ہو جائے۔ تو جنازہ پڑھ لے۔ اور تین سو ساٹھ کے وہ جو تین سو ساٹھ دن یعنی پورے سال کے بعد نماز عید پڑھ لے۔ میرے بھائیو! ان سب قسموں میں سے اگر بننا ہے۔ تو پہلی قسم کے نمازی بنو۔ یعنی اصلی نمازی بنو۔ مگر آہ! اس دور میں پہلی قسم کے نمازی بہت کم ہیں۔ دوسری قسموں کے زیادہ ہیں۔

ہمارے لیڈروں کی نماز اور یہ جو ہمارے لیڈر ہیں۔ یہ زیادہ تر اگر کوئی نمازی ہو تو تین سو ساٹھ قسم کے نمازی ہیں سال بھر کے بعد عیدگاہ میں آئے۔ اور قوم میں اپنی نماز کی نمائش کر دی۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ اگر کوئی لیڈر نماز عید یا نماز جمعہ کبھی پڑھ لے۔ تو اخباروں میں اعلان ہونے لگتا ہے۔ کہ فلاں لیڈر نے نماز پڑھی۔ ریڈیو میں اعلان ہو جاتا ہے۔ کہ فلاں لیڈر نے نماز ادا کی۔ گویا حضرت نے ایک انوکھا۔ نرالا، اچنبھا اور ایسا کام جو ان کے باپ دادا نے بھی نہ کیا تھا۔ کر ڈالا۔

میرے بھائیو! نماز پڑھو! اور خاص خدا کے لئے پڑھو۔ اور پنج وقت کی باقاعدہ نماز پڑھو۔ خبردار! اس نماز سے غفلت اختیار نہ کرنا۔ یہ نماز بڑی برکتوں اور رحمتوں کا موجب ہے۔ اور بے نمازی شیطان سے بھی زیادہ بڑا ہے ؎

شیطان ہزار مرتبہ بہتر ز بے نماز!
کاں سجدہ پیشِ آدم و ایں پیشِ حق نہ کرد

مومنین کی امداد غیبی

حضرات! خدا کا وعدہ ہے۔ کہ اگر تم مومن ہو تو فتح و نصرت اور سربلندی تمہارے ہی لئے ہے۔ چنانچہ اپنی تاریخ پڑھیئے۔ تو اس وعدۂ حق کے متعدد جلوے نظر آتے ہیں۔ میدان بدر میں مسلمانوں کی تعداد کتنی تھی، صرف تین سو تیرہ۔ اور مقابلہ میں ابوجہل کا لشکر ایک ہزار کے لگ بھگ تھا۔ اور یہ لشکر بھی مسلح اور کیل کانٹے سے لیس۔ گویا کافروں کے پاس دنیاوی ساز و سامان سب کچھ تھا۔ اور مسلمانوں کے پاس کیا تھا؟ ؎

تھے انکے پاس دو گھوڑے چھ زرہیں آٹھ شمشیریں
پلٹنے آئے تھے یہ لوگ دنیا بھر کی تقدیریں
نہ تیغ و تیر پر تکیہ نہ خنجر پر نہ بھالے پر
بھروسہ تھا تو اک سادی سی کالی کملی والے پر

سبحان اللہ! ان پاک لوگوں کے پاس بس نام خدا و نام مصطفےٰ تھا۔ اور یہ لوگ میدان جہاد میں آئے تو آئے کس نشان سے؟ یہ بھی سنیئے! دنیا بھر کے جرنیلوں کو دیکھتے جایئے۔ کوئی جرنیل اپنی فوجوں کو شراب پلا کر لڑائے۔ کوئی جرنیل اپنی فوجوں کو چائے بسکٹ کھلا کر لڑائے۔ اور کوئی مکھن توس کھلا کر لڑائے۔ مگر آؤ کوئی بھی دکھاؤ۔ جس نے اپنی فوج سے روزہ رکھوا کر جنگ کروائی ہو۔ مسلمانو! یہ تین سو تیرہ مجاہدین جو میدان بدر میں تشریف لائے تھے۔ روزے سے تھے۔

آج ہم بھی ہیں کہ بجلی کے پنکھوں کے نیچے بھی روزہ نہیں۔ اور ایک وہ بھی تھے۔ کہ تپتے ہوئے میدانِ جہاد میں بھی روزہ تھا ؎

آہ! اسلام ترے چاہنے والے نہ رہے
جن کا تو چاند تھا افسوس وہ ہالے نہ رہے

میرے بھائیو! ایک ہزار مسلح لشکر کے مقابلہ میں یہ بظاہر نہتے تین سو تیرہ صاحبِ ایمان آئے۔ تو خدا نے ان کی کس طرح مدد فرمائی سنیئے! :

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ۔

(پ۴ ع ۲)اور بیشک اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب تم بالکل بے سروسامان تھے۔ تو اللہ سے ڈرو۔ کہیں تم شکر گزار و۔ جب اے محبوب تم مسلمانوں سے فرماتے تھے۔ کیا تمہیں یہ کافی نہیں۔ کہ تمہارا رب تمہاری مدد کرے۔ تین ہزار فرشتہ اتار کر۔ ہاں! کیوں نہیں اگر تم صبر و تقویٰ کرو۔ اور کافر اسی دم تم پر آ پڑیں۔ تو تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے نشان والے بھیجے گا۔"

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر کے دن فرشتے بھیج کر، جو مسلمانوں کی امداد غیبی فرمائی تھی۔ اس کا ذکر فرمایا ہے۔ کہ اے پیارے تم میدانِ بدر میں مسلمانوں کو جب تسلی دے رہے تھے۔ اور یہ کہہ رہے تھے کہ تم اپنی قلت اور بے سروسامانی، اور کفار کی کثرت اور اسبابِ حرب پر خیال کرکے ہراساں نہ ہو۔ کیا تم کو یہ کافی نہیں۔ کہ خدا تمہاری تین ہزار فرشتے بھیج کر مدد فرمائے۔ خدا فرماتا ہے۔ کیوں نہیں — اگر تم صبر و تقوےٰ اختیار کروگے اور کافر تم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ تو میں پانچ ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کروں گا۔

چنانچہ اس جنگ میں پانچہزار فرشتے نازل ہوئے۔ اور مسلمانوں کی مدد کرتے ہوئے کافروں سے لڑے۔ بخاری و مسلم شریف کی احادیث شریفہ میں آتا ہے۔ کہ بدر کے روز فرشتے گھوڑوں پر سوار ہوکر کافروں سے لڑتے رہے۔ اور انہوں نے سفید عمامے باندھے ہوئے تھے۔

جبریل امین کا گھوڑا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ مسلمان اس روز کافروں کا تعاقب کرتے تھے

اور کافر مسلمان کے سامنے بھاگتا جاتا تھا۔ اچانک اوپر سے کوڑے کی آواز آتی تھی۔ اور سوار کا یہ کلمہ سنا جاتا تھا۔

"اقدم حیزوم!" "یعنی آگے بڑھ اے حیزوم!"

حیزوم حضرت جبریل امین کے گھوڑے کا نام ہے۔ اور نظر آتا تھا۔ کہ کافر گر کر مر گیا۔ اور اس کی ناک تلوار سے اڑا دی گئی اور چہرہ زخمی ہو گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنے یہ معائنے سید عالم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے بیان کئے۔ تو آپ نے فرمایا۔ "یہ آسمان سوم کی مدد ہے۔" (تفسیر خزائن العرفان ص۲۵۶)

دیکھا آپ نے یہ ہے تفسیر وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ کی۔ کہ صاحب ایمان حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کی مدد کیلئے اللہ نے آسمان سے مدد نازل فرمائی۔ اور وہ بے سر و سامانی کے عالم میں بھی سربلندی و غلبہ حاصل فرما گئے۔ مگر آج ہم دنیاوی ساز و سامان کے ہوتے ہوئے بھی مظلوم ہیں، دنیائے کفر ہم پر پے در پے حملے کر رہی ہے۔ اور ہمارے حق غصب کر رہی ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ ہمارے ایمان کمزور ہو گئے ہیں۔

میرے بھائیو! اب بھی وقت ہے۔ ہوش میں آؤ۔ اٹھو۔ پھر وہی حرارتِ ایمان پیدا کرو۔ اور دنیا کو دکھا دو۔ کہ ہم مسلمان ہیں۔ صاحب ایمان ہیں۔ ؎

غیرت ہو تو گر کر بھی سنبھلنا نہیں مشکل
جرأت ہو تو نرغے سے نکلنا نہیں مشکل
ہمت ہو تو حالت کا بدلنا نہیں مشکل
انجن ہو تو گاڑی کا بھی چلنا نہیں مشکل
گرمی سے کرو پہلے بخارات مہیا!
پیدا ہو جو حرکت تو لگے گھومنے پہیا!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

نانواں وعظ

اتباعِ رسول

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ - وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ - وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ؕ

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ؕ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (پ ۳ ع)

"اے محبوب! تم فرما دو کہ لوگو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو۔ تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ۔ اللہ تمہیں دوست رکھیگا اور تمہارے گناہ بخش دیگا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

حضرات! آج میرے وعظ کا عنوان "اتباعِ رسول" ہے۔ مجھے بتانا ہے کہ خدا سے رشتہ محبت و دوستی بجز حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی غلامی کے کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ کوئی لاکھ جتن کرے۔ مگر حضور کے وسیلہ کے بغیر وہ خدا تک ہرگز ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔

قُلْ سب سے پہلے آیت مبارکہ کے پیارے انداز کو دیکھئے۔ اپنے محبوب کی غلامی کا حکم دینا یہ خدا کی مرضی اور اس کی منشا ہے۔ مگر وہ اپنی مرضی کو اپنے محبوب کی زبانِ حق ترجمان سے کہلواتا ہے اور فرماتا ہے قل! اے محبوب! تو فرما دے۔ گویا اے محبوب! بات میری اور زبان تیری۔ ؎

قلُ کہہ کے اپنی بات بھی منہ سے ترے سنی
اللہ کو ہے اتنی تری گفتگو پسند!

میرے دوستو! یہ حقیقت ہے۔ کہ زبانِ مصطفےٰ سے جو کچھ ارشاد ہوتا ہے۔ وہ در اصل خدا ہی کا ارشاد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ حضور اپنی خواہش سے کچھ فرماتے ہی نہیں۔ بلکہ

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰي۔ (پ۲۷ ع ۵)

وہ کوئی بات ہی خواہش سے نہیں کرتے۔ وہ تو نہیں۔ مگر وحی جو انہیں کی جاتی ہے۔

مسلمانو! اپنا ایمان رکھو کہ ارشادِ رسول ارشادِ خدا ہی ہے ؎

قولِ حق قرآن ہے قولِ پیمبر ہے حدیث
اہل دل کیواسطے تقریر ہے دونوں کی ایک
اس نے پھیرا دل تو اس نے دعوتِ اسلام دی!
وہ خدا اور یہ نبی تدبیر ہے دونوں کی ایک

ایک بھنگے کا قصہ حضرات! آجکل ایک فرقہ جسے منکر حدیث کہا جاتا ہے۔ نکل آیا ہے۔ جو حدیث کو معاذ اللہ قابلِ اتباع نہیں سمجھتا۔ اور بزعم خویش قرآن کا تابع ہے۔ حالانکہ جو حدیثِ رسول کا تابع نہیں۔ وہ قرآن کا بھی تابع نہیں۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ کے مطابق جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تابع ہے۔ وہ خدا کا تابع ہے۔ اور جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا توڑنے والا ہے۔

وہ خدا کے ہی فرمان کا توڑنے والا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ ایک بھینگا تھا بھینگا اُسے کہتے ہیں۔ جس کی نظر ٹیڑھی ہو اور جسے ایک کے دو نظر آتے ہوں۔ اس کے ماسٹر نے اس سے کہا۔ میرے گھر جاؤ اور طاق سے میرا آئینہ اٹھا کر لے آؤ۔ وہ بھینگا گیا۔ اور طاق میں آئینہ کو دیکھ کر واپس چلا آیا۔ اور ماسٹر سے کہنے لگا۔ ماسٹر جی! طاق میں آئینے دو رکھے ہیں۔ میں کونسا لاؤں۔ ماسٹر نے کہا۔ مگر دو کیسے ہوگئے۔ آئینہ تو ایک ہی ہے۔ بھینگے نے کہا۔ نہیں صاحب! آئینے دو ہیں۔ ماسٹر صاحب نے کہا۔ اچھا جاؤ۔ ایک آئینہ توڑ دو۔ اور دوسرا لے آؤ۔ چنانچہ وہ بھینگا گیا اور اس نے ایک آئینہ توڑ دیا۔ توڑنے کے بعد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ توڑا تو ایک آئینہ تھا۔ مگر دوسرا آئینہ اپنے آپ ہی کیسے ٹوٹ گیا! یہ منظر دیکھ کر پریشانی کے عالم میں واپس ہوا۔ اور ماسٹر صاحب سے کہنے لگا۔ ماسٹر صاحب کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ میں نے آئینہ تو ایک توڑا تھا۔ مگر دوسرا خود بخود ہی ٹوٹ گیا ہے۔ ماسٹر صاحب نے کہا۔ کمبخت بھینگے! آئینہ تو ایک ہی تھا۔ مگر تیرے بھینگے پن کی بدولت تجھے دو نظر آئے۔ اور تم نے دیکھ لیا۔ کہ تم نے بزعمِ خویش جس دوسرے آئینے کو توڑا۔ وہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ بلکہ وہی تھا۔ جو تجھے اپنے آپ ٹوٹتا ہوا نظر آیا۔

میرے بزرگو! اسی طرح حکمِ رسول در اصل حکمِ خدا ہی ہوتا ہے مگر ایمان کے بھینگوں کو ان میں تفریق نظر آتی ہے۔ اور یہ جو آج حدیث رسول کے منکر ہیں۔ انہیں کل پتہ چلے گا۔ جب انہیں حکمِ رسول توڑنے کی پاداش میں حکمِ خدا ہی ٹوٹا ہوا نظر آیا۔ خدا سے دعا کرو۔ کہ وہ ہمیں اس ایمان کے بھینگے پن سے بچائے۔ آمین!

شانِ نزول اس آیتِ کریمہ کا شانِ نزول مفسرینِ کرام نے یہ لکھا ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن اشرف اور اسکے متبعین کو دعوتِ ایمان دی۔ تو وہ کہنے لگے۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ۔ ہم اللہ کے بیٹے اور دوست ہیں"! اس موقعہ پر اللہ نے

یہ آیت اتاری۔ کہ ان سے کہہ دیجئے۔ اگر اللہ کے دوست بننا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کرو۔ ورنہ خدا کی دوستی محال اور جنون ہے۔ (روح البیان صفحہ ۳۱۹)

اور پھر فرمایا۔ کہ اب تو تم یہ چاہتے ہو کہ تم اللہ کے دوست بن جاؤ مگر جب تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بن جاؤ گے۔ تو یُحْبِبْکُمُ اللّٰہ اللہ تمہیں اپنا دوست بنا لیگا۔ سبحان اللہ! کیا شان ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کی کہ جو اس محبوب کا ہو جائے۔ خدا اسے بھی اپنا محبوب بنا لیتا ہے؛

محبوب کے انداز

بات یہ ہے کہ پیار تو اللہ کو اپنے محبوب ہی سے ہے مگر جو شخص اللہ کے محبوب کی غلامی اختیار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وصورت کی نقل اتاریگا، تو محبوب کے انداز جہاں بھی محب کو نظر آئیں گے۔ محب کی محبت وہاں جلوہ گر ہو جائیگی۔

حضور سے اللہ کو اگر پیار ہے تو اس لیئے کہ حضور حضور ہیں۔ اور حضور کے غلاموں سے اگر اللہ کو پیار ہے تو اس لیئے کہ وہ حضور کے غلام ہیں۔ بات ختم حضور ہی پر ہوتی ہے۔ خدا کا دوست اور محبوب بننے کیلئے حضور کی غلامی ضروری ہے۔ ہر وہ چیز جسے حضور سے تھوڑی بہت نسبت حاصل ہو جائے گی۔ وہ اللہ کی محبوب بن جائیگی۔ دیکھیئے دنیا میں بڑے بڑے خوبصورت شہر موجود ہیں۔ ان شہروں کا قرآن میں کہیں نام نہیں لیا گیا۔ مگر ایک شہر ایسا بھی ہے۔ جس کا قرآن مجید میں نام لیا گیا ہے۔ بلکہ اس شہر کی قسم فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ۔ وَ اَنْتَ حِلٌّ بِھٰذَا الْبَلَدِ۔ (پ ۳۰ ع ۱۵)

مجھے اس شہر کی قسم کہ اے محبوب! تم اس شہر میں تشریف فرما ہو! جانتے ہیں آپ یہ کونسے شہر کی قسم فرمائی گئی ہے؟ یہ شہر مکہ معظمہ ہے۔ خدا نے اس شہر کی قسم فرمائی اور اس لئے نہیں کہ اس شہر میں بیت اللہ ہے۔ یا اس شہر میں صفا مروہ ہے۔ یا اس شہر میں حجر اسود

ہے۔ بلکہ اس لئے کہ :-

وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو۔

دیکھا آپ نے ! جس شہر کی گلیوں میں محبوب چلتا پھرتا نظر آیا وہ شہر بھی محبوب بن گیا۔ اور اس کی قسم فرمائی جانے لگی۔

محبوب کے رخ تاباں اور زلفوں کی قسم

اور سنئے ! خدا فرماتا ہے :- وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى (پ ۳۰ ع ۱)

چاشت کی قسم ! اور رات کی جب پردہ ڈالے۔

علامہ اسمٰعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ روح البیان میں فرماتے ہیں :-

اشارت است بروشنی روئے حضرت مصطفٰے علیہ السلام و کنایت است از سیاہی موئے وے۔ (روح البیان ص ۶۶۲ ج ۴)

یعنی والضحٰی سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کی روشنی مراد ہے۔ اور "واللیل" سے حضور کی زلف معنبر کی سیاہی مراد ہے۔"

گویا اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کے چہرۂ انور اور محبوب کی زلفوں کی قسم فرما رہا ہے۔ کیونکہ محبوب کا چہرۂ انور اور محبوب کی زلفیں بھی اللہ کو محبوب ہیں۔

محبوب کے زماں کی قسم

اور سنئے ! خدا فرماتا ہے :- وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ۔ (پ ۳۰ ع ۲۸)

"اس زمانۂ محبوب کی قسم۔ بیشک آدمی ضرور نقصان میں ہے۔"

دیکھئے ! یہاں محبوب کے زمانہ کی قسم فرمائی گئی ہے۔ گویا محبوب کا زمانہ بھی اللہ کو محبوب ہے۔

محبوب کی زبان کی قسم

اور سنئے ! خدا فرماتا ہے :- وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ۔ (پ ۲۵ ع ۱۳) مجھے رسول کے اس کہنے کی قسم کہ اے میرے رب یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

دیکھیئے! یہاں محبوب کے قول و ارشاد کی قسم فرمائی گئی ہے۔ گویا اللہ کو محبوب کی زبان بھی محبوب ہے۔

محبوب کی جان کی قسم

اور سنیئے! خدا فرماتا ہے:۔ لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ۔ (پ۱۴ ع ۵) —

اے محبوب! تمہاری جان کی قسم۔ بیشک وہ اپنے نشہ میں بھٹک رہے ہیں۔ دیکھیئے! یہاں محبوب کی جان کی قسم فرمائی گئی ہے۔ اعلیحضرت فرماتے ہیں ؎

ہے کلامِ الٰہی میں شمس و ضحیٰ ترے چہرۂ نور فزا کی قسم
قسمِ شب تار میں راز یہ تھا کہ حبیب کی زلفِ دوتا کی قسم
وہ خدا نے مرتبہ تجھ کو دیا نہ کسی کو ملے نہ کسی کو ملا
کہ کلام مجید نے کھائی شہا ترے شہر و کلام و بقا کی قسم
ترا مسندِ ناز ہے عرش بریں ترا محرم راز ہے روح امیں
تو ہی سرور ہر دو جہاں ہے شہا ترا مثل نہیں ہے خدا کی قسم

اتباع

میرے بزرگو! آیت مذکورہ میں اللہ نے حضور سے فَاتَّبِعُونِي کہلوایا ہے۔ کہ میری اتباع کرو۔ یاد رکھیئے۔ ایک ہے "اطاعت" اور ایک ہے "اتباع" ان دونوں لفظوں میں کچھ فرق ہے۔ اطاعت کا معنی ہے۔ فرماں برداری اور اتباع کا معنی فرمانبرداری کے علاوہ قدم بقدم چلنا کے بھی ہیں۔ یعنی اتباع عام ہے۔ اور اطاعت خاص۔ اطاعت میں تو محبوب کے حکم و فرمان کی انتظار رہتی ہے۔ مگر اتباع کا یہ معنی ہے کہ حکم و ارشاد کی تعمیل کے علاوہ محبوب کے حکم و ارشاد کے بغیر بھی محبوب کی ہر مرضی کو اپنا لیا جائے۔ محبوب کا حکم نہ بھی ہو۔ تو بھی اس کی سیرت کو اختیار کر لیا جائے۔ میرے دوستو! اسی کا نام ہے مکمل غلامی۔

غلامی کی مثال

مثلاً ہمارے ملک میں انگریز رہے۔ تو ان کی غلامی میں جب انہیں انگریزی بال کٹواتے۔ ٹیڑھی مانگ نکالتے۔ اور داڑھی منڈواتے دیکھا۔ تو غلاموں نے بھی یہ سب حرکتیں اپنا لیں۔ حالانکہ انگریزوں کا یہ کوئی حکم نہیں تھا

کہ ایسا ضرور کرو۔ مگر غلامی کا تقاضا یہ تھا۔ کہ حاکم جس رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اسی رنگ میں اپنے آپ کو بھی رنگ لو۔

اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ جنٹلمینو! خدا کا شکر ادا کرو۔ کہ پچھلی جنگ میں جاپان یہاں نہیں آگھسا۔ ورنہ اگر وہ آجاتا تو پھر ہر فیشن ایبل جنٹلمین کو داڑھی منڈوانے کے ساتھ ساتھ اپنی ناک بھی چپٹی کرانا پڑتی اور ہر نائی کو استرے کے ساتھ ساتھ، ایک عدد ہتھوڑا بھی رکھنا پڑتا۔ اس لئے کہ جاپانیوں کی ناک چپٹی ہوتی ہے۔ تو اُن کے آجانے سے پھر ناک کا چپٹا ہونا بھی فیشن میں داخل ہو جاتا۔

اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ

میرے بھائیو! حاکم وقت کی بود و باش، اور اس کی سیرت و صورت کا رعایا پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ خاندان بنی امیہ میں ولید بن عبدالملک اور سلیمان بن عبدالملک اور حضرت عمرو بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نمایاں شخصیتیں ہیں۔ ان تینوں کے عادات و اطوار مختلف تھے۔ اور ان کے اپنے اپنے عہد میں جو جو کچھ ان کی اپنی طرز زندگی تھی۔ اُسی کا اثر رعایا پر بھی پڑتا رہا۔ چنانچہ ولید کے متعلق روایت ہے کہ:۔

كَانَ صَاحِبَ بِنَاءٍ وَاتِّخَاذٍ لِّلْمَصَانِعِ وَالضِّيَاعِ وَكَانَ النَّاسُ يَلْتَقُوْنَ فِيْ زَمَانِهٖ فَاِنَّمَا يَسْئَلُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا عَنِ الْبِنَاءِ وَالْمَصَانِعِ ــــ

یعنی ولید عمارتیں۔ تالاب۔ زرخیز زمینیں بنانے اور تیار کرنے والا تھا۔ اس کے زمانہ میں لوگ، جب آپس میں ملتے۔ تو ایک دوسرے سے آبادیوں اور تالابوں، حوضوں وغیرہ کی تعمیر کے بارے میں پوچھ لیا کرتے تھے۔

اور سلیمان بن عبدالملک کے متعلق روایتاً ہے۔

كَانَ صَاحِبَ نِكَاحٍ وَطَعَامٍ فَكَانَ النَّاسُ يَسْئَلُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا عَلَى التَّزْوِيْجِ وَالْجَوَارِيْ ــــ سلیمان کھانے پینے اور نکاح کا شوقین تھا۔ تو لوگ بھی اس کے عہد میں ایک دوسرے سے مل کر نکاح

اور لونڈیوں کی باتیں پوچھتے "

اور حضرت عمرو بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق راویوں کا بیان ہے۔

فَلَمَّا وَلِيَ عُمَرُ بنُ عبدِ العزيزِ كانوا يَلْتَقُونَ فَيَقُولُ الرَّجُلُ لِلرَّجُلِ مَا وِرْدُكَ اللَّيْلَةَ وَ كَمْ تَحْفَظُ مِنَ الْقُرْآنِ وَ مَتٰى تَخْتِمُ وَمَا تَصُومُ مِنَ الشَّهْرِ (طبری) لیکن جب حضرت عمرو بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ (جو ایک ولی کامل حاکم تھے) خلیفہ مقرر ہوئے۔ تو ہر شخص ایک دوسرے سے مل کر یہی پوچھتا۔ کہ رات کو پڑھنے کا تیرا کون سا وظیفہ ہے۔ تجھے قرآن مجید کتنا یاد ہے۔ تو کب ختم کرے گا۔ اور تو مہینہ میں کتنے روزے رکھتا ہے۔"

دیکھا آپ نے۔ شاہانہ اقتدار جس طرز و طریق پر اپنی زندگی کی تشکیل کرتا ہو انہی بنیادوں پر رعایا کی معاشرت و تمدن کی دیواریں بھی اٹھتی ہیں۔ آج سینما۔ تھیٹر۔ لاٹری۔ بیمہ۔ بنک۔ تصویر کشی۔ سگ پروری نیم عریانی۔ بے پردگی۔ راگ گانا رقص و سرود وغیرہ جاہلی تہذیبیں انگریزوں کو مرغوب ہیں۔ اس لئے عوام نے بھی ان اشیاء کو اپنا لیا ہے۔ بلکہ معاذ اللہ بعض لوگ اب تو راگ و گانے اور رقص و سرود کو اسلامی فن اور دینی کارنامہ ثابت کرنے لگے ہیں۔ اور اس رقص و سرود کی باقاعدہ تعلیم اپنی لڑکیوں کو بھی دینے لگے ہیں۔ کسی زمانہ میں لڑکی کا باحیا ہونا۔ دینی مسائل اور گھر کے کام کاج سے واقف ہونا۔ سینا پرونا۔ جاننا۔ نمازی و پابند شرع ہونا۔ مرغوب و پسندیدہ تھا۔ مگر اب سب سے پہلے لڑکی کا بے حجاب ہونا اور ناچنے گانے میں مشاق ہونا دیکھا جاتا ہے۔ میں نے ایک نظم میں لکھا ہے:۔ ؎

سرخ تلوے، سرخ ناخن، سرخ لب
ڈبجرس ہی ڈبجرس ہیں عضو سب
ہو نہ ہو سینے پرونے کی تمیز

ناچنے گانے کا ہو لڑکی کو ڈھب

میرے بزرگو! اس کا نام ہے غلامی کہ حاکم کے بود و باش، اس کی تہذیب و معاشرت کو بغیر اس کے حکم کے بھی اپنا لیا جائے۔

بلاچون وچرا تعمیل حکم

غلامی کا ایک اقتضا اور بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حاکم کا حکم بلا چون و چرا تسلیم کیا جائے۔ اور یہ نہ کہا جائے۔ کہ ایسا ہم کیوں کریں۔ مثلاً ہماری حکومت نے گھڑیوں کا ایک گھنٹہ ٹائم پیچھے کر لینے کا حکم دیا تھا۔ تو سب نے اپنی اپنی گھڑیوں کا ایک ایک گھنٹہ ٹائم پیچھے کر لیا تھا۔ اور یہ کسی نے نہیں کہا تھا۔ کہ ہم ایسا کیوں کریں۔ اور اس کا فلسفہ کیا ہے؟ پھر جب حکومت نے نصف گھنٹہ آگے کر لینے کا حکم دیا۔ تو سب نے ایک دم نصف گھنٹہ ٹائم آگے کر لیا۔ اور "کیوں" پھر بھی کسی نے نہیں کہا۔ اور آج یقیناً اس بات کی حکمت، اور فلسفہ بغیر حکومت کے کسی دوسرے کے علم میں نہیں۔ لیکن ٹائم سب نے آگے کر رکھا ہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ حکم رسول پا کر آج کل کے آزاد خیال افراد کیوں کیوں کرنے لگتے ہیں۔ کہ ہم ایسا کیوں کریں نماز کیوں پڑھیں۔ اس کا فلسفہ کیا ہے۔ روزہ کیوں رکھیں۔ اس کی حکمت کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ اتباع رسول کا تقاضا یہ ہے۔ کہ جو حکم سرکار ہو بلا چون و چرا اُسے تسلیم کر لیا جائے۔ اور بقول شاعر نقشہ یہ ہو ؎

مصور دیکھنا تصویر میری یوں بنائی ہو
اُدھر حکم محمد ہو۔ اِدھر گردن جھکائی ہو

اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ حضور ہی کی غلامی میں گزرے۔ کوئی قدم ان کی سیرت مطہرہ کے خلاف نہ اٹھے۔ کوئی حرکت ان کی مرضی کے مخالف نہ ہونے پائے، ان کی ہر ادا ہمیں محبوب ہو۔ ان کی ہر مرضی ہمیں مرغوب ہو۔ مولانا رومی فرماتے ہیں۔ ؎

درہمہ اقوال و افعال اے فتیٰ!
قبلۂ خود ساز خلق مصطفےٰ

ملحدانہ دور

میرے بزرگو! آپ نے سنا کہ انگریز کی غلامی کا یہ عالم ہے کہ اس نے داڑھی منڈائی۔ تو غلاموں نے بھی منڈا ڈالی۔ اس نے ٹیڑھی مانگ نکالی۔ تو غلاموں نے بھی نکال لی۔ اس نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ تو غلاموں نے بھی کھڑے ہو کر پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ اسی طرح جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوگا۔ وہ بھی حضور کی ہر ادا اپنائے گا۔ حضور کے رخ انور پر ریش انور دیکھے گا۔ تو داڑھی رکھے گا۔ حضور کی سر انور پر سیدھی مانگ شریف دیکھے گا۔ تو سیدھی مانگ نکالے گا۔ اسی طرح جو جو ادا سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دیکھیگا۔ اُسے پسند کریگا۔ مگر آہ! یہ ملحدانہ دور ایسا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنتوں پر مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یہ داڑھی پر پھبتیاں، عمامے پر مذاق۔ مسواک پر آوازے کسنے۔ یہ ملحدانہ باتیں۔ آجکل عام ہیں۔ خوب یاد رکھیئے۔ داڑھی کا نہ رکھنا گناہ ہے۔ مگر کفر نہیں۔ لیکن داڑھی پر مذاق اور پھبتیاں اڑانا یہ کفر ہے۔ کہ ادائے محبوب کا مذاق اڑایا گیا۔ افسوس اُن ملحدین پر جو انگریز کے تو اندھے مقلد اور سراپا غلام ہیں۔ لیکن جن کی غلامی کا خالق کائنات حکم دیتا ہے۔ ان کی غلامی سے باہر ہیں۔ اور نام رکھا ہے اس کا آزادی۔ حالانکہ جو حضور کا غلام نہیں وہ برائے نام آزاد ہو تو ہو۔ ورنہ وہ آزاد کب ہے؟ رسم و رواج کا وہ غلام اپنے نفس کا وہ غلام۔ شیطان کا وہ غلام۔ افسروں کا وہ غلام۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کا وہ غلام ـــــ ایک سرور عالم کی غلامی اختیار کر لیتا۔ تو ان سب غلامیوں سے نجات مل جاتی کہ ـــــ ع

محمد کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی

خدا کی گرفت

میرے بھائیو! حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی سے کنارہ کش ہو کر یہ جس کا نام لوگوں نے آزادی رکھ چھوڑا ہے۔ یہ آزادی ہرگز نہیں۔ بلکہ غور کیا جائے

تو اخروی ہولناک عذاب کے علاوہ اس دنیا میں بھی یہ لوگ خدا کی گرفت میں ہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ ادا فرمانے کا ارشاد فرمایا سَو میں سے اڑھائی دینے کا حکم دیا۔ لوگوں نے یہ حکم نہ مانا۔ تو اس کی اخروی سزا تو ملے گی۔ لیکن اس دنیا میں بھی یہ سزا ملی۔ کہ سینکڑوں ٹیکس پیچھے پڑ گئے۔ ہاؤس ٹیکس۔ انکم ٹیکس۔ واٹر ٹیکس۔ یہ ٹیکس اور وہ ٹیکس۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ یہ حکم نہ مانا۔ کہ کون پانچ وقت مسجد میں جائے۔ بوٹ اور جرابیں اتارے وضو کرے۔ اور نماز پڑھے۔ حکم رسول کی ان پابندیوں سے بھاگا۔ تو سینکڑوں پابندیاں پیچھے پڑ گئیں۔ صاحب استطاعت لوگوں کو عمر بھر میں ایک بار حج کا حکم رسول ملا۔ تو اس کی پرواہ نہ کی گئی۔ تو یہ سزا ملی کہ اچھا تو پھر ہزاروں کا خرچ کرکے ولایت جاؤ۔ اور وہاں کچھ عرصہ رہ کر اپنا دین و دنیا برباد کرکے آؤ۔ اور جو زیادہ سزا دینا منظور ہوتی۔ تو وہاں سے ایک میم صاحبہ کو بھی ساتھ کر دیا گیا۔ جس نے یہاں پہنچ کر اپنے دلا بینی ناز و انداز سے مسٹر کا کچومر نکال کے رکھ دیا۔ حج کے دوران صفا مروہ کی دوڑ سے یہ لوگ بھاگے۔ کہ کون وہاں جائے۔ اور دوڑتا پھرے۔ تو سزا یہ ملی۔ کہ اچھا تو پھر یہیں فٹ بال کھیلتے دوڑو۔ پولو کھیلتے دوڑو۔ ہاکی کھیلتے دوڑو۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ بس دوڑتے ہی رہو۔

میرے بھائیو! سچ پوچھو! تو یہ آزادی برائے نام آزادی ہے۔ ہے خدا کی گرفت۔ مگر یار لوگ اسے آزادی سمجھ بیٹھے ہیں۔

لطیفہ ایک کابلی کا قصہ مشہور ہے۔ کہ وہ کابل سے ہندستان آیا۔ تو ایک حلوائی کو دیکھا۔ جو تازہ حلوا بنا کر بیچنے کو سامنے رکھ اپنی دکان پر بیٹھا تھا۔ کابلی نے اُسے دیکھا۔ جو تازہ حلوا بنا کر بیچنے کو سامنے رکھ کر اپنی دکان پر بیٹھا تھا۔ کابلی نے اُسے دیکھا تو اپنی چھڑی اس کی آنکھوں کے قریب لاکر ہلانے لگا۔ حلوائی نے پوچھا۔

خان! یہ کیا کرتے ہو۔ کابلی بولا۔ خو! میں دیکھتا ہوں۔ کہ تم اندھا تو نہیں ہے۔ حلوائی بولا۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ کابلی نے کہا۔ اگر اندھے نہیں ہو تو اتنا حلوہ سامنے رکھا ہے۔ اسے کھاتے کیوں نہیں؟ حلوائی بولا۔ خان! یہ حلوہ میں کھا لوں تو اجڑ جاؤں؟ خان نے کہا اچھا اگر یہ حلوہ کھانے سے آدمی اجڑتا ہے۔ تو لو ہم اجڑتا ہے۔ یہ کہا اور وہ سارا حلوہ کابلی نے کھا لیا۔ حلوائی نے پیسے مانگے۔ تو کابلی بولا۔ پیسہ ویسہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ حلوائی اسے پکڑ کر عدالت میں لے گیا۔ قاضی نے فیصلہ کیا کہ کابلی کو گدھے پر بٹھا کر شہر میں پھراؤ۔ اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی ایک فوج اس کے پیچھے کردو۔ جو ڈھول بجاتے ہوئے اسکے پیچھے پیچھے چلیں چنانچہ اس کابلی کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔ گدھے پر بٹھایا۔ اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی فوج کو پیچھے کر دیا گیا۔ جو ڈھول بجا بجا کر اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ اور کابلی کو سارے شہر میں پھرایا۔ کابلی صاحب اپنے وطن پہنچے۔ تو لوگوں نے پوچھا:-

"ملک ہند چگونہ ملک است؟" ہندوستان کیسا ملک ہے؟

—— تو بولے!

"خوب است۔ حلوہ خوردن مفت است۔ سواری خر مفت است

فوجِ طفلاں مفت است۔ نیز ڈم ڈم مفت است"

—— یعنے بڑا اچھا ملک ہے۔ وہاں حلوہ مفت ملتا ہے گدھے

کی سواری مفت ملتی ہے۔ بچوں کی فوج مفت اور ڈھول

بھی مفت ملتا ہے۔"

گویا خان صاحب نے اپنی اس سزا کو اپنا جلوس سمجھ لیا۔ تھی تو اس کو سزا۔ مگر اس نے سمجھ یہ لیا کہ یہ میرا جلوس نکالا گیا ہے۔

میرے بھائیو! کچھ اسی قسم کا معاملہ یہاں بھی ہے۔ کہ یہ باغیانِ رسول ہیں تو خدا کی گرفت ہیں۔ لیکن نام انہوں نے اسکا آزادی رکھ چھوڑا ہے۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

میرے بھائیو! آؤ صحابہ کرام علیہم الرضوان کی مبارک ہسٹریاں پڑھو۔ وہ لوگ آزادی کا مزہ چکھ گئے۔ قیصر و کسریٰ پر اپنا رعب جما گئے۔ بلکہ حیوانات کو بھی اپنا مطیع و فرمانبردار بناکر دکھا گئے۔ آب و باد۔ خاک و آتش پر حکومتیں کر گئے۔ شاعر لکھتا ہے ؎

وہ مسلمان کہاں اگلے زمانے والے!

گردنیں قیصر و کسریٰ کی جھکانے والے!

فاروق اعظم اور روم کا ایلچی

مسلمانو! حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ سنو! اس واقعہ کو حضرت مولانا رومی علیہ الرحمتہ نے مثنوی شریف میں بھی لکھا ہے۔ اور میں آپ کو مثنوی شریف کے اشعار، کے اردو منظوم ترجمہ میں یہ واقعہ سناتا ہوں۔

شاہ روم نے ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنا ایک ایلچی بھیجا۔ وہ ایلچی جب مدینہ منورہ پہنچا۔ تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے محل کا پوچھنے لگا۔ اس نے سمجھا۔ کہ جیسے ہمارے بادشاہ بڑے بڑے محلوں میں رہتے ہیں۔ فاروق اعظم بھی جن کے نام سے بھی ہمارے بادشاہ کانپتے ہیں۔ کسی بہت بڑے محل میں اور بہت بڑے سنگین پہرے میں رہتے ہوں گے۔ چنانچہ وہ مسلمانوں سے حضرت فاروق اعظم کا محل پوچھتا رہا۔ اور ؎

لوگ جب سنتے تھے اس کا یہ کلام
ہنس کے کہتے تھے کہ اے فرخندہ خام
صبر و شکر اس کے ہیں دو حصنِ حصین
قصر کی اس شیر کو حاجت نہیں
ہے امیر المومنین گرچہ عمرؓ!
پر نہیں رکھتا غریبوں سا بھی گھر

اس ایلچی نے جب یہ جواب سنا تو بڑا حیران ہوا۔ کہ یہ عجیب قسم کی حکومت ہے۔ کہ اتنا بڑا با رعب جلالت مآب مسلمانوں کا بادشاہ۔ مگر

نہ کوئی محل اور نہ کوئی پہرہ ہے

ہے تعجب فاتحِ ملک شہاں
جان روشن کی طرح ہو یوں نہاں

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اس سادگی کا ذکر سن کر اسکا شوقِ جستجو بڑھا اور ہر ایک سے پوچھنے لگا۔ کہ فاروق اعظم کہاں ملیں گے۔

آخر اِک بڑھیا یہ بولی دیکھ کر
نخلِ خرما کے تلے ہے وہ عمر!
ظلِّ حق سایہ میں ہے سویا ہوا
یہ عمر ہے جس کا تو جویا ہوا

بڑھیا کی نشان دہی سے وہ ایلچی کھجور کے درخت کی طرف بڑھا کیا دیکھتا ہے کہ اللہ کا شیر، مسلمانوں کا امیر، وہ جس کے رعب و دبدبہ سے دنیائے کفر لرزہ براندام ہے۔ بغیر کسی تکلف کے اکیلا اپنے ہاتھ کا تکیہ بنائے سو رہا ہے۔ ؎

ڈیل میں تھا ایلچی گو پیل تن
لیکن اس کا کانپ اٹھا تن بدن

سُبحان اللہ! سوئے ہوئے اللہ کے شیر کا یہ رعب کہ روم کا ایلچی آپ کو نیند کے عالم میں بھی دیکھ کر کانپ اٹھا اور ؎

دل میں کہتا تھا، الٰہی کیا ہوا
قیصر و کسریٰ کو دیکھا بارہا
جنگ میں بھی زخم کھائے سینکڑوں
دشمنوں کے سر اڑائے سینکڑوں
میں نے مارے بیسیوں شیر و پلنگ
پر کبھی بدلا نہ اس چہرے کا رنگ
کانپتا ہے اب تو میرا جوڑ جوڑ
آ کے یاں نکلی ہے اب ساری مروڑ

مسلمانو! پھر اس روم کے ایلچی کے منہ سے بے ساختہ نکلا ؎

آسمانی رعب ہے اس شخص کا
ہے خدائی بھید گدڑی میں چھپا

دیکھا آپ نے! یہ تھے آزاد مسلمان کہ آزادی سے سو رہے ہیں۔ اور کفر اس سوئے ہوئے بھی اللہ کے شیر کو دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے۔

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ اور ایک جنگل کا شیر

میرے بزرگو! ان لوگوں کا رعب اور دبدبہ نہ صرف یہ کہ انسانوں پر تھا۔ بلکہ جنگلی درندوں پر بھی ان کا رعب تھا۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف کی حدیث ہے:۔

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سرزمین روم میں اپنے لشکر سے الگ ہوکر راستہ بھول گئے۔ آپ اپنے لشکر کی تلاش میں تھے۔ کہ راستے میں ایک خطرناک شیر مل گیا۔ اس مشکل کے وقت آپ بالکل نہیں گھبرائے اور اس شیر کو مخاطب فرماکر یوں فرمایا۔

یَا اَبَا الْحَارِثِ اَنَا مَوْلٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ۔ "اے ابا الحارث خبردار! میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں"

حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ سن کر شیر نے کتے کی طرح دم ہلانا شروع کی۔ اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کی رہنمائی کرتا ہوا ساتھ چل دیا۔ اور آپ کو لشکر میں ملا کر واپس چلا آیا۔ (دیکھیے مشکوٰۃ شریف ص۵۳۷)

ایک پنجابی شاعر نے اس موقعہ پر لکھا ہے۔ کہ شیر نے جب یہ سنا۔ کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہے تو گویا وہ یوں کہنے لگا ؎

شیر کہیا سفینے تائیں سن راہی راہ جاندے
جو غلام رسول اللہ دے اسی غلام اُنہاندے

صحابہ کرام کا اتباع رسول

حضرات! صحابہ کرام علیہم الرضوان کی ساری زندگیاں اتباعِ رسول میں گزریں۔ اور انھوں نے حضور کا اتباع کرکے دکھایا۔ اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ مگر اتباع رسول

کو نہ چھوڑا۔ حضور نے انہیں جدھر سے روکا وہ رُک گئے۔ جدھر جھکایا جھک گئے۔ فتح مکہ کی لڑائی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ارشاد فرمایا۔ کہ جو مشرک سامنے آئے۔ اسے قتل کر دو۔ اگرچہ وہ تمہارا اپنا عزیز ہی کیوں نہ ہو۔ تو ان متبعینِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کر دکھایا۔ اور اپنے بیگانے میں کوئی فرق نہ رکھا۔ اگر سامنے باپ آگیا۔ تو اسے نہ چھوڑا۔ بیٹا آگیا۔ تو اسے معاف نہ کیا۔ بھائی آیا تو اُسے نہ چھوڑا۔ یہی وہ اتباعِ رسول تھا۔ جس کی بدولت وہ يُحْبِبْكُمُ اللهُ کے مصداق بن کر اللہ کے محبوب بن گئے۔ اور ساری دنیا ان کے قدموں پر گر گئی۔

کدّو سے پیار

میں نے آپ کو بتایا ہے۔ کہ اتباع کے معنی میں قدم بہ قدم چلنا بھی ماخوذ ہے۔ محبوب کے حکم و ارشاد کے بغیر بھی محبوب کی مرغوب چیز سے رغبت رکھنا اور اسے اپنانا یہ اتباع ہے۔ چنانچہ اس کی مثال بھی صحابہ کرام میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں ایک دعوت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گیا۔ صاحبِ خانہ نے کدو پکا رکھا تھا۔ میں نے دیکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کدو کو بڑے شوق و رغبت سے تناول فرما رہے ہیں۔ حضرت انس فرماتے ہیں۔ حضور کی اس رغبت کو دیکھ کر ——

فَلَمْ اَزَلْ اُحِبُّ الدُّبَّاءَ بَعْدَ يَوْمَئِذٍ۔ (مشکوٰۃ ص ۳۵۶)

"اس دن سے میں بھی کدو سے محبت رکھنے لگا۔"

دیکھیے حضور نے حکم نہیں دیا۔ کہ اے انس تو بھی کدو کھایا کر۔ اور اس سے ہمیشہ محبت رکھنا۔ مگر یہ اتباعِ رسول تھا۔ کہ محبوب کو کدو کی طرف رغبت فرماتے دیکھا۔ تو اس مبارک عادت کو خود بخود ہی اپنا لیا۔ میرے بھائیو! خوب یاد رکھو۔ خدا کی محبت و دوستی حاصل کرنے کیلئے یہی اتباعِ رسول درکار ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ادا و سیرتِ مبارکہ کو اپنا لیا جائے۔ اور آپ کے ہر حکم و ارشاد کی تعمیل کی جائے۔ حضور کے اتباع و اطاعت کے بغیر خدا کا پانا ناممکن ہے۔

مسلمانو! یہ تو بھلا صحابہ کرام کی باتیں تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی و اطاعت نباتات و حیوانات اور جمادات نے بھی کر کے دکھائی۔

درختوں کی اطاعت

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔ اگر آپ نبی ہیں۔ تو کوئی معجزہ دکھایئے۔ حضور نے فرمایا۔ اچھا وہ درخت جو سامنے کھڑا ہے۔ اُسے میرا پیغام دو اور اتنا کہہ دو۔ رَسُوْلُ اللّٰہِ یَدْعُوْکَ۔ "تجھے اللہ کا رسول بلاتا ہے۔" وہ اعرابی گیا۔ اور اس نے درخت سے یہ جملہ کہہ دیا۔ دوستو! حدیث میں آتا ہے۔ اُس درخت نے یہ حکم پاتے ہی اپنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے گر کر اپنی جڑیں زمین سے اکھیڑیں۔ اور پھر جڑوں کو گھسیٹتا ہوا چلتے چلتے، حضور کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اور عرض کرنے لگا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔ اعرابی یہ منظر دیکھ کر کہنے لگا۔ اچھا اب اسے کہیئے۔ یہ پھر اپنی جگہ پر چلا جائے۔ اور اسی طرح زمین میں گڑ کر کھڑا ہو جائے۔ چنانچہ حضور نے اس درخت کو حکم دیا۔ تو وہ چلتا ہوا پھر اپنی جگہ پر جاکر کھڑا ہو گیا۔ اعرابی یہ معجزہ دیکھ کر فوراً مسلمان ہو گیا۔ (حجۃ اللہ علی العالمین ص۴۲۱)

مسلمانو! سوچو تو ایک درخت تو حضور کے اشارے پر آ بھی جائے۔ اور چلا بھی جائے۔ مگر ایک وہ برائے نام انسان جو حضور کے حکم پر نہ مسجد میں آتا ہے۔ اور نہ حضور کے روکنے پر منہیات سے رکتا ہے۔ بھلا ایسا انسان بھی انسان کہلانے کے لائق ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایسے شخص کے لئے تو قرآن پاک کا یہ ارشاد ہے۔

وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ — (پ۹ ع۱۱)

اور بے شک ہم نے جہنم کے لئے پیدا کئے ہیں۔ بہت جن اور

آدمی وہ دل رکھتے ہیں جن میں سمجھ نہیں۔ اور وہ آنکھیں جن سے دیکھتے نہیں۔ اور وہ کان جن سے سنتے نہیں۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بڑھ کر گمراہ۔ وہی غفلت میں پڑے ہیں"

بھائیو! آنکھیں کھولو۔ اور خدا کا ارشاد دیکھو۔ کان کھولو اور اس کا ارشاد سنو! اور اس غفلت کی زندگی کو ترک کرو۔ یاد رکھو۔ آج اگر آنکھیں بند رکھیں۔ تو کل پھر یہ سننا پڑے گا۔

لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ۔ (پ۲۶ ع۱۶) بیشک تو اس سے غفلت میں تھا۔ تو ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھایا۔ تو آج تیری نگاہ تیز ہے"

اور یاد رکھو کل قیامت کے دن خداوند کریم نے ایک ایک بات کا سوال فرمانا ہے۔ اور ہمیں جواب دینا پڑے گا۔ یہ کان اللہ نے دیئے ہیں۔ قرآن و حدیث شرعی احکام اور نیک باتیں سننے کے لئے یہ آنکھیں ہمیں دی ہیں۔ نیک اور جائز چیزیں دیکھنے کے لیئے۔ یہ عمر ہمیں دی ہے۔ تاکہ ہم اللہ و رسول کی رضا حاصل کریں۔ مولانا رومی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:۔

حق چو فرماید چہ آوردی مرا
اندریں مہلت کہ من دادم ترا
عمر خود را در چہ پایاں بردۂ
قوت و قوت درچہ فانی کردۂ
گوہر دیدہ کجا فرسودۂ
پنج حس را در کجا پالودۂ

یعنے اللہ تعالیٰ کل قیامت کو پوچھے گا۔ کہ اے بندے! میں نے جو تجھے اتنی مہلت دی۔ تو اس مہلت میں تم میرے لیئے کیا لائے ہو؟ اور بتاؤ کہ تم نے اپنی عمر کس شغل میں بسر کی اور اپنا زور و

زر کس بات میں لگایا۔ اور یہ آنکھوں کا موتی اور اسی طرح اپنی پنج حس کو کہاں صرف کیا؟

بھائیو! سوچو! کہ ہم ان باتوں کا ہم کیا جواب دیں گے۔

غیر شرعی رسمیں

میرے عزیزو! آج ہم میں کئی ایک ایسی رسمیں موجود ہیں۔ جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے۔ مگر افسوس! کہ ہم مسلمانی کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی ان کو نہیں چھوڑتے۔ شادیوں میں۔ غموں میں، ہزاروں رسمیں بری بری ایسی کہ جن کے کرنے سے ایمان بھی جاتا رہے۔ یا نقصان میں آجائے۔ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ بلبجے گاجے ڈھولک تماشا۔ لڑکیوں کا گانا۔ اور برات آنے پر چھتوں پر چڑھ کر کئی طرح کے بکواس آمیز گانے گانا وغیرہ وغیرہ۔ سب وہ باتیں ہیں۔ جن سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ مگر ہم ہیں کہ رکتے ہی نہیں۔ مسلمانو! خوب یاد رکھو! اگر خدا کو راضی کرنا چاہتے ہو۔ تو ہر معاملہ میں اس کے رسول کا اتباع کرو۔ اگرچہ تم سے سارا جہان ناراض ہو جائے۔ جہان ناراض ہوتا ہے تو ہونے دو۔ مگر رسولِ کریم کو ناراض مت کرو۔ یا برادری کو رکھو یا اپنے رسول کو رکھو۔ بھائیو! مگر اتنی بات یاد رکھنا۔ کہ اگر برادری ناراض ہو گئی۔ تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ اور اگر رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے۔ تو کچھ نہیں رہے گا خوب یاد رکھو۔ جب تک تم اپنے ہر معاملہ میں۔ بیع و شرا میں۔ حرکت و سکون میں۔ شادی و غم وغیرہ میں حضور کی فرمانبرداری کا خیال نہ رکھو گے۔ تب تک تم کبھی صحیح معنوں میں مسلمان ہرگز نہیں بن سکتے۔ ویسے نام کے مسلمان ہو تو ہو۔ مگر کام کے مسلمان ہرگز نہیں!

لطیفہ

مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے ایک لطیفہ لکھا ہے۔ کہ ایک شخص نے بہت بڑا عمامہ باندھ رکھا تھا۔ ایک چور نے دیکھا۔ تو اس نے سوچا۔ کہ اگر یہ عمامہ ہاتھ آجائے۔ تو گھر بھر کے لئے ململ کی قمیضیں تیار ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس نے جھپٹ کر اس کا عمامہ اتار لیا۔ اور دوڑا۔

عمامہ کے مالک نے چور کو آواز دی کہ میاں چور! تم عمامہ کی ظاہری شکل پر بھول گئے۔ ذرا اسے کھول کر تو دیکھو۔ اس کے اندر کیا ہے ؎

کھول کر تو دیکھ اس کا کیا ہے حال
پھر بھی تو لے جائیے تو تجھ کو حلال
اس کو کھولا بھاگتے عیار نے
دھجیاں اور چیتھڑے گرنے لگے
ہاتھ میں آخر کو اس کے رہ گیا
اِک پرانا پارچہ کمخواب کا

یعنے چور نے کھول کر دیکھا۔ تو اوپر ایک ہی پیچ ململ کا تھا۔ اندر سب چیتھڑے بھرے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ اسی طرح آجکل کے بے عمل مسلمانوں کا اسلام ہے، کہ اوپر کلمہ کا ایک ہی پیچ ہے۔ اور اندر سب وہی کفریہ رسموں کے چیتھڑے بھرے ہیں۔ ؎

از بروں طعنہ زدی بر با یزید
وز درونت ننگ مے دارد یزید

"باہر سے تو ایسے کہ حضرت بایزید سے بھی اچھے اور اندر سے ایسے کہ یزید سے بھی برے"

— خداوند تعالےٰ اندر اور باہر سے ہمیں پورا مسلمان بننے کی توفیق دے! آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دسواں وعظ

خدا کی بندگی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۝

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ۝ (پ ۲۷ ع ۲)

اور میں نے جن اور آدمی اسی لئے ہی بنائے کہ میری بندگی کریں

حضرات! — آج کے میرے وعظ کا عنوان ہے۔ "خدا کی بندگی" اس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے چند تمہیدی کلمات سن لیجئے:۔

یہ واقعہ و حقیقت ہے۔ کہ خداوند کریم نے دنیا میں کوئی چیز بیکار و غیر مفید پیدا نہیں فرمائی۔ ہر چیز کی پیدائش میں یقیناً کوئی نہ کوئی حکمت

مضمر ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری سمجھ میں وہ حکمت نہ آئے۔ چنانچہ حضرت امام غزالی علیہ الرحمۃ نے کیمیائے سعادت میں لکھا ہے۔ کہ ایک مرتبہ حضرت موسٰی علیہ السلام نے دیوار پر ایک چھپکلی کو دیکھا۔ تو اللہ سے سوال کیا۔ الٰہی! تو نے چھپکلی کو کیوں پیدا فرمایا؟ خدا نے اس کے جواب میں فرمایا اے موسٰے۔ یہی سوال تجھ سے قبل چھپکلی بھی کر چکی ہے۔ کہ الٰہی تو نے موسٰے کو کیوں پیدا فرمایا؟ اور اے موسٰے! میں نے کوئی چیز بیکار پیدا نہیں فرمائی۔ میرے بزرگو! معلوم ہوا کہ اللہ نے کوئی چیز بے کار پیدا نہیں فرمائی۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ کار آمد ہے۔ اور کسی نہ کسی حکمت پر مبنی پیدا فرمائی گئی ہے۔ فِعْلُ الْحَكِيمِ لَا يَخْلُوا عَنِ الْحِكْمَةِ۔ حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

سب کچھ انسان کیلئے

اور پھر یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ خدا نے ہر چیز کو انسان کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ اور ہر شے کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کی خادم نظر آتی ہے۔

ہوا

چنانچہ یہ ہوا ہی دیکھ لیجئے۔ اگر یہ نہ ہو۔ تو انسان کا دم ہوا ہو جائے زندگی محال اور جینا دشوار ہو جائے۔ اور کئی امور جو ہوا سے تعلق رکھتے ہیں۔ سب رک جائیں۔ اور انسان کے لئے نقصان واقع ہو۔ تو معلوم ہوا کہ ہوا انسان کی خادم ہے۔ اور انسان کیلئے پیدا فرمائی گئی ہے۔

پانی

پانی کو بھی دیکھئے۔ اگر پانی نہ ہو۔ تو ہماری پیاس کیسے بجھے، کپڑے کیسے دھلیں۔ لسی۔ چائے۔ شربت و دیگر مشروبات کیسے تیار ہوں؟ آپ کی کھیتیوں کو سیراب کون کرے؟ آپ کا کھانا کھلانا۔ پینا پلانا۔ نہانا دھونا۔ اور اسی طرح متعدد کام جو متعلق بالماء ہیں۔ سب ہی کے سب رک جائیں۔ اور انسان کو بے حد نقصان کا سامنا ہو۔ کیا یہ حقیقت نہیں؟

آگ

آگ کی طرف آیئے۔ دیکھ لیجئے۔ یہ بھی آپ ہی کی خادم ہے۔ آپ کا کھانا پکاتی ہے۔ آپ کے لئے چائے تیار کرتی ہے۔ سردیوں

ہیں آپ کے کمرے اور آپ کا بدن گرم کرتی ہے۔ وَقِسْ عَلٰی ذٰلِکَ ۔ اگر آگ نہ ہو۔ تو انسان کے کئی کام رک جائیں۔

مٹی

مٹی بھی انسان کی خادم ہے۔ ہمارے مکانوں کو سر پر لئے کھڑی رہنے والی زمین اگر نہ ہو۔ تو آپ کا چلنا پھرنا۔ اٹھنا بیٹھنا سب ختم ہو جائے۔ آپ کی کھیتیاں۔ باغات وغیرہ نابود ہو جائیں۔ یہ بارونق شہر اور سیر گاہیں اسی مٹی کی بدولت ہیں۔ یہ نہ ہو۔ تو آدھا جہان ختم ہو جائے۔

اسی طرح چاند، سورج، ستارے۔ جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ غرضیکہ دنیا کی ہر چیز انسان کے لئے ہے۔ اور انسان ان سب سے اعلیٰ و اشرف اور ان سب کا مطاع ہے۔

انسان کیلئے سب اور انسان کس لئے؟

حضرات! جب آپ یہ معلوم کر چکے کہ انسان کے لئے سب کچھ ہے۔ تو اب اس کے برعکس دیکھئے کہ انسان کیا ان چیزوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے؟ — بنظرِ غور دیکھنے سے جواب "نہیں" کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا۔ اور وہ اس طرح کہ آپ مان چکے کہ اگر ہوا نہ ہو۔ تو انسان کا نقصان ہے۔ مگر خود ہی سوچئے۔ کہ اگر انسان نہ ہو۔ تو کیا ہوا کا بھی کوئی نقصان ہے؟ ہرگز نہیں۔ انسان نہ ہو تو ہوا کا کچھ بھی نقصان نہیں۔ اسی طرح پانی اگر نہ ہو۔ تو انسان کا نقصان۔ اور اگر انسان نہ ہو۔ تو پانی کا کیا نقصان؟ یونہی آگ مٹی، یا چاند سورج وغیرہ ان میں سے اگر کوئی ایک چیز بھی نہ ہو۔ تو انسان کا نقصان ہے اور اگر انسان نہ ہو۔ تو ان میں سے کسی چیز کا کچھ نقصان نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ مگر انسان ان میں سے کسی کے لئے نہیں۔ پھر دیکھنا ہے۔ کہ انسان کس لئے پیدا کیا گیا۔ اس کے جواب میں اگر آپ کہیں کہ صاحب! انسان کو سونے کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ حضرت انسان دنیا میں پہنچ کر سونے کی خدمت سرانجام دیا

کرے ، اور دن رات سویا کرے ۔ تو ہم کہیں گے ۔ اگر یہی بات تھی ۔ تو اللہ تعالیٰ انسانوں کی جگہ خرگوش پیدا فرما دیتا ۔ اس لئے کہ خرگوش کی نیند مشہور ہے ۔ کہ وہ بہت سوتا ہے ۔ پھر انسان کیوں پیدا کیا گیا ؟ سوال تا حال باقی ہے ۔ اگر آپ کہیں کہ اسے کھانے پینے یا خواہشات کی تکمیل کے لئے پیدا کیا گیا ہے ۔ تو ہم کہیں گے ۔ کہ کھانے پینے میں انسان سے زیادہ چوپائے ہیں ۔ کہ کتنی انسانوں کی غذا کی مقدار میں ایک ہی چوپایہ کھا جاتا ہے ۔ اور خواہشات کی تکمیل کے لئے حیوانات کافی تھے ۔ ڈارون کی تھیوری کے مطابق ڈارون کی اصل بندر ہے ۔ اور بندر خواہشات نفسانیہ کے پورا کرنے میں کچھ کوتاہی نہیں کرتا ۔ پھر انسان کی جگہ انہیں حیوانات کو کیوں پیدا نہ فرمایا گیا ؟ ——

نئی تہذیب کا جواب

میرے بھائیو ! اس سوال کے جواب میں نئی تہذیب کا جواب تو یہی ہے ۔ جس کا اوپر ذکر ہوا ۔ کہ انسان سونے اور کھانے پینے اور خواہشات کی تکمیل کے لئے ہی پیدا ہوا ہے ۔ مختصر لفظوں میں نئی تہذیب کا جواب یہ ہے ۔ کہ انسان آیا ہے کھانے پینے کے لئے ۔ اور کھانا پینا ہے اس کا جینے کے لئے ، اور جینا ہے پھر کھانے پینے ہی کے لئے ۔

قرآن کا جواب

مگر قرآن کا جواب وہ ہے ۔ جس کا ذکر ابتدائے مضمون میں ہو چکا ۔ اور جو آیت زیب وہ مضمون ہے ۔

اور جس کا ذکر میں اپنے ان اشعار میں لکھ چکا ہوں کہ ؎

جا در پیدا ہوئے تیری وفا کے واسطے

چاند سورج اور ستارے ہیں ضیا کے واسطے

کھیتیاں سرسبز ہیں تیری غذا کے واسطے

سب جہاں تیرے لئے اور تو خدا کے واسطے

مقصد یہ کہ کھانا پینا اگر زندگی کے لئے ہے تو زندگی خدا کی بندگی کے لئے ہے اور ؎

زندگی بے بندگی شرمندگی
زندگی با بندگی تابندگی

اشرف المخلوقات انسان کو ذرا اپنے خالق و مالک اور رازق کی مہربانیوں کا خیال کرنا چاہیئے۔ ذرا سوچئے تو حضرات! بچہ ماں کے پیٹ میں ہے۔ اور رازق اسے وہیں رزق دے رہا ہے۔ اور دنیا میں آنے سے پہلے ہی خدا نے اس کے لئے دو دودھ کی نہریں ماں کی چھاتی میں جاری کر دیں۔ پھر پیدائش کے بعد اُسے ماں کی گود اور باپ کی آغوش عطا فرمائی۔ ذرا بڑا ہوا۔ تو سائیکل۔ تانگے۔ گھوڑے۔ اور پھر جو اور ترقی کر لی تو موٹریں، لاریاں، بحری جہاز اس کے لئے مہیا فرما دیئے۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی خدا نے اس کی یوں قدر فرمائی۔ کہ میرا بندہ عمر بھر سواریوں پر سوار ہی رہا۔ اب مرنے کے بعد اسے قبرستان تک بھی چار آدمیوں کے کندھوں پر سوار کر کے ہی لایا جائے۔ چنانچہ سوار ہی گیا۔ اور دفن ہوا۔ افسوس صد افسوس کہ ایسے محسنِ حقیقی و ربّ منعم کو بھلا دیا جائے؟ یاد رکھئے!

اڑاؤ عیش کرو عشرتیں بہت پھولو!
پھرو جہاز میں موٹر کی گود میں جھولو!
اڑو بلندی پہ اتنا فلک کو بھی چھو لو!
خدا کے واسطے لیکن خدا کو مت بھولو!

جوتے نے کیا کہا ایک بزرگ کا جوتا پرانا ہو گیا۔ انہوں نے اسے اتار کر پھینک دیا۔ اللہ والوں سے ہر چیز بات کر لیتی ہے۔ چنانچہ جوتا بولا۔ اور ان سے کہنے لگا۔ جناب آپ نے مجھے کیوں اتار کر پھینک دیا؟ وہ بولے۔ کہ واہ صاحب واہ! ایک ذلیل و حقیر شے ہو کر مجھ سے خطاب؟ خاموش رہ لے جوتے! جوتا بولا۔ ذرا سنئے حضور! میں اگر ذلیل بھی ہوا۔ تو اس لئے، کہ آپ کا جوتا ہوں۔ اگر آپ کے استاد یا پیر و مرشد کا جوتا ہوتا۔ تو قبلہ آپ مجھی کو سر پر اٹھاتے۔ آنکھوں سے لگاتے۔ تو یہ حقارت و

ذلت بھی تو مجھ ہیں آپ ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ یہ طعنہ سن کر اس بزرگ کی ندامت کا ٹھکانا نہ رہا۔ بولے اچھا۔ بولو! کیا کہنا چاہتے ہو؟ جوتا بولا۔ صرف اتنی بات کہ آپ نے جس مقصد کے لئے مجھے خریدا۔ میں نے وہ مقصد آپ کا پورا کیا۔ آپ کا پیر اگر ٹیڑھا ہوا۔ میں نے آپ کے پیر کی خاطر اپنے آپ کو ٹیڑھا کر لیا۔ آپ کانٹوں میں گئے۔ میں نے خود کانٹے کھائے۔ مگر آپ کے پیر کو بچایا۔ نجاست میں گئے۔ خود نجاست میں لتھڑا۔ مگر آپ کے پیر کو نجاست سے بچایا۔ ذرا آپ بھی غور کیجئے کہ کیا جس مقصد کے لئے آپ پیدا کئے گئے۔ کیا آپنے بھی وہ مقصد پورا کیا؟ اگر کیا تو بہتر۔ ورنہ آپ سے تو میں ہی اچھا رہا۔ یہ سن کر اس بزرگ کی چیخ نکل گئی۔

حضرات! اس حکایت سے نتیجہ یہ نکلا کہ انسان اگر عبادت الٰہی سے غافل ہے۔ تو ایسا شخص ایک جوتے سے بھی بدتر ہے۔ یاد رکھئے! ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ اور انسانیت نام ہی خدا کی عبادت کا ہے۔ عبادت سے جو غافل ہے۔ وہ برائے نام انسان ہے اور اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ کا مصداق۔

مشین کا پُرزہ

دیکھئے! کسی مشین کا پرزہ جب تک وہ اپنی جگہ پر رہ کر وہ کام دیتا رہے۔ جس کام کے لئے وہ بنایا گیا ہے۔ تو وہ اپنی حیثیت قائم رکھیگا۔ بہت بڑی قیمت پائیگا۔ مالک کی نظر میں اس کی قدر و وقعت ہوگی۔ مگر جب کہ وہ اپنی جگہ پر پورا ہی نہ آئے۔ اور جس کام کے لئے اسے بنایا گیا ہے۔ وہ کام ہی نہ دے سکے۔ تو آپ جانتے ہیں۔ اس پرزہ کا کیا حشر ہوتا ہے۔ مالک کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت باقی نہیں رہ جاتی وہ اسے چاہے دو چار سو کا ہی کیوں نہ ہو۔ چار روپیہ پر بھی کباڑیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ اور یا پھر یونہی پھینک دیتا ہے۔ سمجھے آپ؟ یہ اس قیمتی پرزے کی اہمیت کم کیوں ہو گئی؟ اتنا بڑا قیمتی پرزہ اتنا سستا کیوں ہو گیا؟ محض اس لئے کہ اس نے اپنا مقصد پورا کرنے سے

جواب دے دیا۔ تو اسی طرح یاد رکھئے۔ حضرات! جب تک مسلمان اپنے مقصد حیات کو نہیں بھولا۔ عبادتِ الٰہی میں سرگرم رہا۔ اس وقت تک خدا نے بھی اس کی عزت و شرافت، بلندی و عظمت برقرار رکھی۔ اس نے جب میدان میں ایک قدم بھی اٹھایا۔ خدا نے اس کے ایک قدم اٹھانے کی قیمت میں بڑے بڑے ملک اس کے زیر قدم کر دیئے۔ اس نے اپنی گردن خدا کے آگے جھکا دی۔ خدا نے بڑے بڑے سرکش شہنشاہوں کو اس کے آگے جھکا دیا۔ وہ یادِ الٰہی میں روتا رہا۔ اپنے دل میں یاد حق کو راہ دی۔ خدا نے خشک پہاڑوں سے اس کے لئے چشمے بہا دیئے۔ اور سمندروں میں اس کے لئے راہ پیدا فرما دی۔ ایسے ہی مسلمانوں کے لئے شاعر لکھتا ہے ؎

مسلماں وہ مسلماں تھے کہ میداں میں نکل آئے
تو کسریٰ اور اس کے ساتھ قیصر کو کچل آئے
جہاں پہنچے زمیں کو آسماں سے کر دیا اونچا
جہاں ٹھہرے در و دیوار کا نقشہ بدل آئے
سمندر میں بھی ان کی دوڑ کی راہیں نکل آئیں
پہاڑوں پر بھی اُن کے فیض کے چشمے اُبل آئے

مگر آج مسلمان اپنے مقصد کو بھول چکا۔ غور تو فرمایئے مسلمان عبادت کے لئے ہے۔ مگر مسجد میں اس کا دل نہیں لگتا۔ گویا یہ ایک ایسا پرزہ ہے جو اپنی جگہ پر فٹ ہی نہیں بیٹھتا۔ اور جس کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ وہ کام ہی نہیں دیتا۔ حالانکہ اسے عبادتِ الٰہی کے مقام پر خوب روانی سے چلنا چاہیئے تھا۔ مگر افسوس کہ نئی تہذیب کی رگڑ نے اس پرزہ کے اسلامی دندانے توڑ پھوڑ کے رکھ دیئے۔ اور اسے گھسا و سا کر مقامات عبادت کے لئے رہنے ہی نہ دیا۔ اب یہ پرزہ بجائے مسجد کے سینما میں فٹ بیٹھتا ہے۔ بجائے کعبہ کے لندن کے چکر کاٹتا ہے۔ اور بجائے اسلام کے کفر کے گرد گھومتا ہے۔ اسی حالت کا نقشہ اکبر الٰہ آبادی نے ان اشعار میں کھینچا ہے ؎

بتوں سے میں خدا پر نظر یہ خوب کہی
شب گناہ و نماز سحر یہ خوب کہی
نٹن نفیس ہڑک خوشنما ڈنر ہر شب
یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی

اور اس حالت کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے۔ وہ نکلا اور ہم خدا کی نظروں سے گر گئے۔ ہماری کوئی قدر و قیمت نہ رہی۔ کوڑیوں کے مول بکنے لگے ہمارا کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔ اور یہ سب اپنی ہی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے۔ آیئے ہم پھر سچے مسلمان بن جائیں۔ خدا کی عبادت میں سرگرم ہو جائیں۔ ہر حال میں اُسے نہ بھولیں، پھر دیکھئے۔

یادِ او گر مونسِ جانت بود!
ہر دو عالم زیر فرمانت بود!

ایک مثال

میرے بھائیو! جب یہ معلوم ہوا۔ کہ انسان کو عبادت کے لئے پیدا فرمایا گیا ہے۔ اور خدا کی بندگی اس کی ڈیوٹی ہے۔ تو جو شخص اپنے اس فرض کو نہ پہچانے اور اپنی ڈیوٹی سے غافل رہے۔ اس کا جو ہولناک انجام ہو سکتا ہے۔ اس کی تشریح کے لئے یہ مثال ملاحظہ فرمایئے۔

ایک آدمی ایک بچھڑا خریدتا ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے۔ کہ یہ بڑا ہوگا تو اس سے میں ہل جوتنے کا کام لوں گا۔ اسی خیال سے وہ اسکی خوب خاطر کرتا ہے۔ اُسے کھلاتا پلاتا ہے۔ اور اس کی ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے مگر وہ بچھڑا خوب جوان ہوا۔ اور مالک نے اُسے ہل پر جوتنا چاہا۔ تو اس بچھڑے نے جو اب بیل بن چکا ہے۔ ہل کے آگے جتنے سے انکار کر دیا۔ اور مالک کی خدمت سے منہ پھیر لیا۔ تو فرمایئے۔ اس کا مالک اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ سب جانتے ہیں۔ کہ ایسے نکمے بیل کو اس کا مالک قصائیوں کے حوالے کر دے گا۔ جو اس کی گردن پر چھری پھیر دینگے بلاتشبیہ خوب یاد رکھیئے۔ کہ وہ انسان جسے اللہ تعالےٰ نے پیدا فرمایا

اور اس کو خوب کھلایا پلایا۔ اور اس کی ہر ضرورت کو پورا فرمایا۔ اور پھر اس کے ذمہ یہ خدمت لگائی۔ کہ تم میری بندگی کرو۔ تو اب جو شخص اس کی بندگی سے انکار کر دے۔ تو فرمایئے۔ وہ مالک حقیقی ایسے شخص پر کب راضی ہوگا؟

میرے بھائیو! ایسے شخص کے لئے بھی اللہ نے ایک گھر مقرر فرمایا ہے جسے دوزخ کہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ایسے شخص کو دوزخ کے حوالہ کر دیگا۔ اور اسے اپنے کئے کی وہاں سزا بھگتنی پڑے گی۔

عذاب سے پناہ مانگو

میرے دوستو! خدا کا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔ اسکے عذاب سے پناہ مانگو۔ مگر افسوس کہ بعض ناعاقبت اندیش اس موقعہ پر کہہ دیتے ہیں۔ کہ خدا جہاں چاہے۔ ہمیں بھیج دے۔ ہم خوش ہیں۔ توبہ! توبہ! میرے عزیزو! اتنی دلیری نہ کرنی چاہیئے۔ اس کے عذاب سے ہر وقت ڈرنا چاہیئے۔ اور کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیئے۔ جو ہمارے لئے موجب عذاب ہو۔ خدا کے عذاب کی ہم میں پل بھر کے لئے بھی قوت برداشت نہیں ہے۔ پھر کس قدر حیرت کا مقام ہے۔ کہ ہم گویا اس کے عذاب کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اور یوں کہہ دیتے ہیں۔ کہ بھیج لے وہ ہمیں جہاں چاہے۔ استغفر اللہ العظیم!

ایک چھوٹے لڑکے کا خوف

ہم تو اس بچہ سے بھی گئے گزرے جو اللہ کے عذاب کی ہیبت سے رو رہا تھا۔ حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ ایک بار شہر سے باہر نکلے۔ تو آپ نے دیکھا۔ ایک چھوٹی عمر کا لڑکا باہر جنگل میں بیٹھا رو رہا ہے۔ حضرت نے اس سے دریافت فرمایا۔ بچے کیوں رو رہے ہو؟ وہ بولا۔ حضور! میں خدا کے عذاب کے ڈر سے رو رہا ہوں۔ فرمایا۔ وہ کیا خوف ہے تمہیں؟ وہ بولا۔ آج معلم نے مجھے قرآن کی یہ آیت پڑھائی ہے۔

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ ؕ۔ "اس آگ سے ڈرو۔ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں"۔

اس آیت میں اللہ نے انسانوں کو بھی دوزخ کا ایندھن بنایا ہے.
تو حضور مجھے ڈر اس بات کا ہے. کہ میں اپنی ماں کو دیکھتا ہوں. جب
وہ چولہے میں آگ جلاتی ہے. تو موٹی موٹی لکڑیاں چولھے میں رکھتی ہے.
اور اگر ان موٹی موٹی لکڑیوں کو آگ نہ لگے. تو ان کے نیچے چھوٹی
چھوٹی لکڑیاں رکھ دیتی ہے. تاکہ ان چھوٹی لکڑیوں کے ذریعہ ان بڑی
لکڑیوں کو آگ لگ جائے. تو میں اس لئے رو رہا ہوں. کہ دوزخ میں
اگر اللہ نے بڑے بڑے کافر ڈالے. اور ان کو آگ نہ لگی. تو کہیں اللہ
تعالیٰ میرے جیسے چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو دوزخ میں نہ ڈالدے"

یہ سن کر حضرت بایزید بہت روئے اور فرمایا. بیٹا! تمہاری اس
عاقبت اندیشی کا کیا کہنا. انشاء اللہ تم عذابِ الٰہی سے محفوظ رہو گے.

میرے بھائیو! دیکھو اس چھوٹی عمر کے لڑکے کا خوفِ حق، اور ایک
ہم ہیں. کہ کچھ پرواہ ہی نہیں، اس کا رونا دیکھو کہ اللہ کے عذاب کے
ڈر سے وہ رویا. اور سوچو کہ کیا کبھی ہم بھی خدا کے ڈر سے روئے ہیں؟

اللہ سے ڈر کر رونا

مولانا رومی علیہ الرحمۃ پھر ارشاد فرماتے ہیں. ؎

چوں خدا خواہد کہ ما یاری کند
میل مارا جانبِ زاری کند

جب خدا ہماری مدد فرمانا چاہتا ہے. اور ہم پر رحم فرمانا چاہتا ہے.
تو ہمارا میلان رونے کی طرف کر دیتا ہے. یعنی بندہ جب خدا سے ڈر کر
روتا ہے. تو اللہ کی اس رحمت نازل ہونے لگتی ہے. ؎

اے خنک چشمے کہ آں گریانِ اوست
وے ہمایوں دل کہ وے بریانِ اوست
ہر کجا آبِ رواں سبزہ بود
ہر کجا اشکے رواں رحمت بود

جہاں پانی جاری ہوتا ہے. وہاں پھول اور سبزہ اگتا ہے. اور جہاں
آنسو بہیں وہاں اللہ کی رحمت برستی ہے.

میرے بھائیو! غور کرو اور اللہ کے عذاب سے ڈرو۔ خدا کا عذاب بڑا زبردست اور ایسا ہے۔ کہ اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اللہ کے بندے وہ ہیں۔ جو اللہ سے ڈریں اور اس کے آگے جھک جائیں۔ دیکھئے ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے قرآن کی یہ آیت سنی۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَالَهُ مِنْ دَافِعٍ۔

فاروق اعظم کا خوف

آپ گھوڑے پر سوار تھے۔ قاری سے یہ آیت سنتے ہی خدا کے خوف سے غش کھا کر سواری سے گر گئے۔ لوگ آپ کو اٹھا کر گھر لے گئے۔ اور بڑی دیر کے بعد جب آپ ہوش میں آئے تو رونے لگے۔ اسی طرح اللہ والے اس قسم کی آیات سنتے ہی اس قدر متاثر ہوتے کہ رونے لگتے تھے۔ اور خدا سے پناہ مانگنے لگتے تھے۔ دوستو! یہ قرآن پاک کی تاثیر ہے۔ کہ یہ دلوں میں اتر جاتا ہے اور اپنا اثر دکھانے لگتا ہے۔ خدا نے قرآن میں اپنی کتاب کے لئے فرمایا ہے۔ کہ اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل فرماتے۔ (لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللهِ) تو تم پہاڑ کو دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے پھٹ جاتا۔

لطیفہ

اس موقع پر ایک لطیفہ مجھے یاد آگیا۔ کہتے ہیں۔ ایک انگریز کسی شہر کی ایک مسجد میں جا پہنچا۔ وہ مسجد بڑی شکستہ تھی۔ اور جگہ جگہ سے اس کی دیواریں پھٹی ہوئی تھیں۔ انگریز نے نمازیوں سے کہا۔ کہ تم لوگ ہمارا گرجا دیکھو۔ تو حیران رہ جاؤ۔ بڑی مضبوط عمارت، اور پختہ دیواریں ہوتی ہیں۔ مگر تمہاری مسجد کا یہ حال ہے۔ کہ شکستہ اور جگہ جگہ سے دیواریں پھٹ رہی ہیں۔ ایک نمازی نے جواب دیا۔ صاحب! ہماری کتاب قرآن کی یہ شان ہے کہ وہ اگر کسی پہاڑ پر نازل ہوتا۔ تو وہ پہاڑ پھٹ جاتا۔ تو اس مسجد میں چونکہ وہی قرآن پڑھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی دیواریں اس کی تاثیر سے پھٹ گئی ہیں۔ تمہاری موجودہ انجیل میں اتنی طاقت کہاں؟ کہ وہ گرجا کی دیواریں پھاڑ سکے۔

بہر حال اگرچہ یہ ایک لطیفہ ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے۔ کہ قرآن پاک، بڑی طاقت کا مالک ہے۔ مگر افسوس کہ آجکل کے ہمارے دل پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہو چکے ہیں۔ کہ ہم پر تخویف تعذیب کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

میرے بھائیو! اس پرفتن زمانے میں ہمارے اعمال کچھ ایسے ہو چکے ہیں۔ کہ ان کی شامت سے آئے دن ہم پر اللہ کے عذاب پر عذاب آنے لگے ہیں۔ آپ اخبارات کا مطالعہ کیجئے۔ کہیں زلزلے آ رہے ہیں۔ کہیں پانی اپنی تیزی و افراط سے ہمیں برباد کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے اپنے ہی اعمال کی شامت ہے۔ ؎

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ مرا احوال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

دوستو! خدا کسی پر ظلم نہیں فرماتا۔ وہ عادل ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ ہمارے اپنے کئے کا پھل ہے۔ گذشتہ دنوں جو ہولناک سیلاب آیا ہے۔ سب یہ کہتے ہیں۔ کہ اس قسم کا سیلاب کبھی نہیں آیا تھا۔ مگر یہ بھی سوچا۔ کہ جو کچھ ہم اب کرنے لگے ہیں۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ دغا۔ مکر و فریب۔ جھوٹ۔ بلیک۔ رشوت۔ شراب اور زنا کس بات کو آج اختیار نہیں کر لیا گیا۔ ناچ گھر اور سینما تھیٹر آباد ہو رہے ہیں بے حیائی و بے دینی کو ایک مستقل مشغلہ بنا لیا گیا ہے۔ خدا سے منہ موڑ کر شیطان سے رشتہ جوڑ لیا گیا ہے۔ دین و مذہب سے بیزاری عام ہے۔ بے ایمانی و بے غیرتی سے ہی کام ہے۔ اپنے فلسفے اور اپنی عقل و سائنس پر اعتماد ہے۔ خدا پر نظر ہی نہیں۔ وہ جو پنجابی میں کہتے ہیں نا کہ "ربّ نیڑے کہ گھسُن" یعنی رب نزدیک ہے یا گھونسا؟ تو روشن خیال کے مدنظر اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے۔ کہ گھونسا نزدیک ہے گویا موجودہ ملحدانہ زمانہ بس گھونسے ہی کو مانتا ہے۔ تو اس بات کے پیشِ نظر میں تو یہ کہتا ہوں۔ کہ اللہ تعالٰے بھی اب اپنے عذاب کے گھونسوں

سے ہمیں متنبہ فرمانے لگا ہے۔ اور اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ایک سیلاب بھی ہے۔ سیلاب کیا ہے۔ پانی کی ایک زبردست رَو ہے۔ جو ہمیں غرق کرنے کے لئے آئی ہے۔ اور پانی کیا ہے؛ یہ ہمارا نوکر ہے۔ جو ہمارے ہاتھ پیروں کی میل دور کرتا ہے۔ ہمارے کپڑے دھوتا ہے۔ ہماری غلاظتوں کو دھوتا ہے۔ مگر جب کوئی لڑکا نالائق نکلے۔ تو بعض اوقات باپ اپنے نالائق بیٹے کو نوکروں سے پٹواتا ہے۔ میرے بھائیو! اللہ اب ہم نالائقوں کو ہمارے ہی نوکروں سے پٹوانے لگا ہے۔ یہ پانی گلاس میں آئے۔ تو ہم اسے پی لیں۔ مگر اب اللہ کا اسے یہ حکم ہے کہ اے پانی تو ان نالائقوں کو پی جا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔

اللہ کی فوج

آج اس مادی دور میں لوگوں کو اپنی دنیاوی طاقت و قوت پر بڑا ناز ہے۔ اور ہر حکومت اس بات پر فخر کرتی ہے۔ کہ میرے پاس اتنی فوج ہے۔ اتنے ٹینک ہیں۔ اتنے بم ہیں۔ مگر یاد رکھیئے۔ اس احکم الحاکمین کا اپنی فوج کے متعلق ارشاد ہے۔ مَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا ھُوَ۔ یعنی اللہ کے لشکر کی تعداد اللہ ہی جانے۔ اسکا اتنا لشکر اور اتنی فوج ہے کہ انسانی شمار میں آ ہی نہیں سکتی۔

مچھر اور مکھیاں

آج کل نئی دنیا کو اس امر پر بڑا ناز ہے کہ ہم ہر ملک کی آبادی کو جانتے ہیں۔ کہ اس ملک میں آدمی کتنے ہیں۔ اور ان میں سے مرد کتنے اور عورتیں کتنی ہیں۔ پھر کس کس مذہب کے اور کس کس تعداد میں ہیں۔ حتیٰ کہ امریکہ کے بعض شہروں میں گھوڑوں اور کتوں کا شمار بھی ہوتا ہے۔ مگر میں یہ کہتا ہوں۔ اگر اتنا ہی اپنے اس کارنامے پر ناز ہے۔ تو اسی طرح کبھی کسی ایک ملک کی مکھیاں بھی گن کر دکھاؤ۔ مچھر بھی شمار کرکے بتاؤ۔ چلو سارے ملک کی نہ سہی کسی ایک شہر کی۔ شہر کی بھی نہ سہی صرف اپنے گھر ہی میں بتاؤ۔ کہ کتنی مکھیاں ہیں۔ اور کتنے مچھر ہیں؟ یہ جب ٹڈی دل آجاتا ہے۔ اس وقت بھی گن کر بتایا ہوتا۔ تو یہ مکڑیاں کتنی تعداد میں آئی ہیں؟

مگر یہ کب ممکن ہے۔ یہ خدا کی فوج ہے۔ اسے اللہ ہی جانے کہ انکی تعداد کیا ہے۔ دیکھئے یہاں سارا علم رکھا رکھایا رہ گیا۔ سب فلسفے بیکار ہو گئے۔ اور اللہ کی کمزور مخلوق مکھی اور مچھر نے انسانوں کو شکست دے دی۔

عاجز انسان

میرے بزرگو! اللہ نے انسان کو اختیار بھی دیئے ہیں۔ مگر ان اختیارات کے ساتھ ساتھ اس کا کبر و غرور توڑنے کے لئے اسے اپنی کمزور ترین مخلوق کے سامنے عاجز بھی بنا دیا۔ دیکھئے ایک مغرور انسان مثلاً ایک پستول لئے ہوئے جا رہا ہے۔ اس کے دائیں بائیں اس کے محافظ کچھ لوگ بڑی بڑی لاٹھیاں بھی لئے ہوئے چل رہے ہیں۔ اب اس مغرور کے غرور کو اللہ نے خاک میں اس طرح ملایا۔ کہ اسکے ناک پر ایک مکھی آکر بیٹھتی ہے۔ وہ ہاتھ سے اسے اڑاتا ہے۔ وہ پھر آ بیٹھتی ہے یہ پھر اسے اڑاتا ہے۔ وہ پھر آ بیٹھتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ مغرور انسان عاجز آ جاتا ہے۔ اور مکھی کو شکست نہیں دے سکتا اب اگر غصہ میں آکر وہ اپنے پستول سے ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی پر فائر کرتا ہے۔ تو مکھی تو اڑ جائے گی۔ مگر اس کی اپنی ہی ناک کی خیر نہیں ادھر مکھی اڑی۔ ادھر ناک اڑی۔ اس کے محافظ اگر اپنی لاٹھیوں سے مکھی پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ تو مکھی کا تو کچھ نہ بگڑے گا۔ وہ آدمی ہی نہ بچے گا۔ گویا خدا نے اس قدر اختیار دیکر پھر اُسے یوں متنبہ فرمایا۔ کہ دیکھ! غرور میں نہ آجانا۔ باوجود اتنے اختیارات کے تو اس قدر عاجز ہے۔ کہ ایک مکھی کے سامنے بھی بے بس ہے۔

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

میرے بھائیو! معلوم ہوا۔ کہ مکھی اس لئے بھی پیدا فرمائی گئی ہے۔ کہ یہ مغرور انسان کا غرور توڑے۔ اور ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم میں چونکہ غرور نہ تھا اس لئے حضور کے جسم اطہر پر مکھی بیٹھتی ہی نہ تھی۔

ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی فوج لاتعداد ہے اسے اللہ ہی جانے تو میرے بھائیو! یہ پانی اس لاتعداد فوج میں سے صرف ایک سپاہی بھیجدیا۔

اللہ کا ایک سپاہی

خدا نے اپنی ساری فوج میں سے صرف ایک سپاہی بھیجدیا۔ اور بھیجا بھی اس طرح کہ نہ تو اسے کوئی بم دیا نہ کوئی تلوار۔ بس نہتے سپاہی کو بھیج دیا۔ اور یہ سپاہی اس طرح آیا۔ کہ ہند و پاکستان کی جملہ فوجیں حیران و پریشان رہ گئیں۔ یہ اللہ کا سپاہی جس طرف بھی گیا۔ فوجیں کی فوجیں بیکار ہوکر رہ گئیں۔ اور اس کا کچھ بگاڑ نہ سکیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ مَالَہٗ مِنْ دَافِعٍ۔ اللہ کے عذاب کو کوئی نہیں روک سکتا۔"

ہندوستان کے سپاہی آ جائیں تو بفضل اللہ پاکستان کا مردِ مجاہد انکا مقابلہ کر سکتا ہے۔ دشمن کا ہوائی جہاز آجائے تو پاکستان کی طیارہ شکن توپ اُسے گرا سکتی ہے۔ دشمن کا ٹینک آ جائے تو برباد کیا جا سکتا ہے۔ مگر اللہ کا عذاب آجائے تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ سب سپاہی، توپیں اور بم وغیرہ بیکار ہوکر رہ جاتے ہیں۔ فرمایئے، یہ پانی آیا ہے۔ تو اسکا ہم نے کیا بگاڑ لیا ہے۔ پانی کو لاٹھیاں مار کر دیکھئے۔ اسکا کیا بگڑتا ہے۔ بم پھینکیئے، توپیں چلایئے۔ اپنا ہی نقصان ہے۔ اسکا کیا جاتا ہے؟ یہ صرف اللہ کا ایک سپاہی ہے۔ جسکا مقابلہ ناممکن ہے۔ اور انسان باوجود اس قدر صنعتی ترقی اور مادی عروج کے پانی کے سامنے بےبس ہے

دیوار اور کیل

پانی کے سامنے تو کیا۔ در اصل یہ اللہ کا عذاب ہے۔ اور اللہ سے مقابلہ ناممکن ہے۔ عربی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ دیوار نے کیل سے کہا۔ لِمَ تَشُقُّنِیْ ؟ اے کیل! مجھے کیوں پھاڑتے ہو ؟۔ تو کیل نے جواب دیا۔

سَلْ مَنْ یَدُقُّنِیْ۔ اس سے پوچھو جو میرے سر کو ہتھوڑے سے کوٹ رہا ہے۔ یعنی میرا کیا ہے۔ میں تو بے بس ہوں۔ اسی طرح اس پانی کا کیا ہے۔ یہ تو وہی ہے۔ جو ہمارا نوکر ہے۔ رجوع ہمیں اس ہستی کی طرف کرنا چاہئیے جس کے قبضہ میں یہ پانی ہے۔ وہی ان دریاؤں کو

بصورت عذاب ہم پر مسلط کر رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ اسی لئے ہے۔ کہ ہم اس خالق و مالک کو فراموش کر چکے ہیں۔

غفلت

اب یہی دیکھئے کہ اس قدر تباہی و بربادی کے بعد بھی ہم نہیں سنبھلے۔ وہی شرارتیں، وہی لہو و لعب، وہی حرکتیں اور وہی غفلتیں ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی نافرمانیوں کو دیکھیں، کہہ یہ رہے ہیں کہ چونکہ جنگلوں کی کمی ہو گئی ہے۔ اور پانی کے جذب کرنے کو پتے باقی نہیں رہے۔ اس لئے سیلاب آنے لگے ہیں۔ لہذا ہماری حکومت کو جنگلوں کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔ اور اسی طرح ہمارے فنیشن ایبل افراد آئندہ کیلئے سیلاب کو روکنے کے مادی منصوبے تیار کر رہے ہیں۔ مگر

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَا لَهُ مِنْ دَافِعٍ۔ اللہ کے عذاب کو کوئی منصوبہ نہیں روک سکتا۔"

اِبنِ نوح علیہ السلام نے بھی سیلاب سے بچنے کا یہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ کہ سَآوِیْ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ۔ یعنی میں پانی سے بچنے کے لئے جودی پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ تو حضرت نوح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا تھا۔ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ۔ یعنی اس دن اللہ کے عذاب سے کوئی منصوبہ نہ بچا سکے گا؛ ہاں جس پر اللہ رحم فرمائے۔!

تو میرے بھائیو! یہ مادی منصوبے بھی تیار کرو۔ مگر اصلی منصوبہ یہ ہے۔ کہ اللہ کو راضی کیا جائے۔ اور اس کے آگے جھکا جائے۔ وہ اپنا رحم فرمائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ آؤ ہم کوشش کریں کہ خدا کے قہر و غضب کی آگ کو بجھا دیں اور اسکے رحم و کرم کو جوش میں لائیں۔

ندامت کے آنسو

میرے بھائیو! خدا کے قہر و غضب کی آگ بڑی زبردست ہے۔ یہ دنیا کی آگ جہنم کی آگ سے پناہ مانگتی ہے۔ اور جہنم کی آگ ہاویہ کی آگ سے پناہ مانگتی ہے۔ گویا خدا کے غضب کی آگ بڑی ہی زبردست آگ ہے۔ مگر آپ یہ سن کر حیران ہونگے۔ کہ جس قدر یہ زبردست ہے۔ اسی قدر اسکا بجھانا آسان بھی ہے۔ یہ

آگ سات سمندروں کے پانیوں سے نہیں بجھ سکتی. مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ؎

اِنَّ دَمْعَۃَ الْعَاصِیْ تُطْفِیُٔ غَضَبَ الرَّبِّ ۔ (نزہتہ المجالس)

گنہگار کے ندامت کے آنسو غضب الٰہی کی آگ کو بجھا دیتے ہیں"

تو اے میرے بھائیو! خدا کے عذابوں سے بچنے کے لیۓ اپنے گناہوں سے بصدقِ دل توبہ کرنی چاہیئے. اور اشکِ ندامت بہاکر اس کے غضب کی آگ کو بجھا کر اس کی رحمت کو جوش میں لانا چاہیئے. یہی وہ مفید کارگر منصوبہ ہے. جس پر عمل پیرا ہوکر ہم عذاب ہائے الٰہی سے محفوظ رہ سکتے ہیں.

ایک نجومی کی حکایت

میرے بھائیو! یاد حق سے غفلت اور اپنی بد اعمالیوں کے سبب آج اس پانی کے عذاب کے علاوہ اور دیگر قسم کے عذاب بھی ہم پر نازل ہو رہے ہیں. اور اسی صورتِ حالات سے فائدہ اٹھاکر آجکل کے نجومی اور پیشگوئیاں کرنے والے خبطی افراد آئندہ سے متعلق مختلف قسم کی بھیانک اور ڈراؤنی پیشگوئیاں شائع کر دیتے ہیں اور ضعیف الاعتقاد لوگ ان پر یقین کرکے پریشان ہو جاتے ہیں. حالانکہ اس قسم کی بیشتر پیشگوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں. چنانچہ اسی باب کی ایک بہترین حکایت ہے. کہ ایک نجومی نے ایک بادشاہ کا ہاتھ دیکھکر اسے یہ کہہ کر ڈرایا. کہ آپ کی عمر صرف آٹھ دن باقی رہ گئی ہے. اور آپ آٹھ دن کے بعد مرجائیں گے. بادشاہ یہ پیشگوئی سنکر کانپ اٹھا. اور بے حد متاثر ہوا. حتیٰ کہ اسی وقت مرنے کے قریب ہوگیا. وزیر نے جو صورت دیکھی تو نجومی سے کہنے لگا. کہ تم ذرا اپنا ہاتھ تو دیکھو. اور اپنی عمر کا تو حساب لگاؤ. کہ تمہاری عمر کتنی باقی ہے؛ نجومی نے اپنا ہاتھ دیکھا اور بتایا. کہ میں ابھی چالیس سال اور زندہ رہونگا. وزیر نے یہ بات سن کر اسی وقت تلوار نکالی. اور وہیں اس کا سر قلم کر دیا. اور پھر بادشاہ سے کہا. دیکھا آپ نے اس کی پیشگوئی کا حشر؟ کہ چالیس سال زندہ رہنے والا ابھی ابھی آپ کے سامنے مرگیا. تو آپ کے متعلق بھی اسکی پیشگوئی

اسی قسم کی ہے۔ یعنی جس طرح اپنے متعلق اس کی پیشگوئی غلط نکلی ہے۔ اسی طرح آپ کے متعلق بھی اس کی پیشگوئی غلط ہی ہے۔ وزیر با تدبیر کی حکمت کارگر ہوگئی، اور بادشاہ کا خوف وہراس دور ہوگیا۔ اور اسکی حالت سنبھل گئی۔

میرے بزرگو! اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور اپنی غفلت اور بد اعمالیوں کی پاداش میں مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا ہے اور یہ نجومی اسی بات سے فائدہ اٹھاکر طرح طرح کی بیجا پیشگوئیاں شائع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب کچھ ہمارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور اگر ہمارا رنگِ کردار یہی رہا۔ تو آئندہ بھی ممکن ہے۔ کہ عذابِ الٰہی بدستور نازل ہوتے رہیں۔ مگر بجائے اسکے کہ ہم کسی عذاب کی پیشگوئی کریں۔ اخباروں والے اُسے چھاپ دیں۔ اور ہم اس کا چرچا کرتے پھریں۔ ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم آئندہ کے لئے اپنی بداعمالیوں سے سچے دل سے توبہ کریں۔ اور شرم و ندامت کے آنسوؤں سے اللہ کے غضب کی آگ بجھائیں۔ بھائیو! اگر ہم اس طریقے کو اپنا لیں۔ اور اپنے یقین و ایمان کی صحت کے بعد اپنے عمل و کردار کی درستگی کا عزم کریں۔ تو پھر دیکھئے۔ کہ ان عذابوں سے نجات ملتی ہے یا نہیں۔ اور جو جو عذاب آنے والے ہیں۔ وہ بھی ٹلتے ہیں یا نہیں خوب یاد رکھیے۔ یہ دنیا کی آگ ستر ہزار بار جہنم کی آگ سے پناہ مانگتی ہے۔ اور جہنم کی آگ ستر ہزار مرتبہ طبقہ ہاویہ کی آگ سے پناہ مانگتی ہے۔ الامان و الحفیظ! تو غور فرمائیے۔ کہ اللہ کے غضب کی آگ کس قدر تیز ہے مگر لاکھوں درود و سلام رحمتِ عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ جنہوں نے اتنی بڑی تیز آگ کو بجھانے کا ایک سہل نسخہ ارشاد فرما دیا۔

غضبِ الٰہی کی آگ بجھانے کا نسخہ

فرمایا — اِنَّ دَمْعَۃَ الْعَاصِیْ تُطْفِیُٔ غَضَبَ الرَّبِّ۔ گنہگار کے ندامت کے آنسو غضبِ الٰہی کی آگ کو بجھا دیتے ہیں۔"

دیکھا آپ نے اتنی بڑی زبردست آگ جو سارے سمندروں کے پانیوں

سے بھی نہ بجھ سکے۔ گنہگار کے آنسوؤں سے بجھ جاتی ہے۔ تو بھائیو! ان عذابوں سے بچنے کے لئے اللہ کی یاد اختیار کرو۔ اور غفلت و نافرمانی کو چھوڑ دو!

قوم یونس علیہ السلام کا واقعہ قرآن پاک میں حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا واقعہ مذکور ہے۔ کہ جب انکی بداعمالیوں کے سبب ان پر عذاب آنے لگا۔ اور انہوں نے دیکھا کہ آسمان پر سیاہ بادل اور ہیبتناک دھواں چھا گیا ہے۔ اور سارا شہر اس ہولناک دھوئیں میں گھر گیا ہے۔ تو وہ لوگ اپنی بیوی، بچوں اور جانوروں سمیت جنگل میں نکل گئے۔ اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں جھک گئے۔ اور شرم و ندامت کے آنسوؤں سے توبہ و سلام کا اظہار کیا تو خدا فرماتا ہے۔

لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ۔ (پ ۱۱ ع ۱۵) جب ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے رسوائی کا عذاب دنیا کی زندگی سے ہٹا دیا۔ اور ایک وقت تک انہیں برتنے دیا"

حضرات! اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا۔ کہ انسان جب اپنی غفلت کا اقرار کرکے سچے دل سے تائب ہو جائے۔ تو اللہ تعالیٰ بھی اس پر آنے والے عذاب کو ہٹا لیتا ہے۔ اور اُسے معاف فرما دیتا ہے۔ میرے بھائیو! اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ گنہگار سچے دل سے توبہ تو کرے۔ پھر دیکھیے۔ خدا تعالےٰ کی رحمت کس طرح اُسے اپنی آغوش میں لیتی ہے۔

پیر چنگی کی حکایت چنانچہ مولانا رومی علیہ الرحمتہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے ایک گویّے کی حکایت لکھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔ آپ کے زمانہ میں ایک گویّا تھا۔ جو بڑی سریلی آواز رکھتا تھا۔ جب وہ چنگ و رباب بجاتا اور گاتا تھا۔ تو سننے والوں پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس گویے کا بڑا چرچا اور شہرہ تھا۔ ہر پیر و جوان اس کا شائق تھا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں۔ کہ جب یہ

گویا بوڑھا ہو گیا۔ تو اس کی آواز بھی باقی نہ رہی۔ اور وہ سریلا پن بھی جاتا رہا۔ جب وہ جوان رہا۔ اس کی آواز و سریلا پن بھی قائم رہا۔ مگر جب بڑھاپا آگیا۔ تو وہ بات نہ رہی۔ مولانا رومی کے فارسی اشعار کا اردو منظوم ترجمہ سنیئے! فرماتے ہیں۔

کہنہ سالی میں نوا سازی گئی
دانت ٹوٹے اور خوش آوازی گئی
ناز اس کے جو اٹھاتے تھے کبھی
اب نہ دیتے بھول کر اِک نان بھی

اس عالم میں جب وہ گویا بھوکا مرنے لگا۔ اور اس کا کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔ تو اس کا دھیان رب کی طرف گیا۔ اور سچے دل سے اپنے رازق حقیقی کی طرف متوجہ ہوا۔ اور رو کر عرض کرنے لگا۔ ؎

رویا اور کہنے لگا یوں اے خدا
مدتوں تک تجھ سے میں بھاگا پھرا
سر کے بالوں میں سفیدی آگئی
چہرے پر میرے سیاہی چھا گئی
کھوئے عصیاں میں گئے ستر برس
اب نہیں باقی گناہوں کی ہوس
عیب میں کرتا رہا بے باک خوب
تو رہا ستّار۔ ستّارالعیوب
نفس نے ہر آن جرأت دی مجھے
اتنے دن تو نے بھی مہلت دی مجھے
لطف میں کوئی کمی تو نے نہ کی
رزق کی تکلیف اِک دن بھی نہ دی

مولانا فرماتے ہیں۔ کہ اس گویے نے روتے ہوئے سچے دل سے اللہ کی طرف رجوع کر لیا۔ اور پھر دنیا سے کنارہ کش ہو کر جنت البقیع (مدینہ منورہ کا

قبرستان) کیطرف چل دیا۔ اور وہاں پہنچ کر بھی بہت رویا۔ اور روتے روتے پھر ایک قبر کے ساتھ تکیہ لگا کر سو گیا۔ اِدھر تو یہ سویا اور اُدھر سے

حضرتِ فاروق تھے مصروفِ کار
نیند آئی زور کر کے ایک بار
دل کو اپنے کام میں ڈالا بہت
ہر طرح سے نیند کو ٹالا بہت
ہو گئے مصروفِ کار آخر عمرؓ!
کچھ نہ تن من کی رہی اُن کو خبر!
خواب میں اُن کو کسی نے یہ کہا
ہے بقیع پاک میں اِک "باخدا"
سات سَو دینار جا کے اس کو دے
اس کی دل جوئی بھی کر ہر طور سے!

مسلمانو! دیکھو اللہ کی رحمت کا جوش۔ کہاں وہ ایک گنہگار گویّا، اور کہاں اللہ کے برگزیدہ اور مقبول بندے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ۔ اس گویّے کے لیئے حضرت فاروق کا حکم ہو رہا ہے۔ کہ اٹھ اور اُسے سات سَو دینار دے کر آ۔ اور پھر یہ کہ وہ گنہگار گویّا اب وہ گنہگار نہیں رہا۔ بلکہ اُسے "باخدا" کا خطاب مل رہا ہے۔ سبحان اللہ! ایک ہی بار سچے دل سے توبہ کرنے سے رحمت حق نے اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ چنانچہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ خواب دیکھا، تو آپ اٹھے اور سے

وہ اسی دم لے کے ہمیانی گئے
اور قبرستان میں پھرتے رہے
پیر چنگی ایک تھا سویا ہوا
اور وہاں اس کے سوا کوئی نہ تھا
دل میں وہ شیرِ خدا کہنے لگا

پیر چنگی اور پیر ہو با خُدا؟

حضرت فاروق اعظم جنت بقیع میں اس گوّیے کے سوا کسی دوسرے کو نہ پاکر بڑے حیران ہوئے۔ اور دل میں سوچنے لگے۔ کہ گوّیا باخدا کیسے ہو سکتا ہے۔؟ پھر سوچا کہ اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ اور خدا بڑا بے نیاز ہے۔ کیا عجب کہ اللہ نے اسے ہی اپنا مقبول بنا لیا ہو۔ یہ سوچ کر ؎

بیٹھے اس کے سامنے با صد ادب
اور تعظیماً نہ کھولے اپنے لب
ناگہاں اک چھینک اُن کو آ گئی
آنکھ جس سے پیر چنگی کی کھُلی
دیکھ کر فاروق کو بیٹھا ہوا
خوف سے وہ پیر چنگی کانپ اٹھا

اس گوّیے نے جب اپنے سرہانے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بیٹھا ہوا پایا۔ تو خوف سے کانپ اٹھا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ میرے گانے اور رباب و چنگ کے باعث فاروق اعظم شاید مجھے سزا دینے آئے ہیں مسلمانو! ذرا اس نظارے کو دیکھنا۔ فاروق اعظم وہ فاروق اعظم جنکی ہیبت کے ڈنکے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں بج رہے ہیں۔ آج وہی فاروق اعظم بڑے ادب کے ساتھ ایک گوّیے کے حضور بیٹھے ہیں۔ گوّیا ڈر رہا ہے۔ کہ فاروق اعظم شاید مجھے سزا دینے آئے ہیں۔ مگر وہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ چنانچہ حضرت فاروق اعظم نے اس سے فرمایا بڑے میاں! مجھ سے ڈرو مت! ؎

مژدہ تیرے دوست کا لایا ہوں میں
صرف خدمت کے لئے آیا ہوں میں

اللہ اکبر! فاروق اعظم اور اس پیر چنگی کی خدمت! دیکھا آپ نے! رحمتِ حق نے کیا کرشمہ دکھایا۔ حضرت فاروق نے پھر کہا ؎

حق تعالیٰ تجھ کو کہتا ہے سلام
یہ صِلہ بھیجا ہے تم کو اور پیام
لے صلہ ہیں یہ رقم اور خرچ کر
ہو چکے گی جب تو دے گا پھر عمر!
کر توکل ہم پہ اور گا ذوق سے
ہم سنیں گے چنگ اے بندے مرے

سبحان اللہ! سبحان اللہ! خدا فرماتا ہے۔ اے گویتے تو ہم پر توکل رکھ۔ اور گا۔ تیرا گانا اور یہ چنگ و رباب ہم سنیں گے۔ دیکھا آپ نے خدا کی رحمت نے کس طرح اس کو ڈھانپ لیا۔ اور وہ کس طرح اس کی ڈھارس بندھا رہی ہے۔ اللہ کے اس رحمت بھرے پیام کا نتیجہ یہ نکلا ؎

یہ بشارت پیر چنگی نے سُنی
گر کے سجدے میں خدا سے عرض کی
یا الٰہی! شکر تیرا زینہار
کر نہیں سکتا یہ عاصی شرمسار
شک نہیں بندہ نوازی میں تری
بندگی میں گو ہوئی مجھ سے کمی
عمر کھوئی چنگ بازی میں تمام
بھول کے گاہے لیا نہ تیرا نام
زندگی کی اب نہیں مجھ کو ہوس
آرزو ہے میرے دل کی اب یہ بس
قید دنیا سے مجھے آزاد کر!
روح کو رحمت سے اپنی شاد کر!
ہو گئی اس کی دعا تیرِ ہدف
گوہر جاں نے کیا خالی صدف

جان دی سجدے میں حق کو یاد کر
خاتمہ اس کا ہُوا ایمان پر

بھائیو! اس حکایت کو لکھ کر مولانا رومی نے جو نتیجہ بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے سہ

گر رہے گا روز و شب تو اشکبار
رحم فرمائے گا تجھ پر کردگار
کام واں آتی نہیں ہے کوئی شے
عجز و زاری کی فقط واں پوچھ ہے

تو میرے بزرگو! دوستو اور عزیزو! توبہ کرو اور اللہ کی طرف سچے دل سے رجوع کرو۔ پھر دیکھو اللہ تعالیٰ کس طرح اپنی رحمت کا مینہ برساتا ہے۔ اور کس طرح فضل و کرم فرماتا ہے۔ میں آپ سے کہہ رہا تھا۔ کہ خدا کی عبادت اور اس کی یاد یہ بڑی اہم اور ضروری چیز ہے۔ اور آج جس قدر ہم پر عذاب آ رہے ہیں۔ یہ سب اسی یادِ حق کو چھوڑ دینے کے نتائج ہیں۔ اللہ کی یاد سے بڑے بڑے عذاب ٹل جاتے ہیں۔ اور آدمی اللہ کی حفاظت و رحمت میں آ جاتا ہے۔ یہ جو ہر سال ہم پر پانی کا سیلاب آ جاتا ہے۔ اور ہزاروں جانیں اور لاکھوں کا مال تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اسے دیکھو اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ کا طوفانِ عظیم اور اس میں ایک خدا یاد بڑھیا کا قصہ سنو!

طوفانِ نوح اور ایک بڑھیا

حضرت نوح علیہ السلام کے وقت ایک خدا یاد بڑھیا تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جب بحکم الٰہی کشتی بنانا شروع کی۔ تو اس بڑھیا نے حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا۔ کہ آپ یہ اتنی بڑی کشتی کیوں بنا رہے ہیں؟ فرمایا! کہ ایک بہت بڑا طوفان اور سیلاب آنے والا ہے۔ اس طوفان میں بجز اُن مومنین کے جو میری اس کشتی پر سوار ہوں گے اور کوئی نہ بچ سکے گا بڑھیا نے عرض کی۔ حضور! جب طوفان آئے۔ تو مجھے بھی خبر کیجئے گا

اور اپنے ساتھ کشتی پر چڑھا لیجئے گا۔ فرمایا۔ اچھا! اس کے بعد جب سیلاب عظیم آیا۔ تو دنیا بھر میں پانی ہی پانی ہو گیا۔ بڑے بڑے پہاڑ پانی میں ڈوب گئے۔ اور سارے کافر اس طوفانِ عظیم میں غرق ہو گئے۔

اس طوفانِ عظیم میں حضرت نوح علیہ السلام کی ہی ایک کشتی تھی۔ جو محفوظ تھی۔ اور جو مومن اس پر سوار تھے۔ صرف وہی بچ سکے۔ اور کوئی نہ بچ سکا۔ یہ طوفان جب تھما۔ تو اس وقت حضرت نوح علیہ السلام کو وہ بڑھیا یاد آئی۔ اور آپ نے بڑے افسوس کے ساتھ فرمایا۔ کہ اس بڑھیا کو تو کشتی پر چڑھانا یاد ہی نہ رہا۔ پھر آپ اس سمت کو تشریف لے گئے۔ جس طرف اس بڑھیا کی جھونپڑی تھی۔ وہاں جا کر دیکھا۔ تو اس بڑھیا کی جھونپڑی ویسی کی ویسی بدستور کھڑی تھی۔ آپ بڑے حیران ہوئے۔ کہ اتنے بڑے تباہ کن طوفان میں اس جھونپڑی کو تو پانی نے چھوا تک نہیں ہے۔ اندر تشریف لے گئے۔ تو دیکھا۔ بڑھیا بیٹھی ہے۔ بڑھیا نے حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھا۔ تو بولی کیوں حضور! کیا طوفان آنے کا وقت آ گیا ہے؟ اور آپ مجھے کشتی پر سوار کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں؟ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا! بڑی بی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ طوفان تو آ بھی چکا۔ اور دنیا بھر کو غرق کرکے چلا بھی گیا۔ بڑھیا حیران رہ گئی۔ اور بولی! اے اللہ کے پیغمبر! مجھے تو پتہ بھی نہیں کہ طوفان کب آیا۔ اور کب گیا حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا۔ میں جان گیا۔ تو بغیر کشتی پر سوار ہونے کے بھی اللہ کی حفاظت میں رہی ہے۔ اور اللہ نے کشتی کے بغیر ہی تجھے بچا لیا ہے۔

(روح البیان ص۳۵ ج ۳)

دیکھا میرے بھائیو! جو اللہ کو نہیں بھولتا۔ خدا بھی اُسے نہیں بھولتا اور خوب یاد رکھو۔ کہ ہم اگر خدا کو فراموش کر دیں گے۔ تو پھر اللہ بھی ہمیں ممکن ہے کہ نظرِ رحمت سے گرا دے۔ چنانچہ قرآن پاک فرماتا ہے۔ کہ جو خدا کو بھول چکے ہیں۔ کل قیامت کے دن جب وہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوں گے اور واویلا

کریں گے۔ تو جواب یہ ملے گا کہ —

اَلْیَوْمَ نَنْسَاکُمْ کَمَا نَسِیْتُمْ لِقَاءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا — آج ہم بھی تمہیں یاد نہیں فرمائیں گے۔ جس طرح تم نے اس دن کے لئے ملنے کو بھلا دیا تھا۔

لہٰذا اے مسلمانو! اللہ کی عبادت اور اس کی یاد سے کبھی منہ نہ موڑو۔ اور ہر گھڑی اس کی یاد میں لگے رہو۔ شاعر لکھتا ہے ؎

خدا کی یاد سے ہرگز نہ رکھ دل کو کبھی خالی!
وہاں پر بوم رہتا ہے جہاں کوئی نہ بستا ہو!
تو آیا تھا تو روتا تھا تجھے سب دیکھکر ہنستے تھے!
اب ایسی کار کر بندے یہ رونے ہوں تو ہنستا ہو

یعنی جب تم پیدا ہوتے تھے تو سارے تیرے عزیز خوش تھے کہ ہمارے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ مگر اس وقت تم روتے ہوئے پیدا ہوتے تھے۔ تم رو رہے تھے۔ اور ارد گرد سب ہنس رہے تھے۔ اور اب اے بندے! ایسا کام کر! اور ایسے نیک اعمال اختیار کر کہ جب تو مرے تو یہ ہنسنے والے ارد گرد سب روتے ہوں۔ اور تو ہنستا ہوا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ تو آیا بھی روتا ہوا تھا۔ اور جاتے بھی روتا ہوا۔

عبادت الٰہی کا ثمرہ حضرات! خدا کی بندگی اور اس کے احکام کی تعمیل سے اخروی فوائد کے علاوہ اس دنیا میں بھی بہت سے فیوض و برکات حاصل ہوتے ہیں۔ جو خدا کا ہو جائے۔ خدائی اس کی ہو جاتی ہے۔ یہ جو آج کل ہمیں پانی سیلاب کی شکل میں تنگ کر رہا ہے۔ اور کبھی آگ ہمارے لئے عذاب بن کر ہمارے مکانوں، دکانوں اور سامانوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اور کبھی ہوا طوفان کی شکل میں آ کر ہمیں پریشان کر دیتی ہے۔ جب مسلمان اللہ کی عبادت میں منہمک رہتا تھا۔ اور اس کی یاد میں محو نظر آتا تھا۔ یہ پانی۔ آگ۔ اور باد و خاک سب اس کی تابع تھیں۔ اور اس کا حکم ان چیزوں پر چلتا تھا۔

ایک بت پرست بادشاہ اور ایک مسلمان عورت

چنانچہ مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے ایک بت پرست بادشاہ کی حکایت لکھی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ایک بت پرست بادشاہ نے ایک بہت بڑی خندق کھدوائی۔ اور اس میں آگ جلائی اور خود معہ وزیروں کے خندق کے کنارے بیٹھ گیا۔ اور سامنے ایک بت رکھ لیا۔ اور شہر میں اعلان کر دیا۔ کہ سب حاضر ہو کر اس بت کو سجدہ کریں۔ جو سجدہ نہ کرے گا۔ اسے اس خندق کی آگ میں ڈال دیا جائیگا۔ چنانچہ اس مردود کے اس حکم سے کئی بزدل اس بت کو سجدہ کر گئے۔ لیکن ایک مسلمان عورت کو جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ بھی تھا۔ جب سامنے لایا گیا تو ؎

گفت اے زن پیش ایں بت سجدہ کن
ورنہ در آتش بسوزی بے سخن

بادشاہ نے کہا۔ اے عورت اس بت کو سجدہ کر۔ ورنہ آگ میں جلنا پڑے گا۔ ؎

بود آں زن پاک دین و مومنہ
سجدۂ آں بت نکرد آں موقنہ

وہ عورت مومن اور پاک دین تھی۔ اس نے اس بت کو سجدہ نہ کیا۔ ؎

طفل زو بستید در آتش فگند
زن بترسید و دل از ایماں بکند

کافروں نے اس سے اس کا بچہ چھین کر آگ میں پھینک دیا۔ عورت بچاری بچے کا یہ حشر دیکھ کر ڈر گئی۔ اور بت کو مجبوراً سجدہ کر لینے پر آمادہ ہو گئی۔ ؎

خواست تا او سجدہ آرد پیشِ بُت!
بانگ زد آں طفل اِنّی لَمْ اَمُتْ

وہ عورت سجدہ کرنے لگی ہی تھی۔ کہ خندق سے اس کے بچے کی

آواز آئی "اے ماں! میں مرا نہیں ؎

اندر آ مادر کہ من اینجا خوشم ❊ گرچہ درصورت میانِ آتشم

اے ماں! تو بھی خندق میں آ! اور دیکھ میں یہاں کس قدر خوش ہوں اگرچہ بظاہر میں آگ میں ہوں ؎

قدرتِ آں سگ بدیدی اندر آ ❊ تا بہ بینی قدرتِ فضلِ خدا

ماں! اس بت پرست کافر کتے کی تو نے قدرت دیکھ لی۔ اب ذرا اس میں آکر فضلِ خدا کی قدرت دیکھ لے۔

اندر آ و دیگراں را ہم بخواں ❊ کاندر آتش شاہ بنہا دست خواں

اے ماں تو بھی آ۔ اور دوسروں کو بھی یہاں آنے کی دعوت دے اور کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آگ میں سب کے لئے اپنی رحمت کا دسترخوان بچھا رکھا ہے۔

یہ سنتے ہی ماں نے خندق میں چھلانگ لگا دی۔ اور پھر وہ بھی بچے کی ہمزبان ہو کر کہنے لگی۔ لوگو! اندر آ جاؤ۔ اور بت کو ہرگز مت پوجو۔ یہ آواز سن کر سب لوگ خندق میں کود گئے۔ اور پھر ایک شعلہ اس خندق سے ایسا برآمد ہوا۔ جس سے وہ سب کافر جل گئے۔ اور مسلمان سب بچ گئے۔

دیکھا میرے بھائیو! یہ آگ بجائے جلانے کے مسلمانوں کے لئے باغ و بہار بن گئی۔ اسی طرح حضرت امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا بھی یہ واقعہ ہے۔ کہ آپ کے عہد میں

پانی پر حکومت

جب مصر فتح ہوا۔ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس کے گورنر مقرر ہوئے۔ تو ایک بار دریائے نیل خشک ہو گیا۔ حضرت عمرو بن العاص نے لوگوں سے پوچھا۔ تو پتہ چلا۔ کہ یہ دریا ہر سال اسی طرح خشک ہو جاتا ہے۔ اور جب تک ایک کنواری خوبصورت لڑکی کو بھینٹ نہ چڑھایا جائے جاری نہیں ہوتا۔ حضرت عمرو بن العاص کو سال بسال ایک قتل ناحق کی جاہلانہ رسم بڑی معلوم ہوئی۔ اور فرمایا۔ صبر کرو۔ دیکھو خدا کو کیا منظور

ہے۔ آپ نے اسی وقت بارگاہِ خلافت میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط لکھا۔ جس میں دریا خشک ہو جانے۔ اور ہر سال ایک کنواری لڑکی کے قتل ناحق کا مفصل واقعہ لکھ دیا۔ ان کا یہ خط جب فاروقِ اعظم کے پاس پہنچا۔ اور آپ نے کیفیت معلوم کی۔ تو اسی وقت ایک خط گورنر مصر حضرت عمرو بن العاص کے نام، اور دوسرا دریائے نیل کے نام تحریر فرمایا۔ مسلمانو! سنا آپ نے کہ ایک خط تو گورنر کی طرف، اور ایک خط دریا کی طرف۔ کیوں صاحب کبھی ایسی حکومت بھی دیکھی سنی۔ کہ پانی کے نام احکام جاری کیے جا رہے ہیں۔ دیکھئے! جو خط آپ نے دریا کے نام لکھا۔ اس کا مضمون یہ ہے۔

مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ عُمَرَ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِلٰى نِيْلِ مِصْرَ۔ اَمَّا بَعْدُ اِنْ كُنْتَ تَجْرِيْ مِنْ قِبَلِكَ فَلَا تَجْرِ وَ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُجْرِيْكَ فَاَسْاَلُ اللّٰهَ الْوَاحِدَ الْقَهَّارَ اَنْ يُجْرِيَكَ۔

(تاریخ الخلفاء صـ۹) یہ خط اللہ کے بندے عمر امیر المؤمنین کی طرف سے دریائے نیل کے نام ہے۔ اے دریا! اگر تو خود مختار ہے۔ اپنی مرضی سے بہتا ہے۔ اور اپنی ہی مرضی سے رک جاتا ہے۔ تو ہمیں تیری کچھ پرواہ اور ضرورت نہیں ہے۔ تو مت جاری ہو۔ اور اگر تمہیں اللہ جاری کرتا ہے تو ہم اللہ ہی سے سوال کرتے ہیں۔ کہ وہ تمہیں جاری کر دے۔"

پھر حضرت فاروق اعظم نے گورنر مصر کے نام یہ حکم لکھا کہ بجائے عورت کی بھینٹ کے یہ میرا خط دریا کے اندر خشک ریت میں ڈال دینا۔ امیر المؤمنین کا یہ انوکھا ارشاد سن کر سارے مصر میں دھوم مچ گئی۔ لاکھوں آدمی یہ منظر دیکھنے کے لئے دریا پر جمع ہو گئے۔ مجمع کثیر کے ساتھ گورنر مصر بھی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ خط لے کر دریا پر پہنچے۔ اور پھر دریا کے اللہ حاکم کے فاروقِ اعظم کا حکمنامہ

دریا کو پہنچا کر وہاں سے باہر چلے آئے۔ چند لحظوں کے بعد دریائے نیل خود بخود اس زور سے جاری ہوا۔ کہ کبھی بھینٹ لے کر بھی ایسا جاری نہ ہوا تھا۔ اور ہر سال سے اس سال چھ گز پانی زیادہ اونچا آیا۔ پھر اس دن سے ایسا جاری ہوا۔ کہ آج تک بند ہونے کا نام نہ لیا۔

دیکھا آپ نے۔ کہ اللہ کے آگے جھک جانے والے فاروق کے حکم کے آگے پانی بھی جھک گیا۔ وہاں پانی آیا۔ تو ایک لڑکی کی جان بچانے کی خاطر، اور اب جو پانی آتا ہے۔ تو سینکڑوں جانیں لے جانے کی خاطر۔ آخر یہ اتنا بڑا فرق کیوں ہے؟ اسی لئے! کہ وہ لوگ خدا کے تھے۔ اور ساری خدائی ان کی تھی۔ آج ہم خدا کے نہ رہے۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہمارا کوئی نہ رہا۔ اور ہم کہیں کے نہ رہے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ اور ایک شیر سوار

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ میں نے جنگل میں ایک آدمی کو دیکھا۔ جو شیر پر سوار تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ کہ یہ شخص شیر پر کس طرح سوار ہوا۔ اور شیر اس کا مطیع و فرمانبردار کیسے ہو گیا؟ فرماتے ہیں اس آدمی نے میری طرف دیکھا۔ اور کہا ؎

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ پیچد نہ گردن ز حکم تو ہیچ

یعنے اللہ کے حکم سے تو منہ نہ موڑ۔ تو تیرے حکم سے کوئی چیز بھی منہ نہ موڑے گی ــــ بھائیو! یہ ہے اللہ کے ہو جانے کی برکتیں۔ تم خدا کا کہا مانو۔ خدائی تمہارا کہا مانے گی۔ اور اگر تم نے خدا کا کہا نہ مانا۔ تو پھر اگر تمہاری بیوی تمہارا کہا نہ مانے۔ تمہاری اولاد تمہارا کہا نہ مانے۔ تو گھبراتے کیوں ہو۔ آخر تم بھی تو ہو۔ جو اپنے مالک کا کہا نہیں مانتے اگر تم نافرمان ہو کر رہنا چاہتے ہو۔ تو اپنی بیوی بچوں کو بھی نافرمان بن کر رہنے دو۔ اور اگر ان کی نافرمانی تمہیں بری لگتی ہے تو تمہاری نافرمانی کیوں بری نہ ہوگی۔ یہ جو آج کل اولاد کی نافرمانی عام ہے

چھوٹے اپنے بڑوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ بڑوں کے احکام کی چھوٹوں کی نظر میں وقعت نظر نہیں آتی۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ کہ آج کل اللہ کی نافرمانی عام ہے۔ ایک بزرگ گھوڑے پر سوار ہونے لگے تو وہ گھوڑا شوخی کرنے لگا۔ فرمانے لگے۔ ہم سے آج ضرور کوئی گناہ ہوا ہے۔ اسی وجہ سے یہ گھوڑا ہماری نافرمانی کرتا ہے۔ بھائیو! تم خدا کے ہو جاؤ۔ تو خدا ساری خلائق کے دلوں میں تمہارا رعب پیدا کردے گا۔ مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقوےٰ گزید
ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

ازالۂ شبہ

میرے بزرگو! عبادتِ الٰہی کے ثمرات بے شمار ہیں۔ لیکن بظاہر اگر ہمیں کوئی ثمرہ نظر نہ بھی آئے۔ تو اس بات سے یہ وہم بھی نہ لانا چاہیئے۔ کہ عبادت کا کیا فائدہ؟ اس لئے کہ عبادت تو ہمیں محض اللہ کی خاطر کرنی ہے۔ نہ کہ دوسرے کسی ثمرہ کی لالچ سے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اللہ کی عبادت کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا فائدہ ہے۔ عبادت کی توفیق مل جانا ہی ایک بہت بڑی نعمتِ الٰہی ہے۔ چنانچہ ایک نیک خاتون کا واقعہ مذکور ہے۔

ایک تہجد گزار بیوی اور اس کا شوہر

کہ وہ تہجد کے وقت نماز پڑھ کر حسب ذیل لفظوں میں دعا مانگ رہی تھی۔

"اے مولا! تجھے اس محبت کا واسطہ جو تجھے مجھ سے ہے۔ مجھ پر اپنی رحمتوں کا نزول فرما"

اس کا شوہر پاس ہی سو رہا تھا۔ اس نے یہ الفاظ سن کر کہا بڑا فخر ہے تجھے اپنے آپ پر۔ کہنا تو یوں چاہیئے۔ کہ تجھے اس محبت کا واسطہ جو مجھے تجھ سے ہے۔ مگر تو کہہ یوں رہی ہے۔ کہ تجھے اس محبت کا واسطہ جو تجھے مجھ سے ہے۔ بھلا تجھے یہ کیسے معلوم ہو گیا۔ کہ خدا کو تجھ سے محبت ہے؟

بیوی نے اپنے شوہر کی یہ بات سن کر اسے جواب یہ دیا۔ کہ اگر خدا کو مجھ سے محبت نہ ہوتی۔ تو وہ اس رحمت کے وقت مجھے جگا کر اپنی عبادت کے لئے کھڑا ہونے کی کبھی توفیق نہ دیتا۔ آپ کو جو اس نے سلائے رکھا۔ اور مجھے جگا کر اپنی عبادت کے لئے کھڑا کر دیا ہے۔ یہی دلیل ہے اس بات کی کہ اُسے مجھ سے محبت ہے۔ تو میرے بھائیو! خدا کی عبادت کی توفیق مل جانا یہ خود ہی ایک بہت بڑا انعام الہٰی ہے لہٰذا عبادتِ الہٰی میں خوب دل لگاؤ۔ اور شیطان کے مختلف وسوسوں کا شکار مت ہو۔ ہمارا کام اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ اور اس عبادت کو قبول فرما لینا اللہ کا فضل و کرم ہے۔ عبادت سے ثمرات کا قصد کبھی نہ کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ پھر تو یہ ایک قسم کی مزدوری ہو گئی ہاں یہ بھی اللہ کا ایک فضل و کرم ہے۔ کہ اپنی عبادت قبول بھی فرما لے۔ اور اس کے دیگر ثمرات بھی عطا فرمائے۔ ہمارا کام تو محض اس کی رضا جوئی کے لئے اس کی عبادت کرنا ہے۔ اور خوب یاد رکھئے۔ بالفرض ہمیں پتہ بھی چل جائے۔ کہ ہماری عبادت قبول نہیں ہوئی۔ تو بھی ہمارا کام اس کی عبادت ہی کرنا ہے۔ اس لئے کہ اس کی عبادت کو چھوڑ کر پھر اور دروازہ ہی کونسا ہے۔ جس کے بھروسے پر ہم یوں کہہ سکیں۔ کہ چلو اگر اس دروازہ سے قبولیت نہیں ملی۔ تو دوسرے دروازہ پر سہی!

ایک عارف کی حکایت

چنانچہ ایک عارف کو غیب سے آواز آئی۔ کہ تمہاری عبادت قبول نہیں ہوئی۔ انہوں نے اس پر بھی عبادت کو نہ چھوڑا۔ بلکہ بدستور اسی طرح پر پھر بھی عبادت کرتے رہے۔ کسی نے ان سے کہا۔ کہ جب آپ کی عبادت قبول نہیں ہوتی۔ تو پھر اس کے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے کیا اچھا جواب دیا۔ بھائی اگر

کوئی اور دروازہ ہوتا۔ تو اس کو چھوڑ کر اس طرف چلے جاتے۔ جب دوسرا دروازہ ہی نہیں۔ پھر اور کہاں جائیں۔ اور کیا چارہ کریں۔

ے

توانی ازاں دل بپرداختن
کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

پس معاً غیب سے آواز آئی کہ جب ہمارے سوا تمہارا اور کوئی نہیں ہے۔ تو خیر جیسی کچھ ہے۔ ویسی قبول ہے ے

قبول است گرچہ ہنر نیستت
کہ جز ما پناہے دگر نیستت

لطیفہ ۱۷ میرے بھائیو! آج وقت ہے۔ اللہ کی عبادت کر کے اپنی عاقبت سنوار لو۔ اور کل قیامت کے دن اگر اللہ کے ہولناک عذاب دیکھ کر پھر یہ درخواست کی۔ کہ الٰہی ہمیں پھر دنیا میں بھیج تاکہ ہم تیری عبادت کریں۔ تو پھر یہ درخواست منظور نہ ہوگی۔ اور یہ وقت لوٹ نہ آئیگا وقت کی قدر کرو اور جو کرنا ہے آج کرلو۔ ورنہ کل قیامت کے دن پچھتانے سے کچھ نہ ہوگا۔ چنانچہ ایک لطیفہ ہے کہ ایک آدمی گھوڑا خریدنے کے لئے منڈی گیا۔ راستے میں اُسے ایک دوست ملا۔ اور اس نے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو۔ تو وہ بولا۔ منڈی جا رہا ہوں۔ گھوڑا خریدونگا۔ دوست نے کہا۔ میاں جب کوئی کام کرنے کا ارادہ ہو۔ تو ساتھ انشاء اللہ ضرور کہنا چاہیئے۔ لہذا یوں کہو۔ کہ انشاء اللہ گھوڑا خریدوں گا۔ وہ بولا۔ واہ بھئی واہ! پرانے خیال کے آدمی نکلے۔ انشاء اللہ کہنے کی کیا ضرورت۔ پیسے میرے پاس موجود ہیں۔ اور گھوڑا منڈی میں موجود ہے۔ منڈی پہنچنے کی دیر ہے۔ بس گھوڑا خریدا ہی سمجھو۔ اس کے دوست نے کہا۔ بھئی یہ تمہاری غلطی ہے۔ کچھ بھی ہو۔ انشاء اللہ ضرور کہنا چاہیئے۔ اس نے کہا۔ تم کچھ بھی کہو۔ میں تو انشاء اللہ نہ کہوں گا۔

چنانچہ وہ منڈی پہنچ گیا۔ اور گھوڑا خریدنے سے پہلے کھانا

کھانے کو ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ ہوٹل میں کسی گرہ کٹ نے اسکی جیب تراش لی۔ اور بٹوہ نکال لیا۔ اسے کچھ پتہ نہ چلا۔ حتےٰ کہ جب اس نے منڈی میں گھوڑے کا سودا کرکے جیب میں ڈالا۔۔۔ تو بٹوہ غائب پایا۔ اب اسے پتہ چلا کہ میں تو لٹ گیا۔ چنانچہ خالی ہاتھ واپس لوٹا۔۔۔

۔۔۔ اتفاقاً راستے میں پھر وہی دوست ملا۔ اور اس نے پوچھا۔ کیوں دوست! گھوڑا نہیں لائے۔ تو وہ بولا۔ بھئی کیا بتاؤں؟ جب منڈی پہنچا۔ انشاء اللہ! تو بھوک لگ گئی انشاء اللہ! اور میں ہوٹل میں گیا انشاء اللہ! اور کھانا کھایا انشاء اللہ۔ تو اس عرصہ میں انشاء اللہ، کسی گرہ کٹ نے انشاء اللہ میری جیب کاٹ لی انشاء اللہ۔ گھوڑے کا سودا کیا انشاء اللہ۔۔ اور جیب میں ہاتھ ڈالا انشاء اللہ۔ تو جیب میں کچھ نہ تھا انشاء اللہ!

دوست نے کہا! میاں اب انشاء اللہ کہنے کا کیا فائدہ! اسی وقت جب میں نے کہا تھا۔ اگر ایک بار بھی انشاء اللہ کہہ دیتے۔ تو کام بن جاتا۔ اور اب چاہے ہزار مرتبہ کہو۔ بیکار ہے۔

تو اے میرے بھائیو! یہ وقت ہے اللہ کی عبادت اور اس کی یاد کا۔ اس وقت کی عبادت کام آئے گی۔ اور کل اگر ہزار بار بھی اس کی بندگی کا اعلان و اقرار کروگے۔ تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ لہٰذا

ے

آج لے اُن کی پناہ، آج مدد مانگ ان سے
کل نہ مانیں گے قیامت میں اگر مان گیا

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

گیارھواں وعظ

دُنیا

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۝

اَمَّا بَعْد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَمَا هٰذِهِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝ (پ ۲۱ ع ۳)

"اور یہ دنیا کی زندگی تو نہیں مگر کھیل کود۔ اور بیشک آخرت کا گھر ضرور ہی سچی زندگی ہے۔ کیا اچھا تھا اگر جانتے"

حضرات! آج میں دنیا کے متعلق کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں نے قرآن پاک کی وہ آیت پڑھی ہے۔ جس میں اللہ تعالےٰ نے اس دنیا ہی کا ذکر فرمایا ہے۔ میرے بھائیو! دیکھو تو! خدا تعالےٰ

نے اس دنیا کو کھیل کود فرمایا ہے۔ چونکہ کھیل اور تماشا وقتی طور پر خوش کن ہوتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے شیدائیوں کو خوش کر دیتا ہے۔ پھر خود بھی باقی نہیں رہتا۔ اور نہ وہ خوشی اور لذت باقی رہتی ہے۔ جو تھوڑی دیر کے لئے حاصل ہوتی تھی۔ اس لئے اللہ نے اس دنیا کو بھی ایک کھیل اور تماشا بیان فرمایا ہے۔ جو تھوڑے عرصہ کے لئے قائم ہے۔ پھر یہ خود بھی فنا ہو جائے گی اور وہ عارضی خوشیاں جو اس کے شیدائیوں کو حاصل ہوئیں۔ وہ بھی فنا ہو جائیں گی۔ اس کے بعد پھر طالب دنیا بجز اس کے کہ کف افسوس ملے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

میرے بزرگو! اس دنیا میں کئی قسم کے کھیل تماشے ہوتے ہیں۔ مثلاً ریچھ، بندر کا تماشا۔ ناٹک کا کھیل، سرکس کے کرتب وغیرہ۔ یہ تماشے گھنٹہ دو گھنٹہ بھر کے لئے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہاں نہ تماشا کرنے والے نظر آتے ہیں اور نہ تماشا دیکھنے والے۔ اسی طرح یہ دنیا کا کھیل ہے۔ کہ ختم ہو جانے کے بعد نہ یہ کھیل رہے گا۔ اور نہ کھیل والے۔ اور یہ دنیا کا کھیل اگرچہ بظاہر سینکڑوں سال زندگی کا ہو۔ مگر مرنے کے بعد اور قیامت آ جانے پر یہ حقیقت کھلے گی۔ کہ یہ ہماری لمبی زندگی بھی در اصل کچھ نہ تھی۔ اصل زندگی تو یہ آخرت کی زندگی ہے۔ چنانچہ لمبی عمر پانے والے مجرمین کل قیامت کے دن یوں کہیں گے۔ اور قسم کھا کر کہیں گے کہ

مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ (پ۲۱ ع۹) نہ رہے تھے مگر ایک گھڑی۔

دیکھا آپ نے یہ اتنی طویل طویل عمریں کل یوں معلوم ہوں گی۔ جیسے ایک پل اور ایک گھڑی۔

میرے دوستو! دنیا ایک کھیل اور فانی چیز ہے۔ اس میں جو کچھ ہے۔ سب کچھ ایک دن فنا ہونے والا ہے۔ مولانا رومی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

آنچہ دیدی برقرار خود نہ ماند
آنچہ بینی ہم نماند برقرار

نادان عاشق

میرے بھائیو! قرآن مجید نے فرمایا ہے۔ کہ دنیا کی زندگی ایک کھیل اور تماشا ہے۔ اور دیکھ لیجئے۔ بعض کھیل اور تماشے ایسے ہوتے ہیں۔ کہ ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ صرف ایک سایہ کی طرح کچھ آتی جاتی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے بائیسکوپ میں سوائے لیمپ کی روشنی اور کاغذی تصویروں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ مگر تماشائیوں کو یہ نظر آتا ہے۔ کہ بڑی جنگ ہو رہی ہے۔ ہزاروں کا خون ہو رہا ہے۔ کہیں شاہی دربار ہے۔ کہیں لاکھوں آدمیوں کا ہجوم ہے۔ کہیں غمی اور کہیں شادی ہے۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ روشنی گل کر دی جائے تو کچھ بھی نہ رہے۔ لیکن اسی غیر اصل اور محض عکس و سایہ ہی کے مناظر پر تماشائی عاشق ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے مناظر کی حقیقت ہے۔ اور یہی حال دنیا کے نادان عاشقوں کا ہے۔ اور اسی طرف مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے اشارہ فرمایا ہے ؎

ہمچو آں ابلہ کہ تاب آفتاب
دید بر دیوار و حیراں شد شتاب
عاشق دیوار شد کایں باضیا است
بیخبر کایں عکس خورشید سما است

فرماتے ہیں۔ جس طرح ایک بے وقوف نے کسی دیوار پر سورج کی روشنی یعنی دھوپ دیکھی۔ تو اس نے سمجھا کہ یہ دیوار ہی روشن ہے اور اس کو دل دے بیٹھا۔ نادان نے یہ نہ سمجھا۔ کہ دیوار ہرگز ایسی نہیں یہ تو سورج کا عکس ہے ؎

چوں باصلش خویش پیوست آں ضیا
ماند دیوارے سیہ ماندہ بجا

پھر جب وہ روشنی اپنے اصل سورج سے مل گئی۔ یعنی دھوپ جاتی رہی۔ تو دیوار ویسی کی ویسی رہ گئی۔ مولانا رومی کا مقصد یہ ہے۔ کہ جس طرح دیوار پر روشنی دیکھ کر نادان یہ جانتے ہیں کہ دیوار میں کچھ ہے۔ لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد دیوار کو بے نور اور سیہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ اسی طرح اہل دنیا، دنیا کو قیامت کے دن مثل سیہ و بے نور دیوار کے دیکھ کر بڑے حیران ہوں گے، اور اپنی نادانی پر پچھتائیں گے۔

دنیا اچھی ہے میرے بزرگو! یہ جو میں نے بیان کیا ہے۔ یہ تو ہے دنیا کی حقیقت۔ مگر یہ دنیا بیکار یا بذاتہ بُری نہیں ہے۔ یہ بُری اس وقت ہے۔ جب کہ انسان اپنے خالق کو بھول کر اسی میں محو ہو جائے۔ اور اس سے دل لگا بیٹھے۔ ایسے شخص کے لئے دنیا دنیا ہے۔ اور بُری دنیا ہے۔ اور جب کہ انسان اپنے خالق و مالک سے دل لگائے رہے۔ اور اس کی ایک دین وعطا سمجھ کر دنیا کو استعمال کرے۔ اور اپنے اللہ کی مرضی کے مطابق اس کو خرچ کرے۔ تو پھر یہ دنیا، دنیا نہیں رہتی۔ بلکہ یہ دنیا بھی دین ہے۔ اور بڑی اچھی دنیا ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دنیا کیا ہے؛ خدا سے غافل ہو جانے کا نام دنیا ہے۔ جس قدر خدا سے غافل کر دینے کے سامان ہیں وہ سب دنیا ہیں۔ یہ چاندی و سونا، بیوی بچے، انکا نام دنیا نہیں ہے۔ ہاں اگر ان کی وجہ سے خدا کو بھلا دیا جائے۔ تو پھر یہ سب کچھ دنیا ہے اور اگر خدا کو نہ بھلایا جائے، تو پھر چاہے چاندی و سونے کے انبار لگے ہوں، وہ ہرگز دنیا نہیں ہے۔ چنانچہ بزرگان دین میں سے ایسے ایسے بھی گزرے ہیں۔ جو بڑے بڑے مالدار اور امیر تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جو پیغمبر و نبی تھے۔

ایک عظیم الشان حکومت کے مالک تھے۔ اور اسقدر دنیوی مال و متاع رکھتے تھے۔ کہ ایک مرتبہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ تو اپنے لشکرِ عظیم کے لئے ہر روز پانچہزار اونٹ، پانچہزار گائے، اور بیس ہزار بکریاں ذبح فرماتے تھے۔ (دیکھئے حیوٰۃ الحیوان صفحہ ۳۴۵ جلد ۲)

حضرت ابراہیم علیہ السلام

اور اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی بڑے امیر تھے۔ اللہ نے آپ کو مال و اولاد سب کچھ عطا فرما رکھا تھا۔ مگر ان میں سے کوئی چیز یادِ حق کی راہ میں حائل نہ تھی۔ بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وقت آنے پر اپنا سب کچھ راہِ حق میں قربان فرما کر دکھا دیا۔ کہ دنیا ہوتے ہوئے بھی جو اللہ والے ہیں۔ اپنے خالق کو کبھی نہیں بھولتے۔ اور خالق و مالک کے ارشاد پر اور اس کی رضا کی خاطر دنیا کی ہر چیز قربان دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لقب "خلیل" کے متعلق علماء نے لکھا ہے۔ کہ آپ کا یہ لقب اللہ نے اسی لئے رکھا۔ کہ

لِاَنَّهٗ سَلَّمَ نَفْسَهٗ اِلَى النِّيْرَانِ وَمَالَهٗ اِلَى الضِّيْفَانِ وَوَلَدَهٗ اِلَى الْقُرْبَانِ وَقَلْبَهٗ اِلَى الرَّحْمٰنِ۔

اس لئے کہ آپ نے اپنی جان کو، رضائے حق کی خاطر آگ میں ڈال دیا۔ اور مال کو راہِ خدا میں مہمانوں پر خرچ کر دیا۔ اور اپنے بیٹے کو خوشنودئ حق کے لئے قربان کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ اور اپنا دل اللہ کی سپرد کر دیا۔"

ایک مرتبہ چند فرشتے بشریت کے لباس میں سائل بن کر درِ اقدس پر حاضر ہوئے۔ اور سُبْحَانَ ذِی الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ۔ سُبْحَانَ ذِی الْعِزَّةِ وَالْعَظَمَةِ وَالْهَيْبَةِ وَالْقُدْرَةِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْجَبَرُوْتِ۔الخ پڑھ کر اللہ کی راہ میں کچھ مانگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے محبوب حقیقی کا نام سن کر بے حد مسرور ہوئے۔ اور فرمایا۔ مجھے میرے محبوبِ حقیقی کا پیارا پیارا ذکر پھر سناؤ۔ فرشتوں نے دجو بشریت کے لباس میں حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی خلّت کو دیکھنے آئے تھے۔) جواب دیا۔ اگر آپ ہمیں کچھ دیں۔ تو ہم پھر وہی پیارا نغمہ سنائیں گے۔ ورنہ نہیں۔ فرمایا میرا یہ بکریوں کا عظیم ریوڑ موجود ہے۔ آدھا ریوڑ لے لو۔ اور مجھے میرے محبوب حقیقی کا نام پھر سناؤ۔ چنانچہ فرشتوں نے پھر وہی نغمہ چھیڑا۔ آپ نے پھر فرمایا۔ ایک مرتبہ اور سناؤ۔ جواب ملا کہ باقی کا آدھا ریوڑ بھی دے دیجئے۔ تو سنائیں گے۔ ورنہ نہیں۔ فرمایا۔ اچھا جاؤ سارا ہی ریوڑ تمہارا۔ تم میرے پیارے کا نام پھر لو۔ اور اسی نغمہ سے پھر مجھے مسرور کرو۔ چنانچہ فرشتوں نے پھر وہی نغمہ چھیڑا۔ اور حضرت خلیل کو مسرور کیا۔ حضرت نے پھر فرمایا۔ کہ ایک بار اور۔ جواب ملا کہ اب تو آپ کے پاس ریوڑ میں سے کچھ باقی نہیں رہا۔ اب آپ کیا دیں گے؟ فرمایا اس ریوڑ کی نگہبانی کے لئے مجھی کو ساتھ لے چلنا۔ مگر محبوب کا نام ضرور سناؤ۔ فرشتوں نے یہ ایثار دیکھا۔ تو جھٹ بول اٹھے۔ کہ حضور! مان لیا۔ واقعی آپ خلیل اللہ ہیں۔ ہمیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہم تو آپ کے ایثار کا جلوہ دیکھنے آئے تھے۔

بزرگو! دیکھا آپ نے۔ یہ دنیا ہے۔ مگر کیسی مبارک دنیا۔ جو اللہ کی راہ میں قربان ہو رہی ہے۔ تو ایسی دنیا برائے نام دنیا ہے۔ ایسی دنیا کو فنا بھی نہیں۔ یہ دنیا کل قیامت کو بھی کام آئے گی۔ یعنی جو کچھ یہاں اللہ کی راہ میں دے دیا۔ وہ اگرچہ بظاہر یہاں سے مٹ جائے گا۔ مگر وہ در اصل باقی رہے گا۔ اور کل قیامت میں کام آئے گا۔ اور ایک ہماری دنیا بھی ہے۔ جس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔

لطیفہ کہتے ہیں۔ کہ ایک آدمی نے ایک مولوی صاحب کے درس میں سنا کہ جو اللہ کی راہ میں ایک دیگا۔ دس پائیگا۔ اس شخص کی جیب میں ایک روپیہ تھا۔ اس نے باہر نکل کر وہ روپیہ کسی فقیر کو دے دیا۔ اور خود گھر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ کہ کوئی آئے۔ اور دس روپے

دے جائے۔ اب اسی انتظار میں جب کوئی آتا ہوا نظر نہ آیا۔ تو لگا مولوی صاحب کو برا بھلا کہنے۔ کہ خواہ مخواہ میرا روپیہ نقصان کرایا۔ اسی غم میں اسے پیچش بھی لگ گئی۔ حاجت ہوئی تو باہر جنگل گیا۔ وہاں اتفاقاً کسی کا گرا ہوا بٹوا دیکھا۔ اسے اٹھایا اور کھول کر دیکھا۔ تو اس میں سے دس روپے نکلے۔ یہ دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور دوسرے دن مولوی صاحب کے درس میں جا کر کہنے لگا۔ مولوی صاحب مسئلہ پورا سنایا کرو۔ مولوی صاحب نے کہا۔ مگر میں نے آدھا مسئلہ کونسا سنایا ہے۔ وہ بولا۔ وہ کل سنایا تھا نا کہ جو اللہ کی راہ میں ایک دے گا۔ دس پائے گا۔ اس کا اگلا حصہ بھی سنایا ہوتا۔ مولوی صاحب نے کہا تو اگلا حصہ کیا ہے؟ تم ہی بتا دو۔ وہ بولا اگلا حصہ یہ ہے کہ "اسے پیچش بھی لگ جاتی ہے"!

دیکھا آپ نے! ایک دنیا یہ بھی ہے۔ جس میں ایسا دل محو ہے۔ کہ ایک روپیہ جانے سے بھی پیچش لگ جاتی ہے۔ خوب یاد رکھو کہ دنیا ہو تو اس میں ایسا دل مشغول نہ ہو۔ کہ اللہ کے احکام پس پشت ڈال دیئے جائیں۔ اور اس کی مرضی کو فراموش کر کے دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ لیا جائے۔ اس قسم کی دنیا، دنیا ہے۔ اور بری دنیا اور ایسی دنیا ہی کو اللہ نے کھیل کود فرمایا ہے۔

مُردار دنیا

اور ایسی ہی دنیا کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مردار اور اس کے طالب کو کتا فرمایا ہے۔ اور محدثین نے اس ارشاد نبوی کی بڑی حکیمانہ تفسیر فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔ حضور نے طالب دنیا کو کتا فرمایا ہے۔ حالانکہ مردار کو کوّا بھی کھاتا ہے۔ پھر حضور نے طالب دنیا کو کتا ہی کیوں فرمایا ہے؟ فرماتے ہیں کوّا مردار کا صرف گوشت ہی کھاتا ہے۔ اور ہڈیاں چھوڑ جاتا ہے۔ مگر کتا مردار کو ہڈیوں سمیت رگڑ جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کا عاشق بھی چونکہ دنیا کی ہڈی تک نہیں چھوڑتا۔ اس لئے طالب دنیا کو کتا فرمایا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے۔ کہ کوا

مردار پر دن کو جھپٹتا ہے۔ رات کو نہیں آتا۔ مگر کتا دن بھی اور رات بھی مردار کے پاس سے نہیں ہٹتا۔ اسی طرح دنیا دار بھی دن رات مردار دنیا کو اپنائے رکھتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے۔ کہ کوا مردار دیکھ کر شور مچاتا ہے اور اپنے بھائیوں کو بھی بلا لیتا ہے۔ اور اس مردار کو سب ملکر کھاتے ہیں۔ مگر کتا جہاں پہنچا۔ دوسرے اپنے کسی بھائی کو بھی قریب نہیں آنے دیتا۔ اسی طرح دنیا دار بھی اکیلا ہی دنیا کا مالک بننا چاہتا ہے۔ کسی اپنے بھائی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔ چوتھی بات یہ ہے۔ کہ کوا اپنے مردہ بھائی کوے کا گوشت نہیں کھاتا۔ اور کتا اپنے بھائی کتے کی لاش کو بھی رگڑ جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا دار بھی اپنے بھائی کا مال بھی کھا جانے میں دریغ نہیں کرتا۔ یہ وجہ ہے۔ جو حضور نے طالبِ دنیا کو کتا فرمایا ہے

میرے بھائیو! ایسی دنیا واقعی مردار ہے۔ اور قابلِ اجتناب ہے۔ آج جو غافل لوگ ناعاقبت اندیشی سے کام لے کر حصول دنیا میں منہمک ہیں، وہ ہوش کریں۔ اور سوچیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اور فانی ہے۔ اس کے لئے آج جو جو جتن کئے جاتے ہیں۔ ذرا غور تو کرو۔ کہ وہ کہاں تک جائز ہیں ہم یہ نہیں کہتے۔ کہ دنیا کے ذرائع و اسباب کو چھوڑ دیا جائے۔ اور مال و دولت کو پاس نہ آنے دیا جائے۔

بھائیو! کہنا تو یہ ہے۔ کہ دائرہ شریعت میں رہ کر جس قدر بھی دنیوی سامان پا سکتے ہو پاؤ۔ جس قدر بھی امیر بن سکتے ہو بنو۔ سب کچھ حاصل کرو۔ مگر خبردار! شریعت کے دائرہ سے قدم باہر نہ نکلنے پائے۔ جہاں شریعت سے قدم ہٹا۔ یہ دنیا ملعون و مردار ہوئی۔ آج رونا ہی اس بات کا ہے۔ کہ لوگ دنیا کے حصول کی خاطر شریعت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ یہ بلیک رشوت، سود، غبن، اور پگڑی وغیرہ سب مردار اور ملعون ہے۔ اور یاد رکھو۔ کہ آج جو جو بھی ایسی حرکتیں کی جاتی ہیں۔ کل ان سب کا حساب دینا پڑیگا۔ آج تم کہیں اندر چھپ کر کسی سے رشوت لے لو۔ لوگوں کی

نظروں میں دھول ڈال کر غبن کر لو۔ خیانت کر لو۔ مگر کل قیامت کے دن یہ سب خفیہ حرکتیں اور پوشیدہ خیانتیں سامنے آجائیں گی۔

نامۂ اعمال اور نامۂ اعمال تمہارے سامنے پیش کرایا جائے گا۔ جس میں ہر چھوٹی بڑی ظاہر و باطن اور عیاں و نہاں حرکت لکھی ہوگی۔ اور یہ نامہ اعمال پیش کر کے کہا جائے گا:۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔ (پ۱۵ ع ۲)

اپنا نامہ پڑھ۔ آج تو خود ہی اپنا حساب کرنے کو بہت ہے!

اور دوسری جگہ اللہ فرماتا ہے:۔

وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ (پ۱۵ ع ۱۸)

اور نامۂ اعمال رکھا جائے گا۔ تو تم مجرموں کو دیکھ لو گے۔ کہ اس کے لکھے سے ڈرتے ہوں گے"

ڈرتے اس لئے ہوں گے۔ کہ اپنا سب کا سب کارنامہ اس اعمالنامہ میں درج ہوگا۔ حتیٰ کہ جو گناہ مخلوق سے چھپ چھپا کر کیا ہوگا۔ وہ بھی اس میں لکھا ہوگا۔ چنانچہ جب مجرم اپنے نامۂ اعمال کو دیکھے گا اور اس میں ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی پائے گا۔ تو کہے گا:۔

يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ـــ (پ۱۵ ع ۱۸)

ہائے خرابی ہماری اس نوشتہ کو کیا ہوا۔ نہ اس نے کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا۔ جسے گھیر نہ لیا ہو۔ اور اپنا سب کیا انہوں نے سامنے پایا ـــ"

نامۂ اعمال پیش کر کے خدا تعالیٰ پھر فرمائیگا۔ کیوں اے بندے! اس نامۂ اعمال میں جو جو کچھ لکھا ہوا ہے۔ کیا تم نے یہ حرکتیں نہیں کیں؟ مجرم عرض کرے گا۔ الٰہی! شاید میرا یہ نامۂ اعمال نہ ہو۔ خدا فرماتے گا۔ نہیں یہ بات نہیں۔ بلکہ یہ نامۂ اعمال تیرا ہی ہے۔ میرے فرشتے جو میں نے تیرے اعمال لکھنے کو تیرے ساتھ مقرر کر رکھے تھے۔ وہ غلطی نہیں کرتے۔ یہ نامۂ اعمال

بالکل صحیح ہے۔ اور تیرا ہی ہے۔ مجرم عرض کرے گا۔ الہیٰ اس پر کوئی گواہ بھی ہونا چاہئے۔ خدا فرمائے گا۔ اچھا لو گواہ بھی پیش کر دیا جاتا ہے چنانچہ وہ حصہ زمین جس پر مجرم نے گناہ کیا ہوگا۔ اس سے کہا جائے گا۔ اے زمین تو شہادت دے۔ کیا اس نے تجھ پر یہ حرکتیں کیں یا نہیں؟ چنانچہ زمین کا وہ حصہ بولے گا۔ اور کہے گا۔ الہیٰ! جو کچھ اس نامۂ اعمال میں لکھا ہے صحیح ہے۔ واقعی اس بندے نے مجھ پر یہ حرکتیں کی ہیں۔ زمین کی اس گواہی کا ذکر اس آیت میں ہے:۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا۔ (پ۳۰ ع ۲۲)

اس دن وہ (زمین) اپنی خبریں بتائے گی۔ اس لئے کہ تمہارے رب نے اُسے حکم بھیجا"

اور اسی طرح حدیث شریف میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے۔ کہ:۔

مَا مِنْ يَوْمٍ مِنْ أَيَّامِ الدُّنْيَا إِلَّا يَقُولُ بِلِسَانِهٖ يَا ابْنَ آدَمَ أَنَا يَوْمٌ جَدِيْدٌ وَ أَنَا عَلٰى مَا تَعْمَلُ فِيَّ شَهِيْدٌ۔۔۔ یعنی دنیا کے دنوں میں سے ہر ایک دن اپنی زبان میں یوں کہتا ہے کہ اے آدم کے بیٹے میں ایک نیا دن ہوں۔ اور مجھ میں جو جو کام بھی تو کرے گا۔ میں اُن کا گواہ بن جاؤں گا"

اس کے بعد خدا تعالےٰ ارشاد فرمائے گا۔ اے بندے! اگر تو مزید گواہی چاہتا ہے۔ تو لے یہ تیرے اپنے اعضاء ہی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تو نے بے شک یہ حرکتیں کیں۔ چنانچہ خدا تعالےٰ مجرم کے منہ پر خاموشی کی مہر لگا کر اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ کو حکم فرمائے گا۔ کہ تم بولو اور گواہی دو۔ کہ اس نے تمہارے ساتھ یہ یہ کام کئے یا نہیں؟ چنانچہ قرآن میں آتا ہے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى أَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَا أَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (پ۲۳ ع ۳)

آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے۔ اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے۔ اور ان کے پاؤں ان کے کئے کی گواہی دیں گے۔"

اس کے بعد مجرم حیران رہ جائے گا۔ اور جھنجلا کر اپنے اعضاء سے مخاطب ہو کر کہے گا۔ کہ میں تمہارے ہی بچاؤ کے لئے تو اتنے حیلے کر رہا تھا۔ مگر تم نے بھی میرے خلاف شہادت دے دی۔ چنانچہ دوسری جگہ قرآن پاک میں آتا ہے:۔

شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ - وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (پ۲۴ ع ۱۷)۔

ان کے کان اُن کی آنکھیں اور ان کے چمڑے سب ان پر ان کے کئے کی گواہی دینگے۔ اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے۔ تم نے ہم پر کیوں گواہی دی۔ وہ کہیں گی۔ ہمیں اللہ نے بلوایا ہے۔ جس نے ہر چیز کو گویائی بخشی ہے۔

اس کے بعد خداوند کریم فرمائے گا۔ کیوں اے بندے! اب کیا خیال ہے۔ اور دیکھ ان گواہوں کے علاوہ تیری بداعمالیوں پر میں خود بھی گواہ ہوں۔ بتلا اب تو کیا کہنا ہے؟ بھائیو! سوچ لو۔ کہ اس وقت پھر مجرم کا کیا حال ہوگا؟

مادہ پرستوں کو جواب

یہاں مادہ پرست یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ صاحب! ہاتھ پاؤں، اور چمڑے کا بولنا عقل میں نہیں آتا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ ہاتھ پاؤں اور چمڑہ بول سکے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ تم ذرا اپنے گراموفون ریکارڈ ہی کو دیکھ لو۔ وہ ریکارڈ کیا ہے؟ ایک مٹی اور مصالحہ ہی تو ہے۔ مگر جب تمہاری سائنس کی سوئی اس پر لگتی ہے۔ تو وہ مٹی اور مصالحہ کا بے جان ٹکڑا بولنے لگتا ہے۔ گاتا

ہے۔ چلاتا ہے۔ اور طرح طرح کے شعر اور تقریریں سناتا ہے۔ تو بتاؤ۔ اس مٹی کے ٹکڑے میں یہ قوتِ گویائی کیسے پیدا ہو گئی؟ اگر تمہاری سائنس میں یہ طاقت ہے۔ کہ وہ ایک چھوٹی سی سوئی کے ذریعہ ایک مٹی کے بے جان ٹکڑے کو بلوا سکتی ہے۔ تو خداوند قادر و توانا میں کیا طاقت نہیں۔ کہ وہ اپنی قدرت کی سوئی سے ہاتھ پیر اور چمڑے کو بلوا سکے؟ ہے اور یقیناً ہے۔ مگر افسوس کہ ایسے لوگ شانِ ایزدی سے بے حد غافل ہیں۔

انگوٹھے کی مثال

میرے بزرگو! ایک مثال اور سنو! — یہ جو منی آرڈر فارموں پر بجائے دستخط کے انگوٹھے کا نشان لگایا جاتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ دراصل اس بات کی تصدیق کا نشان ہے۔ کہ منی آرڈر فارم پر درج شدہ رقم فلاں صاحب نے وصول کر لی۔ اب ذرا خیال فرمایئے۔ کہ ایک شخص نے رقم وصول کر لی۔ اور اپنا نشان انگوٹھا لگا دیا۔ مگر بعد میں وہ انکار کر گیا۔ کہ میں نے رقم نہیں لی۔ تو اب اس کو غلط ثابت کرنے کے لئے گواہی کس سے لی جائے گی۔ سب جانتے ہیں۔ کہ گواہی اس انگوٹھے سے لی جائے گی۔ یعنی اس کے انگوٹھے کا نشان اس امر کی شہادت دے گا کہ اس نے رقم وصول کر لی ہے۔ یہ جو انکار کر رہا ہے غلط کہہ رہا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس نے رقم وصول کر لی ہے۔ گویا وہ انگوٹھا بولے گا۔ اور اس انکار کنندہ کو جھوٹا ثابت کر دے گا۔ اور فیصلہ بھی انگوٹھے کی گواہی پر ہی کیا جائے گا۔ تو بھائیو! آج اگر تمہارا انگوٹھا کسی تنازعہ میں گواہی دے سکتا ہے۔ تو کل اللہ کے حکم سے یہ گواہی کیسے نہ دے سکے گا؟

شاہد نبی

مسلمانو! سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ ہماری سب حرکتیں ہمارے آقا و مولیٰ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ دیکھ لیجئے۔ خدا تعالیٰ نے حضور کو فرمایا ہے:-

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا۔ (پ۲۲ع۲) اے پیارے نبی! ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا"

اور شاہد کہتے ہیں حاضر کو۔ دیکھ لیجئے۔ نماز جنازہ میں پڑھا جاتا ہے:۔
اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَ مَیِّتِنَا وَ شَاهِدِنَا وَ غَآئِبِنَا الخ۔
یعنی اے اللہ بخش دے ہمارے زندہ اور مردہ کو۔ اور ہمارے حاضر اور غائب کو۔

اور شاہد دیکھنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ دیکھ لیجئے یوں کہا جاتا ہے میں نے فلاں چیز کا مشاہدہ کر لیا ہے۔ یعنے دیکھ لیا ہے۔ تو گویا ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم حاضر بھی ہیں اور ناظر بھی۔ اور ہمارے اعمال وحرکات کو ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ پھر کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ ہم برے کاموں کا ارتکاب کریں۔ اور حضور سے مطلق نہ شرمائیں ؎

دن لہو میں کھونا تجھے شب صبح تک سونا تجھے
شرم نبی، خوف خدا، یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

ایک انگریز اور ایک بھکاری

مجھے یہاں دہلی کی جامع مسجد کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ یہ واقعہ میں نے ایک اردو رسالہ میں پڑھا تھا۔ آج سے تقریباً سو سال پہلے ایک انگریز دہلی کی جامع مسجد دیکھنے کے لئے آیا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ایک بھکاری بیٹھا تھا۔ جس نے انگریز سے براہ خدا کچھ مانگا۔ انگریز نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور بٹوا نکالا۔ اور بٹوے میں سے ایک چونی نکال کر بھکاری کو دی۔ اور پھر جلدی سے مسجد کے اندر چلا گیا۔ بھکاری نے دیکھا۔ کہ انگریز نے جلدی میں بٹوا جو جیب میں ڈالا۔ تو وہ بٹوا بجائے جیب کے نیچے گر پڑا ہے۔ اور سیڑھیوں پر پڑا ہے۔ بھکاری اٹھا۔ اور بٹوا اٹھا کر انگریز کو دینے کے لئے اس کے پیچھے دوڑا۔ مسجد کے اندر گیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ وہ انگریز مسجد کو دیکھ کر دوسرے دروازے سے نکل کر چلا گیا ہے بھکاری نے بہتیری تلاش کی۔ مگر وہ انگریز نہ مل سکا۔ چھ مہینے کے بعد

وہی بھکاری سیڑھیوں پر اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ کہ وہی انگریز بازار میں جاتا ہوا اسے نظر آیا۔ بھکاری فوراً اٹھا۔ اور اس انگریز کے پاس پہنچ کر وہی بٹوا پیش کرتے ہوئے بولا۔ کہ صاحب! آج سے چھ ماہ قبل آپ جامع مسجد دیکھنے کو آئے تھے۔ اور مجھے بھیک دیتے ہوئے آپ نے یہ بٹوا نکالا تھا۔ اور پھر جلدی میں جو جیب میں ڈالا۔ تو یہ نیچے گر گیا تھا۔ میں نے آپ کی اسی دن بڑی تلاش کی تھی۔ مگر آپ نہ مل سکے تھے۔ آج اتفاقاً آپ نظر آ گئے۔ اور میں آپ کی امانت لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔ انگریز حیران رہ گیا۔ اور بٹوہ جو کھول کر دیکھا تو ساری نقدی اس میں محفوظ تھی وہ اور بھی متعجب ہوا۔ اور پوچھا۔ تم چاہتے تو اسے رکھ بھی سکتے تھے مجھے تو علم ہی نہ تھا۔ کہ تم نے اسے اٹھایا ہے۔ پھر اس امانت و دیانت کی کیا وجہ ہے؟ بھکاری نے جواب دیا۔ بات یہ ہے صاحب! آپ عیسائی ہیں۔ اور میں مسلمان ہوں۔ آپ کے پیغمبر عیسٰے علیہ السلام آسمان پر اللہ کے پاس ہیں۔ اور میرے پیغمبر حضور علیہ السلام بھی اللہ کے پاس ہیں۔ مجھے بٹوہ اٹھاتے ہوئے اور کسی نے تو نہ دیکھا تھا۔ مگر اللہ نے ضرور دیکھا تھا۔ میں نے سوچا۔ کہ اگر میں نے یہ بٹوہ رکھ لیا۔ تو اللہ تعالےٰ میرے پیغمبر سے فرمائے گا۔ دیکھ لے محمد (صلے اللہ علیہ و سلم) تیرے امتی نے عیسٰے (علیہ السلام) کے ایک امتی کا بٹوہ رکھ لیا ہے۔ تو میرے پیغمبر کو اس شکایت سے رنج و ملال ہو گا۔ اور حضرت عیسٰے علیہ السلام کے سامنے انہیں ندامت ہو گی۔ بس اسی خیال سے میں یہ بٹوہ اسی روز سے سنبھالے ہوئے ہوں۔

دیکھئے حضرات! ایک زمانہ تو یہ تھا۔ کہ ہمارے بھکاری امانت دار تھے۔ اور آج وہ زمانہ ہے۔ کہ بڑے بڑے بھی خائن ہیں اگر آج کوئی ایسی چیز مل جائے۔ تو اسے مال غنیمت سمجھ کر ہڑپ کر جاتے ہیں۔ عربی زبان میں "بیت المال" کا معنی ہے۔ "مال کا گھر" مگر آج کل ہمارے "امینوں" نے اس کا معنی یہ کر دکھایا ہے۔ "گھر کا مال" چنانچہ

اسی چیز کو میں نے ایک رباعی میں لکھا ہے۔ کہ ؎

آپ کا افسوس کیسا، اور شکایت کس لیئے
اپنی اپنی ہے سمجھ اور اپنا اپنا ہے خیال
کیا ہوا گر مال بیت المال میں پہنچا نہیں
معنی "بیت المال" کا لیڈر نے سمجھا "گھر کا مال"

بہر حال بھائیو! اس دنیا میں منہمک ہوکر خلاف شرع حرکات کا ارتکاب کر کے اس بات سے مطمئن نہ ہو جاؤ۔ کہ تمہیں ان حرکات کا جواب نہ دینا پڑے گا۔ اور تمہاری ایسی حرکات پر اگر تمہاری چالاکیوں سے یہاں گرفت نہیں ہو سکی۔ تو کل بھی گرفت نہ ہوگی۔ یاد رکھو کل کا دن حساب کا دن ہے۔ جو کام یہاں کرو گے۔ اچھا یا برا کل اس کا انجام ضرور دیکھو گے۔ یہ دنیا مثل ایک کھیتی کے سمجھو۔ آج اس میں جو بھی بوؤ گے۔ کل وہی کاٹو گے۔ چنانچہ ایک پنجابی شاعر لکھتا ہے ؎

دنیا کھیتی آخر سیتی، خود حضرت فرماوے
جیہا اس وچ بیجے کوئی تیہا ہی پھل پاوے
جے توں اس وچ محنت کر کے بیجیں اج دہاڑے
ھلکے تیرے تائیں ہوسن بوہل تے کھلواڑے
بیج صدق دا بہتا پائیں، چنگی کریں ہٹائی
جو کچھ بیجیں چنگا بیجیں برا نہ بیجیں بھائی

دنیا میں دل نہ لگاؤ

حضرات! یہ دنیا جسے رب نے صرف کھیل کود بیان فرمایا ہے۔ اس میں اپنا دل نہ لگاؤ۔ اس میں اس طرح دل لگا لینا۔ کہ خدا یاد ہی نہ رہے۔ بہت برا ہے۔ اور اس کا نتیجہ بڑا ہی ہولناک ہے۔ دنیا کو حاصل کرو اور اسے استعمال کرو۔ مگر خدا کو کسی حال میں بھی نہ بھولو۔ دنیا بری نہیں ہے۔ اسے برا بنا لیا جاتا ہے۔ اگر شریعت کے مطابق اسے حاصل کیا جائے۔ اور خرچ کیا

جائے۔ تو دنیا اچھی دنیا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے۔ جیسے کشتی کے لئے پانی ضروری ہے۔ پانی نہ ہو تو کشتی کا تیرنا مشکل ہے۔ مگر یہ پانی کشتی سے باہر باہر رہے تو اسے تیرائیگا۔ اور اگر یہی پانی کشتی کے اندر آجائے۔ تو اسے لے ڈوبے گا۔ اسی طرح دنیا انسان کے لئے بھی درکار ہے۔ اگر روپیہ پیسہ نہ ہو۔ تو حج کیسے کیا جائے۔ زکوٰۃ کیسے دی جائے۔ غرباء و مساکین کی خدمت کیسے کی جائے۔ گویا یہ روپیہ پیسہ ان نیک کاموں کے پورا کرنیکا ایک ذریعہ ہے۔ مگر یہ روپیہ پیسہ اگر دل سے باہر باہر رہا تو انسان کو تیرا گیا۔ اور اگر مثل قارون کے اس کی محبت دل کے اندر سما گئی۔ تو سمجھو بیڑا غرق ہوا۔

عربی اشعار بھائیو! اس دنیائے فانی میں محو ہو کر عاقبت کو بھول جانا سب سے بڑی غفلت ہے۔ موت ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ مرنے کا خیال تک بھی باقی نہ رہا۔ اور اس دنیائے فانی کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے۔ حضرت ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

یَا مَنْ بِدُنْیَاہُ اشْتَغَلْ قَدْ غَرَّہٗ طُوْلُ الْاَمَلْ
اَوَلَمْ یَزَلْ فِیْ غَفْلَۃٍ حَتّٰی دَنٰی مِنْہُ الْاَجَلْ
اَلْمَوْتُ یَاْتِیْ بَغْتَۃً وَالْقَبْرُ صُنْدُوْقُ الْعَمَلْ

مطلب ان اشعار کا یہ ہے۔ کہ اے دنیا میں مشغول و منہمک ہو جانے والے اور حرص و آز کی قید میں متردد و غافل ہو جانیوالے تیری غفلت کی بھی کوئی انتہا ہے۔ موت قریب ہے۔ اور تو غفلت میں پڑا ہے۔ یاد رکھ! موت اچانک آجانے والی ہے۔ اور قبر میں تجھے جانا پڑے گا۔ جس میں عمل ہی کام آئیں گے۔"

عبرتناک اشعار ایک شاعر کہتا ہے۔ کہ مجھے ایک بار میری خواہش و حرص نے یہ کہا۔ کہ تیرے پاس مال دنیا کثرت کے ساتھ ہے۔ اٹھ اور عیش و عشرت کی دنیا بسا۔ یہ عاقبت کا خیال اور انجام کی فکر چھوڑ اور خوب مزے اڑا۔ واعظوں کے پند و نصائح کو پس پشت ڈال۔ اور ہر

قسم کا فکر و غم دل سے نکال۔ جام دمے کو ہاتھ میں لے اور سرور و کیف کی دنیا میں کھو جا۔ چنانچہ وہ شاعر لکھتا ہے ؎

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
کیا زمینِ طوس اور کیا سرزمینِ روس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجے زندگی
اس طرف آوازِ طبل اودھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہوئے گلگوں کا دور
شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے

شاعر کہتا ہے۔ کہ میری حرص و ہوس نے جب مجھے عیش و عشرت اور ناعاقبت اندیشی و غفلت پر ابھارا۔ اور میں اس کیلئے تیار ہو گیا۔ تو ؎

ناگہاں عبرت پکاری اک تماشہ میں تجھے!
چل دکھاؤں تو جو تو قیدِ آز کا محبوس ہے

عبرت نے میرے کان پکڑ لئے اور مجھ سے کہا۔ کہ عیش و عشرت کی زندگی اختیار کرنے سے پہلے تو میرے ساتھ چل۔ میں تمہیں ایک تماشہ دکھاؤں گی۔ وہ منظر و تماشہ دیکھ لینے کے بعد پھر تجھے اختیار ہے۔ جو چاہے کرنا۔ شاعر کہتا ہے۔ میں نے کہا اچھا چل لے چل ؎

لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف!
جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے!
مرقدیں دو تین دکھلا کر مجھے کہنے لگی!
یہ سکندر ہے، یہ دارا ہے، یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمتِ دنیا سے آج
کچھ بھی اُن کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

شاعر کہتا ہے۔ کہ میں نے یہ عبرت ناک نظارہ دیکھا اور بیحد متاثر ہُوا۔ اور اپنے عیش و عشرت اور غفلت کے ارادہ سے باز آگیا۔

مسلمانو! خوب یاد رکھو یہ دنیا فانی ہے اور ایک دن اسے چھوڑ

کر مرنا ہے۔ اپنی عاقبت کی فکر کرو۔ اور دنیا کے عیش و آرام میں پڑ کر موت اور خدا کو مت بھولو۔ یہ غفلت بہت بری ہے۔ اور اس کا نتیجہ بڑا ہولناک ہے۔

مغربی قومیں ممکن ہے۔ نئی تہذیب کے شیدائی اس موقعہ پر یہ کہنے لگیں۔ کہ یہ مولوی بھی عجیب خیال کے لوگ ہیں۔ مغربی قوموں کو دیکھو۔ کس طرح عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور پھر ترقی و عروج بھی انہیں حاصل ہے۔ مگر یہ مولوی ہمیں اس دنیا کی عیش و عشرت سے روکتے ہیں۔ بھائیو! تمہیں عیش و آرام کی زندگی سے کون روکتا ہے۔ مولوی تو یہ کہتے ہیں۔ کہ شریعت کے دائرہ میں رہ کر جو جائز عیش ہے۔ وہ حاصل کرو۔ آرام کی زندگی بسر کرو۔ مگر دائرہ شریعت سے باہر مت نکلو۔ مولوی تمہیں شریعت کی پابندی کی تاکید کرتے ہیں۔ شریعت کا دامن چھوڑ کر جو بھی عیش و عشرت ہے وہ ناجائز ہے۔ اور موجب تباہی و بربادی ہے۔ یہ بلیک و رشوت، سود اور پگڑیاں، سب شریعت کے خلاف ہیں۔ ان چیزوں کو مغربی قومیں اگر اپناتی ہیں۔ تو اپنائیں۔ مگر جو مسلمان ہے۔ اسے ان چیزوں سے اجتناب کرنا ہی پڑیگا۔ اور پھر ایک اور بات بھی ہے۔ کہ جس طرح سب کی شکلیں الگ الگ، اور عادات و اطوار الگ الگ ہیں۔ اسی طرح مزاج بھی سب کے الگ الگ ہیں۔ کافر کا مزاج اور ہے اور مسلمان کا مزاج اور ہے۔ ترقی و عروج پانے کے لئے ہم کافروں ہی کی طرف کیوں دیکھیں۔ کہ ان لوگوں نے ترقی کیسے پائی۔ اپنے بزرگوں کی طرف کیوں نہ دیکھیں۔ جنہوں نے شریعت کے دائرہ میں رہ کر ترقیاں حاصل کیں۔ یہ بلیک۔ رشوت، اور سود وغیرہ حرام چیزیں کافر کے لئے موجب ترقی ہوں تو ہوں۔ مگر مسلمان کے لئے یہ چیزیں ہرگز موجب ترقی نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ ایک لطیفہ سنئے۔

لطیفہ ایک حکیم جی کا کسی گاؤں میں گزر ہوا۔ تو دیکھا۔ ایک گنوار نے چنے کی موٹی موٹی روٹیاں سات آٹھ

کھائیں۔ اور ان پر ایک بہت بڑا لسی کا بھرا ہوا پیالہ غٹا غٹ پی لیا۔ حکیم صاحب نے کہا۔ اب تیری خیر نہیں لسی کو درمیان میں پینا چاہیئے تھا۔ یہ سن کر گنوار نے روٹی لانے والے کو آواز دی۔ کہ ارے چار روٹ اور لے آ۔ حکیم یوں کہتا ہے۔ کہ لسی کو بیچ میں کر لے۔ میں بیچ میں کر لوں۔ چنانچہ چار موٹی موٹی روٹیاں آگئیں۔ اور گنوار نے وہ بھی صاف کر دیں۔ اور حکیم صاحب سے کہا۔" بس اب تو لسی بیچ میں ہوگئی۔" حکیم جی یہ منظر دیکھ کر کہنے لگے۔ بھائی تو چاہے بیچ کر یا اوپر۔ حکمت کا قاعدہ تیرے لئے نہیں ہے۔ جس کا معدہ ہی اس قسم کا ہو۔ اس کے لیئے سب جائز ہے۔ مگر کوئی شہری ایسا نہیں کر سکتا؛ بعینہٖ کافر کا مزاج ہی اس قسم کا ہوتا ہے۔ کہ بلیک، رشوت سود اور سور وغیرہ سب حرام چیزیں اسے راس آ جاتی ہیں۔ مگر مسلمان کا مزاج مزاجِ لطیف ہے۔ اس قسم کی حرام چیزیں اس کے لئے بجائے فائدے کے نقصان دِہ ثابت ہوں گی۔ اور شریعت کے قاعدے کافر کے لئے نہیں۔ مسلمان کے لئے ہیں۔ پھر جو لوگ ان حرام چیزوں کے استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ وہ سوچ لیں کہ وہ مزاج مسلمانوں کا رکھتے ہیں یا کافروں کا۔

ترقی کا ہیضہ

میرے بھائیو! مغربی قوموں نے جو برائے نام ترقی حاصل کی ہے۔ یہ ترقی کیا ہے۔ در اصل ترقی کا ہیضہ ہے۔ عورت کو اس طرح آزاد کر دینا کہ جس کے ساتھ چاہے چلی جائے۔ کلب میں رات بھر ناچتی رہے۔ خاوند کی پروا تک نہ کرے۔ کیا یہ ترقی ہے؟ نہیں۔ یہ تو انتہائی بے غیرتی ہے۔ یورپ کی اس قسم کی ترقی آج برائے نام مسلمان بھی حاصل کرنے چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ ترقی تو ترقی کا ہیضہ ہے۔ مریض ہیضہ کی حرارت کم اور نبض سست پڑ جاتی ہے مریضِ ترقی کی بھی اسلامی حرارت کم اور دینی نبض سست پڑ جاتی ہے مریضِ ہیضہ کو اسہال لگ جاتے ہیں۔ اور قے آنے لگتی ہے۔ مریضِ

ترقی کو بھی الحاد کے اسہال لگ جاتے ہیں۔ اور ارتداد کی قے آنے لگتی ہے۔ مریضِ ہیضہ کی پیاس نہیں بجھتی۔ مریضِ ترقی کی بھی پیاس نہیں بجھتی۔ حتیٰ کہ رمضان شریف میں بھی پیتا ہے۔ اور غریبوں کا لہو بھی پیتا ہے۔ مریضِ ہیضہ پلنگ پر تڑپتا ہے۔ اور مریضِ ترقی کلب میں ناچتا ہے۔ مریضِ ہیضہ چیختا چلاتا ہے۔ مریضِ ترقی فلمی گانے گاتا ہے۔ مریضِ ہیضہ ایک متعدی قسم کا مرض ہے۔ مرضِ ترقی بھی ایک متعدی مرض ہے۔ چنانچہ میاں کو یہ مرض لگ جائے۔ تو بیوی بچے بھی اس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ؎

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے
خصوصاً اس ترقی کی وبا سے

بے وفا دنیا

بھائیو! یہ دنیا بڑی بے وفا ہے۔ چنانچہ ایک حکایت ہے کہ ایک بڑا امیر آدمی جو نشۂ دولت میں بڑا مغرور تھا۔ اور خدا کو بھولا ہوا تھا۔ عید کے روز اپنی بیگم صاحبہ کیساتھ کھانا کھانے بیٹھا۔ تو دروازے پر ایک سائل آگیا۔ جس نے بڑی عاجزی سے سوال کیا اور کہا۔ دو دن سے بھوکا ہوں۔ آج عید کا دن ہے۔ خدا را مجھے کھانا کھلاؤ۔ امیر آدمی اس سائل کی آواز سن کر بڑا غصے میں آگیا۔ اور کہنے لگا۔ یہ سائل کمبخت عید کے دن بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ پھر نوکر کو بلایا۔ اور اس سے کہا۔ کہ اس فقیر کو دھکے دے کر دروازے سے نکال دو۔ چنانچہ نوکر نے ایسا ہی کیا۔ اور فقیر کو دھکے دے کر نکال دیا۔ اس امیر کی یہ مغرورانہ حرکت خدا کو پسند نہ آئی۔ اور خدا کی غیرت جوش میں آئی۔ کچھ دنوں بعد اس امیر آدمی کے کاروبار میں نقصان واقع ہونا شروع ہوا۔ اور اس کی تمام جائداد اسی خسارے کے کام آنے لگی۔ آج یہ دکان ہاتھ سے نکلی تو کل وہ دکان قبضہ سے گئی۔ حتیٰ کہ کچھ دنوں کے بعد اس شخص کی ساری جائیداد نیلام و قرق ہوگئی۔ اور وہ پائی پائی کا محتاج ہو گیا۔ خدا کی

شان، چند روز پہلے جو بڑا امیر آدمی تھا۔ وہ آج مفلس و قلاش ہوگیا۔ اور اسے فاقے پر فاقے آنے لگے۔ ایک دن اس کی بیوی نے کہا۔ کہ اب تو آپ اپنی روٹی بھی مہیا نہیں کر سکتے۔ پھر مجھے کیوں ساتھ ساتھ لٹکائے پھر رہے ہو۔ مجھے طلاق دے دیجئے۔ تاکہ میں کسی دوسرے سے نکاح کرکے اپنی زندگی تو آرام سے گزاروں۔ چنانچہ اس شخص نے اپنی بیوی کو بھی طلاق دے دی۔ اور وہ بالکل تنہا رہ گیا۔ اس بیوی نے عدّت گزار کر کسی دوسرے امیر آدمی سے نکاح کر لیا۔ ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ اور پھر عید کا دن آیا۔ اور یہ عورت اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھی۔ خدا کی شان یہی عورت پچھلے سال کی عید کے دن پہلے خاوند کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ اور آج اس عید کے دن دوسرے خاوند کے ساتھ بیٹھی کھانا کھاتی نظر آئی۔

(اتفاقاً) دیکھئے۔ کہ ان کے دروازے پر بھی ایک فقیر آگیا۔ اور اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ کہ میں چار روز سے بھوکا ہوں۔ خدا را مجھے کھانا دیجئے۔ اس دوسرے شوہر نے اپنی بیوی سے کہا۔ کہ پہلے اس فقیر کو کھانا بھجواؤ۔ ہم پھر کھا لیں گے۔ چنانچہ بیوی اٹھی۔ اور اتفاقاً اسکی نظر دروازے پر کھڑے فقیر پر پڑ گئی۔ اور اسے دیکھتے ہی چیخ مار کر گر گئی۔ اور بیہوش ہوگئی۔ شوہر دوڑا اور منہ پر پانی کے چھینٹے دے کر اسے ہوش میں لایا۔ اور اس سے پوچھا۔ کہ تم بیہوش کیوں ہو گئی اور یہ کیا قصہ ہے؟ بیوی نے روتے ہوئے جواب دیا۔ یہ جو باہر فقیر کھڑا ہے۔ یہ پچھلے سال میرا شوہر تھا۔ اور میں اس کی بیوی۔ گزشتہ سال کی عید کے دن ہم دونوں کھانا کھا رہے تھے۔ کہ ہمارے دروازے پر ایک فقیر آگیا۔ اس نے نشۂ دولت میں آکر اسے دھکے دے کر نکلوا دیا۔ آج یہ اپنے اس غرور کی سزا بھگت رہا ہے۔ کہ خود در بدر کی بھیک مانگ رہا ہے۔ شوہر بولا ـــــ اچھا یہ بات ہے۔ تو لو اللہ کی شانِ بے نیازی کا ایک اور بھی نظارہ کر لو۔ مجھے پہچانو۔ میں کون ہوں؟ دیکھو میں وہی فقیر ہوں۔ جسے تمہارے

خاوند نے دھکے دے کر نکلوا دیا تھا۔ خدا نے تمہارے خاوند کی جگہ مجھے بٹھا دیا۔ اور میری جگہ تمہارے اس پہلے خاوند کو بٹھا دیا ہے۔

دوستو! دیکھا آپ نے اس دنیا کی ناپائیداری اور بے وفائی کو۔ اعلیحضرت فاضل بریلوی نے کیا خوب لکھا ہے ؎

شہد دکھلائے زہر پلائے قاتل ڈائن شوہر کش

کس مردار پہ تو للچایا، دنیا دیکھی بھالی ہے

سلطان ابراہیم ابن ادہم کی حکایت

حضرات! دنیا میں انہماک اور مال و دولت میں محویت سے خدا کا پانا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے مثنوی شریف میں سلطان ابراہیم ابن ادہم کی حکایت لکھی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بر سرِ تختے شنید آں نیک نام

طقطقے و ہائے ہوئے شب ز بام

یعنی تخت پر لیٹے ہوئے سلطان ابراہیم نے کوٹھے پر رات کے وقت کھٹ پٹ اور شور و غل سنا ؎

گامہائے تند بر بامِ سرا!

گفت با خود ایں چنیں زہرہ کرا

گھر کے کوٹھے پر بہت زور سے قدم سنے تو اپنے دل سے کہنے لگے کہ اتنی مجال کس کی ہے۔ مطلب یہ کہ ایک مرتبہ رات کو حضرت ابراہیم ابن ادھم شاہی مسند پر سو رہے تھے تو انہوں نے چھت پر کسی کے پاؤں کی آواز سنی۔ کہ خوب زور سے کھٹ پٹ کرتا چھت پر پھر رہا ہے۔ تو انہوں نے اپنے دل میں کہا۔ کہ ارے یہ کون ہے؟ اور کس کی ہمت ہے کہ میں بادشاہِ وقت ہوں۔ اور پھر یہ رات کو اسطرح چھت پر بے دھڑک پھر رہا ہے۔ ؎

بانگ زد بر روزنِ قصر او کہ کیست

ایں نباشد آدمی مانا پریست

انہوں نے محل کی کھڑکی میں سے آواز دی کہ کون ہے، یہ آدمی تو ہے نہیں۔ شاید جن ہے۔ ؎

سر فرو کردند قومے بوالعجب
ماہی گردیم شب بہرِ طلب

ایک عجیب قوم یعنی فرشتوں نے سر لٹکایا۔ اور کہا کہ ہم رات کو تلاش میں پھر رہے ہیں۔ حضرت سلطان ابراہیم نے دریافت کیا۔ ؎

ہیں چہ مے جوئید گفتند اشتراں!
گفت اشتر بام بر کہ جست ہاں

کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ تو وہ بولے کہ اونٹ ڈھونڈ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ارے اونٹ کو کوٹھے پر کس نے ڈھونڈا ہے۔ مطلب یہ کہ اونٹ کو کوئی کوٹھے پر بھی ڈھونڈتا ہے۔ وہ یہاں کیسے مل سکتا ہے۔ بالکل بے جوڑ سی بات ہے۔ ؎

پس بگفتندش کہ تو بر تخت وجاہ
چو ہمی جوئی ملاقات اللہ!

انہوں نے جواب دیا کہ تم جاہ و دنیا کے تخت پر خدا کی ملاقات کی کس طرح تلاش کرتے ہو؟ مطلب یہ کہ اگر ہمارا اس جگہ اونٹ تلاش کرنا بے جوڑ ہے۔ تو اسی طرح تمہارا تخت و تاج اور مال و دولت میں رہ کر خدا کی تلاش کرنا بھی ایسا ہی بے جوڑ ہے۔ یہاں کوئی صاحب یہ شبہ نہ کریں۔ کہ خدا کو پانے کے لئے تخت و تاج اور امارت و دولت کا نہ ہونا ضروری ہے۔ نہیں یہ بات نہیں۔ میں کہہ چکا۔ کہ دنیا وہ بری ہے۔ جس میں محو ہو کر خدا کو بھلا دیا جائے۔ اور اگر دنیا میں رہ کر خدا کی یاد بھی بدستور قائم رہے۔ تو وہ دنیا بری نہیں۔ حضرت سلطان ابراہیم کے واقعہ سے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ تخت و تاج میں انہماک اور مال و دولت میں محویت یہ وصال حق میں مخل ہے چنانچہ اس کے بعد حضرت سلطان ابراہیم ادھم علیہ الرحمۃ کے دل پر کچھ ایسا

اثر ہوا۔ کہ آپ نے تخت و تاج کو چھوڑ کر یکسوئی کے ساتھ طلبِ حق شروع کر دی۔ اور پھر آپ اپنے مقصد میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ ایک خدائی پر آپ کی روحانی حکومت قائم ہو گئی۔ اور بحر و بر میں آپکا روحانی سکہ چلنے لگا۔ چنانچہ آپ ایک دن دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اپنی پرانی گدڑی درست کر رہے تھے۔ اتفاقاً اس طرف سے آپ کا جو کبھی وزیر رہ چکا تھا۔ آ نکلا۔ آپ کو اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور عرض کیا ؎

ترک کردہ ملک ہفت اقلیم را
میزند بر دلق سوزن چوں گدا

آپ ہفت اقلیم کی سلطنت کو ترک کرکے اب گدڑی کو فقیروں کی طرح سی رہے ہیں ؎

شیخ سوزن زود در دریا فگند
خواست سوزن را بآواز بلند

حضرت ابراہیم ابن ادہم نے یہ بات سن کر اپنی سوئی دریا میں پھینک دی۔ اور پھر آواز دی۔ میری سوئی لاؤ"

وہ وزیر یہ بات دیکھ کر دل میں کہنے لگا۔ کہ لو یہ نئی بات اور سنو! بھلا سوئی دریا میں گری ہوئی کبھی واپس بھی ملی ہے؟ لیکن اس نے دیکھا کیا؟ مولانا فرماتے ہیں ؎

صد ہزاراں ماہیِ اللٰہیے
سوزنِ زر برلبِ ہر ماہیئے
سر بر آوردند از دریائے حق
کہ بگیر اے شیخ سوزنہائے حق

ہزاروں مچھلیاں آپ کی آواز سنتے ہی اپنے مونہوں میں سونے کی سوئیاں لے کر آئیں۔ اور باہر گردن نکال کر کہا۔ حضرت سوئی لیجئے!

وہ وزیر یہ عجیب نظارہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر حضرت ابراہیم

نے اس وزیر کو دیکھا اور کہا ؎

رو بدو کرد و بگفتمش اے وزیر!
ملک حق بہ یا چنیں ملک حقیر!

آپ نے اس وزیر کو دیکھ کر فرمایا۔ اب بتاؤ کہ یہ روحانی و حقانی بادشاہت اچھی ہے یا وہ فانی بادشاہت؟

دیکھا آپ نے؟ حضرت ابراہیم ابن ادہم نے خدا کی طلب میں اس دنیوی حکومت کو ترک فرمایا۔ تو خدا نے ان پر کس قدر انعام فرمایا۔ کہ اب دریا کی مچھلیوں پر بھی حکم چلنے لگا۔

الغرض

میرے بھائیو! دنیا میں انہماک اور ناعاقبت اندیشی کو ترک کرو اور اللہ کی یاد میں اپنے دن رات گزارو۔ اس دنیا میں رہو۔ لیکن اپنے خالق کو نہ بھولو۔ یہ دنیا فانی ہے۔ فانی چیز سے دل لگایا۔ تو نہ یہ چیز رہے گی۔ نہ تم رہو گے۔ رب باقی سے دل لگایا۔ تو اس کی یاد کے صدقہ میں تم بھی حیات ابدی حاصل کر لو گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اور مجھے بھی اپنی یاد کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اس دنیا کی ایسی محبت سے جس سے خدا فراموشی پیدا ہو، بچائے۔

آمین

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

بارہواں وعظ

تکمیلِ اسلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَ
السَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ○

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ
تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ (پ ۴ ع ۲)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔ جیسا اس سے
ڈرنے کا حق ہے۔ اور ہرگز نہ مرنا۔ مگر مسلمان!"

حضرات! اس آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خطاب فرما کر، دو باتوں کا حکم دیا ہے۔ ایک تو اس بات کا کہ خدا کا خوف اور ڈر پیدا کیا جائے۔ دوسرے اس بات کا کہ مسلمان زندہ رہے تو مسلمان بن کر اور مرے بھی تو مسلمان ہی رہ کر۔ گویا آیت مذکورہ میں، تقوےٰ اور اسلام ان دو چیزوں کی تاکید فرمائی گئی ہے!

بھائیو! مسلمان کا ایمان ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مالک موجود ہے۔ جس نے سارے عالم کو پیدا فرمایا ہے۔ وہ بڑی طاقت کا مالک ہے۔ انسان کو اس نے چند روزہ عمر عطا فرما کر اس دنیا میں بھیجا ہے اور اسکی ہدایت کے لئے اپنے آخری رسول حضور سید الانبیاء محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے۔ جو خدا کی آخری کتاب قرآن پاک ساتھ لائے ہیں۔ اللہ نے اس آخری رسول و آخری کتاب کے ذریعہ انسان کو ہدایت فرمائی ہے۔ کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق اپنی چند روزہ زندگی گزار دے۔ تاکہ خدا اس پر راضی ہو۔ اور اس کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھائے تاکہ وہ ناراض نہ ہو۔ اور اس حقیقت کا اعلان فرما دیا ہے۔ کہ اس چند روزہ عمر کے بعد موت آنے والی ہے۔ اور مرنے کے بعد اپنے خالق کے حضور پیش ہو کر اپنی عمر کے ایک ایک دن کا حساب دینا پڑے گا

بھائیو! جب یہ حقیقت ہے اور مسلمان کا اس حقیقت پر ایمان ہے تو اس پر لازم ہے۔ کہ وہ اپنی اس مختصر سی عمر میں کوئی ایسا کام نہ کرے۔ جو خدا کی مرضی کے خلاف ہو۔ اور کل قیامت کے دن جسکی وجہ سے ندامت اٹھانی پڑے۔ اور سزا بھگتنی پڑے۔ اللہ کے حضور پیش ہونے کے خیال سے ہر وقت اللہ سے ڈرتا رہے۔ اور کوئی لمحہ ایسا نہ گزارے۔ جس میں خدا کا خوف شامل حال نہ ہو۔ خدا تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں پہلے اسی بات کا ارشاد فرمایا ہے۔ اور فرمایا ہے۔ کہ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو۔ جیسا ڈرنے کا حق ہے۔

کمالِ تقویٰ

"جیسا ڈرنے کا حق ہے" اس جملہ سے کمالِ تقویٰ کا درس دیا ہے یعنی برائے نام ڈرنا نہ ہو۔ بلکہ پورا پورا اور کامل طور پر ڈرنا پایا جائے۔ جیسے کسی کمرہ صاف کرنے والے سے کہا جاتے۔ دیکھو میاں! کمرہ ایسا صاف کرنا جیسا صاف کرنے کا حق ہے۔ یعنی کمرہ میں کوئی تنکا تک باقی نہ رہ جائے۔ یا جیسے کوئی جنٹلمین نائی سے یوں کہے۔ دیکھو میاں داڑھی یوں مونڈنا جیسے داڑھی مونڈنے کا حق ہے۔ یعنے چہرے پر ایک

بال بھی نظر نہ آئے۔ چنانچہ داڑھی منڈانے والے جنٹلمینوں کے رخ دیکھ لیجئے کیا کوئی ایک بال بھی نظر آتا ہے؟ داڑھی کا یا مونچھ کا؟ بالکل نہیں۔ بالکل صاف اور فارغ البال ۔

الٰہی نیچریت ہے کہ کوئی بالخوارہ ہے!!
سرمو بھی نہ رکھا جس نے داڑھی کا پتہ باقی!
مریدوں پر جو پھیرا دستِ شفقت پیر نیچر نے
نہ رکھا دونوں گالوں پر پتا بھی بال کا باقی

پھر لطف یہ کہ منہ پر "اک بال" بھی نہیں اور مانگتے اقبال ہیں۔ میں نے ایک رباعی میں لکھا ہے ۔

اقبال نہیں ملتا جو تجھے کچھ ضد نہیں تجھ سے قدرت کو
اقبال کے قابل ہی لیکن اب تیرے رہے اعمال نہیں
ہر بال سے ہو اسلام عیاں پھر کیوں نہ ملے اقبال تجھے
اقبال کی رٹ ہے منہ سے بہت چہرے پہ مگر اک بال نہیں

الغرض کسی بات کو کما حقہٗ کرنے کا یہ معنٰی ہے۔ کہ اسے کامل طور پر کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ بھی یہی فرماتا ہے۔ کہ ڈرو اللہ سے جیسا ڈرنے کا حق ہے۔ یعنی کامل طور پر ڈرو۔

علمائے کرام

میرے بزرگو! خدائے برتر و توانا سے خوف و خشیت ایک بہت بڑی اہم چیز ہے۔ اور یہ چیز علم والوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ خدا خود ارشاد فرماتا ہے کہ:۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ۔ (پ ۲۲ ع ۱۶)

اللہ سے اسکے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

دیکھ لیجئے۔ خدا خود اس بات کا اعلان فرما رہا ہے۔ کہ علمائے کرام خدا سے ڈرنے والے ہیں۔ مگر افسوس کہ آج طبقہ جہلا علمائے کرام پر پھبتیاں کستا ہے اور علمائے کرام کو برا بھلا کہتا ہے۔ حالانکہ خدا سے ڈرنے والے یہی لوگ ہیں۔ اور خشیت الٰہی انہی کا حصہ ہے اور یہی لوگ ہیں۔ جو دوسروں کو

اللہ سے ڈرنے کا درس دیتے ہیں۔ مگر ظالم اور بے خوف لوگ جب اللہ ہی سے نہیں ڈرتے پھر کیوں نہ علمار کرام کو برا بھلا کہیں۔

میرے بزرگو! یہ جو آجکل بلیک۔ رشوت۔ سود۔ غبن۔ بدمعاشی۔ عیاشی بداخلاقی وفحاشی اور عریانی عام ہے۔ یہ سب خدا سے نہ ڈرنے کے نتائج بدہیں۔ اور آپ تجربہ کر لیجئے۔ کہ ان سب امور کا ارتکاب وہی کرتے ہیں۔ جو عالم نہیں ہیں۔ "مولوی" خدا کے فضل سے کبھی فحاشی وعیاشی میں نہ پڑا ہے نہ پڑے گا۔ کیا کبھی آپ نے کسی مولوی کو بھی اپنی بیوی کو ننگے منہ پھراتے، اپنے دوستوں سے ملاقات کراتے، اور کلب میں نچاتے دیکھا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ تو شایانِ شان مسٹر ہی ہے۔ جس کے متعلق میں نے ایک نظم میں لکھا ہے۔ ؎

ادھر وائف رہی شب بھر کلب میں ٭ ادھر صاحب رہے گھر میں اکیلے
وہی لڑکی مہذب آج کل ہے ٭ جو دیکھے کھیل اور پولو بھی کھیلے

لطیفہ میں جس زمانہ میں راولپنڈی آرسنل میں خطیب تھا۔ ایک شب مری روڈ پر تقریر کر رہا تھا۔ کہ ایک رقعہ ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس محلہ میں ایک نوجوان کنواری لڑکی ہے۔ جو آرسنل میں ملازم ہے اور ہر روز بن ٹھن کر بے حجاب آرسنل میں جاتی ہے۔ اس کے متعلق بھی کچھ کہیں۔ میں نے یہ رقعہ پڑھ کر کہا۔ کہ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ اس لڑکی کا نکاح کر دیا جائے۔ مگر کسی مولوی کے ساتھ کیا جائے۔ کسی آزاد خیال مسٹر سے نہیں۔ اس لئے کہ مولوی تو اس کا کفیل بن کر اسے ملازمت سے ہٹا لے گا۔ اور اسے بے حجاب نکلنے نہ دیگا۔ اور اگر کسی مسٹر سے کیا۔ تو بات ویسی کی ویسی ہی رہے گی۔ اس لئے کہ مسٹر اپنی آزاد خیال اور بے حجاب وائف پر فخر ہی کرے گا۔ اور اسے بے حجاب نکلتے اور تنخواہ لاتے دیکھ کر خوش ہی ہوگا۔ تو اس کا واحد علاج یہی ہے۔ کہ اسے کسی مولوی کی بیوی بنا دیا جائے

میرے دوستو! علمار کرام کا دل میں وقار پیدا کرو۔ اور اس مادر پدر

آزادی سے بچو۔ اور خوب یاد رکھو۔ کہ علماء کرام کے دشمن اپنی عریانی و فحاشی کی راہ میں "مولوی" کو ایک روڑا سمجھتے ہوئے اسے مٹا دینے کے درپے ہیں۔ مگر انشاء اللہ یہ لوگ اس ناپاک مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ علماء کرام کے دلوں میں خدا کا خوف ہے۔ اور خدا کی رحمت ان کے شامل حال ہے۔

اہل حق کو مٹانے والے خود ہی مٹ جائیں گے ؎

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

اسلاف کا خوف

حضرات! اپنے بزرگوں کو دیکھئے۔ ان کے دلوں میں کس قدر خوفِ خدا تھا۔ اور وہ کس طرح ہر وقت اپنے اللہ سے ڈرتے رہتے تھے۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی:۔

اِنَّ لَدَيْنَا اَنْكَالًا وَّ جَحِيْمًا ۙ وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّ عَذَابًا اَلِيْمًا۔

ہمارے پاس بیڑیاں ہیں۔ اور آگ ہے اور کھانا ہے گلے میں اٹکنے والا۔ اور عذاب ہے دکھ دینے والا"

حضرت عمران رضی اللہ عنہ یہ آیت سن رہے تھے۔ خدا کا خوف طاری ہوا اور غش کھا کر گر گئے۔ اور انتقال فرما گئے۔ (اخلاق الصالحین)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ سورۃ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کو پڑھنا شروع کیا جب وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ۔ پر پہنچے۔ تو غش کھا کر گر پڑے۔ اور بہت دیر تک زمین پر لیٹتے رہے۔ (اخلاق الصالحین)

زرارہ بن اوفی نے فجر کی نماز پڑھی اور فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ۔ پڑھتے ہوئے بیہوش ہو کر گر پڑے۔ اور وصال پا گئے۔ بعض سلف جب آگ دیکھتے یا چراغ جلاتے تو جہنم کو یاد کرکے صبح تک روتے رہتے۔ (اخلاق الصالحین)

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کو ہنستے ہوئے دیکھا۔ تو اس سے پوچھا کہ اے جوان! کیا تو پل صراط سے گزر چکا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا۔ کیا تجھے علم ہے کہ تمہارا ٹھکانا جہنم ہے یا جنت؟ اس

نے کہا نہیں۔ فرمایا۔ پھر یہ ہنسنا کیسا۔ اس کے بعد پھر وہ شخص کبھی نہ ہنسا۔

سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ میں اپنی ناک ہر روز کئی مرتبہ اس خوف سے دیکھتا ہوں۔ کہ میرا منہ سیاہ نہ ہو گیا ہو۔

حضرت یزید رقاشی رحمۃ اللہ علیہ حضرت عمرو بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ تو حضرت عمرو بن عبدالعزیز نے فرمایا۔ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ فرمایا۔ اے امیرالمؤمنین! تو وہ پہلا خلیفہ نہیں ہے۔ جو مرے گا۔ یعنی تجھ سے پہلے بھی کئی خلفاء انتقال کر گئے۔ اور تو بھی انتقال کر جائے گا۔ حضرت عمرو بن العزیز نے رونا شروع کر دیا۔ اور کہا۔ کچھ اور فرمایئے فرمایا کہ تیرے اور آدم علیہ السلام کے درمیان تیرے آباء میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہا۔ عمرو بن عبدالعزیز اور بھی زیادہ روئے۔ اور کہا۔ کچھ اور بھی فرمایئے۔ فرمایا جنت اور دوزخ کے درمیان کوئی اور مقام نہیں۔ یعنی یا جنت یا دوزخ۔ اس پر حضرت عمرو بن عبدالعزیز اس قدر روئے۔ کہ غش کھا کر گر پڑے۔ (اخلاق الصالحین)

اللہ اکبر! یہ تھے ہمارے اسلافِ عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ بھائیو! ان پاک لوگوں کے خوف و خشیت کو دیکھو۔ اور پھر سوچو کہ کیا تمہیں بھی کبھی آیاتِ عذاب سن کر رونا آیا ہے۔ کبھی خوفِ خدا سے غش آیا ہے۔ کبھی کلام سنکر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر نہیں۔ تو بھائیو! اپنی قساوتِ قلبی کا علاج کرو۔ اور اللہ کے کسی مقبول بندے کی غلامی اختیار کرو۔

سلطان الاعضاء دل

میرے بزرگو، دوستو اور عزیزو! آج جو خدا کی نافرمانی عام ہے۔ اور بے خوف انسان اپنے ہاتھ پاؤں آنکھوں اور کانوں سے خدا کی نافرمانی کر رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ کہ دل میں خدا کا خوف نہیں۔ یہ دل تمام اعضاء کا بادشاہ ہے۔ اور ہاتھ پاؤں آنکھ کان وغیرہ سب اعضاء اس کے گویا لشکری اور سپاہی ہیں۔ سب اعضاء اس کی مرضی دیکھ کر اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔

اور اسی کی مرغوب چیز کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ دیکھ لیجئے۔ مثلاً شاہ دل اگر سیب کھانا چاہے۔ تو فوراً سب کے سب لشکری اپنے بادشاہ کی خواہش کی تکمیل کے لئے آمادۂ کار ہو جاتے ہیں۔ پاؤں بازار کو دوڑتے ہیں۔ آنکھ سیب کو دیکھتی ہے۔ زبان اس کا سودا کرتی ہے۔ ہاتھ اس کو پکڑ کر منہ میں ڈال دیتے ہیں۔ دانت اسے چبا کر سپرد حلق کر دیتے ہیں۔ اور حلق اسے نگل کر اپنے بادشاہ کی مرضی پوری کر دیتا ہے۔ اور اگر ایسی چیز جو چاہے لذیذ بھی ہو۔ دل پسند نہ کرے۔ اور کھانا نہ چاہے۔ تو آنکھ اسے دیکھتی بھی نہیں۔ ہاتھ اس کی طرف بڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ منہ بند ہو جاتا ہے۔ گویا سب لشکری اس سے ہٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ سلطان دل اگر کسی شے سے ڈرنے لگے تو اس کے سب لشکری بھی اس شے سے ڈرنے لگتے ہیں۔ اور اگر یہ جرأت سے کام لے تو ساری فوج بھی دلیر ہو جاتی ہے۔ مثلاً دل اگر سانپ کو دیکھ کر ڈرنے لگے۔ تو پاؤں سانپ کی طرف اٹھنے سے انکار کر دیں گے۔ آنکھ اسے دیکھنے سے بیزار ہو جائے گی۔ ہاتھ میں ہمت نہ رہے گی کہ کوئی پتھر اسے دے مارے۔ اور اگر دل بے خوف ہو تو پھر دیکھئے۔ آنکھ سانپ کو دیکھتی رہے گی۔ پاؤں فوراً اس کی طرف دوڑیں گے۔ اور ہاتھ کسی پتھر سے اس کا سر کچل دیں گے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کا اظہار اس ارشاد میں فرمایا ہے۔ کہ آدمی کے بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ایسا ہے۔ کہ اگر وہ سنور جائے تو سارا بدن سنور جاتا ہے۔ اور اگر وہ بگڑ جائے۔ تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے۔ اور وہ دل ہے۔

ارشادِ رومی

اور مولانا رومی نے اس حقیقت کا اظہار ان شعروں میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شہ چوں حوضے داں حشم چوں لولہا
آب از لولہ دواں در کولہا!

یعنی یہ شاہِ دل ایک حوض ہے۔ اور اس کا لشکر اعضاء اسکی ٹونٹیاں ہیں۔ اور حوض کا پانی انہیں ٹونٹیوں سے گزھوں میں گرتا ہے ؎

چونکہ آب جملہ از حوضے است پاک
ہریکے آبے دہد خوش ذوقناک

حوض کا پانی اگر صاف و پاک ہے۔ تو ہر ٹونٹی سے بھی پانی صاف اور پاک ہی بہے گا ؎

ور در آں حوض آب شور است و پلید
ہریکے لولہ ہماں آرد پلید!

اور اگر حوض کا ناپاک پانی ہے۔ تو ہر ٹونٹی ناپاک پانی ہی دیگی۔

حاکم ملک اور اسکے کارندے

مولانا کے ان اشعار کی یہ تشریح بھی ہوسکتی ہے۔ کہ ملک کا حاکم ایک حوض ہے۔ اور اس کے ارکان دولت ٹونٹیوں کی مانند ہیں۔ اس حوض یعنی حاکم ملک کے اخلاق کا پانی پہلے ان ٹونٹیوں یعنی ارکان دولت کو۔ پھر ان ٹونٹیوں سے رعایا کو ملتا ہے۔ لہذا حاکم اگر حسن اخلاق کا مالک، شرع مصطفویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ و السلام کا پابند اور اسلام کا گرویدہ و غلام ہے۔ تو لاریب اس کے ارکان سے بھی رعایا اسی حسن اخلاق اور اسلامی سیرت و کردار ہی کی صاف و شفاف دھاریں بہتی پائے گی۔ اور اگر اسکا حوض وہی یورپ کے گندے پانی کے نل سے بھرا ہوا ہوگا۔ تو یقیناً عمالِ سلطنت کی ہر ٹونٹی سے بھی وہی ناپاک قطرے بہیں گے۔ یہی باعث ہے۔ کہ عہد اسلامی کے زریں دور کے خلفائے عظام کی مقدس سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ان اللہ والوں کے دورِ حکومت میں ملک کا ہر کارندہ خدا ترس اور رعایا پرور تھا۔ وہ لوگ کسی قسم کے جور و ستم جبر و ظلم سے واقف تک نہ تھے۔ اسلامی کردار و گفتار کے حامل، اور اسلام پر پورے پورے عامل تھے۔ اور یہی حال رعایا کا بھی تھا۔ وہ دین و دنیا میں خوشحال اور دینی و دنیوی دولت سے مالامال تھے

یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ خود ان کا امیر ایمان و اسلام کا علمبردار ہوتا تھا۔ مگر اس پُرفتن دور میں "وزیرے چنیں شہر یارے چناں" کے مصداق اوپر سے نیچے۔ اور نیچے سے اوپر تک معاملہ ہی برعکس ہے۔ موجودہ یورپین تہذیب نے دنیا کے حوضہائے حکومت کچھ ایسے گندے اور ناپاک پانی سے بھر دیئے ہیں۔ کہ ہر چھوٹی بڑی ٹونٹی سے گندے اور ناپاک پانی ہی بہتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ اللہ ماشاء اللہ!

دل میں خدا کا خوف

حضرات! میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ دل تمام اعضاء کا بادشاہ ہے۔ اور اعضاء سب اس کے لشکری ہیں اور بادشاہ جس چیز سے ڈرے، لشکری بھی اس سے ڈرتے ہیں۔ لہٰذا دل میں اگر خدا کا خوف پیدا ہو جائے۔ تو سارے اعضاء بھی اللہ سے ڈرنے لگیں گے۔ اور یہ ہاتھ پاؤں وغیرہ کبھی کوئی خلافِ شرع حرکت کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ اور اگر دل خدا کے خوف سے خالی ہوگا۔ تو سارے اعضاء بھی خلافِ شرع حرکت کرنے سے نہیں ڈرینگے۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ جس کے دل میں خدا کا خوف ہوگا۔ خدا تعالےٰ ساری خدائی کے دل میں اسکا خوف پیدا فرما دے گا۔ یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ ساری خدائی اس سے ڈرتی ہے۔ چنانچہ حیٰوۃ الحیوان میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے۔ کہ آپ شہر میں سے گزر رہے تھے۔ تو آپ نے بازار میں ایک ہجوم دیکھا۔ وجہ دریافت فرمائی تو پتہ چلا کہ ایک شیر جنگل سے آکر راستے میں بیٹھ گیا ہے۔ اٹھتا نہیں ہے اور لوگ ڈر کے مارے آگے نہیں جاتے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر آگے بڑھے۔ اور شیر کے پاس پہنچ کر اس کے کان پکڑ لئے۔ اور فرمایا" اٹھ اور جنگل میں چلا جا۔ تجھ سے وہ ڈرے جو خدا سے نہ ڈرے۔ بس اتنا کہنا تھا۔ کہ شیر اٹھا۔ اور واپس جنگل میں چلا گیا۔ بزرگو! ایک تو وہ مسلمان تھے۔ اور ایک ہم بھی ہیں۔ جو چوہے سے بھی ڈر جاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ دل میں خدا کا خوف نہیں ہے۔ اس کا خوف نکلا تو ہزاروں خوف سما گئے۔ سے

ڈرنا ہے تو اِک اللہ سے ڈر مرنا ہے تو اس کی راہ میں مر
رکھ اس کی رضا پر اپنی نظر پھر ساری یہ دنیا تیری ہے

آزادی

افسوس آج اللہ سے بے خوفی کا نام لوگوں نے آزادی رکھ لیا ہے۔ یعنی خدا کے احکام سے بے خوف ہوکر جو جی میں آئے۔ آزادی سے کرو۔ یہ آزادی ہے۔ حالانکہ یہ آزادی سرتاپا بربادی ہے۔ آزاد وہ لوگ تھے۔ جو گرفتارِ خوفِ حق اور اسیرِ غمِ آخرت تھے۔ ان پاک لوگوں کے قلوب میں صرف اللہ کا خوف تھا۔ اور دنیا اور اس کے ماحول سے وہ یکسر بے نیاز تھے۔ انہیں لوگوں کے لیے اللہ نے لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ فرمایا ہے۔ آج ذرا غور تو فرمایئے۔ کونسا دل ہے جو مطمئن ہے۔ ہر دل میں خوف ہے کہ خدا جانے کل کیا ہوگا؟ جنگ کا خوف، قحط کا خوف۔ سیلاب کا خوف۔ بیماریوں کا خوف۔ نقصان و اتلاف۔ جان کا خوف۔ مگر جو اللہ والے ہیں۔ جن کے دل میں خدا کا خوف ہے۔ وہ ہر حال میں مطمئن ہیں ؏

نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

حضرت غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آئینہ چینی

دیکھئے آج ہمیں مالِ دنیا حاصل نہ ہو۔ تو غم، اور اگر مل جائے تو اس کے چلے جانے کا خوف، کسی پہلو اطمینان نہیں۔ مگر اللہ والوں کا یہ عالم ہے۔ کہ دنیا نہ آئے تو غم نہیں۔ اور آکر چلی جائے۔ تو کوئی فکر نہیں۔ چنانچہ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کو ایک مرید نے ہزاروں روپے کی قیمت کا ایک چینی آئینہ بھیجا۔ حضرت نے اسے قبول فرماکر ایک خادم سے فرمایا۔ اسے رکھ دو۔ خادم کے ہاتھ سے اتفاقاً وہ آئینہ چھوٹ گیا۔ اور ٹوٹ گیا۔ اور وہ ڈرتے ڈرتے حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔ ؏

از قضا آئینۂ چینی شکستہ!

یعنی حضور وہ چینی آئینہ تقدیراً میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ

گیا ہے۔ حضرت غوث اعظم نے جواب دیا ؎

خوب شد اسباب خود بینی شکست!

یعنی بہت اچھا ہوا۔ خود بینی کا ذریعہ ٹوٹ گیا۔ یعنی میں خدا بین ہوں۔ اور یہ آئینہ انسان کو اپنا آپ دکھاتا ہے۔ بڑا اچھا ہوا کہ اپنے آپ کو دیکھنے کا ایک سبب جاتا رہا۔ دیکھا آپ نے ؟ اتنے بڑے قیمتی آئینے کے نہ آنے کی خوشی اور نہ جانے کا غم۔ ہم چونکہ ایک روپیہ بھی آجائے تو خوش ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر وہ گم ہو جائے۔ تو خوشی کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے، کہ ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔ تو میرے دوستو! آزادی کے حامل تو وہ لوگ تھے۔ یہ ہماری آزادی ایک برائے نام آزادی ہے۔ ورنہ ہزاروں مصائب و آلام کے ہم اسیر ہیں۔ اور یہ مصائب و آلام ہمارے اعمالِ بد کا نتیجہ ہیں۔ اور اعمالِ بد خدا کا خوف نہ ہونے کے باعث ہیں۔

مولوی آزادی کے مخالف نہیں

حضرات! علماء کرام آزادی کے مخالف نہیں ہیں۔ مگر ایسی آزادی کو جس میں اللہ و رسول کے احکام سے آزادی مل جائے۔ یقیناً وہ برا سمجھتے ہیں۔ آزادی یا ترقی پانے کے لئے مسلمان کے لئے بہرحال سب سے پہلے اسیر شرع ہونا ضروری ہے۔ اور اگر دین و مذہب ہی نہ رہا۔ تو پھر کفار کی برائے نام آزادی و ترقی اور مسلمان کی آزادی و ترقی میں فرق کیا رہا۔

یہ دنیاوی عہدے کس کام کے۔ جبکہ دینی کوئی علامت نہیں پائی جاتی۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب لکھا ہے ؎

نہ نماز ہے، نہ روزہ، نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
پھر اسکی کیا خوشی کوئی ڈپٹی ہے کوئی جج ہے

عاقبت کا خوف

مسلمانو! اس دورِ آزادی میں لوگ عاقبت کے خوف سے بھی آزاد ہو چکے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا۔ کہ ہمارے اسلاف دل میں عاقبت کا خوف رکھتے تھے۔

سلیمان علیہ السلام اور ہُدہُد

چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ہُدہُد

کا قصہ قرآن پاک میں مذکور ہے۔ کہ جب ایک مرتبہ اپنی بھری کچہری میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کو غیر حاضر پایا تو بڑے جلال میں آکر آپ نے فرمایا۔

مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ۔ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَ اذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَأْتِيَنِّيْ بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ ٥ (پ ۱۹ ع ۱۷)

کیا ہوا کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا۔ یا واقعی وہ حاضر نہیں۔ ضرور میں اسے سخت عذاب کروں گا۔ یا ذبح کر دونگا۔ یا کوئی روشن سند میرے پاس لائے۔"

یہ فرما کر پھر عقاب کو حکم دیا۔ کہ اڑکر دیکھیے کہ ہدہد کہاں ہے۔ چنانچہ عقاب اڑا۔ اور بہت اوپر پہنچکر ساری دنیا کو اس طرح دیکھنے لگا۔ جس طرح آدمی اپنے ہاتھ کے پیالے کو دیکھتا ہے۔ حضرات! یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ بلکہ کتابوں میں اسی طرح لکھا ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ دمیری علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب حیوٰۃ الحیوان کی دوسری جلد کے صفحہ ۳۰۵ پر صاف یوں لکھا ہے کہ:-

فَارْتَفَعَ فِي الْهَوَاءِ فَنَظَرَ اِلَى الدُّنْيَا كَالْقَصْعَةِ فِيْ يَدِ الرَّجُلِ۔

یعنی عقاب ہوا میں اتنا بلند ہوا۔ کہ ساری دنیا کو اس طرح دیکھنے لگا۔ جس طرح آدمی اپنے ہاتھ کے پیالے کو دیکھتا ہے۔"

میرے بھائیو! یہ ایک جانور کی نظر ہے۔ پھر جو شخص انبیاء و اولیاء کرام کی وسعتِ نظر کا انکار کرے۔ اور خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ عقیدہ رکھے۔ کہ حضور کو (معاذ اللہ) دیوار کے پیچھے کی بھی خبر نہ ہوتی تھی۔ تو ایسے گمراہ کی گمراہی اور کم نظری کا آپ خود ہی اندازہ کر لیجیے۔ ہمارا تو ایمان ہے۔ کہ یہ دنیا ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہے۔ اور آپ ساری دنیا کو یوں ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ جیسے اپنے کفِ دست کو۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر

خود فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا میرے لئے اٹھائی اور میرے سامنے کر دی۔

فَاَنَا اَنْظُرُ اِلَیْھَا وَ اِلٰی مَا ھُوَ کَائِنٌ فِیْھَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ کَاَنَّمَا اَنْظُرُ اِلٰی کَفِّیْ ھٰذِہٖ۔ (مواہب لدنیہ) پس میں ساری دنیا کو اور اس میں قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے۔ ان سب امور کو اس طرح دیکھ رہا ہوں۔ جس طرح اپنی اس ہتھیلی کو"

علامہ زرقانی علیہ الرحمتہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں۔

اِنَّہٗ نَظَرٌ حَقِیْقِیَّۃٌ دَفَعَ بِہٖ اِحْتِمَالُ اِنَّہٗ اُرِیْدَ بِالنَّظَرِ الْعِلْمُ (شرح المواہب صد ۲۳۴ ج ۷) یعنی حضور نے واقعی، اور حقیقی طور پر ساری دنیا کو دیکھا اور یہ خیال و احتمال کہ دیکھنے سے مراد صرف علم ہے۔ مدفوع و مردود ہے۔"

اس حدیث سے صاف صاف یہ بات ثابت ہو گئی۔ کہ ساری دنیا اور اس میں جو کچھ ہونے والا ہے۔ ہمارے حضور کے سامنے ہے۔ اور حضور واقعی اور حقیقی طور پر سب دنیا و مافیہا کو دیکھ رہے ہیں۔

اولیاء کی نظر

میرے بھائیو! یہ تو حضور کی بات ہے۔ حضور کے صدقہ میں اولیاء کرام کی نظریں اتنی وسعت ہے۔ کہ یہ ساری دنیا ان کے سامنے مثل اس دستر خوان کے ہے۔ جو سامنے بچھا ہوا ہے۔ اور جس کی ہر شے نظروں کے سامنے ہو۔ چنانچہ حضرت جامی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں:۔

"حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند قدس سرہٗ می فرمودند کہ حضرت عزیزان علیہ الرحمتہ و الرضوان می گفتہ اند کہ زمین در نظر ایں طائفہ چوں سفرہ ایست و ما می گوئیم چوں روئے ناخن است ہیچ چیز از نظر ایشاں غائب نیست" (نفحات الانس صد ۲۲۹)

یعنی حضرت خواجہ نقشبند علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔ کہ حضرت عزیزان علیہ الرحمتہ نے فرمایا۔ کہ یہ زمین اولیاء کرام کی نظریں مثل دستر خوان

کی ہے۔ اور ہم کہتے ہیں کہ مثل ناخن کی ہے۔ کہ کوئی چیز بھی ان کی نظر سے غائب نہیں۔"

بایزید علیہ الرحمۃ کی نظر

میرے بزرگو! یہ زمانہ جو برائے نام روشنی کا زمانہ ہے۔ در اصل تاریکی و ظلمت کا زمانہ ہے۔ انبیاء و اولیاء کرام کی وسعتِ نظر ایک مسلّم حقیقت ہے۔ مگر افسوس کہ اس نئی روشنی کے دور میں اس مسلّم حقیقت کا انکار کیا جا رہا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں اولیاء کرام کی وسعتِ نظر کا یہ عالم ہے کہ ساری دنیا انکے سامنے ہے۔ اور نہ صرف یہی دنیا بلکہ مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

لوحِ محفوظ است پیشِ اولیاء ✿ ازچہ محفوظ است محفوظ از خطا

یعنی لوح محفوظ جس میں ہر چیز کا ذکر موجود ہے۔ ان اولیاء کرام کے ہر وقت سامنے رہتی ہے۔ تو فرمایئے۔ جن کی نظروں کے سامنے لوح محفوظ رہے، اُن سے کیا چیز غائب رہ سکتی ہے۔ ان اولیاء کرام کی شان اور ان کی وسعتِ نظر دیکھنے کے لئے حضرت بایزید علیہ الرحمۃ کا قصہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ یہ واقعہ مولانا رومی علیہ الرحمۃ نے مثنوی شریف میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ حضرت بایزید علیہ الرحمۃ نے اپنے مریدوں میں حضرت ابوالحسن خرقانی کی ولادت سے پہلے ہی کئی سال ان کی ولادت کی خبر دے دی تھی۔ اور فرمایا تھا۔ کہ مجھے سرزمین خاقان سے ابوالحسن کی خوشبو آ رہی ہے۔ اور پھر نہ صرف یہ کہ حضرت ابوالحسن خرقانی کی پیدائش ہی کی قبل از وقت خبر دے دی۔ بلکہ ان کی شکل و صورت اور رنگ اور نام کی بھی اطلاع دے دی۔ چنانچہ مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

گفت زیں سو بوئے یارے می رسد
کاندریں دہ شہر یارے مے رسد

یعنی بایزید نے فرمایا۔ کہ مجھے اس (خرقان کی) طرف سے یار کی خوشبو آ رہی ہے۔ اس قصبہ سے ایک شہریار پیدا ہونے والا ہے ؎

بعد چندیں سال مے زائد شہے ✿ مے زند بر آسمان با غرگہے

اور اتنے سالوں کے بعد وہ پیدا ہوگا۔ گویا میعاد بتا کر سنہ ولادت کی بھی خبر دے دی۔ ؎

چیست نامش گفت نامش بوالحسن ٭ حلیہ اش واگفت زابرو تا ذقن

نام پوچھا گیا۔ تو فرمایا۔ اس کا نام ابوالحسن ہوگا۔ اور پھر ان کا سارا حلیہ بھی مکمل طور پر بیان فرما دیا ؎

قد اُو و رنگ اُو و شکل اُو! یک بیک واگفت از گیسوئے او

ان کا قد، ان کا رنگ اور شکل اور گیسو ایک ایک بات صاف صاف بیان فرما دی۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ مریدوں نے حضرت بایزید کی یہ باتیں لکھ لیں۔ اور وہ سنہ اور تاریخ بھی لکھ لی۔ چنانچہ فرمایا ؎

برنوشتند آں زماں تاریخ را ٭ از کباب آراستند آں سیخ را

یعنی مریدوں نے سنہ اور تاریخ سب کچھ لکھ لیا ؎

چوں رسید آں وقت و آں تاریخ راست
زاں زمین آں شاہ پیدا گشت و خاست

جب وہ زمانہ اور تاریخ آئی تو بالکل اسی خبر کے مطابق اس سرزمین سے ابوالحسن پیدا ہوئے۔ اس واقعہ کے نقل کرنے کے بعد مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

لوحِ محفوظ است پیشِ اولیاء
از چہ محفوظ است محفوظ از خطاء

یعنی وہ لوحِ محفوظ جو ہر خطا سے محفوظ ہے۔ اور جس میں ساری آئندہ کی اور غیب کی باتیں لکھی ہیں۔ وہ ہر وقت ان اولیاء کرام کے سامنے رہتی ہے۔ پھر ان سے کوئی چیز چھپی کیسے رہے؟

حضرات! پوچھو ان شرک و بدعت کے تقسیم کرنے والوں سے کہ اب کیا کہتے ہو۔ مولانا رومی کے حق میں؟ جنہوں نے یہ غیب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے لئے بھی ثابت فرما دیا۔ اور حضرت بایزید کا واقعہ لکھ کر یہ ظاہر کر دیا۔ کہ حضور تو حضور ہیں۔ آپ کے صدقہ میں آپکے غلاموں کی یہ شان ہے۔ کہ آنے والی باتوں کو وہ حرف بحرف اور مو بمو جانتے ہیں۔

ذرا غور تو فرمایئے۔ کہ حضرت ابوالحسن ابھی شکمِ مادر میں بھی نہیں آئے۔ اور حضرت بایزید ان کی پیدائش کی خبر دے رہے ہیں۔ اور نہ صرف ان کی پیدائش کی خبر بلکہ ان کے شہر کی ان کے حلیہ و نام کی بھی خبر دے رہے ہیں۔ بھائیو! جس ذاتِ بابرکات کے غلاموں کا یہ علم ہے۔ اس ذات بابرکات علیہ افضل التحیات کے اپنے علم کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ جس کے غلاموں کے سامنے لوحِ محفوظ رہتی ہو۔ اس کی اپنی نظر سے کوئی چیز غائب کیسے رہ سکتی ہے؟ اسی لئے اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے۔ ؎

دلِ فرش پر ہے تری نظر، سرِ عرش پر ہے تری گزر!

ملکوت و ملک میں کوئی شے نہیں وہ جو تجھ پہ عیاں نہیں

بھائیو! یہ اولیاء کرام کے جملہ علوم حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے علم پاک کی شاخیں ہیں۔ اور بقول شاعر "اسی دریا سے یہ نہریں ہوئیں جاری ساری"۔ یہ سب علوم اسی دریائے علم کی نہریں ہیں۔ پھر آپ خود ہی فیصلہ کرلیں۔ کہ جو گستاخ حضور ہی کے علم پاک کے منکر ہیں۔ اور علم غیبِ مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کو تسلیم نہیں کرتے۔ کس قدر جاہل اور دشمنانِ حق ہیں اور حقیقت سے بے خبر ہیں۔

محمدؐ آدمی کے دل کی باتیں جان جاتے ہیں

ایک روایت یاد آئی۔ جو خصائص کبریٰ کے صـ۲۰۷ جلد ۱ پر اور دلائل الخیرات کے صـ۱ جلد ۲ پر موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے قیدیوں سے تاوان طلب فرمایا۔ تو ان قیدیوں میں حضور علیہ السلام کے چچا حضرت عباس بھی تھے۔ حضور علیہ السلام نے اپنے چچا سے بھی تاوان طلب کیا۔ تو چچا نے جواب دیا۔ لَقَدْ تَرَكْتَنِیْ فَقِیْرَ قُوْمٍ یعنی آپ نے مجھے کہ میں اس حال میں چھوڑا تھا۔ کہ میں ساری قوم سے غریب تھا"۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ چچا! اور وہ جو تم اپنی بیوی ام فضل کو علیحدگی میں سونے کی ڈلیاں دے کر آئے ہو۔ ؎

وہ سب دولت ہے ام فضل کی تحویل میں اب تک

یہ جرمانہ ادا کر دو ، چھپاؤ گے بھلا کب تک
جناب حضرت عباس پر رعشہ ہوا طاری
کہ پیغمبر تو رکھتا ہے دلوں کی بھی خبر داری
خیال آیا مسلمان نیک و بد پہچان جاتے ہیں
محمد آدمی کے دل کی باتیں جان جاتے ہیں
پکار اٹھا بحالِ وجد میں ایمان لے آیا
بجا ہے، راست ہے جو کچھ رسول اللہ نے فرمایا

یہ دیکھئے! حضرت عباس نے آتے وقت علیحدگی اور پوشیدگی میں جو سونے کی ڈلیاں اپنی بیوی کو دیں۔ وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عیاں ہو گئیں۔ تو فرمائیے! حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دیوار کے پیچھے کی چیز سے بے خبر بتانے والے کس قدر خود ہی بے خبر، اور گمراہ ہیں — ؎

یارسول اللہ

تو دانائے ماکان اور مایکون ہے ؛ مگر بے خبر، بے خبر دیکھتے ہیں

ہُدہُد کا قصہ

ہاں میں کہہ یہ رہا تھا۔ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کو غائب پاکر جب عقاب کو پتہ لانے کے لئے بھیجا - اور عقاب اوپر اڑا۔ تو اس نے ہدہد کو یمن کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ عقاب فوراً اس کے پاس پہنچا۔ اور کہا تیری ماں تجھے روئے۔ اپنی فکر کر لو۔ اللہ کے نبی سلیمان علیہ السلام نے تمہارے لئے قسم کھائی ہے۔ کہ میں ہدہد کو سخت سزا دونگا۔“

ہدہد نے ڈرتے ہوئے کہا۔ اور اللہ کے نبی نے اس قسم میں کسی بات کا استثناء بھی فرمایا ہے۔ یا نہیں؟ عقاب نے کہا۔ ہاں فرمایا ہے کہ یا کوئی روشن سند میرے پاس لائے۔“ ہدہد نے کہا تو پھر میں نجات پا گیا۔ میں ان کے لئے ایک بہت بڑی خبر لایا ہوں۔ پھر عقاب اور ہدہد دونوں بارگاہ سلیمانی میں حاضر ہوئے حضرت سلیمان نے جلال میں آکر فرمایا۔ ہدہد کو حاضر کرو۔

ہدہد بچارہ اپنی دم نیچے کئے ہوئے زمین پر ملتا ہوا اور کانپتا ہوا حضرت کے قریب آیا۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو سر سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا

اس وقت ہدہد نے کہا :۔

اُذْكُرْ وُقُوْفَكَ بَيْنَ يَدَيِ اللهِ — حضور! اللہ کے سامنے اپنی حاضری کو بھی یاد کر لیجیے —"

ہدہد کا اتنا کہنا تھا۔ کہ اللہ کے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ بات سن کر ایک دم ہدہد کو چھوڑ دیا۔ اور رونے لگے۔ اور پھر فرمایا۔ اے ہدہد! جا میں نے تجھے معاف کر دیا۔ اس کے بعد پھر اس سے غیر حاضری کی وجہ پوچھی۔ اور ہدہد نے ملکہ بلقیس کا سارا قصہ بیان کیا۔

میرے بھائیو! اس قصہ سے مجھے بتانا یہ ہے۔ کہ دیکھیے ایک پیغمبر کا دل اللہ کے خوف سے کس قدر معمور ہے۔ باوجود معصوم ہونے کے وہ خدا کا خوف رکھتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم سرتاپا گنہگار ہونے کے باوجود اللہ کے خوف سے عاری ہیں۔ میرے بھائیو! اللہ سے ڈرو اور اس طرح ڈرو۔ جس طرح ڈرنے کا حق ہے۔ آیت مذکورہ میں اللہ نے یہی درس دیا ہے۔ اور پھر اس کے بعد فرمایا ہے کہ :۔

تکمیلِ اسلام

تم مرو تو مسلمان ہی رہ کر مرو۔ یعنی زندہ رہو تو مسلمان بن کر، اور مرو بھی تو مسلمان ہی رہ کر مرو۔ میرے بزرگو! ہمارا اسلام اس قسم کا نہ ہونا چاہیئے۔ کہ سٹیج پر آئیں تو خادم اسلام اور کوٹھیوں میں جائیں تو الحاد و زندقہ کی مکمل تصویر بن جائیں جیسے کہ آجکل کے "جنٹلمینوں" کا اسلام ہے۔ نام کے مسلم اور کام کے غیر مسلم۔ یاد رکھو۔ کامل مسلمان وہ ہے۔ جس کی ہر ہر ادا اسلام میں رنگی ہوئی ہو۔ جس کی چال ڈھال، اور سیرت وصورت، مکمل مسلمانوں کی سی ہو۔ نہ ایسی کہ جسے دیکھ کر بقول اقبال یہودی بھی شرما جائیں۔ وہ کہتا ہے نا!

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

دوستو! یہ شعر کسی مولوی کا نہیں۔ بلکہ یہ اقبال کا شعر ہے۔ اور وہ آجکل کی مسلمانی کا رونا رو رہا ہے۔ اور بتا رہا ہے۔ کہ آج کل کی مسلمانی کیا ہے۔

صورت میں عیسائی اور سیرت میں ہندو ــــ

ہرچہ خواہی پوش

بھائیو! یہاں جنٹلمینوں نے ایک مصرعہ یاد کر رکھا ہے، وہ کہتے ہیں۔ ع "درعمل کوش ہرچہ خواہی پوش"

یعنی لباس کا کیا ہے۔ کسی طرح کا بھی پہن لو۔ کوئی بھی وضع ہو۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر "ہرچہ خواہی پوش" ایسا عام ہے۔ تو ذرا مہربانی کر کے زنانے کپڑے بھی پہن کر دکھلایئے۔ اور بیگم صاحبہ کو اپنے مردانے کپڑے بھی پہنا دیجئے۔ اور کبھی زنانہ وضع اختیار کر کے خود کانٹے بھی پہن کر نکلئے اور بیوی صاحبہ کو پگڑی بندھا کر دکھایئے۔ اگر آپ ایسا کریں تو ہم بھی وضع کی نسبت فتوی دینا چھوڑ دینگے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اسلام کو کچھ ایسا ماڈرن قسم کا اسلام بنا لیا ہے۔ کہ عیسائیت اور اس میں کچھ فرق ہی باقی نہیں رہ گیا۔

برقِ کلیسا

چنانچہ اس باب میں اکبر الہ آبادی نے ایک مزیدار نظم برق کلیسا کے نام سے لکھی ہے، وہ لکھتا ہے۔

ـــہ رات اس مِس سے کلیسا میں ہُوا میں جو دو چار
ہائے وہ حُسن و شوخی وہ نزاکت وہ ابھار

یعنی رات کو گرجا میں محبوبہ سے جو سامنا ہو گیا۔ تو اس کے حسن و شوخی کا عالم میرے لئے وجہ اضطراب بن گیا۔ اکبر نے اس پہلے شعر ہی میں آج کل کے "ماڈرن مسلمانوں" پر چوٹ کی ہے۔ گویا یہ ماڈرن مسلمان مسجدوں میں تو نہیں آتے اور گرجے میں جاتے ہیں۔

اکبر پھر اس شوخ مِس کے ناز و انداز کا نقشہ کھینچتا ہے۔ ـــہ

دلکشی ناز میں ایسی کہ ستارے رک جائیں!
سرکشی چال میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

اس قدر ناز و انداز کے پرکالے کو دیکھ کر اکبر کا کیا حال ہُوا؟ سنئے ـــہ

پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی
سُر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

اکبر کہتا ہے۔ کہ اس عالم میں میں نے دل کو بہت سنبھالا۔ مگر ؎

ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یاحفیظ کا کیا وِرد مگر کچھ نہ ہوا

اس کے بعد اکبر صاحب کہتے ہیں۔ کہ دل سے مجبور ہو کر میں نے اس مِس سے کہہ ہی دیا کہ ؎

تو اگر عہد وفا باندھ لے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

اسکے جواب میں اس مس نے جواب جو دیا وہ بھی سنیئے۔ وہ بولی ؎

غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے انسانوں سے

یعنی اے اکبر! تو مسلمان ہے۔ اور یہ قوم تو بڑی مجاہد اور دین کی خاطر خون بہا دینے والی قوم ہے۔ میں ایسی قوم کے کسی فرد سے انس رکھوں؟ یہ ممکن نہیں۔ پھر کہتی ہے۔ ؎

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

یعنی یہ مسلمان تو نمازی بھی ہیں اور غازی بھی۔ لہذا میں تم سے انس پیدا نہیں کر سکتی۔ اکبر نے اس مِس کی زبان سے مسلمانوں کے اوصاف گنوا کر پھر عجیب رنگ میں آج کل کی ماڈرن مسلمانی کا تذکرہ کیا ہے، اور اس مِس کو جواب دیا۔ کہ ؎

مجھ سے کچھ وجہ شکایت تمہیں اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

یعنی اے مِس! کیوں گھبراتی ہے۔ وہ مسلمان اگلے زمانے والے اب کہاں؟ یہ جو اوصاف تو نے بیان کئے ہیں۔ یہ تو پہلے مسلمانوں کے تھے اور اب جو ہم لوگ ہیں۔ یہ تو محض نام ہی کے مسلمان ہیں۔ لہذا ؎

مرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو

ہنس کے بولی وہ کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

یعنی جب اکبر نے کہا کہ میرے اسلام کو اک قصۂ راضی سمجھو۔ تو میں نے جواب دیا۔ کہ اگر یہ بات ہے تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو۔

دوستو! کچھ سمجھے آپ؟ اکبر نے عجیب رنگ میں آجکل کے ماڈرن اسلام کا پول کھولا ہے۔ منشا اس کی یہ ہے کہ یہ "جنٹلمین اسلام" عیسائیت سے ملتا جلتا ہے۔ اور آجکل کے برائے نام مسلمان" دو اسلام" جیسی کتابیں لکھ پڑھ کر اصلی اسلام سے دور رہ کر کسی دوسرے ہی اسلام کے دلدادہ ہیں یاد رکھو۔ اس قسم کا برائے نام اسلام اسلام نہیں۔ اسلام وہی ایک پرانا اسلام ہے۔ جسے صحابہ و تابعین اور بڑے بڑے اولیاء اور جمہور نے اپنایا۔ یہ دو اسلام والا نیا اسلام اس نئی روشنی کا ایک کرشمہ ہے جو مسلمانوں کو اسلام سے دور کر رہا ہے۔ میرے بھائیو! خدا کا ارشاد ہے کہ تم مسلمان ہو۔ مسلمان ہی جیو۔ اور مرو بھی تو مسلمان ہی مرو۔ چونکہ اس دور میں بڑے بڑے فتنے پیدا ہو رہے ہیں۔ اور یہ دین و مذہب کے لئے بڑا ہی خطرناک دور ہے۔ ذرا سی لغزش سے آدمی گمراہ ہو سکتا ہے۔ اور مرتے دم ایمان سے خالی جا سکتا ہے۔ اس لئے لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ـــ خدا کے ارشاد کو ہر وقت پیشِ نظر رکھنا چاہئے اور اسی فکر میں رہنا چاہیئے۔ کہ مرتے ہوئے ہم ایمان لے کر مریں۔

غوث اعظم رضی اللہ عنہ کا قطعۂ عید

میرے بھائیو! انجام کی بہتری ہی میں سب بھلائی مضمر ہے۔ اگر مرتے دم ایمان لے کر مرے تو سمجھئے بیڑا پار ہے۔ ورنہ سمجھ لیجئے کہ عمر بھر کی پونجی ضائع ہو گئی۔ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس محلہ کے چند بچے حاضر ہوئے اور کہنے لگے۔ حضور کل عید ہے۔ ہمیں کوئی عید کا قطعہ لکھ دیجئے۔ آپ نے حسب ذیل رباعی لکھ کر دے دی ؂

خلق گوید کہ فردا روزِ عید است ٭ خوشی در روح ہر مومن پدید است

دراں روزے کہ با ایماں بمیرم ٭ مرا در ملکِ خود آں روز عید است

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ کل عید ہے۔ اور ہر مسلمان خوش ہے۔ مگر جس دن میں ایمان کے ساتھ مروں گا۔ میرے لئے تو وہ دن عید کا ہوگا۔"

سبحان اللہ! اتنے بڑے غوث اور مقبول حق۔ مگر ہمیں اپنے انجام کی فکر کرنے کے لئے کس عجیب پیرائے میں درس دے گئے۔ گویا ہمیں سبق دے گئے۔ کہ مسلمانو! مرو تو مومن و مسلمان ہی رہ کر مرو۔ سب سے بڑی خوشی کی بات یہی ہے۔ کہ ایمان سلامت رہے۔ دوستو! اسی واسطے آدمی جب نزع کے عالم میں ہو تو حکم یہ ہے۔ کہ اس کے پاس بیٹھ کر کلمہ شریف پڑھو۔ مگر اسے یوں نہ کہو۔ کہ کلمہ پڑھ۔ اس لئے کہ وہ نزع کے عالم میں ہے۔ اور تکلیف میں ہے۔ اگر اسے کہا گیا کہ کلمہ پڑھ تو ممکن ہے۔ کہ وہ کہدے۔ کہ نہیں پڑھتا۔ تو اس طرح وہ بے ایمان ہو جائے گا۔ ہاں اس کے پاس بیٹھ کر کلمہ پڑھتے رہو۔ تاکہ وہ بھی سن کر پڑھنے لگے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر جیو تو مسلمان ہی رہو۔ اور مرتے دم تک مسلمان رہو۔ اور مرو بھی تو مسلمان ہی رہ کر۔ اسلام کو ادھورا نہ چھوڑ دینا۔ بلکہ تکمیل اسلام یہ ہے کہ اسلام ہی پر خاتمہ ہو۔ آج کل لوگوں میں لہو و لعب کا بڑا شوق ہے۔

لہو ولعب

سینما و تھیٹر کا شوق۔ جوئے و سٹے کا شوق۔ گھوڑ دوڑ و بٹیر بازی کا شوق۔ میخواری و عیاری کا شوق۔ کیا کیا عیاشیاں اور ناعاقبت اندیشیاں نہیں ہیں؟ بھائیو! ایسا نہ ہو کہ کھیل دیکھتے ہوئے دم نکل جائے۔ جوا و سٹہ کی بازی لگاتے ہوئے ہاٹ فیل ہو جائے۔ شراب پیتے ہوئے موت آجائے۔ توبہ کرو۔ اور ایسی زندگی اختیار کرو کہ اللہ اللہ کرتے ہوئے موت آئے۔ درود شریف پڑھتے ہوئے دم نکلے۔ ذکرِ حق کرتے ہوئے جان نکلے۔ ایسی موت آئے۔ تو خدا بھی خوش، اور خدائی بھی آفرین و تحسین کے پھول برسائے گی۔ دیکھ لو۔ جن اللہ والوں کی خدا کی یاد میں عمر تمام ہوئی ہو۔ آج تک کس طرح ان کے مزار بھی مرجع خلائق ہیں۔ مگر جو بدمعاشی اور عیاشی میں مرتے ہیں۔ خدا بھی ناخوش، اور خدائی بھی انہیں اچھے الفاظ سے یاد نہیں کرتی ؟

موت کو یاد رکھو

میرے بھائیو! مرنا تو سب نے ہے ہی۔ موت سے کس کو مفر ہے۔ اسی واسطے موت کو ہر وقت یاد رکھنے کا حکم ہے۔ دیکھئے قرآن پاک میں ہے کہ جب تم گھوڑے یا کسی دوسری سواری پر سوار ہونے لگو۔ تو یہ آیت پڑھو۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۔ (پ۲۵ ع۷) پاکی ہے اُسے جس نے اس سواری کو ہمارے بس میں کر دیا۔ اور یہ ہمارے ہونے کی نہ تھی۔ اور بیشک ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"

اس آیۂ کریمہ کا پہلا حصہ تو سواری کے مناسب نظر آ رہا ہے۔ مگر آگے جو فرمایا گیا ہے۔ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔ اور بیشک ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے" اس کو بظاہر پہلے مضمون سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر بزرگانِ دین نے اس کو سمجھا کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا کے بندو! اس جانور پر سوار ہونے سے دوسری سواری کو بھی یاد رکھو اور سمجھ لو کہ تم کو کسی تختہ یا چارپائی پر بھی سوار ہونا ہے۔ جس میں تم کو رکھ کر چار آدمی لے جائیںگے۔ اصل سواری وہی ہے۔ کہ جس پر سوار کر کے تم کو خدا کے ہاں پہنچا دیں گے۔ تو اے بھائیو! جب جانور پر سواری کرتے وقت بھی موت کو یاد کرنے کا حکم ہے۔ تو کسی میت کو دیکھ کر یا قبرستان میں پہنچکر موت کو یاد کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا۔ مگر افسوس! آج ہم پر اس قدر غفلت طاری ہے کہ قبرستان میں بیٹھے ہیں۔ اور مقدمے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم موت سے ڈرتے بھی بہت ہیں۔ چونکہ اسی دنیا کو ہم نے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے یہاں سے جدا ہونے کا رنج وغم ہوتا ہے ورنہ جب آدمی سفر میں ہوتا ہے۔ تو جتنا گھر سے قریب ہوتا جاتا ہے۔ خوشی بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہاں یہ حالت ہے کہ جوں جوں مرنے کے دن قریب آتے ہیں۔ روح فنا ہوتی ہے۔ اور یہ حالت دنیا داروں ہی کی ہے۔ کیونکہ وہ دنیا ہی کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ بخلاف اللہ والوں کے کہ انہیں نہ اپنے

مرنے کی پرواہ، نہ اولاد کے مرنے کی پرواہ ہوتی ہے۔ وہ موت کو بمصداق اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُّوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ۔ ایک ایسا پل سمجھتے ہیں جو اس کنارے سے اس کنارے پرلے جاکر دوست سے ملا دیتا ہے۔

حضرت خلیل علیہ السلام اور ملک الموت

چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) کے پاس جب ملک الموت حاضر ہوا۔ تو حضرت خلیل نے اسے فرمایا۔ جان قبض کرنے سے پہلے میری طرف سے خدا کو جاکر کہو کہ دوست کیا اپنے دوست کی جان بھی لیتا ہے؟ ملک الموت نے خدا کے حضور یہ پیغامِ خلیل عرض کیا۔ تو خدا نے فرمایا۔ تم جاکر میری طرف سے یہ جواب دو کہ دوست، دوست کو بلاتے تو کیا دوست آنے سے انکار بھی کرتا ہے؟ ملک الموت نے یہ بات حضرت خلیل سے کہی۔ تو آپ کو بڑا لطف حاصل ہوا۔ اور خوشی سے فرمایا کہ چلو پھر چلتے ہیں۔ اور جان قبض کرنے کی اجازت دے دی۔

دیکھا آپ نے! یہ اللہ والے موت کو ایک ذریعہ وصال سمجھتے ہیں۔

شیخ المحدثین مولانا سیّد دیدار علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ جب میں اپنے استادِ حدیث شیخ المحدثین حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ صاحب الوری قدس سرہٗ سے دورہ حدیث پڑھ رہا تھا۔ اور بخاری شریف میں جب یہ حدیث آئی کہ قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ "ان کے متعلق کیا کہتے ہو" اس موقعہ پر پہنچے۔ تو شیخ المحدثین حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اور فرمایا کہ یہ حدیث پڑھتا ہوں۔ تو ابھی مرجانے پر دل چاہتا ہے۔ تاکہ حضور کا دیدار ہو۔ اسی باب میں اعلیٰ حضرت کا یہ شعر بھی ہے ؎

جان تو جانے ہی جائے گی، قیامت یہ ہے
کہ یہاں مرنے پہ ٹھہرا ہے نظارہ تیرا

حضرت مولانا آسی علیہ الرحمۃ کا بھی ایک شعر سن لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

آج پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی!
جس کے جویاں تھے ہے اس گُل کی ملاقات کی رات

اور میرے بھی اشعار سن لیجئے:-

وہ تنہائی، تاریکی، تنگی لحد کی! یہ سنکر میرے دل کی حالت بُری تھی
مگر اس خبر نے مجھے دی تسلی! کہ واں مصطفےٰ کا بھی دیدار ہوگا

اَلدُّنیا سِجنُ المُؤمن! یہ جو حدیث میں آتا ہے۔ اَلدُّنیَا سِجنُ المُؤمِنِ دنیا مومن کے لئے جیلخانہ ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ جیلخانہ میں اگرچہ کیسا ہی عیش ہو۔ اور سب سامانِ راحت موجود ہوں۔ مگر وہاں جی نہیں لگتا۔ تو مسلمان کی شان یہ ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے۔ اگرچہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو۔ کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے۔ اور وہ گھر نہیں ہے۔ پھر جب جی نہ لگے گا۔ تو کیوں سوچے گا۔ کہ یوں ہو۔ اور یوں نہ ہو۔ یہ ہو اور وہ نہ ہو۔ بلکہ اب سوچے گا۔ کہ دنیا تو پردیس ہے۔ یہاں جس طرح سے بھی دن گزر جائیں۔ اور دنیا کی فکر کی بجائے اب یہ ہوگا۔ کہ انجام اچھا ہو۔ اور آخرت بن جائے۔ اور آخرت بننے کے لئے یہی نسخہ ہے۔ کہ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ یعنی مرو تو مسلمان رہ کر مرو۔ میں یہی کہہ رہا تھا۔ کہ مرنا تو سب ہی نے ہے تو بھائیو پھر کیوں نہ ہم ایسی موت مریں۔ جو خدا کے حکم کے مطابق ہو۔ یعنی مسلمانی کی موت۔ بھائیو! ہم میں جو جو غیر اسلامی حرکتیں ہیں۔ ان کو ترک کردو۔ اور آج سے کامل مسلمان بن کر جینے اور مسلمان ہی رہ کر مرنے کا عہد کر لو۔ خوب یاد رکھو کہ مرنا ضرور ہے۔ اور اگر غیر اسلامی موت واقع ہو گئی۔ تو عاقبت برباد ہو گئی۔ آج وقت ہے کہ ہم موت سے پہلے پہلے کامل مسلمان بن جائیں۔ اور اسلام پر ہی مرنے کا عہد کر لیں۔ ورنہ پھر وقت ہاتھ نہ آئیگا

لطیفہ کہتے ہیں ایک شخص سو رہا تھا۔ اور سوتے میں اس نے خواب دیکھا کہ اسے ایک بھینس مل گئی ہے۔ وہ بھینس کو لے کر خوشی خوشی گھر آرہا تھا۔ کہ راستے میں بھینس کا ایک خریدار بھی مل گیا۔ خریدار نے

پوچھا۔ کیوں بھئی! اس بھینس کا کیا لو گے؟ وہ شخص بولا۔ پانچسو روپے خریدار نے کہا۔ نہیں صاحب دو سو لے لو۔ اس نے کہا۔ نہیں صاحب۔ پانچسو سے ایک پیسہ بھی کم نہیں۔ خریدار نے پھر کہا۔ دو سو بہت ہیں۔ دو سو لے لو۔ اب اس شخص نے زور سے کہا۔ نہیں پانچ سو ہی لوں گا۔ زور سے جو "نہیں" کہا تو آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہے۔ کہ نہ بھینس ہے نہ پانچسو۔ اور نہ دو سو۔ بڑا پچھتایا اور پھر آنکھیں بند کر کے بولا۔ اچھا لا دو سو ہی دے جا ۔ مگر اب دو سو بھی کہاں۔ اس وقت سودا کر لیتا۔ تو تھوڑے وقت کے لیے کچھ تو مل جاتا۔ میرے بھائیو! مطلب میرا یہ ہے۔ یہ وقت ہے کچھ کر لو ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔ اب مولانا رومی کی بیان کردہ ایک حکایت بھی سن لیجئے۔

مثنوی شریف کی ایک حکایت

وہ فرماتے ہیں۔ ایک دریا کے قریب ہی تھوڑے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔ جس میں تین مچھلیاں رہتی تھیں۔ اتفاقاً وہاں ایک ماہی گیر آیا اور اس نے جب اس گڑھے میں تین مچھلیاں دیکھیں تو کہنے لگا۔ کل جال لاؤں گا اور تینوں مچھلیوں کو پکڑ لوں گا۔ مولانا رومی فرماتے ہیں۔ ان تینوں مچھلیوں میں ایک تو بڑی دانا تھی۔ اور دوسری نیم عاقل تھی۔ اور تیسری بڑی احمق تھی۔ مگر اپنے آپ کو دانا سمجھتی تھی۔ مولانا رومی کے اشعار کا اردو منظوم ترجمہ سنیئے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

مشورہ دونوں سے عاقل نے کیا	تم نے ماہی گیر کا کہنا سنا!
ہے مری رائے کہ ہم سب رات بھر	کر کے محنت گرتے پڑتے جلد تر
یاں سے دریا کی طرف جائیں نکل	ورنہ یہ جانو کہ بس آئی اجل
نیم عاقل نے کہا سب کچھ سنا	وہ جو ماہی گیر اور تو نے کہا
پر مرے پیارے نبی کا ہے سخن	جزو ہے ایمان کا حب الوطن
میں نہ جاؤں گی وطن کو چھوڑ کر	جان کو بھی ہو اگر میرے خطر
یہ کہا عاقل نے اور سن کر ہنسی	مجھ کو بھی معلوم ہے قولِ نبی!

ہے غلط فہمی یہ تیری اے بہن عارضی پانی کو تو سمجھی وطن

مولانا فرماتے ہیں۔ کہ اس کے بعد وہ احمق مچھلی بولی اور کہا۔ ~

یہ کہا احمق نے میں ایسی نہیں لے پکڑ صیاد جو مجھ کو کہیں
اتنے پانی میں نہ میں آؤں گی ہاتھ جانتی ہوں خوب صیادوں کی گھات

عاقل مچھلی نے جب ان دونوں مچھلیوں کا جواب سنا تو ~

چل پڑی دریا کی جانب یہ کہا! لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
جو کوئی کرتا ہے خود اپنی مدد اس کی کرتا ہے خدا خود بھی مدد

اس کے بعد دوسرے دن ماہی گیر آیا۔ تو ~

نیم عاقل نے بھی یہ تدبیر کی دم لیا گھونٹ اور مردہ بن گئی
جان کر صیاد نے اس کو مُوا پھینکا دریا کی طرف واں سے اٹھا
اس جگہ سے جست کر کے ایک بار پہنچی دریا میں ہنسی بے اختیار

اور جو احمق مچھلی تھی اس کا کیا حشر ہوا ~

تیسری احمق پھنسی جب جال میں خوب روئی یاد کر کے پھرا نہیں
اپنی خود رائی پہ پچھتاتی بہت اپنی نادانی سے شرماتی بہت

نتیجہ

مولانا رومی اس حکایت کو لکھ کر نتیجہ یہ بیان فرماتے ہیں ~

ہے مراد عاقل سے یاں وہ متقی جو جیا بے عیب ساری زندگی
نیم عاقل سے غرض ہے وہ جوان عمر اول جس نے کھوئی رائیگاں
ہوش میں وہ آگیا پر وقت پر عاقبت کو کچھ نہ پہنچایا ضرر!!

ہے مراد احمق سے یاں وہ جیا
غرق عصیاں جو بڑھاپے تک رہا

میرے دوستو! اس حکایت سے سبق حاصل کرو۔ اول تو اس دانا مچھلی کی طرح عاقبت کی فکر کرو۔ موت کا شکاری آنے والا ہے اپنی زندگی اسلامی سانچے میں ڈھال لو۔ اور اگر آج تک، غفلت طاری رہی ہے۔ تو دوسری مچھلی ہی کی طرح آخری حصہ عمر کا درست کر لو۔ تاکہ انجام بخیر ہو۔

ورنہ یاد رکھو۔ تیسری احمق مچھلی کا سا حشر ناگزیر ہے اور عذاب کے فرشتے پکڑ کرلے جائیں گے۔ پھر اس احمق مچھلی کی طرح پچھتانا اور شرمانا پڑے گا۔ اب آخر میں یہ دعا ہے کہ ؎

یا خدا جسم میں جب تک کہ مری جان رہے
تجھ پہ صدقے ترے محبوب کے قربان رہے
کچھ رہے یا نہ رہے پر یہ دعا ہے کہ امیرؔ
نزع کے وقت سلامت مرا ایمان رہے

آمین یا ربّ العٰلمین

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ